فقہ حنفی
پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب

فقہ حنفی

قرآن و سنّت کی روشنی میں

جلد اوّل

ترجمہ۔ ترتیب۔ تحقیق
لجنۃ المصنّفین

جناب مولانا خالد محمود صاحب
جناب مفتی عبد العظیم ترمذی صاحب
جناب مولانا محمد انس صاحب

ادارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

فقہ حنفی قرآن وسنّت کی روشنی میں

(جلد اوّل)

منفرد خصوصیات کی حامل ایک بے مثال کتاب کا پہلی بار اردو ترجمہ اور تحقیق

فقہ حنفی

پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب

فقہ حنفی قرآن وسنّت کی روشنی میں

(جلد اوّل)

ترجمہ۔ ترتیب۔ تحقیق

لجنۃ المصنّفین

جناب مولانا خالد محمود صاحب

جناب مفتی عبد العظیم ترمذی صاحب

جناب مولانا محمد انس صاحب

ادارہ اسلامیات

لاہور۔ کراچی

پاکستان

نام کتاب

فقہ حنفی
قرآن و سنت کی روشنی میں

(جلد اول)

اشاعت اول

جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ بمطابق جون ۲۰۰۸ء

ترجمہ۔ترتیب۔تحقیق

لجنۃ المصنفین

جناب مولانا خالد محمود صاحب

جناب مفتی عبدالحکیم ترمذی صاحب

جناب مولانا محمد انس صاحب

اِدارہ اِسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

۱۴- دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور فون ۷۳۲۳۳۱۱ فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲+

۱۹۰- انارکلی، لاہور- پاکستان.......فون ۷۲۲۳۹۹۱-۷۳۵۳۲۵۵

موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی- پاکستان.....فون ۲۷۲۲۴۰۱

ملنے کے پتے

ادارۃ المعارف، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

مکتبہ دار العلوم، جامعہ دار العلوم، کورنگی، کراچی نمبر۱۴

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ، چوک لسبیلہ، کراچی

دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت القرآن، اردو بازار، کراچی نمبر۱

بیت العلوم، نابھہ روڈ، لاہور

فہرست

تقدیم

از فضیلۃ الشیخ عبد الرزاق الحلبی فقیہ الاصناف فی بلاد شام

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لانبی بعدہ

اما بعد! اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تفقّہ فی الدّین کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّیَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّیْنِ وَ لِیُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَیْهِمْ لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ" [التوبة: ۲۲]

''سوایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ یہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں اور تا کہ اپنی قوم کو جب کہ وہ ان کے پاس واپس آئے ڈرائیں، شاید کہ وہ بچیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس بندے کے ساتھ خیر و بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں۔''

علماء فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان پر دین کا اتنا علم حاصل کرنا فرض ہے جس سے اس کے عقائد، عبادات اور معاملات درست ہو جائیں اور یہ امر فقہ کے بغیر ممکن نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا بھی یہ معمول تھا کہ جن مسائل کا علم نہ ہوتا تو آپس میں ایک دوسرے سے پوچھ لیتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: "فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ" [الانبیاء: ۷] ''سو اگر تم کو (یہ بات) معلوم نہ ہو تو اہلِ کتاب سے دریافت کرلو۔''

مروی ہے کہ ایک مرتبہ ایک جدّہ (دادی، نانی) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئی اور اپنی میراث کا مطالبہ کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں کتاب اللہ میں تمہارا کوئی حصہ نہیں پاتا اور نہ ہی میں نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث تمہارے بارے میں سنی ہے، تم ابھی واپس

جاؤ، میں اپنے اصحاب سے دریافت کروں گا یا پھر خود غور کروں گا، چنانچہ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا: ''کیا تم میں سے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے جدّہ کے بارے میں کوئی حدیث سنی ہے؟ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جدّہ کے لیے سدس (۱/۶) کا فیصلہ فرمایا تھا، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''اطعم الجدۃ السدس'' یعنی آپ ﷺ نے جدّہ کو سدس دلایا تھا۔''
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی گواہ ہے؟ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ میں بھی مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی طرح اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے جدّہ کے لیے سدس کا فیصلہ فرمایا تھا۔''

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے نبی مکرم ﷺ سے دین کی تعلیم حاصل کرتے تھے اسی طرح ایک دوسرے سے بھی دین سیکھتے تھے۔

فقہ کا پہلا ماٰخذ و مصدر ''کتاب اللہ'' ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: ''اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ'' [بنی اسرائیل: ۹] ''بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقے کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔'' نیز فرمانِ الٰہی ہے: ''اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ'' [الاعراف: ۳] ''تم لوگ اس وحی کا اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے۔''

دوسرا ماٰخذ و مصدر ''حدیثِ رسول اللہ ﷺ'' ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ''وَ مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا'' [الحشر: ۷] ''اور رسول تم کو جو دے وہ لے لو اور جس سے روکے رک جاؤ۔''

اور تیسرا مصدر و منبع ''اجماعِ امت'' ہے: جیسا کہ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''میری امت ضلالت و گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔''

اور چوتھا ماٰخذ ''قیاس'' ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ'' [الحشر: ۲] ''سو، اے دانشمندو! (اس حالت کو دیکھ کر) عبرت حاصل کرو۔''

''اعتبار'' (عبرت حاصل کرنے) کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اس کی نظیر کی طرف لوٹانا، جب پیغمبرِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو ان سے پوچھا کہ تم مقدمات کا فیصلہ کس طرح کرو گے؟ عرض کیا کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، اگر کتاب اللہ میں حکم نہ ملا تو سنتِ رسول ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا، اگر اس میں بھی بظاہر حکم نہ ملا تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔''

انہوں نے اجماعِ امّت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ اجماع کی تشکیل وصالِ نبوی ﷺ اور سلسلہءِ وحی کے انقطاع کے بعد شروع ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی فقہ کے مصادر ومنابع چار ہیں۔

اس دور میں اس امر کی شدید ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے لیے فقہ اسلامی کو مبسوط اور واضح انداز میں ادلّہ شرعیہ کی روشنی میں مرتّب ومزیّن کیا جائے، اللہ تعالیٰ کا بے حد شکر ہے کہ استاذِ جلیل شیخ اسعد محمد سعد الصاغرجی حفظہ اللہ نے اس اہم فریضہ کو سرانجام دیا، انہوں نے امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ میں ایک مبسوط ومدلل کتاب تصنیف فرمائی جو دلائلِ شرعیہ کے زیور سے آراستہ و پیراستہ ہے، جیسا کہ ہدایہ اور اختیار کے مصنفین ؒ نے اس موضوع پر کام کیا ہے۔ میں نے کتاب ہذا کی تمام انواع (عبادات ومعاملات) کو ملاحظہ کیا تو فی الواقع یہ کتاب اپنے موضوع پر انتہائی عمدہ ثابت ہوئی۔ موصوف نے اس کی ترتیب میں کافی محنت وجدوجہد اور عرق ریزی سے کام لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں بہترین صلہ اور بدلہ عنایت فرمائے اور ہمیں بھی اس کتاب سے نفع اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عبدالرزاق الحلبی

۲۲ ربیع الاوّل ۱۴۲۰ھ

مقدمہء مؤلف

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاة والسلام علٰی سیّدنا محمّد القائل: "من یرد اللّٰہ به خیرًا یفقّهه فی الدین" واشهد ان لا اله الا اللّٰہ، و ان محمّدًا عبده و رسوله خیر نبی ارسله.

اما بعد: محترم قارئین! میں آپ کے سامنے فقہ حنفی اور امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے صاحبین امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف پیش کرتا ہوں۔

ایک کتاب "الخیرات الحسان" میں لکھا ہے: "کسی آدمی کی عظمت وشرافت پر لوگوں کے متعارض خیالات سے استدلال کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے بارے میں دو گروہ ہلاک ہوئے، ایک گروہ وہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں حد سے تجاوز کر گیا اور دوسرا وہ جو ان سے بغض وعداوت رکھتا تھا اور اس نے تفریط سے کام لیا"۔

مذکورہ بات امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر پوری طرح صادق آتی ہے کہ بعضوں نے تو آپ رحمۃ اللہ علیہ کو اتنا بلند شان ثابت کیا کہ ان کو انبیاء ومرسلین کے مقام کے قریب پہنچا دیا اور زعم یہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نام کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا: ان لوگوں نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بہت سی صفات و مناقب کا انتساب کیا، جب کہ بعض لوگوں نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف متعصّبانہ رویہ اختیار کیا کہ آپؒ پر ترکِ سنت، زندیقیت اور بلا حجت ودلیل فتویٰ دینے کے الزامات لگائے، انہوں نے آپؒ کے دین وایمان اور شخصیت کو مجروح اور مطعون کیا، یوں وہ تفریط میں حد سے تجاوز کر گئے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی علمی شخصیت کے مالک تھے، جس کی بدولت ان کی فقہ عراق کے شہروں سے تجاوز کر کے دوسرے اسلامی ممالک میں پھیل گئی اور اکثر علاقوں میں لوگ ان کی آراء واقوال کو بیان کرنے لگے اور ہر مخالف وموافق نے اس سے استفادہ کیا، البتہ مخالفین نے نفرت کا اظہار کیا اور موافقین نے اس کی خوب نصرت وحمایت کی۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مخالفین کو جب ان میں نئی نئی آراء نظر آئیں تو ان کے انکار اور ناگواری میں اضافہ ہوا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ مخالفین نے آپ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف دشنام

طرازی اور زبان درازی بھی کی، لیکن جب انہیں آپ رحمۃ اللہ علیہ کے علم وتقویٰ اور ورع کا علم ہوا اور شرفِ زیارت سے مشرف ہوئے یا دلیل کی قوت کا اندازہ ہوا تو ان کی شدت میں کمی آئی بلکہ بسا اوقات آپ رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت وجلالت کے معترف ہوئے اور آپ رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال سے اتفاق کیا۔ جیسا کہ ایک واقعہ اس سلسلہ میں منقول ہے کہ ملک شام کے فقیہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (جو کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے) نے ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ ''یہ کون بدعتی ہے جو کوفہ میں نکلا ہے، جس کی کنیت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بتائی جاتی ہے''؟ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ وہ پیچیدہ مسائل وفتاویٰ کا ذکر کرنے لگے، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ یہ کن کے فتاویٰ ہیں؟ ابن المبارک رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ ایک شیخ کے ہیں جن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی تھی، امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ بڑے درجہ کے مشائخ میں سے ہیں، ان کے پاس جایا کرو اور کثرت سے علم حاصل کرو' عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔'' ایک مرتبہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ دونوں مکہ مکرمہ میں جمع ہوگئے اور ان میں ان مسائل کا مذاکرہ ہوا جن کو عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا تھا، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان مسائل کی خوب وضاحت کی، جب دونوں جدا ہوئے تو امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ ''مجھے اس آدمی کی علم کی کثرت اور وفورِ عقل پر رشک آیا اور میں اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں، میں کھلی غلطی پر تھا، میں نے ان پر الزام لگایا، حالانکہ وہ ایسا نہیں جیسا مجھے ان کے متعلق بتایا گیا تھا۔''

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی علمی شخصیت، عمیق تاثیر اور اثر ورسوخ کے باوجود افتاء وتخریج، فہمِ حدیث اور استنباطِ مسائل میں ایک خاص طریق کے مالک تھے، جس کو انہوں نے اپنے تلامذہ اور ان کے متعلقین میں تقریباً تیس سال تک پھیلایا، جس کی یہ شان ہو وہ ایسی تلخ تنقیدوں کا نشانہ ضرور بنا کرتا ہے، بلکہ اس کی شخصیت کو مجروح اور رائے کو بے بنیاد اور مبنی بر تعصب قرار دیا جاتا ہے۔

حیاتِ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

(۱) نام ونسب اور خاندان

اکثر مؤرخین کا تقریباً اتفاق ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کوفہ میں ۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے والد کا نام ثابت بن زوطی الفارسی ہے، یہ مشہور قول ہے اس پر تمام ثقات متفق ہیں۔ آپ کے دادا کا تعلق کابل سے تھا، جب مسلمانوں نے ان علاقوں کو فتح کیا تو اس میں وہ بھی اسیر بنا کر کوفہ لائے گئے تھے جنہیں قبیلہ بنی تیم بن ثعلبہ کے کچھ افراد نے گرفتار کیا تھا اور بعد میں آزاد کر دیا تھا، اس قبیلہ سے آپ کا رشتہ وِلاء قائم ہوا جس کی وجہ سے آپ کو "تیمي" کہا جاتا ہے۔ نام ونسب کے متعلق یہ روایت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے، عمر بن حماد بن ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے، لیکن آپ کے دوسرے پوتے اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہے۔ حضرت اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ واللہ ہمارا خاندان کبھی کسی کا غلام نہیں رہا۔

بہرحال! آپ کے والد یا دادا غلام تھے یا نہیں؟ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے علم وشرف اور مقام ومرتبہ پر کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوتا، آپ کا جاہ ومنصب آپ کے علم وتقویٰ اور فہم وفراست پر مبنی ہے اور یہی اصل شرف وعزت ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ" [الحجرات: ۱۳] "یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں معزز وہ ہے جو تم میں زیادہ متقی ہو۔"

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ (جو فارسی النسل تھے) کی شان میں فرمایا:

"سلمان منا آل البيت" یعنی سلمان ہمارے اہلِ بیت میں سے ہیں۔"[۱]

حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا نافرمان تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے اہل و اولاد سے اس کی نفی فرمائی، ارشاد فرمایا: "اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِکَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ" [هود: ۴۶] "وہ تیرے اہل واولاد میں سے نہیں ہے کیونکہ اس کے عمل اچھے نہیں ہیں۔"

حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو دیکھئے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اپنے قریب کیا اور اپنے چچا ابولہب کو دور کیا اور اس سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا، حالانکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے۔

---

۱ [الطبرانی فی الکبیر ۶/۲۶۱، الحاکم ۳/۵۹۸]

اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فارسی النسل ہونا کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اس سے آپؒ کی شانِ عالی میں کوئی کمی نہیں آتی، اور یہ چیز فضائل وکمالات تک پہنچنے میں مانع بھی نہیں ہے، خود امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ غلام نہیں تھے بلکہ شریف النسب اور اصلاً آزاد تھے۔ علم فقہ کا اکثر حصہ موالی کو حاصل تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جس میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے نشوونما پائی۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ایسے اہلِ علم عطا فرمائے جو علم کے میدان میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے جیسا کہ درج ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''الخیرات الحسان'' میں رقمطراز ہیں: ''ایک مرتبہ عطاء بن عبداللہ اور ھشام بن عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان گفتگو ہوئی، حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں رصافہ (مقام) میں ھشام بن عبدالملک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ کیا تمہیں مختلف شہروں کے علماء کے بارے میں کچھ علم ہے؟ میں نے کہا: یا امیر المؤمنین! کیوں نہیں! (مجھے معلوم ہے کہ کس شہر کا کونسا عالم سب سے بڑا ہے)، ھشام نے پوچھا کہ بتاؤ! مدینہ منورہ کے رہنے والوں میں کون بڑا فقیہ ہے؟ میں نے کہا کہ نافعؒ مولی ابن عمرؓ اہلِ مدینہ کے بڑے فقیہ ہیں۔ ھشام نے کہا کہ مکہ مکرمہ کے رہنے والوں میں کون بڑا فقیہ و عالم ہے؟ میں نے کہا کہ عطاء بن ابی رباحؒ اس وقت وہاں کے بڑے فقیہ ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا وہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ وہ عربی نہیں ہیں بلکہ مولیٰ ہیں، پھر انہوں نے پوچھا کہ اہلِ یمن میں کون بڑا فقیہ ہے؟ میں نے کہا کہ طاؤس بن کیسانؒ وہاں کے بڑے فقیہ ہیں، ھشام نے پوچھا کہ وہ عربی ہیں یا مولیٰ؟ میں نے کہا کہ وہ عربی نہیں ہیں بلکہ مولیٰ ہیں، پھر ھشام نے پوچھا کہ اہلِ یمامہ میں اس وقت کون بڑا فقیہ ہے؟ میں نے بتایا کہ یحییٰ بن کثیرؒ بڑے فقیہ ہیں، انہوں نے کہا کہ کیا وہ عربی ہیں یا مولیٰ ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ عربی نہیں ہیں بلکہ مولیٰ ہیں، پھر پوچھا کہ اہل شام میں اس وقت کون بڑا فقیہ و عالم ہے؟ میں نے مکحولؒ کا نام لیا، کہنے لگے کہ کیا وہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ وہ عربی نہیں ہیں بلکہ مولیٰ ہیں، پھر پوچھا کہ اہلِ جزیرہ میں اس وقت کون بڑا فقیہ ہے؟ میں نے میمون بن مہرانؒ کا نام ذکر کیا، کہنے لگے کہ کیا وہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ وہ تو مولیٰ ہیں، عربی نہیں، پھر ھشام نے پوچھا کہ خراسان کا بڑا فقیہ کون ہے؟ میں نے کہا کہ ضحاک بن مزاحمؒ وہاں کے بڑے فقیہ ہیں، پوچھا کہ وہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ وہ تو مولیٰ ہیں عربی نہیں ہیں۔ پھر پوچھا کہ اہلِ بصرہ میں اس وقت کون بڑا فقیہ ہے؟ میں نے کہا کہ حسن بصری اور ابن سیرینؒ ہیں، کہنے لگے کہ کیا وہ دونوں موالی ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ وہ دونوں موالی ہیں، عربی نہیں ہیں۔ پھر پوچھنے لگے کہ اہلِ کوفہ میں اس وقت

کون بڑا فقیہ ہے؟ میں نے ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا کہ وہ بڑے فقیہ ہیں، پوچھا کہ وہ مولیٰ ہیں یا عربی؟ میں نے کہا کہ وہ عربی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد دین کا علم ایک عرصہ دراز تک موالی کے پاس رہا، یعنی ایک طویل مدت تک موالی ہی علم فقہ میں مرکز اور مرجع کی حیثیت رکھتے تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان سے علم حاصل کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچ فرمایا تھا کہ عنقریب علم فارس کی اولاد میں پہنچ جائے گا، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر علم ثریا کے پاس بھی ہوگا تو فارس کے لوگ اس کو پالیں گے۔''[1]

(۲) تعلیم و تربیت

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوفہ ہی میں نشوونما ہوئی اور وہیں آپؒ نے تربیت پائی، کوفہ میں آپ کی زندگی کا اکثر حصہ تعلیم و تعلم اور بحث و مناظرہ میں گزرا، آپؒ صاحب ثروت تاجر تھے، آپؒ کے والد ماجد حضرت ثابت رحمۃ اللہ علیہ کو بچپن میں حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ آپ کے دادا (نعمان) نے نوروز کے جشن کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فالودہ پیش کیا تھا جس پر آپؓ نے فرمایا کہ ہمارا ہر دن نوروز ہے، ایک روایت کے مطابق یہ واقعہ جشنِ مہرجان کا ہے۔[2]

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان دولت وثروت میں اتنا متمول تھا کہ خلیفۂ وقت بھی ان کے تحائف سے شرف حاصل کرتے تھے۔ مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امام صاحبؒ کے والد ماجد حضرت ثابت اور ان کی اولاد کے حق میں خیر و برکت کی دعا فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی مسلمان تھے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خالص اسلامی گھرانے میں پرورش پائی، اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے، شاذ و نادر ہی کسی نے اختلاف کیا ہے۔

آپؒ نے بچپن میں ہی حفظِ قرآنِ کریم کی طرف توجہ دی اور امام عاصم رحمۃ اللہ علیہ سے جو قراء سبعہ میں سے ہیں، قرأت کا فن حاصل کیا، اس وقت کوفہ عراق کا ایک بڑا شہر تھا بلکہ اس وقت کا دوسرا مصر تھا اور عراق میں مختلف مذاہب و فرق کے لوگ آباد تھے۔ ابتداء میں آپ رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان مناظرہ و مجادلہ کی طرف تھا، آپ اہلِ بدعت وضلالت سے بحث و مناظرہ کرکے ان کو راہِ مستقیم پر لاتے تھے۔ لیکن زیادہ وقت تجارتی مصروفیت کی وجہ سے بازاروں میں آنے جانے میں گزرتا۔ علماء کی خدمت

[1] [صحیح البخاری: ۴۸۹۷ و مسلم ۲۵۴۶]

[2] [اخبار ابی حنیفہ واصحابہ ص ۳، و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۶]

میں بہت کم آمد ورفت تھی، پھر ایک عالم نے ان میں جوہر شناسی اور فہم وفراست دیکھ کر اور یہ سوچ کر کہ ان کا سارا وقت تجارت پر ہی صرف نہ ہو جائے، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو علماء کی خدمت میں آنے جانے کی نصیحت کی کہ جس طرح وہ بازاروں میں آتے جاتے ہیں اسی طرح ائمہ دین کے پاس بھی آمد ورفت رکھیں۔

علامہ ابن حجر المکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ایک روز میرا گزر امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے ہوا، وہ بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ کس کے پاس آتے جاتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں بازاروں میں آتا جاتا ہوں، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا، میرا مطلب یہ ہے کہ تم کس عالم کے پاس آتے جاتے ہو، بازاروں میں آنا جانا مراد نہیں ہے؟ میں نے کہا کہ میں تو بہت کم علماء کے پاس جاتا ہوں، اس پر انہوں نے مجھے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، علماء کی صحبت اور علم میں غور وفکر کو اپنے اوپر لازم کرلو، کیونکہ میں تمہارے اندر فہم وفراست اور بیدار مغزی محسوس کرتا ہوں، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی بات میرے دل میں گھر کرگئی، میں نے پھر بازاروں میں آنا جانا ترک کردیا اور علم کے حصول میں لگ گیا، اللہ تعالیٰ نے مجھے ان کی بات سے بہت نفع عطا فرمایا۔"

آپؒ ایک طویل عرصہ تک مختلف علوم میں کمال حاصل کرنے کی جدوجہد فرماتے رہے، لیکن بالآخر آپؒ کو فقہ پر کامل عبور اور اس میں کامل دسترس حاصل ہوگئی اور آپ اسی کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے۔ آپؒ نے اصولِ عقائد میں علم جدل سے خوب استفادہ کیا علم الکلام میں آپؒ نے وہ مقام حاصل کرلیا کہ آپؒ مرجع الخلائق بن گئے، لیکن بعد میں آپؒ نے مجادلہ کو ترک کرکے علمِ فقہ کی طرف توجہ دینا شروع کردی اور اپنے دور کے بڑے بڑے مشائخ وائمہ سے علمِ فتویٰ کی تعلیم حاصل کرنے لگے، آپؒ کے دور میں کوفہ شہر فقہائے عراق کا مرکز تھا، آپؒ کا اس بارے بیان ہے کہ "میں علم وفقہ کے معدن (مرکز) میں رہتا تھا، مجھے اہلِ علم کی صحبت وہمنشینی حاصل ہوئی اور میں نے وہاں کے فقہائے کرام میں سے ایک فقیہ سے تعلق اور وابستگی اختیار کرلی۔" ان فقیہ سے مراد حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کا علم حاصل کیا اور تاحیات انکے ساتھ برابر تعلق قائم رکھا، یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے شیخ حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ سے تقریباً اٹھارہ سال تک تعلق قائم رہا۔

امام زفر رحمۃ اللہ علیہ حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ سے امام صاحبؒ کے تعلق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ امام صاحبؒ نے فرمایا: "میں دس سال تک ان کی صحبت میں رہا، ایک دفعہ میرے دل میں جاہ

ومنصب کی خواہش پیدا ہوئی اور میں نے ارادہ کرلیا کہ ان کی مجلس کو چھوڑ کر اپنی مجلس لگاؤں، چنانچہ ایک دن شام کے وقت میں گھر سے نکلا اور میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر چکا تھا، جب مسجد میں داخل ہوا اور ان پر نظر پڑی تو پھر میرے دل نے ان سے تعلق ختم کرنے کو پسند نہ کیا، پس میں آیا اور ان کی مجلس میں بیٹھ گیا، پھر ایک دن میرے شیخ کے کسی رشتہ دار کی وفات کی خبر آئی کہ بصرہ میں اس کا انتقال ہو گیا ہے اور اس نے وراثت میں بڑا مال چھوڑا ہے اور ان شیخؒ (حماد) کے علاوہ اس کا کوئی وارث بھی نہیں ہے، چنانچہ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں ان کی جگہ (مسند) پر بیٹھوں، پس میں مسائل کا جواب دیتا تھا اور اپنے جوابات کو لکھتا تھا، پھر جب وہ آئے تو میں نے ان کے سامنے وہ مسائل پیش کیے جو تقریباً پچاس کے قریب تھے، تو چالیس مسائل میں میرے ساتھ اتفاق کیا اور دس مسائل میں اختلاف کیا، پھر میں نے پختہ عزم کرلیا کہ اب میں وفات تک ان سے جدا نہیں ہوں گا، پس میں ان سے جدا نہیں ہوا (یعنی مسلسل ان کی صحبت علمی سے فیض یاب ہوتا رہا) حتیٰ کہ ان کا انتقال ہوا۔[1]

جب حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو اس وقت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عمر چالیس برس تھی اور ان کی وفات کے بعد امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کی مسند پر بیٹھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران کوفہ ہی میں مقیم نہیں رہے بلکہ اس عرصہ میں کئی مرتبہ حج بیت اللہ کے لیے حرمین شریفین بھی آتے رہے، مکہ و مدینہ کے بہت سے علماء سے ملاقاتیں بھی ہوئیں جن میں تابعین کرامؒ کی بڑی تعداد شامل ہے جن کے ساتھ آپ کی علمی ملاقاتیں ہوئیں اور ان سے احادیث بھی روایت کیں، اور ان کے ساتھ فقہی مذاکرات کیے۔ جن ائمہ عظام کے ساتھ علمی و فقہی مذاکرے ہوئے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں: زید بن علی بن الحسین رحمۃ اللہ علیہ، جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہ، ابو محمد عبد اللہ بن حسن رحمۃ اللہ علیہ، ان کا لقب ''النفس الزکیۃ'' تھا، اور وہ تابعین کرام کی تلاش میں رہتے تھے، جہاں کہیں بھی وہ موجود ہوتے ان سے کسب فیض کرتے، یہاں تک کہ ان کا قول ہے کہ ''میں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی فقہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فقہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی فقہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی فقہ ان کے اصحاب و تلامذہ سے حاصل کی ہے۔''

شیخ حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد جب امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مستقل طور پر ان کے مسند نشیں ہوئے اور اپنا حلقۂ درس شروع کیا تو اپنے تلامذہ کے ساتھ بھی ایسے پیش آمدہ فتاویٰ و

---

1. [تاریخ بغداد ۱۳/۳۳۳]

قضایا کے بارے میں علمی وفقہی مذاکرات کرتے رہے اور غیر منصوص مسائل میں درست اور مضبوط رائے اور معتدل کلام کے ساتھ قیاس کرتے رہے، یہاں تک کہ فقہی مسلک وضع ہوا، اس کے باوجود آپؒ نے تجارت کو ترک نہیں کیا، اس سلسلہ میں آپ کا ایک امانت دار شریک تھا جس نے آپؒ کو تجارت کی مصروفیت سے مستغنی کر دیا تھا، یہ ان علماء وائمہ کرام کا حال ہے جنہوں نے علم اور تجارت دونوں کو جمع کیا۔

(۳) ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بحیثیت تاجر

آپؒ تاجر ہونے کی حیثیت سے چار اوصاف سے موصوف تھے جن کی وجہ سے آپؒ مثالی تاجر بن گئے تھے، جیسا کہ علمائے کرام کی شان ہوتی ہے: (۱) آپؒ دل کے غنی تھے، حرص وطمع کا ان پر غلبہ نہ تھا جو انسان کے دل کو حقیقت میں فقیر بناتا ہے۔ (۲) آپؒ بڑے امانت دار تھے۔ (۳) آپؒ انتہائی سخی تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو بخل سے محفوظ رکھا تھا۔ (۴) آپؒ انتہائی متدین اور عبادت گزار تھے، دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام کرتے۔

بہت سے لوگوں نے آپؒ کو تجارت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے، آپ کی بیع وشراء امانت ودیانت کے مطابق ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک عورت ریشم کا کپڑا بیچنے کے لیے آئی، آپؒ نے اس کی قیمت پوچھی تو اس نے کہا کہ سو درہم، آپ نے کہا کہ یہ کپڑا تو سو درہم سے زیادہ کا ہے، بتاؤ! کتنے کا بیچتی ہو؟ وہ عورت اس کی قیمت بڑھاتی رہی یہاں تک کہ اس نے کہا کہ میں چار سو درہم میں بیچوں گی، آپؒ نے کہا کہ یہ کپڑا تو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے، وہ عورت کہنے لگی، آپ میرے ساتھ مزاح تو نہیں کر رہے؟ امام صاحبؒ نے کہا کہ کوئی آدمی لاؤ جو اس کی صحیح قیمت لگائے، وہ ایک آدمی کو لائی اس نے پانچ سو درہم قیمت لگائی، چنانچہ آپؒ نے وہ کپڑا اس سے پانچ سو درہم کے عوض خریدا۔

آپؒ کی شان یہ تھی کہ آپؒ اپنا خیال رکھنے سے پہلے بائع کا خیال رکھتے تھے اور اس کی مصلحت کو پیش نظر رکھتے تھے، آپؒ عام تاجروں کی طرح بائع کی غفلت کو غنیمت جان کر فائدہ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ ایسے موقع پر اس کی صحیح رہنمائی کیا کرتے تھے۔

اگر کسی موقع پر مشتری تنگدست ہوتا یا ان کا دوست ہوتا تو اس سے نفع نہ لیتے، بلکہ بسا اوقات اپنا زائد نفع اس کو دے دیتے۔

ایک دفعہ ایک عورت آئی اور کہنے لگی: میں کمزور عورت ہوں آپ مجھ پر احسان کریں کہ یہ

کپڑا میرے ہاتھ فروخت کردیں اور اس کی کلفت (صرفہ، لاگت) آپ کو دوں گی، آپؒ نے کہا کہ تم یہ کپڑا صرف چار درہم میں لے لو، وہ کہنے لگی کیا آپؒ میرے ساتھ مزاح کررہے ہیں، میں بوڑھی عورت ہوں؟ آپ نے کہا کہ میں نے دو کپڑے خریدے تھے، ایک کپڑا تو میں نے اصل رقم کے عوض بیچ دیا، صرف چار درہم کی کمی رہ گئی تھی، بس یہ کپڑا چار درہم کا میرے پاس رہ گیا تھا، یہ تم لے لو۔"

ایک شخص نے ایک خاص رنگ کا ریشمی کپڑا امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے طلب کیا، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ انتظار کرو، ایسا کپڑا آجائے گا تو تمہارے لیے رکھ لوں گا، ایک ہفتہ نہیں گزرا تھا کہ مطلوبہ رنگ کا ریشمی کپڑا دکان پر آگیا اور وہ شخص دکان کی طرف سے گزرا تو آپؒ نے اس کو بلا کر کہا کہ تمہاری پسند کا کپڑا آگیا ہے، اس نے قیمت پوچھی، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک درہم بتائی، اس نے مذاق سمجھا، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا کہ میں نے دو کپڑے بیس دینار اور ایک درہم میں خریدے تھے، اور ایک کپڑا بیس دینار میں فروخت ہوگیا، میرے رأس المال (اصل رقم) میں ایک درہم کی کمی رہ گئی تھی، تم دوسرا کپڑا لے لو اور ایک درہم دے دو، میں اپنے احباب سے نفع نہیں لیتا ہوں۔"[1]

معاملات میں امام صاحبؒ کا تقویٰ

جس معاملے میں گناہ کا شبہ بھی ہوتا آپ اس سے بہت احتیاط کرتے تھے، اور جب کسی معاملہ میں گناہ کا وہم وخیال بھی ہو جاتا تو اس کو فقراء اور حاجت مندوں پر صدقہ کردیتے تھے۔ جیسا کہ ایک واقعہ منقول ہے کہ حفص بن عبدالرحمٰن امام صاحبؒ کے شریکِ تجارت تھے، آپؒ ان کے ہاں مال روانہ کیا کرتے تھے اور وہ فروخت کرتے تھے، ایک مرتبہ مال بھیجا اور ان کو بتا دیا کہ ایک تھان میں عیب ہے، گاہک کو بتا دینا، مگر حفص کے ذہن سے بات اتر گئی اور انہوں نے اس تھان کو عام قیمت فروخت کردیا اور خریدار کا پتہ نہ چل سکا، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو پتہ چلا تو انہوں نے اس کی پوری قیمت صدقہ کردی۔[2]

اس تمام تر دیانت داری کے باوجود آپؒ کی تجارت بڑی نفع بخش ہوتی تھی، امام صاحبؒ ضرورت مند علماء ومحدثین اور مشائخ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ سامانِ تجارت بغداد بھیجتے تھے اور ان کو فروخت کرکے دوسرا سامان کوفہ سے منگواتے تھے جو یہاں فروخت ہوتا تھا اور ان کا

---

[1] [تاریخ بغداد ۱۳/۳۶۲]

[2] [تاریخ بغداد ۱۳/ ۳۵۸، اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ ص ۳۴]

سال بھر کا منافع جمع کر کے اہلِ علم پر خرچ کرتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ ”آپ لوگ صرف اللہ کا شکر ادا کریں کیونکہ میں نے اپنے رأس المال میں سے کچھ نہیں دیا ہے، یہ سب آپ ہی لوگوں کے سامان کا منافع ہے۔“

آپ کے شریک فی التجارت کہتے ہیں کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے طالب علموں کا پورا بار برداشت کرتے تھے، تاکہ وہ سکون واطمینان سے دینی تعلیم حاصل کریں، فراغت تک ان کے بال بچوں کے لیے وظیفہ دیتے تھے اور فارغ ہو جاتے تو ان سے کہتے کہ اب تم حلال وحرام معلوم کر کے غنی اکبر کے درجہ پر پہنچ گئے۔“[1]

حسن بن زیاد لولوی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ امام صاحبؒ اپنے شاگردوں کو خستہ حال دیکھتے تو مجلس درس ختم ہونے کے بعد ان کو بیٹھنے کا حکم دیتے اور جب مجمع چلا جاتا تو ان کی مدد کرتے تھے۔ ایک دن ایک طالبِ علم کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے دیکھے تو حسبِ معمول اس کو بیٹھے رہنے کا حکم دیا اور جب سب لوگ چلے گئے تو کہا کہ مصلیٰ اٹھاؤ، اس کے نیچے رقم ہے، وہ لے لو اور اپنی ہیئت بدل ڈالو، اس طالبِ علم نے کہا کہ میں امیر آدمی ہوں، ناز ونعمت میں زندگی بسر کرتا ہوں، مجھے اس کی ضرورت نہیں، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ کیا تم کو یہ حدیث معلوم نہیں ہے: ”**ان اللّٰہ یحب ان یریٰ اثر نعمتہ علی عبدہ**“ ”اللہ اس کو پسند کرتا ہے کہ اپنے بندہ پر اپنی نعمت کا نشان دیکھے۔“ جب تم مال دار ہو تو اپنی حالت درست کر لو، تاکہ تمہارے احباب تمہاری خستہ حالی دیکھ کر غمگین نہ ہوں۔“

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اموی دورِ حکومت میں اپنی زندگی کے باون سال گزارے اور عباسی دور میں اٹھارہ سال کا زمانہ گزارا، ۱۳۰ھ میں آپ مکہ مکرمہ چلے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے یہاں تک کہ عباسی دورِ خلافت شروع ہوا اور آپ خلیفہ جعفر المنصور کے زمانہ میں کوفہ واپس آئے۔

(۴) عہدۂ قضاء کی پیش کش

ابو جعفر المنصور نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو عہدۂ قضاء قبول کرنے کا حکم دیا، آپؒ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر مطالبہ کیا کہ قضاۃ مشکل مسائل میں ان کی طرف رجوع کریں گے اور وہ ان کو فتویٰ دیں گے، آپؒ نے اس سے بھی انکار کیا۔ ابو جعفر المنصور نے آپؒ کو سزا دی اور کوڑے لگوائے اور قید خانہ میں ڈالا۔

---

[1] [اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ ص ۴۷، ۴۸]

آپؒ کے مناقب میں آتا ہے: ''جب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بغداد کے لیے روانہ ہونے لگے تو چہرہ چمک رہا تھا اور فرمایا کہ اس شخص (خلیفہ ابوجعفر) نے مجھے عہدۂ قضاء قبول کرنے کی دعوت دی ہے، میں نے ان کو بتا دیا کہ میں اس منصب کی صلاحیت نہیں رکھتا اور مجھے معلوم ہے کہ مدعی کے ذمہ بیّنہ (ثبوت فراہم کرنا)، اور منکر کے ذمہ یمین (قسم) ہوتی ہے۔ منصبِ قضاء کا اہل صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو ایسے حوصلہ و ہمت کا مالک ہو جس کی وجہ سے وہ تمہارے خلاف یا تمہاری اولاد اور افسران کے خلاف فیصلہ کرسکتا ہو میرے پاس ایسا حوصلہ نہیں ہے۔ پھر اس نے کہا کہ آپ میرے عطایا کو قبول کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا کہ اگر امیر المؤمنین اپنے ذاتی مال میں سے مجھے کوئی عطیہ یا ہدیہ دیں تو میں ضرور قبول کروں گا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر المؤمنین مجھے مسلمانوں کے بیت المال میں سے عطایا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کے مال میں میرا کوئی حق نہیں ہے، میں ان مسلمانوں کے تحفظ جان کے لیے نہ تو قتال کرتا ہوں کہ وہ حق وصول کروں جو ایک جنگجو وصول کرتا ہے اور نہ میں ان کی اولاد میں سے ہوں کہ وہ حق وصول کروں جو کسی کی اولاد وصول کیا کرتی ہے اور نہ ہی میں ان کے فقراء میں سے ہوں کہ وہ حق لوں جو فقراء لیتے ہیں، اس نے کہا کہ ایسا کرو کہ تم یہاں اقامت اختیار کرلو، قُضاۃ تمہارے پاس آئیں گے، اپنے مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کریں گے، لیکن میں نے اس بات کو بھی قبول نہیں کیا۔''

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے عہدۂ قضاء کو اس لیے ٹھکرا دیا کہ وہ جانتے تھے کہ یہ کتنا پُر خطر کام ہے، بسا اوقات انسان اس کا متحمل نہیں ہو پاتا، آپؒ نے افتاء کے منصب کو بھی قبول نہیں کیا، اس لیے کہ جب مسائلِ قضاء پیش آتے ہیں تو اس وقت افتاء کی حقیقت ایک حکم کی ہوتی ہے، خلیفہ منصور تو کسی صورت میں اس کو گوارا نہیں کرسکتا تھا۔ آپؒ نے قضاء و افتاء کے عہدوں اور خلیفہ کے عطایا و ہدایا کو نتائج سے بے پرواہ ہو کر رد کر دیا۔ خلیفہ منصور نے آپؒ کو جیل خانہ میں ڈال دیا اور کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ آپؒ کو ایک سو دس کوڑے لگائے گئے۔ اس دوران آپؒ سے کہا جاتا تھا کہ قضاء کو قبول کرو، آپؒ جواب دیتے کہ میں اس کی صلاحیت نہیں رکھتا ہوں، جب کوڑے پر کوڑے لگنے شروع ہوئے تو آپ نے خفیہ طور پر یہ دعا کی کہ اے اللہ! اپنی قدرت و طاقت سے مجھے ان کے شر سے بچا لیجئے!''
چنانچہ خلیفہ منصور سے کسی نے آپ کے متعلق بات کی، اس نے آپؒ کو جیل خانہ سے تو رہا کر دیا لیکن فتویٰ دینے، لوگوں کے لیے مجلس درس لگانے اور گھر سے نکلنے پر پابندی لگادی (یعنی نظر بند کر دیا) چنانچہ آپؒ نے اسی حالت میں ۱۵۰ھ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی، آپؒ نے یہ وصیت کی تھی کہ ان کو پاک سرزمین میں دفن کیا جائے جو کسی سے غصب کردہ نہ ہو اور ایسی زمین جس کے بارے

میں حاکمِ وقت پر غصب کرنے کا الزام ہو اس میں بھی انہیں دفن نہ کیا جائے۔ مروی ہے کہ جب ابو جعفر کو آپ کی وفات کا پتہ چلا تو کہا کہ اب کون ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے میری معذرت قبول کرے گا۔

سارا بغداد فقیہ العراق اور امامِ اعظمؒ کے جنازہ میں شریک ہوا، ایک اندازے کے مطابق آپؒ کی نمازِ جنازہ میں پچاس ہزار کے قریب لوگوں نے شرکت کی اور بغداد ہی میں مدفون ہوئے۔

(۵) علماءِ عصر کا خراجِ تحسین

آپؒ کے ہمعصر فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقیہ آدمی تھے، علمِ فقہ میں معروف تھے اور بڑے صاحبِ ثروت تھے، ہر آنے والے کے ساتھ مہربانی سے پیش آتے تھے، شب و روز دین کی تعلیم و تدریس میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے، اچھے شب بیدار تھے، بہت زیادہ خاموش رہنے والے تھے، کم گو تھے، حلال و حرام کے مسائل میں حق کی طرف بہترین رہنمائی کرتے تھے۔"

حضرت جعفر بن الربیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال تک امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہا، میں نے آپ سے زیادہ اور کسی کو خاموش طبیعت نہیں پایا لیکن جب فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو علم کا سمندر بہا دیتے۔

آپؒ کے ہمعصر عبد اللہ بن المبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ علم کا مغز تھے۔"

آپؒ کے ایک اور ہمعصر عالم امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ واقعی فقیہ انسان ہیں۔"

محدث ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "عنقریب علم میں ان کی عجیب شان ہوگی" جب آپؒ بڑے ہوئے اور محدثِ ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے آپ کا تذکرہ ہوا تو فرمایا: "واقعی وہ فقیہ ہیں، واقعی وہ فقیہ ہیں۔"

بعض معاصرین کا قول ہے کہ وہ ان سے زیادہ فہمِ حدیث کا ماہر کسی کو نہیں جانتے۔" اس کا سبب یہ ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے ظاہری مفہوم پر اکتفاء نہیں کرتے تھے بلکہ احکامات کا باعث بننے والے ان اسباب وعلل کا بھی استخراج اور استنباط کرتے جو حدیث کے الفاظ یا سیاق و سباق کی مناسبت سے معلوم ہوتے ہیں، اور پھر اس کے ہم شکل اور ہم معنی مسائل کو علتِ مشترکہ کی وجہ سے اس پر قیاس کرتے۔

(۶) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا علم

(اولاً) بعض وہ صفات جو آپؒ کی خلقت اور فطرت میں موجود تھیں اور بعض وہ صفات جن کو آپؒ نے اپنی محنت و جدوجہد سے حاصل کیا تھا۔ (ثانیاً) آپؒ کے شیوخ و اساتذہ، جن سے آپؒ نے علم حاصل کیا اور جنہوں نے آپؒ میں اپنے نقوش چھوڑے اور راستے کی نشاندہی اور رہبری کی، (ثالثاً) آپؒ کی خصوصی تحقیقات اور مذاکرات۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی صفات

(۱) آپؒ اپنے آپ پر کنٹرول کرنے والے اور اپنے جذبات پر قابو پانے والے انسان تھے، نیز آپؒ سنجیدہ مزاج محتاط، دوراندیش اور متحمل مزاج آدمی تھے، آپؒ کی فکر جذبات سے متاثر نہیں ہوتی تھی۔

(۲) آپ اپنی فکر میں مستقل بالذات اور آزاد تھے، کسی کی رائے کے متبع نہ تھے۔ صرف کتاب و سنت اور صحابی کے فتویٰ کے پیروکار تھے، تابعی کی رائے میں غور وفکر کی گنجائش سمجھتے تھے، خواہ اس کو درست قرار دیں یا نادرست۔ کیونکہ تابعی ہونے کی بناء پر تابعی کی رائے اور اس کا تقویٰ ان کے لیے واجب الاتباع نہیں تھا۔

اس کے باوجود آپؒ نے زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ، جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہ، محمد الباقر رحمۃ اللہ علیہ اور عبداللہ بن حسن رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے علم حاصل کیا، نیز آپؒ کی خانوادۂ نبوت سے محبت اور میلان اور ان کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنا بھی بے مثال تھا۔ آپؒ اپنی فکر میں آزاد تھے، عوام کی رائے کے سامنے جھکتے نہیں تھے اور خواص کی رائے کو اپنے لیے واجب الاتباع نہیں سمجھتے تھے، کسی کی محبت یا کسی کی نفرت آپؒ کے ذہن پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔

(۳) آپؒ شرعی مسائل میں عمیق درجہ میں غور وفکر کرنے والے تھے، جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

(۴) آپؒ حاضر جواب تھے کہ ضرورت پیش آنے پر مضامین کا تسلسل اور حقائق کا سمندر رواں ہو جاتا اور نظر وفکر میں کوئی انغلاق نہ آتا تھا، بحث ومناظرہ میں کبھی لاجواب نہیں ہوتے تھے جب کہ آپؒ حق بجانب ہوتے اور آپؒ کے پاس ادلہ اور مؤیدات موجود ہوتیں، مدِ مقابل کو لاجواب کرنا آپؒ کے لیے انتہائی آسان کام ہوتا تھا، آپؒ کی سوانح حیات پر لکھی

جانے والی کتابیں آپؒ کے مناظروں کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔

لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دید وزیارت کی تمنا رہتی تھی، یہاں تک کہ ایک دن میں نے لوگوں کو ایک شیخ کے ارد گرد ہجوم لگائے ہوئے دیکھا، ایک آدمی نے یا اباحنیفہ! کہہ کر ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا تو خدا جانتا ہے کہ مجھے ان کے درست جواب نے اتنا حیرت زدہ نہیں کیا جتنا کہ حاضر جوابی نے ورطۂ حیرت میں ڈالا۔

(۵) آپ رحمۃ اللہ علیہ حق کی طلب میں مخلص تھے، آپؒ اپنی رائے کو دوسروں پر مسلط نہیں کرتے تھے کہ حق اسی میں منحصر ہو اور اپنی رائے کو حرف آخر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ فرماتے تھے کہ یہ ہماری رائے ہے جو ہمارے خیال میں بہتر ہے، جو شخص اس سے زیادہ بہتر رائے لائے گا وہ زیادہ لائقِ صواب ہوگی۔

چوں کہ آپؒ طلبِ حق میں مخلص تھے اس لیے اگر آپؒ کا مدِ مقابل کوئی صحیح حدیث پیش کرتا تو آپؒ اپنی رائے سے رجوع کر لیتے تھے بلکہ کسی صحابی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ بھی ذکر کرتا تو فوراً اپنی رائے سے رجوع کر لیتے تھے۔ آپؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنی آراء میں متعصب ہوتے ہیں، بلکہ اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے دوسروں کی آراء کو کشادہ دلی سے قبول کرتے تھے۔

(۶) آپؒ کی علمی وروحانی شخصیت بھی لوگوں کے لیے جذب وکشش کا سبب تھی، آپؒ کے بیشمار تلامذہ تھے، آپؒ ان پر اپنی رائے تھوپنے کی بجائے ان کے ساتھ علمی وفقہی مذاکرات اور مباحثہ کرتے تھے، اور ان میں بڑوں کی آراء کو معلوم کرتے تھے اور علمی مباحثہ بھی یوں کرتے تھے جیسے ایک ہم پلہ آدمی اپنے برابر درجہ والے آدمی سے کرتا ہے، آپؒ کی رائے پر مجلس مباحثہ اختتام پذیر ہوتی تھی، ایسے موقع پر تمام تلامذہ خاموش رہتے تھے اور مطمئن ہو جاتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بعض تلامذہ اپنی رائے پر قائم رہتے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شیوخ واساتذہ

آپؒ کے شیوخ واساتذہ سب کے سب ایک ہی مسلک ومشرب سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بعض شیوخ جن سے آپؒ نے علم حاصل کیا، حدیث کے امام تھے اور بعض وہ تھے جنہوں نے قرآن کا علم اور فقہ ترجمان القرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا تھا۔ آپؒ نے اپنے اساتذہ سے ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فتاویٰ بھی معلوم کیے جو اجتہاد، اصابتِ رائے اور ذکاوت وذہانت میں

مشہور تھے۔

تاریخ بغداد میں ہے کہ "ایک دن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ منصور کے پاس آئے، وہاں عیسی بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ بھی بیٹھے تھے، انہوں نے منصور سے کہا کہ: "هذا عالم الدنيا اليوم" یعنی آج یہ شخص دنیا کا بڑا عالم ہے۔ منصور نے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ نے علم کس سے حاصل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا علم، اصحاب عمر رضی اللہ عنہ سے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علم اصحابِ علی رضی اللہ عنہ سے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا علم اصحابِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے، اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم روئے ارض پر موجود نہ تھا، منصور نے کہا کہ یقیناً آپ نے اپنے لیے مستند اور قابلِ اعتماد علم حاصل کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی چند ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ملاقات بھی ہوئی ہے جو آپؒ کے زمانہ میں موجود تھے، لیکن آپؒ نے ان سے احادیث روایت نہیں کیں، ایسے چند صحابہ رضی اللہ عنہم کے اسماءِ گرامی یہ ہیں۔

(۱) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ المتوفی ۹۳ھ، (۲) حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ المتوفی ۸۷ھ، (۳) حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ المتوفی ۸۵ھ، (۴) حضرت ابوالطفیل عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ المتوفی ۱۰۲ھ وغیرہ

امام صاحبؒ تابعی ہیں یا تبع تابعی

کیا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تابعینِ کرام میں ہوتا ہے؟ اگر تابعی کی تعریف یہ ہو کہ تابعی وہ ہوتا ہے جس کی کسی صحابی سے ملاقات ہوئی ہو، اگرچہ اس کی صحبت نہ اٹھائی ہو تو اس اعتبار سے امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شمار تابعینِ کرامؒ میں ہوگا اور اگر تابعی ہونے کے لیے ملاقات کے ساتھ صحابی کی صحبت کا شرف حاصل کرنا بھی ضروری ہے تو اس لحاظ سے آپ تابعی شمار نہ ہوں گے۔ البتہ جو بات متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ آپؒ کی بعض تابعین سے ملاقات ثابت ہے اور آپؒ نے ان کی صحبت بھی اٹھائی ہے ان کے حلقۂ درس میں بیٹھے ہیں اور ان سے احادیث نقل بھی کی ہیں اور ان سے فقہ کی تعلیم بھی حاصل کی ہے، ان تابعینِ کرام میں امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا نام بھی آتا ہے جو اثر (حدیث) میں مشہور ہوئے اور بعض تابعین رائے میں مشہور ہوئے اور ایسے حضرات کثیر تعداد میں ہیں، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ جو علمِ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حامل تھے، اور حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ، جو علمِ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے حامل تھے، اور حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۱۴ھ جو فقیہ مکہ تھے ان سے اکتساب علم کیا،

اس کے علاوہ آپؒ نے اپنے شیخ حماد بن ابی سلیمان الاشعری رحمۃ اللہ علیہ التوفی ۱۲۰ھ سے فقہ کا علم حاصل کیا، جنھوں نے فقہ کا علم حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ (التوفی ۹۶ھ) سے حاصل کیا، شیخ حماد بن ابی سلیمان رائے میں اعلم الناس تھے، آپ نے ابراھیم النخعیؒ اور امام شعبیؒ کا علم وفقہ شیخ حماد سے حاصل کیا ہے، اور امام شعبی اور شیخ ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ دونوں نے امام شریحؒ اور علقمہ بن قیسؒ اور مسروق بن الاجدعؒ سے اکتسابِ فیض کیا اور ان حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب سے علم فقہ حاصل کیا تھا، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اقامتِ کوفہ کے زمانہ میں اہلِ کوفہ کو علمِ فقہ کے کثیر حصہ کا وارث بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ شیخ دھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''شیخ ابراہیم النخعی کے اقوال فقہ حنفی کے لیے معین ومددگار ہیں۔''

معلوم ہوا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ اثر کی فقہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ سے اور اہلِ رائے کی فقہ اپنے شیخ حمادؒ سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ آپؒ نے زید بن علی رحمۃ اللہ علیہ جو قرأت، فقہ، عقائد اور تمام علومِ قرآن کے عالم تھے، کی فقہ سے بھی فیض حاصل کیا، نیز آپ رحمۃ اللہ علیہ نے محمد الباقر بن علی، جعفر الصادق بن محمد الباقرؒ اور ابو محمد النفس الزکیہؒ، عبداللہ بن حسن بن حسن رحمھم اللہ کے علم وفقہ سے بھی اکتسابِ فیض کیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کی خصوصی تحقیقات اور مذاکرات

آپؒ کثرت سے بیت اللہ شریف کا سفر فرمایا کرتے تھے، جب پہلی بار مکہ مکرمہ آئے تو یہاں حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، انہوں نے پوچھا کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ امام صاحبؒ نے بتایا کہ وہ کوفہ کے رہنے والے ہیں، حضرت عطاء بن ابی رباحؒ نے پوچھا کہ اچھا آپؒ اس قریہ کے رہنے والے ہیں جہاں کے لوگوں نے اپنے دین کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیا ہے؟ آپؒ نے اثبات میں جواب دیا، پھر حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس گروہ سے ہے؟ آپؒ نے کہا کہ میرا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اپنے اسلاف کو برا بھلا نہیں کہتے اور تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی کی گناہ کی وجہ سے تکفیر نہیں کرتے، حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک جانا، پس تم اس پر قائم رہو۔''

امام صاحبؒ حج کے موقع پر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی جایا کرتے تھے اور ان کے ساتھ فقہی مذاکرات کیا کرتے تھے، اسی طرح امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات بھی فرماتے اور ان کے ساتھ بھی مذاکراتِ علمی فرماتے تھے، آپؒ کے علمی اسفار ایسے ہوتے تھے کہ ان سے وحی کے مواقع

اور مشاہدِ رسول کی معرفت حاصل ہوتی تھی اور آثار واخبار کے معانی ودقائق کا احاطہ ہوتا تھا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ مناظر آدمی تھے، بحث ومناظرہ کے دلدادہ تھے، منقول ہے کہ آپ نے اسلام کے دفاع میں تقریباً بائیس (۲۲) فرقِ باطلہ سے مناظرہ کیا ہے، اس لیے آپ تیز اور عمیق فکر کے مالک تھے، آپؒ کے مناظرے ہر جگہ میں ہوتے تھے، مکہ ومدینہ میں بھی اور حجاز کے دوسرے علاقوں میں بھی مناظرے ہوئے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہء تدریس یہ نہیں تھا کہ تلامذہ کے سامنے اسباق کی تقریر کر دی، بلکہ آپؒ کا طریقہ مذاکرے اور تحقیق کا ہوتا تھا کہ کوئی مسئلہ تلامذہ کے سامنے پیش کرتے اور اس کے حکم کے بارے میں ان سے بحث ومباحثہ کرتے ہر ایک اپنی رائے کا اظہار کرتا، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اجتہادِ مسئلہ میں تلامذہ کی آراء امام صاحبؒ سے متعارض ہوتیں بلکہ بحث ومباحثہ کے دوران کبھی ان کی آوازیں بلند بھی ہو جاتی تھیں اور جب تمام تلامذہ اس مسئلہ کو ہر پہلو سے جانچ پرکھ لیتے تو امام صاحبؒ اپنی رائے کو پیش کرتے جو اس علمی مذاکرہ میں پیش کردہ آراء پر غالب آتی اور تمام حاضرین اس پر اتفاق کرتے اور اس پر مطمئن ہو جاتے، اس نہج پر علم کی تحقیق اور مذاکرہ معلّم اور متعلّم دونوں کے لیے ہنرمندی اور مہارت کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے، اس طرح آپؒ اپنے تلامذہ کو مناظر اور محقق بناتے تھے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے تلامذہ کے ساتھ مالی تعاون بھی کرتے تھے اور مشکلات میں ان کی اعانت فرماتے تھے اور ان کے حالات کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ جب کسی شاگرد میں علم کے ساتھ ساتھ اس (علم) میں گھمنڈ محسوس کرتے تو اس کی اصلاح امتحان لے کر کرتے تھے حتیٰ کہ اس کو باور کراتے کہ وہ اب بھی مزید علم کے حصول کا محتاج ہے، نیز آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے تلامذہ واصحاب کی وصیت ونصیحت سے بھی خبر گیری فرماتے رہتے تھے، خصوصاً ایسے شاگرد جن کے بلند شان ہونے کی آپؒ کو توقع ہوتی تھی، جیسے قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کو آپؒ نے وصیتیں فرمائیں۔ آپؒ اپنے تلامذہ کے ساتھ والہانہ تعلق اور گہری وابستگی رکھتے تھے، آپؒ ان سے فرماتے تھے کہ ''تم میرے دل کے سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہو۔''

(۷) فقہ ابی حنیفہؒ

فقہ میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب معروف نہیں ہے، اس لیے کہ آپؒ کے زمانہ میں تالیف وتصنیف کا رواج ابھی نہیں ہوا تھا، اور عہدِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں مجتہدینِ کرام اپنے فتاویٰ کی تدوین وترتیب سے اجتناب کرتے تھے، تا کہ اصولِ دین میں صرف کتاب اللہ ہی مدوّن شکل میں باقی رہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد علماءِ امت نے سنت، فقہ اور فتاویٰ کی تدوین کی ضرورت محسوس فرمائی۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ آپؒ کی آراء کو مدون کیا کرتے تھے اور آپؒ کے اقوال کو قلمبند کرتے تھے، بعض اوقات آپؒ ان کو املاء کرواتے تھے، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا کچھ حصہ تو خود امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے سن کر ضبط کیا اور کچھ حصہ اپنے شیخ ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ سے قلمبند کیا۔ اس وقت امام صاحبؒ کی عمر اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ آپؒ خود اس تحریر کو، جو انہوں نے امام صاحبؒ سے نقل کر کے ضبط کی تھی ملاحظہ کر سکیں، اس لیے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اٹھارہ سال کی تھی، امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے جو کتابیں تالیف کیں وہ حقیقت میں وہی مدون شدہ مجموعے تھے جو انہوں نے آپؒ سے اخذ کیے تھے اور جو اصحابِ ابی حنیفہؒ کے ہاں معروف و مشہور ہیں۔

جن لوگوں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی طرف کتابوں کو منسوب کیا ہے کہ انہوں نے کتابیں تالیف کی ہیں یا یہ کہا ہے کہ امام صاحبؒ نے فقہ کو مدون کیا ہے تو ان کا مطلب یہی ہے کہ امام صاحبؒ کے تلامذہ نے آپؒ کی نگرانی اور سربراہی میں اقوالِ ابی حنیفہ کو مدون کیا ہے، پھر آپؒ کے اصحابؒ نے ان اقوال کو کتابوں کی صورت میں مبوّب اور مرتب کر کے نشر کر دیا، جس کی ابتداء کتاب الطہارت سے ہوئی تھی، اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ، پھر اسی طرح فقہی ترتیب کے مطابق تمام عبادات کو مرتب کیا، اس کے بعد معاملات کے ابواب پھر میراث پر ان کو ختم کیا۔ فقہ کو اس ترتیب پر اس لیے مرتب کیا کہ عقائد کی درستگی کے بعد انسان سب سے پہلے نماز کا مخاطب ہے، اس لیے کہ نماز تمام عبادات میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے، اور وجوب کے اعتبار سے بھی سب سے عام ہے۔

(۸) مُسندِ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مرویات کا ایک بڑا حصہ جمع کیا اور اس کا نام ''الآثار'' رکھا، اسی طرح امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کی مرویات کا ایک حصہ جمع کر کے اس کا نام بھی ''الآثار'' رکھا۔

علامہ ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ''تعجیل المنفعۃ'' میں فرماتے ہیں کہ ''مسند ابی حنیفہؒ خود آپ کی جمع کردہ نہیں ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث ہی کتاب الآثار میں مذکور ہیں جس کو امام محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کیا ہے اور ان کی دیگر تصانیف میں موجود ہیں اور ان سے پہلے امام ابو یوسفؒ کی تصانیف میں بھی مذکور ہیں۔''

حاجی خلیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ''کشف الظنون'' میں مسند ابی حنیفہؒ کی روایات، ان کا اختلاف اور

ان کی جمع وترتیب کا ذکر کیا ہے، پندرہ تک روایات بیان کی ہیں جن کو ائمہ حدیث نے جمع کیا ہے اور یہ امر اس کی صحتِ نسبت میں قادح (قابل اعتراض) نہیں ہے اور سند کے اعتبار سے امام ابو یوسفؒ کی ''الآثار'' اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ''الآثار'' زیادہ قوی ہے۔

امام صاحبؒ کے نزدیک ادلّہ فقہیّہ

''تاریخ بغداد'' میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول منقول ہے کہ آپؒ نے فرمایا کہ ''میں اوّلاً کتاب اللہ سے مسئلہ اخذ کرتا ہوں، اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے معلوم کرتا ہوں، اگر کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دونوں میں نہ ملے تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال کو لیتا ہوں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کے قول کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، اور میں ان کے اقوال کو چھوڑ کر دوسروں کے اقوال کو اختیار نہیں کرتا ہوں، لیکن جب بات ابراہیمؒ، شعبیؒ، ابن سیرینؒ، حسن بصریؒ، عطاءؒ اور سعید بن المسیبؒ وغیرہ تک پہنچتی ہے (یعنی ان کے اقوال آتے ہیں) تو وہ مجتہد لوگ تھے، پس میں اس وقت اجتہاد کرتا ہوں جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا۔''

ابن حجر المکی رحمۃ اللہ علیہ کی ''المناقب'' میں مذکور ہے کہ ''امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ناسخ ومنسوخ کی خوب تفتیش وتحقیق کرنے والے تھے، آپؒ کے نزدیک جب کوئی حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، یا آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہو جاتی تو آپؒ اس پر عمل کرتے تھے۔ آپؒ اہلِ کوفہ کی احادیث سے بخوبی واقف تھے اور اس پر سختی سے عمل پیرا تھے۔'' نیز اس کتاب میں ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مراتب مقرر فرما دیئے تھے۔ سہیل بن مزاحم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''امام صاحبؒ کا کلام ثقہ کو اختیار کرنا، قبیح کو ترک کرنا اور لوگوں کے معاملات میں غور کرنا ہے جب تک امور کی اصلاح اور استقامت رہے گی تو امور کو قیاس پر پیش کیا جائے گا، اس کے بعد استحسان پر اور جب کوئی بھی چارۂ کار نہ رہے گا تو تعامل کی طرف رجوع کیا جائے گا۔''[۱]

ان عبارتوں سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادلہ فقہیہ کی ترتیب معلوم ہو جاتی ہے۔

پہلی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پہلی دلیل کتاب اللہ، دوسری دلیل سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور تیسری دلیل اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم ہے، اور جس مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہو اس میں امام صاحبؒ ان کے اقوال کو ترک کر کے دوسروں کے اقوال کو اختیار نہیں کرتے

---

۱ [ابو زہرہ ص ۳۵۱]

بلکہ ایسی صورت میں ان میں سے جس کا قول چاہتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں کہ آپؒ کی نظر میں جو قول زیادہ قرینِ قیاس ہوتا یا کتاب وسنت سے مستنبط کردہ مسئلہ کے موافق ہوتا اس کو اختیار کرتے۔

دوسری عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ فقہاءِ کوفہ کی رائے کو دیگر فقہاء کرام کی رائے پر ترجیح دیتے تھے، نیز اس سے یہ بات بھی مستفاد ہوتی ہے کہ آپؒ فقہاء کے اجماع کو بھی قابل استدلال خیال کرتے تھے۔

اور تیسری عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس مسئلہ میں کوئی نص یا قولِ صحابیؓ نہ ہوتا تو آپؒ قیاس کو اختیار کرتے تھے جب تک اس کی گنجائش موجود ہوتی، اگر قیاس کی گنجائش نہ ہوتی تو استحسان کو لیتے تھے جب تک کہ امور کی اصلاح اور استقامت رہتی اور جب کوئی بھی صورت نہ ہوتی تو تعامل کی طرف رجوع کرتے تھے، یعنی عرفِ عام پر عمل کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادلہءِ فقہیہ سات ہیں۔

(۱) کتاب اللہ (۲) سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۳) اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم (۴) اجماع (۵) قیاس (۶) استحسان (۷) عرف۔

دلیلِ اوّل: کتاب اللہ۔:

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کتاب اللہ، لفظ اور معنی دونوں سے عبارت ہے، جس طرح کہ ایمان دو رکنوں کا نام ہے۔ (۱) تصدیق بالقلب اور (۲) اقرار باللسان۔ البتہ جو نمازی عربی زبان میں رسوخ نہ رکھتا ہو اور اس کی زبان پر عربی لفظ کی ادائیگی دشوار ہو تو اس کو اجازت ہے کہ معنی قرآن کی قرأت کرلے، جب تک کہ ٹھیک طرح سے ادا کرنا اس کے لیے آسان نہ ہو جائے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عربی زبان کے علاوہ اور کسی زبان میں قرأت نامقبول ہے۔ اِلاّ یہ کہ عربی زبان سے عاجز اور بے بس ہو تو پھر درست ہے۔ لیکن فخر الاسلام امام بزدویؒ نے نوح بن ابی مریم رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس قول سے رجوع کرلیا تھا اور دیگر ائمہ کے قول کو اختیار کرلیا تھا، قاضی امام ابوزید رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مختار قول ہے اور عام محققین بھی یہی فرماتے ہیں اور اسی پر فتویٰ ہے۔

قرآن حکیم اس فقہ کا اصل الاصول ہے، اور سنت ضرورت کے وقت اس کی توضیح کرنے والی ہے۔ اور سنت کا قرآن کے لیے بیان ہونا، بیانِ تقریر، بیانِ تفسیر اور بیانِ تبدیل ہے جو کہ نسخ سے عبارت ہے۔ بیان تقریر کی مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "صوموا لرؤیتہ و

افطروا لرؤیتہ" یعنی چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ نہ رکھو۔"

یہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا معنی متعین کرتی ہے: "شَهْرُ رَمَضَانَ" [البقرة: ۱۸۵] بیانِ تفسیر کی مثال قرآن کے مجمل احکام، نماز، زکوٰۃ اور حج ہے کہ سنت سے اس اجمال کی تفسیر ہوگئی، اور بیانِ تفسیر کو ضرورت کے وقت سے مؤخر کرنا جائز نہیں ہے اور عام کی تخصیص تراخی کے ساتھ ناجائز ہے، اس لیے کہ یہ اس بات کا بیان ہے کہ لفظِ عام سے مراد اس کے بعض افراد ہیں کہ ایک لفظ کو عموم سے خصوص کی طرف نقل کرلیا گیا ہے اور مخصص قرینہ ہوتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ وہ قرینہ اس سے متصل ہو، اس سے مؤخر نہ ہو، اس لیے کہ حکم کے وجوب میں عام، خاص کی مثل ہے لیکن جب بیان مؤخر ہوگا تو اس پر عمل نسخ کے طور پر واجب ہوگا نہ کہ تخصیص کے اعتبار سے اور یہ بیانِ تبدیل ہے جس کا دوسرا نام نسخ ہے اور یہ اس وقت جائز ہے جب ناسخ قرآن ہو یا سنتِ متواترہ ہو۔

دلیلِ ثانی: سنت۔:

کتاب اللہ کے بعد شریعت اسلامیہ کا اہم ترین مصدر وماً خذ سنت ہے، جیسا کہ حدیثِ معاذ رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ تو انہوں نے اسی ترتیب سے جواب دیا تھا.......... الحدیث۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ کے نام جو خط لکھا تھا، اس سے بھی یہی ترتیب معلوم ہوتی ہے کہ پہلے کتاب اللہ کا درجہ ہے پھر سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ ہے۔ امامِ ابوحنیفہؒ نے بھی استنباطِ مسئلہ میں کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتماد کیا ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ قیاس کو نص اور حدیث پر مقدم رکھتے تھے یہ ان کا آپؒ پر افتراء اور بہتان ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس افتراء کی خود نفی کی ہے۔ فرمایا: "جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم قیاس کو نص پر ترجیح دیتے ہیں وہ خدا کی قسم! ہم پر تہمت لگاتا ہے اور افتراء پردازی کرتا ہے۔ کیا نص کے ہوتے ہوئے قیاس کی ضروت باقی رہتی ہے؟" بلکہ امام صاحبؒ نے ایک مقام پر صراحت کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ وہ شدید ضرورت کے وقت ہی قیاس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپؒ فرماتے تھے کہ "ہم اوّلاً کتاب اللہ سے استدلال کرتے ہیں، پھر سنت سے پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے قضایا سے استدلال کرتے ہیں اور جس بات پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم متفق ہوں اس پر بھی عمل کرتے ہیں، اگر وہ کسی مسئلہ میں اختلاف رکھتے ہوں تو ہم اس مسئلہ کو دوسرے مسئلہ پر قیاس کرتے ہیں جب کہ دونوں میں وجہ اشتراک موجود ہو، یہاں تک کہ اس

کا معنی واضح ہو جائے۔

علماءِ حدیث نے تعدادِ رواۃ کے اعتبار سے احادیث کی تین قسمیں ذکر کی ہیں۔ (۱) احادیثِ متواترہ (۲) احادیثِ مشہورہ (۳) احادیثِ احاد۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احادیث متواترہ حجت ہیں، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں یہ بات منقول نہیں ہے کہ آپؒ نے ایسی خبر کا انکار کیا ہو جس کا متواتر ہونا ان کو معلوم ہوا ہو۔ اور وہ علمِ یقینی کا فائدہ دیتی ہے۔ اور احادیثِ مشہور وہ ہیں جو طبقہ اولیٰ اور طبقہ ثانیہ میں احاد کے درجہ میں ہو پھر بعد میں لوگوں میں پھیل جائیں اور اس کو ایسی قوم نقل کرے جن کا جھوٹ پر اتفاق کرنا متوہم نہ ہو اور ایسی احادیث کے مشہور ہونے میں اصل اعتبار دوسری اور تیسری صدی کا ہے، احادیث کی یہ قسم علمِ طمانینت کی موجب ہے لیکن علمِ یقین کی موجب نہیں ہے، اور اس کا درجہ احادیثِ متواترہ سے کم اور خبرِ احاد سے اونچا ہے، بعض کی رائے میں احادیث مشہورہ مفیدِ ظن ہیں، مفیدِ یقین نہیں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ بطریقِ استدلال مفیدِ یقین ہیں، علمِ ضروری کے اعتبار سے مفیدِ یقین نہیں ہیں اور احادیثِ احاد ہر اس خبر کو کہتے ہیں جس کو ایک یا دو راوی نقل کریں اور شہرت کے اسباب اس میں موجود نہ ہوں اور احادیثِ آحاد کا نبی کریمؐ کے ساتھ اتصال، ظنِ راجح کے طور پر ہے، علمِ یقینی کے طور پر نہیں ہے۔

صاحبِ ''کشف الاسرار'' امام بزدوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''خبر احاد کے اتصال میں صورۃً اور معنیً شبہ پایا جاتا ہے، صورۃً شبہ اس لیے ہے کہ اس میں اتصال بالرسولؐ قطعاً ثابت نہیں ہے اور معنیً شبہ اس لیے ہے کہ امت نے اس کو قبول نہیں کیا ہے۔ احادیثِ احاد میں اس شبہ کی وجہ سے اجتہاد کے دور میں ایسے حضرات موجود رہے ہیں جنھوں نے ان احادیث سے استدلال کرنے کا انکار کیا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف غلط بات منسوب کرنے والے بہت تھے اور صحیح اور غیر صحیح احادیث میں اختلاط ہو گیا تھا، اس بناء پر جمہور فقہاء کی رائے یہ تھی کہ احادیث احاد سے استدلال اعمال میں درست ہے لیکن عقائد میں درست نہیں ہے اور ضروری ہے کہ ان کے رواۃ بھی ثقہ اور عادل ہوں، عقائد میں ایسی احادیث اس لیے ناقابل استدلال ہیں کہ عقائد میں ضروری ہے کہ اس کی بناء ایسے یقینی دلائل پر ہو جن میں کوئی شبہ نہ ہو۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پہلے فقیہ ہیں جنھوں نے احادیث احاد کو قبول کیا ہے اور اس سے استدلال کیا ہے یا اس کے مقتضیٰ کے مطابق اپنی آراء کو معدل کیا ہے، آپ کو مسئلہ امانِ عبد میں جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فتویٰ پہنچا تو آپؒ نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا، حالانکہ وہ خبر واحد کے طریق سے آپؒ کو روایت کیا گیا تھا، جب خبر واحد میں آپ کا یہ حال تھا تو خود حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی ان کی نظر میں کیا شان اور حیثیت ہوگی! امام صاحب احادیثِ احاد کو قبول کرتے تھے اور اس کو روایت بھی کرتے تھے یا اپنی فقہ کی اس پر بناء رکھتے تھے اور اس سے احکام کے علل واسباب مستنبط کرتے تھے، پھر اس پر (غیر منصوص) مسائل کو قیاس کرتے، جب کہ قیاس کی گنجائش ہوتی۔ باقی رہی بات تابعی اور تبع تابعی کی مرسل روایات کی، تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایسے لوگوں کی مرسل روایات کو قبول کرتے تھے جن کو آپؒ جانتے تھے یا ان کے طریق سے متاثر ہوتے، ایسے لوگ امام صاحبؒ کے نزدیک ثقہ راویوں کے درجہ میں ہیں کہ اس میں شک وشبہ کو کوئی راہ نہیں ہے، چنانچہ ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ آپؒ کے شیخ الشیخ ہیں، آپؒ ان کے طریق سے متاثر ہیں، ان کی فقہ کو نقل کرتے ہیں خواہ ان کے خلاف ہو یا موافق، دونوں حالتوں میں وہ ثقہ رواۃ کے درجہ میں ہیں کہ ان کی مرویات میں شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ واعظ عراق، وہ بھی ثقہ کے مرتبہ میں ہیں، یہی حال ان ائمہ کا ہے جن کی مرسل روایات کو امام صاحبؒ نے قبول کیا ہے، معلوم ہوا کہ آپ مطلقاً مرسل روایات کو قبول نہیں کرتے تھے بلکہ ان لوگوں کی مرسلات کو قبول کرتے تھے جو ثقہ رواۃ کے مقام و مرتبہ کے ہوتے تھے، کیونکہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی متصل روایات کو امام صاحبؒ قبول نہیں کرتے، چہ جائیکہ مرسل روایات قبول کریں اور مرسل روایات کو قبول کرنا آپؒ کے زمانہ میں عام تھا، اس لیے کہ وہ ثقہ تابعین جن سے آپؒ نے ملاقات کی ہے یا جن کے تلامذہ سے آپؒ نے ملاقات کی ہے وہ خود صراحت سے یہ کہا کرتے تھے کہ وہ اس وقت صحابی کا نام چھوڑ دیتے ہیں جب کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے روایت کرتے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ''جب ایک حدیث (کی روایت) پر چار صحابہ رضی اللہ عنہم جمع ہوں تو میں ارسال کرتا ہوں'' نیز ان سے مروی ہے کہ جب میں تم سے کہوں کہ ''حدثنی فلان'' تو وہ اسی کی حدیث ہوتی ہے اور جب میں کہوں ''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے یہ حدیث ستر یا اس سے بھی زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے سنی ہے۔''

وضعِ حدیث سے پہلے تابعینِ کرامؒ میں ارسال (حدیث کو مرسل ذکر کرنا) کثرت سے ہوتا تھا، لیکن اس کے بعد علماء نے حدیث کی اسناد کی ضرورت محسوس فرمائی۔

بہر حال! امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی فقہ کی بنیاد بنایا، جب قابلِ اطمینان ثقہ راویوں سے سنت ثابت ہو جائے تو اس سے استدلال کرتے ہیں، اور اس کو قیاس پر مقدم رکھتے ہیں اور اخبارِ احاد کو قرآن کے عموم سے مؤخر رکھتے ہیں۔ جب مرویات کا شریعت کے کسی اجماعی قاعدے اور ضابطے سے تعارض واقع ہو تو ان روایات کو شاذ قرار دے کر رد

کردیا جائے گا۔اس مسئلہ میں فقہاءِ حجاز کے شیخ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ بھی امام صاحبؒ کے ساتھ ہیں کہ اخبارِ آحاد اور مرسلات اس وقت تک مقبول ہیں جب تک کہ وہ کتاب اللہ یا سنتِ مشہورہ یا شریعت کے مقرر کردہ قواعد کے خلاف نہ ہوں۔"

دلیلِ ثالث: صحابی رضی اللہ عنہ کا فتویٰ:۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صحابی کے فتویٰ اور قول کو بھی قابلِ استدلال واجب الاتباع سمجھتے ہیں، جب کسی موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم کی آراء مختلف ہوں تو آپؒ ان میں سے کوئی رائے منتخب کر لیتے تھے، لیکن ان کی آراء کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی رائے کو اختیار نہیں کرتے تھے، اگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی رائے موجود نہ ہوتی تو خود اجتہاد کرتے اور تابعی کی رائے کی پیروی نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی تقلید کرتے تھے، صحابی کی تقلید کرتے تھے۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ امانِ عبد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کی وجہ سے اپنے قیاس کو ترک کردیا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ امام صاحبؒ بعض فروعی مسائل پر اعتماد کرتے ہوئے صحابی رضی اللہ عنہ کے قول پر اپنی رائے کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ آپؒ کے نزدیک صحابی اپنی رائے میں معصوم نہیں ہے اور ان کے اجتہاد میں خطاء کا احتمال موجود ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ خود آپؒ نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ میں اپنی رائے کو صحابی کے قول پر ترجیح نہیں دیتا ہوں، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

دلیلِ رابع: اجماع:

اجماع کی تعریف یہ ہے کہ امت اسلامیہ کے مجتہدین کا کسی مسئلہ کے حکم میں اتفاق کرنا۔

فخر الاسلام البزدوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اجماع کے تین مراتب ہیں، سب سے اعلیٰ مرتبہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے اور وہ حدیثِ متواتر اور ادلّہ قطعیہ کی طرح ہے جو قطعیت کا موجب ہے، اس لیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے۔ دوسرا مرتبہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد والے لوگوں کا کسی غیر مجتہد فیہ مسئلہ میں اجماع کا ہے، یہ حدیثِ مشہور و مستفیض کی طرح ہے، تیسرا مرتبہ مجتہد فیہ مسئلہ میں اجماع کا ہے، اور یہ خبرِ احاد کی طرح ہے، اس کو صرف ظنی قرار دیا جائے گا، اور اس میں شبہ ہوگا، یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جب خبرِ اجماع بطریقِ تواتر ہو، لیکن جب خبرِ اجماع بطریق احاد ہو تو اس صورت میں وہ اجماع یقین کا موجب نہیں ہوگا خواہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو۔

اجماع قیاس پر مقدم ہے، اجماع کا انکار کرنا اپنے دین کے ابطال کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ تمام اصولِ دین کا مدار اجماع پر ہے، جو علماء اجماع کی حجیت کے قائل ہیں وہ اجماع کے لیے سند ہونے کے بھی قائل ہیں یعنی وہ سبب جو اجماع کا باعث ہوا۔ اجماع کے منعقد ہونے کے بعد اس کی سند قابلِ بحث نہیں ہے، بلکہ وہ فی ذاتہ حجت شمار ہوگا اور لزوم کا فائدہ دے گا۔ اور یہ لزوم خبر احاد یا قیاس سے نہیں بلکہ خود اجماع سے ہوگا، تا کہ اس حدیثِ نبوی ﷺ کا مفہوم ثابت ہو جائے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لاتجتمع أمتي علی ضلالة'' ''یعنی میری امت گمراہی پر جمع نہ ہوگی۔'' اور وہ اجماع جو اکثر علماء کے نزدیک قابلِ اعتبار اور حجت ہے وہ علماءِ مجتہدین کا اجماع ہے، عوام کا اجماع نہیں ہے۔ اور اجماع، کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کے بعد حجت ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنتِ مشہورہ کے متعارض نہ ہو۔ اور اجماع اکثر ائمہ کے نزدیک حجتِ ظنیہ ہے اور وہ بھی اعمال میں حجت ہے، عقائد میں نہیں، صرف امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم حجتِ قطعیہ ہے۔

دلیلِ خامس: قیاس:

قیاس کی تعریف یہ ہے کہ کسی غیر منصوص مسئلہ کا حکم ایسے مسئلہ پر قیاس کر کے معلوم کرنا جس کا حکم کتاب اللہ یا سنتِ رسول ﷺ یا اجماع سے معلوم ہو اور حکم کی علت میں دونوں مشترک ہوں۔ امام صاحبؒ کا فہم احادیث میں مسلک یہ ہے کہ آپؒ حدیث کے ظاہری الفاظ سے مفہوم ہونے والی تفسیر (مطلب) پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ حدیث کی عبارت سے جو بات اشارۃً یا اقتضاءً معلوم ہوتی اس کو بھی مدِ نظر رکھتے تھے اور حوادث المسائل کے حل کی طرف بھی توجہ تھی، یہ وہ اسباب تھے جس کی وجہ سے آپؒ کثرت سے قیاس کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔ عراق میں جو فقہاءِ صحابہ رضی اللہ عنہم قیام پذیر تھے وہ اپنی رائے اور اجتہاد کا کثرت سے استعمال کرتے تھے اس لیے کہ ان کی نظر میں رسول اللہ ﷺ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب کرنے سے زیادہ بہتر تھا کہ اپنی رائے اور اجتہاد کو استعمال کیا جائے۔

امام ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ جو کہ شیخِ کوفہ تھے وہ بھی اس بات کو پسند کرتے تھے کہ قال رسول اللہ ﷺ کی بجائے قال الصحابی یا قال التابعی کہا جائے، کہ کہیں آنحضور ﷺ کی طرف کوئی جھوٹی بات منسوب نہ ہو جائے۔ اور آنحضور ﷺ کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہ کہہ دی جائے جو حقیقت میں آپ ﷺ نے نہ فرمائی ہو۔

ان وجوہات کی بناء پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ آپؒ نصوص اور احادیث سے احکام کی علل عامہ مستنبط کر کے ان پر فروعی مسائل کو متفرع کرتے تھے۔ اور ان علل کو قواعد قرار دے کر ان پر غیر منصوص مسائل کو پیش کرتے تھے اور ان کے مقتضیٰ کے مطابق حکم لگاتے تھے، پھر اگر بعد میں حدیث پہنچتی اور وہ اس قیاس کے مطابق ہوتی تو اس کی قوت میں اضافہ ہو جاتا اور اگر حدیث اس کے خلاف ہوتی اور اس حدیث کے راوی بھی آپؒ کے نزدیک ثقہ ہوتے اور روایتِ صحیحہ کی شرائط اس پر منطبق ہوتیں تو حدیث پر عمل کرتے اور قیاس سے عدول کر کے اس کو موردِ نص میں منحصر کرتے اور اس پر آگے قیاس نہ کرتے تھے۔ جیسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھول کر کھانے پینے والے کا روزہ برقرار رکھا اور فرمایا کہ ''یہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس تک پہنچایا'' امام صاحبؒ نے اس مسئلہ میں حدیث پر عمل کیا اور اس قاعدے کو ترک کر دیا جس کے مطابق افطار کی بنیاد جماع یا اس چیز پر ہے جو پیٹ تک پہنچ جائے۔

آپؒ نے قیاس کی علت کو بھول کر کھانے پینے کے علاوہ کی صورت میں اپنے عموم پر قائم اور برقرار رکھا اور خطاء کی صورت کو نسیان پر قیاس نہیں کیا، حالانکہ دونوں میں عدمِ قصد کی علت موجود ہے۔ اس لیے کہ نسیان کا حکم مقتضائے قیاس سے معدول ہو کر آیا ہے لہٰذا وہ اپنے موردِ نص میں ہی منحصر رہے گا، آگے تجاوز نہیں کرے گا۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سمجھا کہ تمام نصوصِ دینیہ علل کے ساتھ معلول ہیں، لیکن اگر کوئی نص معدول عن القیاس ہو یا امرِ تعبدی ہو یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہو اور جن نصوص کے احکام تمام مسلمانوں کے لیے عمومی طور پر نہیں ہیں، وہ سب اس سے مستثنیٰ ہیں اور علت ایسے وصفِ معیّن کا نام ہے کہ اس کے علت ہونے پر دلیل قائم ہو۔

دلیلِ سادس: استحسان:

استحسان کی تعریف یہ ہے کہ کسی وجہ قوی یا ضرورت شدیدہ کی بناء پر مجتہد کسی مسئلے میں اس کے نظائر کے مثل حکم کرنے سے باز رہے، یعنی قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ فلاں مسئلے میں حکم یہ ہونا چاہیئے لیکن کسی اثر (آیت یا حدیث یا اثر صحابی) یا اجماع یا ضرورت کے معارض ہونے کی وجہ سے مجتہد وہ حکم دے۔[1]

استحسان کی دو قسمیں ہیں۔ (اوّل) استحسان القیاس: استحسان القیاس کی تعریف یہ ہے

---

1 [ابو زہرہ ص ۳۴۴، ص ۳۴۶]

کہ کسی مسئلہ میں دو ایسے وصف ہوں جو دو متعارض قیاس کا تقاضا کرتے ہوں کہ ان میں سے ایک ظاہر اور متبادر الی الذہن ہو جسے قیاسِ اصطلاحی کہتے ہیں اور دوسرا خفی ہو جو ایک دوسرے اصل کے ساتھ الحاق کا تقاضا کرتا ہو اس کو استحسان کہتے ہیں۔

لہٰذا ایسا مسئلہ جس کے حکم میں فقیہ غور وخوض کرتا ہے اس کے بارے میں دیکھا جائے گا کہ قیاسِ اصطلاحی اور قیاسِ خفی اس مسئلہ پر منطبق ہوتا ہے یا نہیں، البتہ ان میں سے ایک قیاس جلی ہے کہ جس کے نظائر کے مثل حکم لگایا جائے گا اور دوسرا قیاسِ خفی ہے کہ جس کے نظائر کے مثل حکم نہیں لگایا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ استحسان اصل میں قیاس (جلی) کو ترک کرنے کا اور ایسے امر کو اختیار کرنے کا نام ہے جو عوام الناس کے لیے زیادہ مستحسن اور موافق ہو، یعنی سہولت اور راحت کے حصول کے لیے عسرت اور تنگی کو ترک کر دینا اور یہ دین میں اصل کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

"يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ [البقرة: ١٨٥]

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتے ہیں، تنگی کا ارادہ نہیں کرتے۔"

استحسان کی صورت یہ ہے کہ سباع الطیر (گوشت خور پرندے) کے جھوٹے کو نجاستِ لحم میں بہائم کے ساتھ تشبیہ دی جائے، اور یہ قیاس کا تقاضا ہے۔ لیکن استحسان یعنی قیاسِ خفی یہ چاہتا ہے کہ سباع الطیر کا جھوٹا ناپاک نہ ہو، کیونکہ طیور (پرندے) اپنی چونچ سے پانی پیتے ہیں، پانی میں اپنا لعاب نہیں ڈالتے، اس لیے احتیاط کی بناء پر اس کے استعمال کو مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

(قسمِ ثانی) استحسان السنۃ، استحسان الاجماع اور استحسان الضرورۃ: اس کا سبب قیاس کا کسی شرعی مصدر و مأخذ یا ایسے امور کے معارض ہونا ہے جن کی اسلام نے رعایت لازم قرار دی ہے۔

استحسان السنۃ کی صورت یہ ہے کہ حدیث سے ایسی بات ثابت ہو جو ردِ قیاس کا موجب ہو، جیسا کہ نسیاناً کھانے پینے سے روزے کا درست ہونا مروی ہے۔

استحسان الاجماع کی صورت یہ ہے کہ جیسے کوئی چیز کاریگر سے بنوائی اور قیمت پیشگی طے کر لی (جیسا کہ آج کل بکثرت ہوتا ہے) اس میں قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ یہ معاملہ ناجائز ہونا چاہیے، کیونکہ مبیع معدوم ہے لیکن استحساناً اجماع کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔

استحسان الضرورۃ کی صورت یہ ہے کہ جیسے ناپاک کنوئیں یا حوض کی دیواریں اور پانی نکالنے والوں کی رسی، ڈول، ہاتھ، کنوئیں میں سے ناپاک پانی کے آخری ڈول نکال دینے سے پاک ہو جاتے ہیں، حالانکہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ دیواروں کو پاک نہ ہونا چاہیے لیکن استحساناً ضرورت شدیدہ اور حرج کی وجہ سے پاک قرار دیا جاتا ہے۔

دلیلِ سابع: عُرف:

جہاں کوئی دلیل شرعی نہ ہو وہاں عرف دلیل ہے۔ پس یہ عرف وہاں دلیل ہے جہاں کتاب وسنت کی دلیل موجود نہ ہو۔ جب عرف کتاب وسنت کے خلاف ہو تو وہ مردود ہے۔ عرف کی دو قسمیں ہیں۔ عرف عام اور عرف خاص۔ عرفِ عام تو وہ ہے جو تمام شہروں یا پورے ملک میں رائج ہو اور عرف خاص وہ ہے جو بعض شہروں میں ہو اور بعض میں نہ ہو۔ اس تقسیم کے تحت عرف کے احکام میں فرق ہے، فقہاء کرام نے عرفِ عام کا اعتبار کیا ہے، لیکن عرفِ خاص کے بارے میں اختلاف ہے۔ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”عرفِ عام مخصص بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس کے مقابلے میں قیاس کو ترک کر دیا جائے گا۔“[1]

چنانچہ فقہ کی کتابوں میں استصناع (کوئی چیز بنوانے) کے جواز کا مدار اسی عرف پر ہے، ورنہ قیاس تو اس کے ناجائز ہونے کو کہتا ہے اور عرفِ خاص وہ ہے جو کسی خاص طبقے یا شہر کا ہو، اس میں عمومیت موجود نہ ہو۔ اس کے متعلق علماء کا ارشاد ہے: ”عرفِ خاص کے مقابلہ میں قیاس ظنی کو ترک کر دیا جائے گا۔“[2] اور عرفِ خاص پر عمل اس وقت ہوگا جب وہاں کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ

آپ کا نام ونسب یعقوب بن ابراہیم بن حبیب الانصاریؒ ہے۔ آپ عربی النسل ہیں، ۱۱۳ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۸۲ھ میں وفات پائی۔ فقر وافلاس کی حالت میں پرورش پائی۔ پہلے کوفہ میں ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آنا جانا شروع کیا، پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے۔ آپؒ نے محدثین سے تعلق اور ان سے فیض حاصل کیا، تین خلفاء، مہدی، ہادی اور ہارون الرشید کے ادوار میں عہدِ قضاء پر فائز رہے۔ آپؒ اصحاب الرائے میں پہلے فقیہ وامام ہیں جنہوں نے ان کی آراء کو حدیث سے مستحکم کیا، یہاں تک کہ آپؒ کا شمار حفظ اصحابِ ابی حنیفہؒ میں ہوتا ہے۔

آپ کے دورِ قضاء میں قیاس اور استحسان عملی زندگی کا جزو بن گیا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی کتب لکھیں جن میں اپنی اور اپنے شیخ ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی آراء کو مدوّن کیا۔ جیسے کتاب الآثار، کتاب الخراج اور اختلاف ابن ابی لیلیٰ وغیرہ۔

---

[1] [ردالمحتار] [2] [ابوزہرہ ص ۳۵۳]

امام محمد بن الحسن الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش ۱۳۲ھ میں اور وفات ۱۸۹ھ میں ہوئی۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے عرصہ دراز تک اکتساب فیض کیا، آپؒ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، امام سفیان الثوریؒ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے علم فقہ حاصل کیا اور فقہاءِ عراق سے فقہ و درایت کی تعلیم اور ھارون الرشید کی طرف سے منصبِ قضاء کی سپردگی کے بعد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس چلے گئے۔ اگرچہ آپ اپنے شیخ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے درجہ کے قاضی القضاۃ نہ تھے لیکن آپ کو لغت وادب میں وسیع درایت حاصل تھی اور آپؒ کو اپنے شیخ ابو یوسفؒ کے سوا تمام اصحابِ ابی حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ میں اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا۔ آپؒ نے علماءِ عراق کی تمام فقہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے اور علماءِ حجاز کی تمام فقہ امام مالکؒ سے اور اہلِ شام کی فقہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی تھی، آپ فقہ عراق اور فقہ حجاز کے جامع تھے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی مدوّن کردہ کتب امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ کے لیے مرجعِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہیں، خواہ وہ اقوال بروایتِ ابو یوسفؒ منقول ہوں جیسے کتاب الجامع الصغیر اور خواہ وہ اقوال فقہاءِ عراق کی معروف فقہ سے مدون کردہ ہوں، اور اس کو انہوں نے امام ابو یوسفؒ وغیرہ سے حاصل کیا ہو۔ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ ''البحر الرائق'' میں لکھتے ہیں کہ ''محمد بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی ہر وہ تالیف جو الصغیر کے نام سے موصوف ہو وہ باتفاقِ شیخین (ابو یوسف وابو صبیحؒ) ہے، لیکن جو الکبیر کے نام سے موصوف ہو وہ اس کے خلاف ہے۔''

علماء نے ان کی کتابوں کو ثقہ کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) کتب ظاہر الروایۃ: اس سے مراد وہ کتب ہیں جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بروایتِ ثقات ثابت ہیں اور وہ یا تو متواترہ ہیں یا مشہورہ۔ ان کے نام یہ ہیں: المبسوط، الزیادات، الجامع الصغیر، السیر الصغیر، السیر الکبیر، الجامع الکبیر۔ ان کو کتب اصول کہتے ہیں، اور کتاب الآثار اور کتاب الحجۃ بھی ان ہی کتابوں میں داخل ہیں، فقہ حنفی میں یہ کتب نقل کی بنیاد ہیں۔

(۲) کتبِ غیر ظاہر الروایۃ: ان کو کتبِ غیر ظاہر الروایۃ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے بروایت ظاہرہ ثابتہ مروی نہیں ہیں، اور یہ اصل میں امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی امالی میں شامل ہیں، حسن بن زیادؒ وغیرہ کی کتب، ''النوادر'' کے نام سے موسوم ہیں۔ حنفیہ کی کتب اصول، نوادر اور فتاوی و واقعات پر مشتمل ہیں، کتب اصول کو مذہب میں اصل کا درجہ حاصل ہے اس لیے کہ سند کے اعتبار سے وہ زیادہ قوی ہیں، جب نوادر کا ان کے ساتھ تعارض ہوتا ہے تو

روایتِ اصول کے ساتھ فیصلہ کیا جاتا ہے اور فتاوی اور واقعات کا درجہ نوادر سے کم ہے اس لیے کہ اصول اور نوادر اصل میں اصحابِ مذہب کے اقوال ہیں اگرچہ دونوں میں روایت کا تفاوت اور فرق موجود ہے۔

☆☆☆

یہ ائمہ مذاہب، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے مختصر سے حالات ہیں اور مذہب حنفی اور اس کے مآخذ کا مختصر سا تعارف ہے۔ جسے میں نے شیخ محمد ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ابو حنيفة" سے اختصار کے ساتھ نقل کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے، تاکہ وہ اس سے روشنی حاصل کریں اور انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت وخدمت کے لیے کیسے کیسے عظیم رجال اور ائمہ ہدیٰ پیدا کیے، جیسے امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس الشافعی، امام احمد بن حنبل وغیرہ **رحمهم الله تعالى و جزاهم عن الاسلام خير الجزاء۔**

میں نے دورانِ تالیف "کتاب الاختیار" کو پیشِ نظر رکھا ہے، میں نے اس کی احادیث کی تخریج اور کتب احادیث کے مطابق کچھ اضافات کا بھی اہتمام کیا ہے، جو کام بھی میں نے کیا ہے اگر وہ صواب اور درست ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہے اور اگر اس میں کوئی خطا اور غلطی ہے تو وہ میری طرف سے ہے، میں اس پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور توبہ کا طلبگار ہوں۔ میرا اس کام میں خیر کے سوا اور کوئی ارادہ نہیں ہے ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مجھے اس ذاتِ کبریائی سے امید ہے کہ وہ مجھے اس کے اتمام اور تکمیل کی توفیق عنایت فرمائے گی۔

"کتاب الاختیار" کو منتخب کرنے کا سبب یہ ہے کہ میں نے اس کتاب کی فقہ العبادات تمام کی تمام اپنے شیخ ابراھیم الیعقوبی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، انہوں نے فقہ حنفی اپنے شیخ عبدالمجید الطرابیشی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، انہوں نے شیخ عطاء اللہ الکسم رحمۃ اللہ علیہ سے اور انہوں نے شیخ عبدالغنی الغنیمی المیدانی رحمۃ اللہ علیہ صاحب "اللباب" سے اور انہوں نے سید محمد امین عابدین صاحب "الحاشية الشهيرة" سے حاصل کی، پھر انہوں نے اپنے شیخ سے، اس طرح چلتے چلتے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اکتسابِ فیض کیا۔

اس طرح میں نے فقہ العبادات میں تحریر کردہ کتاب "**حاشية الطحطاوى على مراقى الفلاح**" اپنے شیخ عبدالوھاب دبس وزیت سے پڑھی، انہوں نے مفتی الشام شیخ عطاء اللہ الکسم رحمۃ اللہ علیہ سے، انہوں نے شیخ عبدالغنی الغنیمی المیدانی سے، انہوں نے سید محمد امینؒ عابدین صاحب

"الحاشية" سے پڑھی۔

اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ اس نے مجھے ایسے شیوخ واساتذہ عطا فرمائے جو علم کے ساتھ تربیت کرنے والے تھے، جن کے علم کے حلقے مسجد التوبۃ، الدرویشیۃ اور شیوخ کے گھروں میں لگا کرتے تھے، اور اسی موقع پر میں نے ان سے فیض حاصل کیا۔

لیجئے اب کتاب "الفقه الحنفي وأدلته" کا حصہ فقہ العبادات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو خاص اپنی ذاتِ کریم کی رضاء کے لیے قبول فرمالے۔ انه خير مسئول۔

خادم العلم الشریف
أسعد محمد سعید الصاغرجی

﴿کتاب الطھارۃ﴾

تعریف

کتاب کا لغوی معنی ہے جمع کرنا اور کتابة کہتے ہیں حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر جمع کرنا اور کتاب الطہارۃ کا معنی ہے مسائلِ طہارت کو جمع کرنا۔ ''کتاب'' کا اصطلاحی معنی ہے شامل ہونا اور احاطہ کرنا، اور ''طہارۃ'' کا لغوی معنی ہے نظافت، اس کا عکس (متضاد لفظ) ہے ''دنس''۔اور ''طہارۃ'' کا شرعی معنی ہے مخصوص اعضاء کو دھونا اور اس کا عکس (متضاد) ''حدث'' ہے نیز طہارت کا ایک شرعی معنی رفعِ حدث اور ازالۂ نجس بھی ہے، اس کو ''دباغ'' کہتے ہیں۔اور ''تیمّم'' طہارت ہے، اور ''طہارۃ'' کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ مطہر (پاک کردینے والی چیز) کا ایسے محل میں پہنچانا جس کی تطہیر واجب ہو یا مندوب ہو۔

مطہر (پاک کردینے والی چیز) کسے کہتے ہیں؟ مطہر پانی ہے جب وہ موجود ہو، اور اس کی عدم موجودگی میں پاک مٹی مطہر ہے۔طہارت کی دو قسمیں ہیں۔(ا) حقیقی: جیسے پانی سے طہارت حاصل کرنا (ب) حکمی: جیسے تیمم۔ پھر طہارت بالماء کی دو قسمیں ہیں۔خفیفہ: جیسے وضو، غلیظہ: جیسے غسلِ جنابت یا حیض ونفاس کا غسل۔

فرضیتِ وضو کا سبب

وضو کی فرضیت کا سبب، حدث کے پائے جانے کے وقت نماز کا ارادہ کرنا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ'' [المائدۃ: ٦] ''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولیا کرو۔''

اس آیت میں حدث کا لفظ محذوف ہے: معنی یہ ہے کہ جب تم نماز کے لیے قیام کا ارادہ کرو اور تم حالتِ حدث میں ہو تو پھر وضو کرلیا کرو۔تو یہاں ''وانتم محدثون'' محذوف ہے۔وضو کے حکم میں ''اِذَا قُمْتُمْ'' اور جنابت کے ذکر میں ''وَ اِنْ کُنْتُمْ'' فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ''اذا'' کا کلمہ ایسی چیز پر داخل ہوتا ہے جو لامحالہ موجود ہو یا وہ چیز ایسی ہو جس کا انتظار کیا جاتا ہو اور

''ان'' کا کلمہ ایسی چیز پر داخل ہوتا ہے جو کبھی تو موجود ہو اور کبھی موجود نہ ہو۔ اب قیامِ صلوۃ کو لیجیے یہ ایسا امر ہے جو بندے کے لیے لامحالہ (ہر روز) لازم ہوتا ہے، جب کہ جنابت کی حالت کبھی موجود ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔

آیتِ ہذا سے وضو کے فرائض یہ معلوم ہوئے: (۱) چہرے کا دھونا (۲) ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھونا (۳) چوتھائی سر کا مسح کرنا (۴) دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا۔

فرض کا لغوی وشرعی معنی:

فرض کا لغوی معنی ہے اندازہ کرنا۔ اور شرعی معنی ہے کہ جس حکم کا لزوم دلیلِ قطعی سے ثابت ہو اور اس میں کوئی شبہ نہ ہو، جیسے اعضاءِ وضو میں اصلِ غسل ومسح، یہ علم اور عمل دونوں اعتبار سے فرض ہے، اس کو فرضِ قطعی کہتے ہیں، اور کبھی ایک حکم صرف عمل کے اعتبار سے فرض ہوتا ہے، علم کے اعتبار سے فرض نہیں ہوتا، اس کو فرضِ اجتہادی کہتے ہیں، جیسے پیشانی کی بقدر سر کے مسح کا فرض ہونا۔ جو حکم دلیلِ قطعی سے ثابت ہو اس کا انکار موجبِ کفر ہے لیکن جو حکم دلیلِ اجتہادی سے ثابت ہو اس کا انکار موجبِ کفر نہیں ہے۔

غَسل کا لغوی معنی اور اس کی حد

غَسل کا لغوی معنی ہے ''اِسالہ'' یعنی بہانا۔ اور اس کی حد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ ہے کہ پانی کا تقاطر (قطرے ٹپکنا) ہو خواہ ایک قطرہ ہی ٹپکے۔ فیض القدیر میں ہے کہ اقل حد دو قطرے ہیں، چہرے کی حد لمبائی میں پیشانی کی سطح کی ابتداء سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور چوڑائی میں ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک ہے۔ کان اور رخسار کے درمیان کا سفید حصہ دھونا بھی واجب ہے۔ عند ابی حنیفہ ومحمد، کیونکہ یہ چہرے کا حصہ ہے۔ اگر کسی نے چہرہ دھویا اور پانی ابروؤں کے نیچے نہیں پہنچایا تو وضو ہو جائے گا آنکھوں کا اندرونی حصہ دھونا ساقط ہے (معاف ہے)، کیونکہ اس میں مشقت کے ساتھ ضرر وتکلیف کا بھی اندیشہ ہے لیکن گوشۂ چشم میں پانی پہنچانا واجب ہے، اور اس میں آنکھ کا وہ گوشہ جو ناک کے برابر ہے اور وہ گوشہ جو کان کے برابر ہے دونوں شامل ہیں۔ اسی طرح دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت اور دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا بھی فرض ہیں۔ دونوں کہنیاں ہاتھ کے دھونے میں اور دونوں ٹخنے پاؤں کے دھونے میں علی سبیل الفرضیۃ داخل ہیں۔ لیکن امام زفرؒ اختلاف فرماتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ غایہ مغیَّہ میں داخل نہیں ہوتی ہے، جیسے روزے کے

حکم میں رات داخل نہیں ہے۔ احناف کے ائمہ ثلاثہ کی دلیل یہ ہے کہ یہاں غایہ اپنے ماوراء کو ساقط کرنے کے لیے ہے، اس لیے کہ اگر غایہ (مرفقین اور کعبین) نہ ہوتی تو دھونے کا حکم سارے ید (ہاتھ) اور سارے رِجل (ٹانگ) کو شامل ہوتا یعنی پھر پورے ہاتھ اور پوری ٹانگ کو دھونا فرض ہوتا، روزے میں رات تک مدِ حکم مقصود ہے، کیونکہ "صوم" کا اطلاق امساک ساعۃ پر بھی ہوتا ہے۔

سنت یہ ہے کہ دھونے کی ابتداء انگلیوں سے کرے اور انتہاء کہنیوں اور ٹخنوں پر کرے، اگر اس کے برعکس دھویا تو جائز ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مکہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم ابھی راستے میں پانی کی جگہ پر اترے تھے کہ کچھ لوگوں نے عصر کے وقت جلدی دکھائی اور جلدی جلدی میں وضو کیا، ہم ان کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کی ایڑیاں (خشک رہ جانے کی وجہ سے) چمک رہی ہیں، پانی ان کو نہیں پہنچا تھا، (یعنی ایڑیاں دھونے سے رہ گئیں تھیں) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ويل للأعقاب من النار، اسبغوا الوضوء**" یعنی ایسی ایڑیوں کے لیئے جہنم کی ہلاکت ہے، وضو مکمل کیا کرو۔"[1]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے پیچھے رہ گئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں اس وقت پایا جب عصر کا وقت قریب ہو چکا تھا پس ہم وضو کرنے لگے اور اور اپنے پاؤں پر مسح کرنے لگے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلند آواز سے فرمایا: "**ويل للأعقاب من النار**" یعنی ایسی ایڑیوں کے لیے (جو خشک رہ جائیں) دوزخ کی ہلاکت ہے، دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمایا۔"[2]

سر کے مسح میں مقدارِ ناصیہ فرض ہے یعنی چوتھائی سر، سر کے چار حصے ہیں: ناصیہ (پیشانی کے بال)، قذال (گدی سے اوپر کے بال) اور فودان (دونوں کنپٹیوں کے بال)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، آپ کے سر مبارک پر ایک قطری عمامہ تھا، آپ نے اس عمامہ کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر سر کے مقدم حصے کا مسح کیا اور عمامہ نہیں اتارا۔"[3]

اس حدیث میں "سر کے مقدم حصے" کی تفسیر ناصیہ کے ساتھ کی گئی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، فارجع إليه۔ احناف کے نزدیک سر کے فرض مسح کی مقدار میں اختلاف مروی ہے، ایک روایت میں ہاتھ کی تین انگلیوں کی مقدار فرض ہے، اس لیے کہ اصل کے اعتبار سے یہ آلہءِ مسح میں اکثر ہے، اور یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے۔ لیکن پہلی روایت اولیٰ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک

---

[1] صحیح مسلم ۱/۲۱۴ [2] صحیح البخاری: ۱/۵۱ [3] سنن ابی داود: ۱/۳۷

تین بالوں کی مقدار فرض ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک استیعابِ راٴس (تمام سر کا مسح کرنا) فرض ہے۔ رحمہم اللہ جمیعاً

وضو کی سنتیں

سنت کا لغوی معنی ہے طریقہ، خواہ وہ طریقہ اچھا ہو یا بُرا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا اس کو اس کا اجر ملے گا اور اس کے بعد اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کا اجر بھی اسے ملے گا اور ان سب کے اجور میں کوئی کمی نہ کی جائے گی، اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ رائج کیا اس کو اس کا گناہ ہوگا اور اس کے بعد اس پر عمل کرنے والوں کا گناہ بھی اس کو ملے گا اور ان سب کے گناہوں میں کوئی کمی نہ کی جائے گی''[1] حدیثِ مذکورہ میں لفظِ سنت ''طریقہ'' کے معنی میں مذکور ہے۔

اور سنت کا شرعی و اصطلاحی معنی یہ ہے کہ وہ کام جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا آپ کے کسی صحابی رضی اللہ عنہ نے مواظبت فرمائی ہو اور کبھی کبھار اس کو ترک کر دیا ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں: (۱) سنن الھدی (۲) سنن الزوائد۔ سنن الھدیٰ کی مثال جیسے اذان، نماز باجماعت، اور سنن الزوائد کی مثال جیسے فرائض کے نوافل۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض سنتیں ایسی ہیں کہ انکا تارک فاسق اور منکر مبتدع ہوگا اور بعض سنتیں ایسی ہیں کہ انکا تارک نہ فاسق ہوگا اور نہ ان کا منکر مبتدع ہوگا۔

استنجاء

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ''[2]

استنجاء کہتے ہیں شرمگاہ (اگلی یا پچھلی) پر باقی رہنے والی نجاست کو پانی سے دور کرنا یا ڈھیلے وغیرہ کے ذریعہ مخرج (شرمگاہ) کو صاف کر کے اس نجاست کو کم کرنا۔ استنجاء سنتِ مؤکدہ ہے، جیسا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جو شخص استنجاء کرنا چاہے اس کو چاہیئے کہ طاق عدد کو اختیار کرے جس نے ایسا کیا اس نے اچھا کیا اور جس نے نہ کیا تو کوئی حرج نہیں۔''[3]

آدمی پر استبراء لازم ہے یعنی مخرج کو پیشاب کے قطروں کے اثر سے بچانا، یہاں تک کہ دل مطمئن ہو جائے، عورت کو اس کی ضرورت نہیں، وہ تھوڑی دیر توقف کرے گی، پھر استنجاء کرے

---

[1] [صحیح مسلم: ۲/۷۰۵] [2] [صحیح البخاری: ۱/۴۷] [3] [سنن البیہقی: ۱/۱۰۴]

گی۔اور یہ استبراء ہر شخص کی عادت اور طبیعت کے مطابق ہے،اس کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً چند قدم چلنا، کھنکارنا اور ذکر پر انگلیوں کا پھیرنا وغیرہ۔اس وقت تک وضو شروع کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ اس کو پیشاب کے قطرے ختم ہونے کا اطمینان نہ ہو جائے اور یہ حکم فرض ہے۔جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا گزر مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ کی کسی دیوار کے پاس سے ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دو آدمیوں کی آواز سنی کہ ان کو قبر میں عذاب دیا جا رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:''ان کو عذاب ہو رہا ہے اور ان کو کسی بہت بڑی بات پر عذاب نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ان میں سے ایک شخص تو پیشاب سے نہیں بچتا تھا اور دوسرا شخص چغلخوری کیا کرتا تھا۔'' پھر آپؐ نے ایک تر شاخ لی اور اس کے دو ٹکڑے کر کے دونوں پر ایک ایک ٹکڑا گاڑ دیا،لوگوں نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا''شاید اس وقت تک کے لیے ان کے عذاب میں کچھ تخفیف ہو جائے جب تک یہ خشک نہ ہوں۔''[۱]

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے استنجاء پر مواظبت فرمائی ہے اور اس کی دعوت وترغیب دی ہے، آپ نے فرمایا کہ''جو شخص استنجاء کرے اس کو چاہیئے کہ طاق عدد (پتھروں) ہی سے کرے۔''[۲]

دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر بایاں ہاتھ نہ ہو یا اس کے استعمال سے عاجز ہو تو جائز ہے۔جیسا کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ آدمی اپنے عضو (شرمگاہ) کو دائیں ہاتھ سے پکڑے۔''[۳]

استنجاء میں مسح کرنا (پونچھنا) پانی سے دھونے کے قائم مقام ہے، اور پانی پر اکتفاء بھی کر سکتا ہے۔جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:''جب تم میں سے کوئی شخص بیت الخلاء کے لیے جائے تو اپنے ساتھ تین پتھر لے جائے اور ان کے ذریعہ پاکی حاصل کرے، کیونکہ تین پتھر، اس کے لیے کافی ہو جاتے ہیں۔''[۴]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بیت الخلاء کیلئے تشریف لے جاتے تھے تو میں اور ایک انصاری غلام پانی کا برتن ساتھ لے جاتے تھے جس کیساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم استنجاء کرتے تھے۔[۵]

استنجاء میں افضل یہ ہے کہ مسح اور غسل کو جمع کرے (یعنی ڈھیلے بھی استعمال کرے اور پھر پانی سے بھی طہارت حاصل کرے)، جیسا کہ حضرت ابو ایوب، حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت

---

۱ [صحیح البخاری:۱/۶۲] ۲ [صحیح البخاری:۱/۵۱] ۳ [سنن ابی داود:۱/۱۱]

۴ [سنن البیہقی:۱/۱۰۵] ۵ [سنن البیہقی:۱/۱۰۵]

انس بن مالک رضی اللہ عنہم کی روایات ہیں کہ جب یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ''فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ج وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ.'' [التوبہ:۱۰۸] تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے معشر انصار! بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہاری طہارت کی خوب تعریف کی ہے، بتاؤ تم کیسے طہارت حاصل کرتے ہو؟ انہوں نے کہا، یارسول اللہ! ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں اور جنابت پیش آنے پر غسل کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا اس کے علاوہ بھی کوئی عمل ہے جو تم کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ اور تو کوئی عمل نہیں کرتے، البتہ جب ہم میں سے کوئی شخص بیت الخلاء کے لیے جاتا ہے تو وہ پانی سے استنجاء کرنے کو پسند کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں یہی وہ عمل ہے اس کو اپنے اوپر لازم کرلو۔'' [1]

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ انہوں نے کہا: ''ہمارا کوئی مرد اور عورت اپنے مخرج کو دھوئے بغیر بیت الخلاء سے نہیں نکلتا۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''پس اسی عمل کی وجہ سے تمہاری تعریف کی گئی ہے۔''

جب تک نجاست مخرج پر ہی لگی ہو اور اس سے پھیلی نہ ہو تو اس کا ازالہ استنجاء سے ہو جائے گا، لیکن اگر مخرج سے زیادہ پھیلی ہو اور وہ تجاوز کی ہوئی نجاست ہتھیلی کی گہرائی (ایک درہم) کے برابر ہو تو ڈھیلوں سے استنجاء کافی نہ ہوگا بلکہ اس کا دھونا واجب ہے اور اگر نجاستِ مائعہ ہتھیلی کی گہرائی کی مساحت سے زیادہ ہو یا نجاستِ متجسدہ (جسم والی نجاست) چار گرام سے زیادہ ہو تو اس کو پانی سے دھونا فرض ہے، اگر پانی دستیاب نہ ہو تو نجاست کو زائل کرنے والی ہر مائع چیز کافی ہے۔

ایسے پتھر سے استنجاء کرنا مسنون ہے جو انقاء (صاف کرنے) کی صلاحیت رکھتا ہو، لہٰذا وہ پتھر کھردرا نہیں ہونا چاہیئے جیسے اینٹ وغیرہ اور نہ ہی چکنا ہو جیسے ٹھیکری وغیرہ۔

استنجاء کرنے والا خوب طہارت حاصل کرے یہاں تک کہ بدبو ختم ہو جائے اور مقعد کو خوب ڈھیلا چھوڑے تاکہ خوب نظافت حاصل ہو، لیکن اگر روزے دار ہو تو روزے کو فساد سے بچانے کے لیے ایسا نہ کرے۔

جب استنجاء سے فارغ ہو جائے تو اپنے ہاتھ کو دوبارہ دھوئے اور روزہ دار (خصوصاً) اٹھنے سے پہلے مقعد کو خشک کرلے تاکہ مقعد میں کوئی چیز (پانی وغیرہ) جذب نہ ہو جائے۔

کسی کے سامنے شرمگاہ کھولنا اس کی حرمت کی وجہ سے ناجائز ہے۔ اس پر اس کو فاسق قرار دیا جائے گا، لہٰذا اقامتِ سنت کے لیے اس کام کا ارتکاب نہ کرے اور مخرج کو کپڑوں کے نیچے سے

---

[1] [سنن البیہقی: ۱/۱۰۵]

صاف کرے، اگر اس کو ترک کرے تو اس کے بغیر بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔ اگر نجاست اپنے مخرج سے متجاوز ہو جائے اور تجاوز کی ہوئی نجاست نجاستِ متجسدہ میں چار گرام سے زیادہ ہو اور نجاستِ مائعہ میں ہتھیلی کی گہرائی سے زیادہ ہو کہ اس کے ہوتے ہوئے نماز صحیح نہ ہوتی ہو اور اس نجاست کا ازالہ بھی اس کے لیے ممکن ہو لیکن غیر کے سامنے ستر کھولنے کی احتیاج ہو تو وہ ستر کھولے بغیر ازالۂ نجاست کی کوشش کرے، تاکہ حتی المقدور حرام کے ارتکاب سے بچاؤ ہو سکے اور اگر مخرج پر لگی ہوئی نجاست کو ملائے بغیر ازالہ نہ کرے تو اس کو ترک کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ جس قدر نجاست مخرج پر ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں، کیونکہ اس کا کسی چیز سے پونچھ لینا کافی ہے اور اگر نجاستِ مائعہ کا ازالہ ستر کھولے بغیر ممکن نہ ہو تو اسے ترکِ طہارت میں معذور سمجھا جائے گا، اس کے ساتھ ہی نماز پڑھے گا اور ستر نہیں کھولے گا۔

بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پہلے بایاں پاؤں داخل کرے اور تعوذ پڑھے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، بائیں جانب کو جھک کر (بائیں پیر پر قدرے زور دے کر) بیٹھے، اس طرح حاجت آسانی سے ہو جاتی ہے، دونوں پاؤں کو دور رکھے (یعنی کشادہ ہو کر بیٹھے)، بیت الخلاء میں بلاضرورت بات نہ کرے، قبلہ کی طرف نہ منہ کرے اور نہ پشت۔ جیسا کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص بیت الخلاء میں جائے تو نہ قبلہ کی طرف رخ کرے اور نہ اس کی طرف اپنی پشت پھیرے، مشرق یا مغرب کی طرف رخ کر لے۔'' (لیکن پاکستان کے اکثر حصے سے مغرب کی جانب قبلہ ہے لہٰذا اس سے اجتناب کرے)[1]

اور استقبال واستدبار (قبلہ کی طرف منہ یا پشت کرنے) کا یہ مسئلہ مطلق ہے۔ خواہ آبادی میں ہو یا صحراء میں، دونوں صورتیں ممنوع ہیں، کیونکہ ممانعت مطلق آئی ہے۔ اور آنحضور ﷺ کا اس بارے وارد شدہ فعل جواز پر محمول ہے۔

بچے کو بھی قبلہ رخ بٹھا کر پیشاب کرانا مکروہ ہے۔ ہوا کی مخالف سمت پیشاب کرنا مکروہ ہے، کیونکہ پیشاب کی چھینٹیں واپس آ کر اس کو ناپاک کر دیں گی، جاری پانی یا بند پانی یا نہر یا کنوئیں یا حوض یا چشمہ کے کنارے پر یا پھل دار درخت کے نیچے یا کھیتی میں یا ایسے سائے میں جہاں لوگ بیٹھ کر آرام حاصل کرتے ہوں، اور مسجد کے برابر اور عید گاہ کے برابر اور قبروں میں اور چوپائے جانوروں اور لوگوں کے بیٹھنے یا راستہ چلنے کی جگہ میں پیشاب اور پاخانہ کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ کام موجبِ لعنت ہیں: جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

1 [صحیح البخاری: ۱/۴۷]

"اتقوا اللاعنین" یعنی لوگو! دولعنت کا سبب بننے والی چیزوں سے بچو" لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! وہ دولعنت کا سبب بننے والی چیزیں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کے عام راستہ میں اوران کے سایہ کی جگہ میں پاخانہ کرنا۔"[1]

اگرانگوٹھی یاکسی اور چیز پراللہ تعالیٰ کا نام یاقرآن مجید کی آیت یارسول اللہ ﷺ کانام یا کسی بزرگ کا نام یاحدیث شریف یادعا کھدی ہوئی ہو یالکھی ہوئی ہوتو اسے پہن کر بیت الخلاء میں جانامکروہ ہے،لہٰذااس کواتاردے،البتہ اگرایسی چیز جیب میں ہو یاتعویذ وغیرہ کپڑے میں لپیٹا ہوا ہوتومکروہ نہیں،زبان اور حلق وغیرہ سے اللہ کاذِکر نہ کرے، چھینک،سلام اوراذان کا جواب نہ دے، اگرخودکو چھینک آئے تو دل میں الحمدللہ کہہ لے،زبان سے نہ پڑھے،بلاضرورت اپنے سترکو نہ دیکھے اور نہ بول وبرازکودیکھے،نہ تھوکے،نہ ناک صاف کرے،نہ کھنکارے،نہ بہت ادھرادھر دیکھے،اپنے بدن سے نہ کھیلےاورآسمان کی طرف نگاہ نہ اٹھائے،اور بیت الخلاء میں بہت دیرتک نہ بیٹھےاور جب فارغ ہوجائےتو مرد بائیں ہاتھ سےاپنے ذکر(آلہ تناسل) کوجڑ کی طرف سے سرکی طرف سونتے تاکہ جوقطرے رکے ہوئے ہوں نکل جائیں،جب بیت الخلاء سے نکلے تو پہلے دایاں پاؤں باہر نکالےاور یہ دعاپڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَ عَافَانِیْ

"تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے تکلیف دورفرمائی اور مجھے عافیت بخشی۔"

---

[1] [سنن ابی داؤد:۱/۷]

باب الوضوء

وضو کی سنتیں:

(۱) حدثِ اصغر سے جو طہارت حاصل کی جاتی ہے اس کی پہلی سنت دونوں ہاتھوں کو کلائیوں تک تین بار دھونا ہے، خواہ پانی کے برتن میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو یا نہ ہو، نیز عام ہے کہ نیند سے بیدار ہوا ہو یا پہلے سے جاگ رہا ہو۔ ہر حالت میں دونوں ہاتھوں کو (ابتدائے وضو میں) تین بار کلائیوں تک دھونا مسنون ہے، البتہ جب نجاست کا توہم ہو مثلاً استنجاء کیے بغیر سو گیا تو چونکہ ہو سکتا ہے کہ نیند میں اس کا ہاتھ ناپاک حصے پر پڑا ہو اس لیے ایسی حالت میں سو کر اٹھنے کے بعد وضو کے شروع میں ہاتھوں کا دھونا سنتِ مؤکدہ ہے۔[1]

جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "جب تم میں سے کوئی شخص سو کر بیدار ہو تو اپنا ہاتھ برتن میں اس وقت تک نہ ڈالے جب تک کہ تین بار اس کو نہ دھو لے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں بسر کی۔"[2]

عقلی دلیل یہ ہے کہ ہاتھ تطہیر کا آلہ ہے، اس لیے پہلے اس کی تنظیف مسنون ہوگی اور کلائیوں تک اس لیے دھویا جائے گا کہ تنظیف کے لیے یہی کافی ہے۔

(۲) وضو شروع کرتے وقت بسم اللہ الخ پڑھنا، لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ مستحب ہے، جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اس شخص کا کوئی وضو نہیں جس نے وضو کرتے وقت اللہ کا نام ذکر نہیں کیا۔"[3]

اور اس سے مراد فضیلتِ وضو کی نفی ہے۔ استنجاء سے پہلے بھی اور بعد میں بھی تسمیہ (یعنی بیت الخلاء جانے سے پہلے اور نکلنے کی بعد کی دعا) پڑھے، یہی صحیح ہے اور یہاں تسمیہ سے مراد مطلق اللہ کا نام لینا ہے۔

(۳) مسواک کرنا، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر مواظبت فرمائی ہے، مسواک موجود نہ ہو تو انگلیوں سے دانتوں کو ملے، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح بھی ثابت ہے۔

---

۱ [بحر الرائق] ۲ [صحیح مسلم: ۱/۲۳۳] ۳ [سنن الترمذی: ۱/۲۰]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں (ایک دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں مسواک ہے اور اس کو استعمال کر رہے ہیں اور مسواک منہ میں ہے اور اع اع کی آواز نکل رہی ہے، جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قے کر رہے ہوں۔“[۱]

اصح قول یہ ہے کہ مسواک مستحب ہے، جیسا کہ ارشادِ رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ”اگر مجھے اپنی امت پر مشقت اور دشواری کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک استعمال کرنے کا حکم دیتا۔“[۲]

(۴) تین بار کلی کرنا اور تین بار ناک میں پانی ڈالنا، اس لیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کام مواظبت کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت حمران رضی اللہ عنہ اور ابن ابی ملیکہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان سے وضو کی کیفیت پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ ان سے بھی کسی نے وضو کی کیفیت پوچھی تھی تو انہوں نے پانی منگوایا، چنانچہ وضو کا ایک برتن لایا گیا، آپ رضی اللہ عنہ نے اس کو دائیں ہاتھ پر جھکایا، پھر پانی میں ہاتھ ڈال کر تین مرتبہ کلی کی اور تین مرتبہ ناک میں پانی ڈالا، اور تین مرتبہ اپنے چہرے کو دھویا، پھر تین مرتبہ دائیں ہاتھ کو دھویا اور تین بار ہی بائیں ہاتھ کو دھویا، پھر (پانی میں) ہاتھ ڈالا اور (اس سے) اپنے سر اور کانوں کا مسح کیا، آپ رضی اللہ عنہ نے کانوں کے اندرونی اور بیرونی حصہ کو ایک مرتبہ دھویا (یعنی مسح کیا)، پھر اپنے دونوں پاؤں دھوئے، پھر فرمایا کہ وضو کا طریقہ پوچھنے والے کہاں ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا وضو کیا، پھر ایک مرتبہ سر کا مسح کیا اور دایاں پاؤں تین مرتبہ اور بایاں پاؤں بھی تین مرتبہ دھویا۔“[۳]

کلی کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تین بار کلی کرے اور ہر مرتبہ نیا پانی لے، جیسا کہ حدیث میں موجود لفظ ”ثلاثا“ (تین مرتبہ) سے معلوم ہوتا ہے، اور دونوں (کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے) میں مبالغہ کرے، لیکن روزہ دار مبالغہ نہ کرے۔

(۵) سارے سر کا مسح ایک بار کرنا اور دونوں کانوں کا مسح سر کے پانی (تری) سے کرنا۔ جیسا کہ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کیا، جب سر کے مسح پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دونوں ہتھیلیاں سر کے اگلے حصے پر رکھیں اور ان کو پیچھے گدی تک لے گئے، پھر ان (ہاتھوں) کو اسی جگہ پر واپس لے آئے جہاں

---

[۱] [صحیح البخاری: ۱/ ۴۷] [۲] [صحیح البخاری: ۱/ ۶۸] [۳] [سنن ابی داؤد: ۱/ ۲۷]

سے ابتداء کی تھی، پھر اپنے کانوں کے اندرونی اور بیرونی حصے کا مسح کیا اور اپنی انگلیاں کانوں کے سوراخ میں داخل کیں۔[۱]

اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ساری حدیث بیان کی اور اس میں ہر عضو کو تین تین بار دھونے کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے سر اور کانوں کا ایک ہی مسح فرمایا، نیز حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "الأذنان من الرأس" یعنی دونوں کان سر کا حصہ ہیں"[۲] اس حدیث سے مراد حکم بیان کرنا ہے یعنی سر اور کان دونوں کا حکم ایک ہے، ان کی پیدائش کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت احکام بیان کرنے کے لیے ہوئی ہے، موجودات کے حقائق بیان کرنے کے لیے نہیں ہوئی ہے۔

(۶) ڈاڑھی کا خلال کرنا، جب کہ ڈاڑھی گنجان ہو، خلال کا وقت تین بار منہ دھونے کے بعد ہے، ڈاڑھی کا خلال کرنے کے بارے میں چار قول ہیں: ایک قول یہ ہے کہ یہ واجب ہے، یہ حضرت سعید بن جبیرؒ کا قول ہے، دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سنت ہے، یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہی ہے، تیسرا قول یہ ہے کہ مستحب ہے اور چوتھا قول یہ ہے کہ جائز ہے، یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ (طرفین) کا مذہب ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔ جائز کا مطلب یہ ہے کہ اس کا کرنے والا بدعت کی طرف منسوب نہیں ہے۔ ڈاڑھی میں خلال کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کے چلّو میں پانی لے کر ٹھوڑی کے نیچے کے بالوں کی جڑوں میں اس طرح ڈالے کہ اس وقت ہاتھ کی ہتھیلی گردن کی جانب ہو اور ہاتھ کی پشت باہر یعنی نیچے کی طرف ہو تا کہ چلو کا پانی بالوں میں داخل ہو سکے، پھر ڈاڑھی میں اسی دائیں ہاتھ کی انگلیاں نیچے کی جانب سے ڈال کر اوپر کو خلال کرے۔ اس کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب وضو فرماتے تو پانی کا ایک چلو لیتے اور اس کو ٹھوڑی کے نیچے ڈالتے، اس سے اپنی ڈاڑھی مبارک کا خلال کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "میرے رب عزوجل نے مجھے اسی طرح حکم دیا ہے۔"[۳]

(۷) سب انگلیوں کا خلال کرنا، اس کی ایک دلیل تو حدیثِ لقیطؓ ہے۔ حضرت لقیط رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم وضو کرو تو اپنی انگلیوں کا خلال کر لیا کرو۔" دوسری دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تم وضو کرو تو اپنے

---

[۱] [سنن ابی داؤد: ۱/۳۰]
[۲] [سنن ابی داؤد: ۱/۳۳]
[۳] [سنن ابی داؤد: ۱/۳۶]

ہاتھوں اور اپنے پیروں کی انگلیوں کا خلال کرلیا کرو' پاؤں کی انگلیوں میں خلال بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے کرے، جیسا کہ حدیثِ مستورد رضی اللہ عنہ سے معلوم ہوتا ہے: حضرت مستورد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو فرماتے تو اپنے پاؤں کی انگلیوں کو چھنگلیا کے ذریعہ ملتے۔''[۱]

(۸) اعضاءِ مغسولہ کو تین تین بار دھونا۔ اس کی دلیل استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) کے ذیل میں گزر گئی ہے۔

(۹) وضو کی نیّت کرنا، اور یہ سنتِ مؤکدہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دل میں یوں کہے: ''نَوَیْتُ أَنْ أَتَوَضَّأَ لِلصَّلٰوةِ تَقَرُّبًا إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى'' ''میں نے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے نماز کے واسطے وضو کی نیت کی۔'' یا حدث دور کرنے کی یا نماز ادا کرنے کی یا وضو کی یا شارع کا حکم بجالانے کی نیت کرے۔ اگر زبان سے کہے تو کوئی حرج نہیں ہے، منہ دھوتے وقت یہ نیت کرے اور نیت کا محل دل ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نیت کرنا فرض ہے۔ اس لیے کہ وضو ایک عبادت ہے، لہٰذا تیمّم کی طرح یہ بھی نیت کے بغیر درست نہ ہوگی۔ احناف کے نزدیک نیت عبادات کے لیے فرض ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَمَآ أُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' [البیّنۃ: ۵] ''ان کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے مخلص ہو کر عبادت کریں۔'' یہاں اخلاص سے مراد نیت کرنا ہے، وضو بعینہٖ عبادت نہیں ہے، بلکہ عبادت کے لیے شرط ہے، کہ اگر کوئی شخص ایک ہی مجلس میں کئی مرتبہ وضو کرے تو یہ مکروہ ہے، کیونکہ اس نے پانی میں مذموم اسراف کیا ہے، تیمّم میں نیت کرنا اس لیے فرض ہے کہ تیمّم مٹی سے ہوتا ہے اور مٹی بذاتہ پاک کرنے والی نہیں ہے مگر ارادۂ صلوٰۃ کے وقت۔ پس مٹی سے پاک کرنا امر تعبدی (خلافِ قیاس) ہے، اور امور تعبدیہ نیت کے محتاج ہوتے ہیں، اس وجہ سے تیمّم پر قیاس کرنا درست نہیں ہے اور وضو پانی سے ہوتا ہے اور پانی بذاتہ پاک کرنے والا ہے، اس میں نیت کی ضرورت نہیں ہے، بلاشبہ وضو کا عبادت ہونا بغیر نیت کے متحقق نہیں ہوسکتا لیکن وضو بغیر نیت کے مفتاحِ صلوٰۃ ہوسکتا ہے، کیونکہ نماز کی کنجی طہارت ہے اور طہارت نیت اور بغیر نیت دونوں طرح متحقق ہو جاتی ہے۔

اس سے ایک مسئلہ متفرع ہوا کہ اگر کسی شخص کے اعضاء پر مٹی اس کے قصد کے بغیر گر پڑے یا کسی دوسرے انسان کو تیمّم سکھائے تو وہ تیمّم نماز کے لئے کافی نہیں ہوگا۔

---

[۱] [سنن الترمذی: ۱/۲۹]

(۱۰) ترتیب، یہ احناف کے نزدیک صحیح قول کی بناء پر سنتِ مؤکدہ ہے، اس کے ترک کی عادت سے گنہگار ہوگا۔ ترتیب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں جس کا ذکر پہلے کیا ہے اس کو پہلے ادا کرے، یعنی آیتِ وضو میں جس ترتیب سے مذکور ہے اسی ترتیب سے وضو کرے، ترتیب فرض نہیں ہے۔ اس کی ایک دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا'' (آخر آیت تک) [المائدۃ:۶]

دوسری دلیل یہ ہے کہ وضو کے اعضاءِ مفروضہ کے درمیان ''واؤ'' مذکور ہے اور ائمہ نحو اور اہلِ لغت کا اس پر اجماع ہے کہ واؤ مطلق جمع کے لیے آتا ہے، پس اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ ''فاء'' تعقیب کے لیے ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اعضاءِ اربعہ کے مجموعہ کا غُسل قیام الی الصلوٰۃ پر مرتب ہے، پس قیام الی الصلوٰۃ اور اعضاءِ اربعہ کے مجموعہ کے غُسل میں ترتیب ثابت ہوگی نہ کہ اعضاءِ اربعہ میں، حالانکہ کلام اعضاءِ اربعہ کی ترتیب میں ہے اور اعضاءِ اربعہ میں واؤ داخل ہے اور وہ ترتیب کا فائدہ نہیں دیتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترتیب فرض ہے۔ ان کی دلیل یہی فرمانِ خداوندی ہے: ''فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ'' [المائدۃ:۶]۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ ''فاء'' تعقیب کے لیے آتا ہے اور تعقیب، ترتیب کے معنی پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ تعقیب کے معنی ہیں فاء کے مابعد کا اس کے ماقبل پر مرتب ہونا، پس آیتِ ہٰذا سے قیام الی الصلوٰۃ اور غسلِ وجہ کے درمیان ترتیب ثابت ہوئی اور جب اس میں ترتیب ثابت ہوگئی تو باقی اعضاء میں بھی ترتیب ثابت ہوگی، کیونکہ باقی اعضاء، غسلِ وجہ پر معطوف ہیں اور معطوف علی المرتب، مرتب ہوتا ہے، اس لیے باقی اعضاء میں بھی ترتیب ثابت ہوگی۔

(۱۱) اعضاءِ وضو کو پے در پے دھونا، یہ ہمارے نزدیک سنت ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فرض ہے، پے در پے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وضو کرنے والا وضو کے افعال کے درمیان کسی ایسے فعل میں مشغول نہ ہو جو وضو سے متعلق نہ ہو، یعنی ایک عضو کو دھونے کے بعد متصل ہی دوسرا عضو بھی دھولے اور اس کی معتبر حد یہ ہے کہ معتدل موسم میں پہلے دھوئے ہوئے عضو کی تری خشک ہونے سے پہلے دوسرا عضو دھونا شروع کردے، گرمی، ہوا اور سردی کی شدت کا اعتبار نہیں اور اعضاء کے خشک ہونے میں وضو کرنے والے کی حالت یکساں رہنے کا بھی اعتبار کیا جائے گا، وضو میں تفریق کرنا یعنی بعض اعضاء کو دھو کر کچھ توقف کے بعد باقی اعضاء کو دھونا اگر عذر کے بغیر ہو تو مکروہ ہے، لیکن اگر عذر سے ہو مثلاً پانی ختم ہوجائے یا پانی کا برتن الٹ جائے، اس لیے اور پانی لینے کے لیے جائے تو صحیح قول کی بناء پر حرج نہیں ہے (یعنی مکروہ نہیں ہے)۔ غسل اور تیمّم کے افعال کے درمیان

تفریق کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔

(۱۲) گردن کا مسح کرنا، اس کی دلیل وہ روایت ہے جس کو امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت کعب بن عمرو الیامی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو فرمایا تو تین بار کلی کی اور تین بار ناک میں پانی ڈالا، ہر ایک کے لیے نیا پانی لیتے تھے، پھر چہرہ مبارک تین مرتبہ دھویا، پھر جب مسح کیا تو انہوں نے یوں اشارہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہاتھوں کو سر کے اگلے حصے سے گردن کے نچلے حصے یعنی گدی کی طرف لے گئے۔''[۱]

وضو کے مستحبات

''مستحب'' کا لغوی معنی ہے پسندیدہ چیز، اور شرعی معنی یہ ہے: وہ کام جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کیا ہو اور کبھی ترک کر دیا ہو یا جس کام کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ترغیب دی ہو لیکن اس کو خود نہ کیا ہو، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کام کی دوسروں کو دعوت وترغیب دینا بطورِ استحباب ہوگا نہ کہ بطورِ وجوب، اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو کرنا باعثِ ثواب ہے اور نہ کرنا باعثِ عِقاب نہیں ہے۔

وضو کرنے والے کے لیے یہ امر مستحب ہے کہ وہ ان اعضاء میں جو دو دو ہیں ان میں دائیں کو بائیں پر مقدم کرے، مثلاً دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ سے پہلے دھوئے اور دائیں پیر کو بائیں پیر سے پہلے دھوئے۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر کام میں تیمن (دائیں جانب کو مقدم رکھنا) کو پسند فرمایا کرتے تھے حتی کہ جوتا پہننے میں، کنگھی کرنے میں اور وضو کرنے میں بھی۔''[۲]

لیکن کانوں کا حکم یہ ہے کہ دونوں کانوں کا مسح ایک ساتھ کرے، اگر کسی کا ایک ہی ہاتھ ہو یا اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی بیماری ہو اور وہ دونوں کانوں کا مسح ایک ساتھ نہ کر سکے تو وہ ایک ہی ہاتھ سے پہلے دائیں کان کا مسح کرے پھر بائیں کا۔

بعض حضرات نے رخساروں کو کانوں کے حکم میں شامل کیا ہے۔

نیز وضو کرنے والے کے لیے مستحب ہے کہ چہرے اور ہاتھ پاؤں کو حدودِ معینہ سے زیادہ دھوئے، تا کہ قیامت کے روز وضو کے آثار سے ان اعضاء کی روشنی اس جگہ تک بڑھے، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری امت کے لوگوں کی پیشانی اور ہاتھ پاؤں وضو کے آثار سے سفید اور روشن ہوں گے، لہٰذا تم میں سے جو شخص اپنی سفیدی کو بڑھا سکتا

---

[۱] [معجم الطبرانی: ۱۹/۱۸۱ و میزان الاعتدال] [۲] [صحیح مسلم: ۱/۲۲۶]

ہو وہ بڑھائے۔"[۱]

وضو کے آداب:

(۱) اونچی جگہ پر بیٹھ کر وضو کرنا۔

(۲) وضو کے مستعمل پانی کے قطرے ٹپکنے سے کپڑوں کو بچا کر رکھنا۔

(۳) قبلہ رخ بیٹھ کر وضو کرنا۔

(۴) وضو کے دوران بلا ضرورت ایسی باتیں نہ کرے جو لوگوں سے کیا کرتے ہیں یعنی دنیا کی باتیں نہ کرے تاکہ وضو کا عمل دنیا کی آمیزش سے پاک رہے۔

(۵) وضو کے آخر تک تمام افعال میں یعنی ہر عضو کے دھونے یا مسح کرنے کے وقت نیت کو مستحضر رکھنا۔

(۶) کانوں کے مسح کے وقت مبالغہ کے لیے کانوں کے سوراخ میں گیلی چھنگلیا ڈالنا۔

(۷) کھلی انگوٹھی کو حرکت دینا، تاکہ اس کے نیچے کھال پر پانی اچھی طرح پہنچ جائے، اگر انگوٹھی تنگ ہو لیکن اس کے نیچے کی کھال تک پانی پہنچ جانے کا علم ہو تب بھی انگوٹھی کو حرکت دینا مستحب ہے ورنہ فرض ہے۔

(۸) جو شخص معذور نہ ہو اس کو وقت سے پہلے وضو کرنا، تاکہ عبادت و طاعت کی طرف سبقت پائی جائے۔

(۹) وضو کے بعد شہادتین کو ادا کرنا، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے جو شخص کامل وضو کرنے کے بعد یہ کہتا ہے: "أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔"[۲]

(۱۰) منہ پر پانی ڈالتے وقت زور سے ہاتھ نہ مارے یعنی پیشانی کے اوپر کے حصہ کی طرف سے نرمی کے ساتھ منہ پر پانی ڈالے، طمانچہ سا نہ مارے۔

(۱۱) اعضاءِ وضو کو رومال وغیرہ سے پونچھنا، اس کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے، صحیح یہ ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کرنا مروی ہے لیکن اس میں مبالغہ نہ کرے بلکہ اپنے اعضاء وضو پر اس کا اثر باقی رہنے دے۔

---

۱ [صحیح البخاری: ۱/۴۵] ۲ [صحیح مسلم: ۱/۲۰۹]

(۱۲) اپنی دونوں آنکھوں کے کونوں اور دونوں ٹخنوں اور دونوں ایڑیوں اور دونوں تلوؤں کے اندر اور انگوٹھی کے نیچے کی جگہ کی حفاظت کرنا، اسی طرح چہرے اور ہاتھ پاؤں کو حدودِ معینہ سے زیادہ دھونا، تاکہ قیامت کے دن وضو کے آثار سے ان اعضاء کی روشنی اس جگہ تک بڑھے۔

(۱۳) اگر روزہ دار نہ ہو تو وضو سے فارغ ہونے کے بعد وضو کا بچا ہوا سارا یا کچھ پانی آبِ زمزم کی طرح کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر پینا جیسا کہ حضرت نزّال بن سبرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ نے ظہر کی نماز ادا کی، پھر لوگوں کی ضروریات کے لیے بیٹھے، پھر جب عصر کی نماز کا وقت ہوا تو پانی کا ایک برتن لایا گیا، آپؓ نے اس سے ایک چلّو لیا، اس سے اپنا چہرہ، دونوں بازو، سر اور دونوں پاؤں دھوئے، پھر بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہو کر پیا، پھر فرمایا کہ لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور یہ اس شخص کا وضو ہے جس کو حدث لاحق نہ ہوا ہو۔''[1]

مکروہاتِ وضو:

مکروہ (ناپسندیدہ)، محبوب (پسندیدہ) کی ضد ہے۔ لہٰذا وضو کرنے والے کے لیے وہ چیزیں مکروہ ہوں گی جو آدابِ وضو کے خلاف ہوں، چند مکروہات کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) پانی میں اسراف (بے جا زیادہ استعمال) کرنا۔ اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا، وہ وضو کر رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے سعد! یہ کیسا اسراف ہے؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ کیا وضو میں بھی اسراف ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''ہاں! اگرچہ تم کسی جاری نہر (کے کنارے) پر ہو۔''[2]

(۲) نیا پانی لے کر تین دفعہ مسح کرنا۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ اپنی ''سنن'' میں فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تمام صحیح احادیث مسحِ رأس کے ایک مرتبہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔[3]

(۳) پانی اس قدر کم خرچ کرنا کہ مستحب ادا نہ ہو اور غَسل (دھونا) دھن (تیل) کی حد کے قریب ہو جائے۔ قطرے ٹپکنا ضروری ہیں، خواہ دو قطرے ہی کیوں نہ ہوں تاکہ غَسل کا معنی ثابت ہو ورنہ وضو بالکل نہیں ہوگا۔

(۴) بلا عذر کسی دوسرے شخص سے مدد لینا۔ عذر ہو تو مکروہ نہیں۔

---

[1] [سنن النسائی: ۱/۸۴] [2] [مسند احمد شرح البنا: ۲/۳] [3] [سنن ابی داؤد: ۲/۲۷]

اقسامِ وضو

وضو کی تین قسمیں ہیں: (۱) فرض (۲) واجب (۳) مستحب

فرض

(۱) ہر نماز کے لیے وضو فرض ہے جب کہ پہلے سے وضو نہ ہو، خواہ وہ نماز فرض ہو یا واجب یا سنت یا نفل ہو۔

(۲) نماز جنازہ کے لیے۔

(۳) سجدۂ تلاوت کے لیے۔

(۴) قرآنِ مجید کو بلا غلاف چھونے کے لیے، اگر چہ ایک آیت ہی ہو۔

واجب:

(۱) بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے باوضو ہونا واجب ہے۔ اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''بیت اللہ کا طواف نماز کی طرح ہے، مگر یہ کہ تم اس میں بات کر سکتے ہو، پس جو بات کرے اسے چاہیے کہ خیر ہی کی بات کرے۔''[۱]

پس اگر کسی شخص نے فرض طواف یعنی طوافِ زیارت بے وضو کیا تو اس پر دم (بکری ذبح کرنا) واجب ہوگا اور اگر جنابت کی حالت میں طواف کیا تو اس پر بُدنہ یعنی ایک سالم اونٹ یا سالم گائے ذبح کرنا واجب ہوگا۔

اور اگر واجب طواف مثلاً طوافِ وداع یا نفلی طواف بے وضو کیا تو اس پر صدقہ ءفطر (دو سیر گندم) واجب ہوگا اور اگر جنابت کی حالت میں کیا تو دم (بکری ذبح کرنا) واجب ہوگا۔

مستحب:

مستحب وضو کے مواقع بکثرت ہیں، ان میں سے مشہور یہ ہیں:

(۱) طہارت کی حالت میں سونے کے لیے جیسا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب بستر پر آؤ تو نماز کی طرح وضو کرو۔''[۲]

(۲) سو کر اٹھنے کے بعد وضو کرنا، تا کہ فوراً طہارت حاصل ہو جائے، جیسا کہ فرمانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے: ''بے شک وضو اسی شخص پر واجب ہے جو اضطجاع کی حالت میں سو جائے۔''[۳]

---

[۱] [المستدرک: ۱/۴۵۹] [۲] [صحیح مسلم: ۴/۲۰۸۱] [۳] [سنن الترمذی: ۱/۵۱]

(۳) وضو کی محافظت کے لیے یعنی ہر وقت باوضو رہنے کے لیے نیا وضو کرنا، جیسا کہ آنحضرتﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ ”تم جنت میں مجھ سے سبقت کس عمل کی وجہ سے لے گئے؟ میں گزشتہ شب جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے تمہارے چلنے کی آواز سنی“! حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! میں نے جب بھی اذان دی تو دو رکعت نماز ادا کر لی اور جب بھی میں بے وضو ہوا تو میں نے فوراً وضو کر لیا، آنحضور ﷺ نے فرمایا: ”لھذا“ یعنی اسی عمل کی برکت سے تم سبقت لے گئے۔“[1]

(۴) وضو کے ہوتے ہوئے (کسی عبادت کے لئے) نیا وضو کرنا۔

(۵) غیبت کرنے کے بعد۔

(۶) جھوٹ بولنے کے بعد۔

(۷) چغلی کرنے کے بعد۔

(۸) ہر گناہ کے بعد خواہ صغیرہ ہو یا کبیرہ جیسا کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا ہے: ”جو شخص وضو پر وضو کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے دس نیکیاں لکھ دیتے ہیں۔“[2]

(۹) بُرا شعر پڑھنے کے بعد، جیسا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ”جو آدمی گناہ کرے، پھر اٹھے اور وضو کرے پھر نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی:

”وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ“

[آل عمران:۱۳۵]

”اور جو لوگ ایسے ہیں کہ جب کوئی برا کام ان سے سرزد ہو جائے یا اپنی جانوں پر زیادتی کرتے ہیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں۔“

(۱۰) میت کو غسل دینے کے لیے۔

(۱۱) جنازہ اٹھانے کے لیے۔ جیسا کہ فرمانِ رسالت مآب ﷺ ہے: ”جو شخص میت کو غسل دے اس کو غسل کر لینا چاہئے اور جو شخص اس کا جنازہ اٹھائے اس کو وضو کر لینا چاہئے۔“[3]

(۱۲) وضو ہوتے ہوئے ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ”نبی کریم ﷺ ہر نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے خواہ باوضو ہوتے یا نہ۔“[4]

---

[1] [رواہ ابن خزیمۃ، الترغیب والترھیب:۱/۱۶۳] [2] [سنن ابی داؤد:۱/۱۶]

[3] [مسند احمد بشرح البناء:۲/۱۴۵] [4] [سنن الترمذی:۱/۴۰]

(۱۳) غسلِ جنابت سے پہلے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غسلِ جنابت کا ارادہ فرماتے تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اس کو دھوتے، پھر شرمگاہ دھوتے اور نماز جیسا وضو فرماتے، پھر پانی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالوں میں سرایت کرتا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے سر مبارک پر تین بار پانی ڈالتے۔'' [1]

(۱۴) جنبی شخص کو غسل کرنے سے پہلے کھانے پینے، سونے یا دوبارہ جماع کرنے کے لیے وضو کرنا۔ جنبی کے لیے غسل سے پہلے کھانے پینے کے لیے وضو کرنے سے مراد لغوی وضو ہے یعنی اپنے ہاتھ اور منہ کو دھو لینا اور دوبارہ جماع کرنے یا سونے کے لیے وضو کرنے سے مراد شرعی وضو ہے یعنی نماز کے وضو کی طرح وضو کرنا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کھانے یا پینے یا سونے کا ارادہ فرماتے تو وضو فرما لیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مراد یہ ہے کہ جب آپ حالتِ جنابت میں ہوتے تو ایسا کرتے۔'' [2]

(۱۵) جماع سے پہلے وضو کرنا جیسا کہ حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ''ایک دن نبی کریمؐ نے اپنی ازواجِ مطہرات کے پاس شب باشی فرمائی تو ہر ایک کے پاس غسل فرمایا۔ (راوی کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ نے ایک ہی غسل کیوں نہیں فرما لیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ زیادہ پاکیزہ، زیادہ عمدہ اور زیادہ پاکی والا ہے۔'' اسی طرح حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنی اہلیہ کے پاس آئے (یعنی ہمبستر ہو) اور پھر دوبارہ اس کے پاس آنا چاہے تو ان دونوں کے درمیان وضو کر لے۔'' [3]

(۱۶) جب کسی کو غصہ آجائے تو اس وقت وضو کرنا۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''بے شک غصہ شیطان کے اثر سے ہوتا ہے اور شیطان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور آگ کو پانی ہی بجھا سکتا ہے۔ لہٰذا جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو اس کو وضو کر لینا چاہیے۔'' [4]

(۱۷) علمِ حدیث پڑھنے اور اس کی روایت کرنے کے لیے۔

(۱۸) علومِ شرعیہ کے سیکھنے اور سکھانے کے لیے۔

(۱۹) اذان کے لیے۔

(۲۰) اقامت کے لیے۔

---

[1] [سنن الترمذی: ۱/۷۰] [2] [سنن ابی داود: ۱/۵۷]

[3] [سنن ابی داود: ۱/۵۶] [4] [جامع الترمذی: ۱۵/۵۴]

(۲۱) خطبہ کے لیے۔ اگرچہ نکاح کا خطبہ ہو۔

(۲۲) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ ءاطہر کی زیارت کے لیے۔

(۲۳) مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں داخل ہونے کے لیے۔

(۲۴) وقوفِ عرفات کے لیے۔

(۲۵) صفاومروہ کی سعی کے لیے۔

(۲۶) اختلافِ فقہاء سے بچنے کے لیے۔ جیسے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد۔ جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اونٹ کا گوشت کھا کر وضو کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو کھا کر وضو کرو۔''[1]

(۲۷) اسی طرح اختلافِ فقہاء سے بچنے کے لیے ہر اس حالت میں وضو کرنا مستحب ہے جس میں ہمارے نزدیک وضو نہیں ٹوٹتا اور دوسرے کسی امام کے نزدیک وضو ٹوٹ جاتا ہے مثلاً کسی قابلِ شہوت غیر محرم عورت کو چھونے کے بعد۔ اسی طرح اپنی شرمگاہ کو ہاتھ سے چھونے کے بعد وضو کرنا مستحب ہے تا کہ اس کی عبادت بالاتفاق صحیح ادا ہو۔ جیسا کہ حضرت بسرہ بنتِ صفوان رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: ''جو شخص اپنی شرمگاہ کو چھوئے تو جب تک وضو نہ کرے نماز نہ پڑھے۔''[2]

وضو میں شک ہو جانے کے مسائل

اگر وضو کے درمیان میں کسی عضو کے دھونے یا مسح کرنے میں شک ہوا کہ ایسا کیا ہے یا نہیں اور یہ شک اس کو پہلی دفعہ ہوا تو اس عضو کو دھولے یا مسح کر لے یعنی دھونے والے عضو کو دھولے اور مسح والے عضو کا مسح کر لے، اور اگر اکثر شک ہوتا ہے اور شک کی عادت ہے تو شک کی طرف التفات نہ کرے اور شک والے عضو کے دھونے یا مسح کرنے کا اعادہ نہ کرے اور اگر وضو سے فارغ ہونے کے بعد شک ہوا تو اس کی طرف التفات نہ کرے، خواہ پہلی دفعہ شک ہو یا اس کو شک کی عادت ہو، جب تک اس کو اس عضو کے نہ دھونے کا یقین نہ ہو جائے وہ شخص باوضو ہے۔ اس کو اس عضو کا دوبارہ دھونا فرض نہیں ہے اور اگر یقین کے ساتھ یاد آئے (کہ نہیں دھویا تھا) تو دھونا فرض ہے۔

---

[1] [سنن ابی داود:۴/۲۴۹] [2] [سنن ابی داود:۱/۷۰]

نواقضِ وضو:

(۱) جو چیز سبیلین یعنی مرد وعورت کے پاخانہ کے مقام سے اور مرد کے ذکر اور عورت کی فرج سے نکلے وہ مطلقاً وضو کو توڑنے والی ہے، پاخانہ خواہ تھوڑا نکلے یا بہت، اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہی حکم پیشاب کا ہے۔ اور خروج (نکلنا) کا تحقق مخرج کے سرے پر تری کے ظاہر ہونے سے ہو جاتا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِنَ الْغَآئِطِ'' [النساء: ۴۳] آیت ہذا میں مذکور لفظ ''الغائط'' کا معنی ہے کشادہ نشیبی زمین، یعنی وہ جگہ جہاں انسان لوگوں کی نظروں سے چھپنے کے لیے قضاء حاجت کے ارادہ کے وقت جاتا ہے۔ اس آیت سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کی عدم دستیابی کے وقت قضاء حاجت کرنے والے پر تیمّم کا وجوب مرتب کیا ہے اور قضاء حاجت، خروجِ نجاست کو لازم ہے تو یہ حدث سے کنایہ ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ حدث، وجوبِ تیمّم کا سبب ہے۔ جب یہ وجوب تیمّم میں ثابت ہوگا تو وضو میں بھی ثابت ہوگا، کیونکہ تیمّم، وضو کا بدل ہے، بدل سبب میں اپنے اصل کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس بات کی دلیل کہ سبیلین سے جو چیز بھی نکلے خواہ وہ عادت کے طور پر نکلے جیسے پاخانہ، پیشاب، ریح، منی، مذی، ودی، حیض ونفاس کا خون، یا خلافِ عادت نکلے جیسے استحاضہ کا خون، کیڑا، کنکری وغیرہ، سب سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''الوضوء مما خرج و ليس مما دخل'' یعنی جو چیز باہر نکلے اس سے وضو لازم ہوگا اور جو چیز اندر داخل ہو اس سے لازم نہیں ہوگا۔''[۱] نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے موقوفاً روایت ہے کہ جو چیز نکلے اس سے وضو لازم ہوگا اور جو داخل ہو اس سے نہیں ہوگا اور روزہ اس چیز سے ٹوٹتا ہے جو اندر (پیٹ میں) داخل ہو اور باہر نکلنے سے نہیں ٹوٹتا۔'' نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہ قول مروی ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مستحاضہ عورت سے فرمایا: ''تم ہر نماز کے لیے وضو کر لیا کرو، یہاں تک کہ دوسرا وقت آجائے۔'' یہ چیز (استحاضہ) خلاف عادت نکلنے والی نجاست ہے، اس پر کیڑے اور کنکری وغیرہ کو اور غیر سبیلین سے نکلنے والی نجاست کو قیاس کر لیا جائے گا۔

(۲) بچے کی پیدائش کے وقت کسی عورت کو نفاس کا خون نظر نہ آنا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمدؒ

---

۱ [سنن البیہقی: ۱/۱۱۶]

کے قول کے مطابق وہ عورت نفساء (نفاس والی) میں شمار نہیں ہوگی، یہی صحیح ہے۔ کیونکہ نفاس کا تعلق خون کے ساتھ ہے جو کہ پایا نہیں گیا اور رطوبت نکلنے کی وجہ سے اس پر وضو واجب ہوگا اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس پر احتیاطاً غسل واجب ہوگا، کیونکہ بظاہر یعنی غالب طور پر وہ تھوڑے خون سے خالی نہیں ہوگی۔

(۳) خون اور پیپ جب نکل کر جسم کے اس حصے تک بہہ جائے جس کو پاک کرنے کا حکم ہے یعنی وہ بہہ کر بدن یا کپڑے کے اس حصے تک پہنچ جائے جس کا دھونا یا مسح کرنا واجب یا مستحب ہے۔ آبلے سے نکلنے والا صاف پانی ناقضِ وضو نہیں ہے۔

(۴) اگر ناک میں انگلی ڈالی اور انگلی پر خون نظر آیا تو اگر خون ناک کے قصبہ (بانسہ) سے اترا ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر اس سے نہیں اترا تو نہیں ٹوٹے گا۔

(۵) اگر کوئی چیز چبائی اور اس چیز پر خون کا اثر پایا یا مسواک کی اور اس پر خون کا اثر پایا تو جب تک وہ نہ بہے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۶) اگر لکڑی سے خلال کیا اور لکڑی پر خون کا اثر پایا تو جب تک وہ نہ بہے اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ تھوک پر غالب ہو۔

(۷) اگر کسی شخص نے ناک صاف کی اور اس سے جمے ہوئے خون کا لوتھڑا سا نکلا تو اس کا وضو نہیں ٹوٹا، کیونکہ یہ منجمد خون ہے۔ اگر ناک صاف کرنے سے بہنے والے خون کا قطرہ نکلا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

(۸) جب زخم کے سرے سے خون بہہ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر نہ بہے تو نہیں ٹوٹے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب خون زخم کے سرے پر آجائے اور اوپر کو اٹھے اور وہ زخم کے سرے سے زیادہ ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا، لیکن پہلا قول صحیح ہے۔

(۹) اگر زخم سے تھوڑا سا خون نکلا اور زخم کے سرے پر ظاہر ہوا، اس نے روئی وغیرہ سے پونچھ دیا اور اس کو خشک کر دیا، پھر خون نکلا اور اس نے پھر ایسا ہی کیا اور چند بار اسی طرح کیا تو اس کو جمع کیا جائے گا اور دیکھا جائے گا کہ اگر نہ پونچھتا تو وہ بہہ جاتا یا نہیں، پس اگر بہہ جاتا تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔

(۱۰) اگر زخم پر کوئی چیز باندھی اور وہ چیز تر ہوگئی تو اگر تری خارج تک سرایت کر گئی ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔ اگر باندھنے والی چیز دو طاق والی ہو اور ایک کی تری دوسرے میں سرایت کر جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔

(۱۱) اگر کانوں سے پیپ وغیرہ نکلے تو اگر اس کے نکلنے کے وقت درد محسوس ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔

(۱۲) اگر دانتوں سے تھوک کے ساتھ خون نکلے تو اگر خون غالب ہے یا برابر ہے تو وضو ٹوٹ جائے گا اور اگر خون مغلوب اور تھوک غالب ہے تو نہیں ٹوٹے گا۔ اسی پر یہ مسئلہ بھی مبنی ہے کہ جب روزہ دار تھوک کو نگل لے اور اس میں خون ہو تو اگر خون غالب ہو یا دونوں برابر ہوں تو روزہ ٹوٹ جائے گا ورنہ نہیں۔

(۱۳) اگر خون زخم سے نکلے اور زخم والی جگہ سے متجاوز نہ ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا لیکن کیا وہ اتنی مقدار کے نکلنے سے پاک ہوگا یا ناپاک؟ صاحب ہدایہؒ فرماتے ہیں کہ "**مالا یکون حدثا لایکون نجسًا**" جو چیز موجبِ حدث نہ ہو وہ موجب نجس بھی نہیں ہوگی۔ امام ابو یوسفؒ سے یہی مروی ہے اور یہی صحیح ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ وہ ناپاک ہوگا۔ دونوں اقوال میں تطبیق یہ ہے کہ جامد اشیاء جیسے کپڑے، بدن وغیرہ ان میں ایسا خون اگر لگ جائے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ ہوگا کہ وہ پاک ہے اور اگر مائع چیزوں میں لگ جائے جیسے پانی وغیرہ تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ ہوگا اور قے جب منہ بھر کی مقدار نہ ہو تو اس کا حکم بھی اس اختلاف کے مطابق ہے۔

(۱۴) خون اور پیپ جب بہہ کر ایسی جگہ پہنچ جائے جس کو پاک کرنے کا حکم نہیں ہے تو اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۱۵) اگر کسی کی آنکھ کے زخم سے خون نکل کر آنکھ کے ایک گوشے سے بہہ کر دوسرے گوشے تک چلا جائے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا، اس لیے کہ آنکھ کے اندر کا دھونا وضو یا غسل میں فرض یا واجب یا مستحب نہیں ہے۔

(۱۶) اسی طرح اگر زخم کے اندر خون ایک جانب سے دوسری جانب چلا جائے تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۱۷) اسی طرح اگر پیشاب آلہ تناسل کے قصبہ (بانسہ) تک آجائے لیکن خروج نہ ہو تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۱۸) اگر خون ناک کی نرم جگہ تک آجائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ اس لیے کہ ناک کے نرم حصہ پر تطہیر کا حکم استحباباً لگتا ہے۔ دمِ سائل کے ناقضِ وضو ہونے پر یہ حدیث دلیل ہے: "**الوضوء من کل دمٍ سائل**" "ہر بہنے والے خون سے وضو لازم ہو جاتا ہے۔"[1]

---

[1] [رواہ ابن عدی فی الکامل]

(۱۹) اگر باوضو شخص کو منہ بھر کر قے ہو جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ یہ حکم اس وقت ہے جب کہ وہ قے صفرا یا سودا یا بستہ خون یا کھانا یا پانی کی ہو۔ اور معدے میں پہنچ جائے، پھر معدہ میں ٹھہرے یا نہ ٹھہرے۔ اس سے وضو ٹوٹ جائے گا کیونکہ وہ پیٹ کی نجاست کے ساتھ مل جانے کے باعث نجسِ مغلظ ہے۔

(۲۰) اگر معدے میں پہنچنے سے پہلے فوراً قے ہو گئی تو وضو نہیں ٹوٹے گا۔

(۲۱) بلغم کی قے سے بالاتفاق وضو نہیں ٹوٹتا، خواہ منہ بھر کر ہو۔

(۲۲) اگر دمِ سائل کی قے کی ہو اور وہ منہ بھر کی مقدار سے کم ہی کیوں نہ ہو اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔ اس کی دلیل حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قے آئی، آپ نے روزہ توڑا اور وضو کیا۔[۱] نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کسی کو نماز میں قے آئے یا جی متلائے تو اس کو چاہیے کہ جائے اور وضو کرے، پھر اپنی نماز پر بناء کرے جب تک کہ بات نہ کرے۔" ابن جریج رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اگر بات کرے تو از سر نو نماز پڑھے۔"[۲]

(۲۳) اگر تھوڑی تھوڑی قے اس طرح سے آئے کہ اگر سب کو جمع کیا جائے تو منہ بھر ہو جائے تو اگر ان سب کا سبب ایک ہی ہو تو وضو ٹوٹ جائے گا، ورنہ نہیں ٹوٹے گا۔ سبب کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ متلی ہو کر قے آئی اور وہ متلی دور نہیں ہوئی بلکہ اسی متلی کی حالت میں دوبارہ قے آئی تو دونوں مرتبہ کی قے کا سبب ایک ہے۔ اور اگر پہلی مرتبہ کی قے کی متلی دور ہونے کے بعد دوبارہ قے آئی تو سبب مختلف ہے۔ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور یہی اصح ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجلس کے متحد ہونے کا اعتبار ہوگا۔ منہ بھر ہونے کی حد میں اختلاف ہے، صحیح قول یہ ہے کہ اس کو روکنے پر قادر نہ ہو۔ لیکن اس کی اصح حد یہ ہے کہ اس کو دقت اور مشقت کے بغیر نہ روک سکے۔

(۲۴) نکسیر بھی ناقضِ وضو ہے، اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو جب نکسیر آئی تھی تو انہوں نے نماز کو چھوڑ کر وضو کیا، پھر واپس آ کر سابقہ نماز پر بناء کی اور (اس دوران) کسی سے بات نہیں کی۔ حضرت یزید اللیثی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ انہیں نکسیر آئی وہ نماز میں تھے، پس وہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں آئے، وضو کے لیے پانی لایا گیا، آپ نے وضو کیا، پھر واپس آ کر پڑھی ہوئی نماز پر بناء فرمائی۔[۳]

---

۱ [سنن الترمذی: ۱/۵۹] ۲ [سنن الدارقطنی: ۱/۱۵۳] ۳ [الموطا: ۱/۴۷]

(۲۵) لیٹ کر یا ٹیک لگا کر سونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے خواہ پشت کے بل یا پیٹ کے بل یا کروٹ پر لیٹ کر سوئے یا تکیہ یا کہنی یا اور کسی چیز پر اس طرح سے ٹیک لگا کر سوئے کہ اگر اس چیز کو ہٹالیا جائے تو سونے والا شخص گر پڑے اور سرین زمین سے، جدا ہو جائے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اس کی دلیل آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''آنکھیں مقعد کے لیے گویا بند (گرہ) ہیں پس جو سو جائے تو اس کو وضو کر لینا چاہیئے۔''[۱]

(۲۶) اگر کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا یا رکوع کرتا ہوا یا سجدہ کرتا ہوا سو جائے تو کسی صورت میں وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''احتباء کی حالت میں سونے والے پر وضو نہیں ہے اور نہ ہی کھڑے سو جانے والے پر وضو ہے اور نہ ہی سجدہ کی حالت میں سو جانے والے پر وضو ہے اور نہ ہی بیٹھے بیٹھے سو جانے والے پر وضو ہے، جب تک کہ وہ لیٹ نہ جائے، جب لیٹ جائے تو وضو کرے۔''[۲]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا! وضو اس شخص پر لازم ہے جو پہلو پر لیٹ کر سو جائے''[۳]

(۲۷) بیہوشی اور جنون خواہ قلیل ہو یا کثیر اس سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ بیہوشی ایک ایسا مرض ہے جس میں عقل مغلوب ہو جاتی ہے اور قوی ضعیف ہو جاتے ہیں۔ لیکن عقل زائل نہیں ہوتی اور جنون ایسا مرض ہے جس میں عقل سلب ہو جاتی ہے، عقل زائل ہو جاتی ہے لیکن قوت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بیہوشی اور جنون میں نیند سے زیادہ سلبِ اختیار پایا جاتا ہے اس لیے اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

نیز حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا ہے کہ مرضِ وفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا نہیں یارسول اللہ! لوگ تو آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے لیے بڑے برتن میں پانی رکھ دو'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غسل فرمایا پھر جانے لگے تو بیہوشی طاری ہوگئی، جب افاقہ ہوا تو پوچھا کہ کیا لوگ نماز پڑھ چکے ہیں؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا نہیں یارسول اللہ! وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا (اچھا) ''میرے لیے بڑے برتن میں پانی رکھ دو'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسا ہی کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غسل فرمایا.......... (الحدیث) احمد بن یونس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیہوشی کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غسل فرمانا استحباب کے لیے تھا، ورنہ وضو بھی کافی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

---

[۱] [سنن ابی داؤد: ۱/۵۲] [۲] [سنن البیہقی: ۱/۱۲۳] [۳] [سنن ابی داؤد: ۱/۵۲]

(۲۸) رکوع سجدہ والی نماز میں قہقہہ لگانا ناقضِ وضو ہے، قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ناقضِ وضو نہ ہو، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ یہ نکلنے والی نجاست نہیں ہے، اور اسی لیے یہ (قہقہہ) نمازِ جنازہ میں ناقضِ وضو نہیں ہے، اسی طرح سجدۂ تلاوت اور نماز سے باہر ناقضِ وضو نہیں ہے۔ اس کے ناقضِ وضو ہونے کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت ابو العالیہؒ نے نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک نابینا آدمی کنوئیں کے پاس سے گزرا تو بیہوش ہو کر اس میں گر پڑا اس پر کچھ لوگ ہنس پڑے۔ (نماز کے بعد) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ جو ہنسا ہے وہ وضو اور نماز کا اعادہ کرے۔'' [1]

اسی طرح امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے منصور بن زاذانؒ سے، انہوں نے حسنؒ سے انہوں نے معبد بن ابی معبد الخزاعیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ (ایک مرتبہ) حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک نابینا، جو نماز پڑھنا چاہتا تھا، آیا اور گڑھے میں گر گیا، اس پر لوگ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: ''تم میں سے جس نے قہقہہ لگایا ہے وہ وضو اور نماز (دونوں) کا اعادہ کرے۔'' [2] اور یہ معبد بن معبد الخزاعیؓ صحابی ہیں، جیسا کہ ابن مندہ اور ابونعیم نے ان کو صحابہ رضی اللہ عنہم میں ذکر کیا ہے اور ان کی ایک روایت بھی نقل کی ہے۔ اور یہ اثر صلوٰۃِ مطلقہ میں وارد ہوا ہے لہٰذا اسی پر انحصار کیا جائے گا۔ قہقہہ وہ ہنسی ہے جس کو ہنسنے والا اور اس کے پاس کے لوگ سن لیں۔ یہ (رکوع و سجود والی) نماز اور وضو دونوں کو توڑتا ہے اور ایسی ہنسی جس کو ہنسنے والا خود سنے اور پاس والے لوگ نہ سنیں اس کو ضحک کہتے ہیں، اس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، لیکن وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور ایسی ہنسی جس کو نہ خود سنے اور نہ پاس والے لوگ سنیں بلکہ صرف دانت ظاہر ہوں اس کو تبسم کہتے ہیں، اس سے نماز اور وضو دونوں ہی نہیں ٹوٹتے۔ اس کی دلیل دار قطنی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ ضحک میں وضو نہیں ہے، ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ ان سے ایک آدمی کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز میں ضحک کرتا ہے تو فرمایا نماز کو لوٹائے گا لیکن وضو کو نہیں لوٹائے گا۔ [3]

(۲۹) مباشرتِ فاحشہ یعنی مرد و عورت کی شرمگاہوں کا شہوت کے ساتھ ملنا بھی ناقضِ وضو ہے۔ اس کی دلیل حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا: مجھے بتائیے کہ ایک آدمی کسی عورت سے ملتا ہے، دونوں کے درمیان کوئی پہچان نہیں ہے، خاوند اپنی بیوی سے جو کچھ کرتا ہے اس نے بھی وہ سب کچھ کیا مگر اس سے

---

[1] [سنن الدار قطنی: ۱/۱۶۹] [2] [سنن الدار قطنی: ۱/۱۶۷] [3] [سنن الدار قطنی: ۱/۱۷۲]

جماع نہیں کیا تو اس کا کیا حکم ہے؟" اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفِیِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ......"
[هود: ۱۱۴] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کو حکم دیا کہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔[1]

---

[1] [سنن الترمذی: ۴/۳۵۴]

﴿باب الغسل﴾

غُسل لغت کے اعتبار سے غین کے ضمہ (پیش) کے ساتھ اغتسال کا اسم ہے اور وہ تمام جسم کے دھونے کو کہتے ہیں، اور یہ لفظ لغت میں اس پانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس سے غسل کیا جائے، لیکن امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ غُسل لغت میں غین کے فتحہ (زبر) اور ضمہ دونوں کے ساتھ صحیح ہے اور غین کے فتحہ کے ساتھ زیادہ فصیح ومشہور ہے اور ضمہ کے ساتھ فقہا یا ان کی اکثریت میں مستعمل ہے اور اصطلاحِ شریعت میں پہلے لغوی معنی یعنی تمام بدن کا دھونا مراد ہے۔[۱]

فرائضِ غسل

غُسل میں تین فرض ہیں، وہ یہ ہیں: (۱) کلی کرنا (۲) ناک میں پانی ڈالنا (۳) سارے بدن کو ایک بار دھونا۔

غسل اور وضو میں وجہ فرق یہ ہے کہ وضو میں چہرہ دھونے کا حکم دیا گیا ہے اور چہرہ (یعنی مواجہت) سامنے نظر آنے والی چیز کو کہتے ہیں لہٰذا یہ مواجہت ناک اور منہ کے اندر کے حصے کو دھونے سے ثابت نہ ہوگی جب کہ غسل میں تمام بدن کی تطہیر کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: ”وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا [المائدہ:۶] لہٰذا تمام بدن حتی الامکان دھونا واجب ہوگا۔ آنکھوں کے اندر کا حصہ دھونا واجب نہیں ہوگا جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے، لیکن ناک اور منہ کے اندر کے حصوں کا دھونا واجب ہوگا کیونکہ ان کا دھونا ممکن ہے اور اس میں کوئی ضرر بھی نہیں، لہٰذا یہ واجب ہوگا۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس کی تاکید آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص بال برابر جگہ بھی غسلِ جنابت میں چھوڑ دے، اس کو نہ دھوئے تو اسے دوزخ کا عذاب ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، اسی لیے میں اپنے سر کا دشمن ہوگیا، اسی لیے میں اپنے سر کا دشمن ہوگیا۔ تین بار فرمایا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپنے بالوں کو کاٹتے تھے۔“[۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں نے نبی کریمؐ کے لیے غسل کا پانی رکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کو دو یا تین مرتبہ دھویا، پھر پانی اپنے بائیں

---

[۱] [البحر الرائق، ردالمحتار، مراقی الفلاح] [۲] [سنن ابی داؤد: ۱/۶۵]

ہاتھ میں پانی لے کر شرمگاہ کو دھویا، پھر ہاتھ کو زمین پر رگڑا، پھر کلی کی اور ناک میں پانی ڈالا اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کو دھویا، پھر سارے جسم پر پانی بہایا، پھر اس جگہ سے ہٹ کر اپنے قدموں کو دھویا۔''[1]

غسلِ فرض میں پانی سارے جسم تک بلا حرج پہنچانا واجب ہے، جہاں تک پہنچانا ممکن ہو۔ عورت کے لیے فرجِ خارج تک پانی پہنچانا واجب ہے نہ کہ فرجِ داخل تک۔ اسی طرح جو چیزیں جسم تک پانی کے پہنچنے سے مانع ہوں اس کا دور کرنا ضروری ہے، جیسے نیل پالش وغیرہ۔

اور قلفہ کے اندر کا دھونا فرض ہے، اس لیے کہ اس میں کوئی حرج اور مشقت نہیں ہے، اگر مشقت ہو تو پھر اس کا مکلّف نہیں ہے۔ ناف کے اندر کا دھونا بھی فرض ہے، اس لیے کہ وہ جسم کا خارجی حصہ ہے، اور اس کے دھونے میں کوئی حرج (تنگی) بھی نہیں ہے۔ کان کے سوراخ کا جب کہ ملا ہوا نہ ہو، دھونا فرض ہے کیونکہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مرد کو گوندھے ہوئے بال کے اندر کا دھونا فرض ہے اور ان کو ہر حال میں کھولنا ضروری ہے، کیونکہ یہ اس کے لیے زینت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے کھولنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، عورت کو گوندھے ہوئے بال کا کھولنا فرض نہیں ہے بشرطیکہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے۔ اس کی دلیل حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں ایک ایسی عورت ہو کہ بالوں کو اپنے سر پر سختی سے باندھتی ہوں، کیا غسلِ جنابت کے وقت ان کو کھولا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''پانی کے تین لپ اس پر ڈال لینا کافی ہیں، پھر سارے جسم پر پانی بہادو، تم پاک ہو جاؤ گی۔'' ایک روایت میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر لپ بھر پانی ڈالنے کے وقت اپنی مینڈھیوں کو دبالیا کرو۔'' نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''مرد کو اپنے سر کے بال کھول لینے چاہئیں اور اس کو دھونا چاہیئے کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے، البتہ عورت پر واجب نہیں کہ وہ بالوں کو کھولے۔'' اگر عورت کے بال چپکے ہوئے ہوں یا بہت گھنے ہوں کہ پانی بالوں کی جڑوں تک نہ پہنچ پائے تو بالوں کا کھولنا واجب ہے۔[2]

ڈاڑھی کے بال اور نیچے کی کھال کا دھونا فرض ہے، خواہ وہ گنجان ہی ہو، اسی طرح مونچھ اور ابرو کے نیچے کی کھال کا دھونا بھی فرض ہے۔

غُسل کی سنتیں

(۱) بسم اللہ سے غسل کی ابتداء کرنا۔ اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''جب کوئی شخص اپنے کپڑے اتارے تو جنات اور انسانوں کی آنکھوں کے درمیان پردہ کرنے والی

---

[1] [صحیح البخاری:۱/۷۱] [2] [سنن ابی داؤد:۱/۶۵]

چیز بسم اللہ الخ کہنا چاہیے۔''[1]

(۲) نیت کرنا! تا کہ اس کا فعل عبادت بن جائے اور اس پر ثواب حاصل ہو۔

(۳) اگر بدن پر نجاست لگی ہو تو اس کو شروع میں الگ سے دھونا۔ اس کی دلیل حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب غسل کا ارادہ فرماتے تو پہلے دائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر اس کو دھوتے، پھر جسم پر لگی ہوئی نجاست پر دائیں ہاتھ سے پانی ڈال کر اس کو بائیں ہاتھ سے دھوتے۔[2]

(۴) دونوں ہاتھوں کو کلائیوں تک دھونا۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ''نبی کریم ﷺ جب غسلِ جنابت فرماتے تو پہلے اپنے ہاتھوں کو دھوتے، پھر نماز کی طرح وضو کرتے۔''[3]

(۵) شرمگاہ کو دھونا، اگر چہ اس پر نجاست نہ لگی ہو تا کہ اس کو اس بات کا خوب اطمینان ہو جائے کہ پانی شرمگاہ سے ملے ہوئے حصے تک پہنچ گیا ہے۔ اس کی دلیل حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ غسل جنابت فرماتے تو اپنے ہاتھوں کو دو یا تین مرتبہ دھوتے، پھر برتن میں ہاتھ ڈال کر (پانی) شرمگاہ پر ڈالتے اور اسے بائیں ہاتھ سے دھوتے۔[4]

(۶) نماز کی طرح وضو کرنا، پس اعضاءِ مغسولہ کو تین مرتبہ دھوئے اور سر کا مسح بھی کرے۔ اگر ایسی جگہ پر غسل کر رہا ہو جہاں پانی جمع ہو جاتا ہو تو پیروں کو بعد میں دھوئے۔ اس لیے کہ اس کو پاؤں دوبارہ دھونا پڑیں گے۔ اور اگر ایسی جگہ ہو جہاں پانی جمع نہ ہوتا ہو تو پھر پیروں کو اسی وقت دھولے۔

(۷) بدن پر تین مرتبہ اس طرح پانی ڈالنا کہ ہر مرتبہ پانی سارے جسم پر پہنچ جائے۔ جیسا کہ حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں غسل کے بارے میں بحث کرنے لگے، بعض کہنے لگے کہ ہم تو اس طرح سر دھوئیں گے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو اپنے سر پر تین چلو پانی ڈالوں گا۔''[5]

اگر ہر مرتبہ سارے جسم پر پانی نہ پہنچے تو تثلیث کی سنت ادا نہ ہوگی۔ اگر غسل کرنے والا جاری پانی میں، یا جو جاری پانی کے حکم میں ہے اس میں غوطہ لگائے اور وضو اور غسل کرنے کی بقدر اس میں ٹھہرا رہے تو اس نے سنت کو مکمل کر لیا۔ اس لیے کہ جس طرح تثلیث کی صورت میں مبالغہ حاصل ہوتا ہے اس طریقے سے بھی مبالغہ حاصل ہو جاتا ہے۔ غسل کرنے والا جب جسم پر پانی ڈالنا شروع

---

[1] [المعجم الاوسط للطبرانی: ۳/۲۵۲۵] [2] [صحیح مسلم: ۱/۲۵۹] [3] [صحیح البخاری: ۱/۶۹]
[4] [صحیح مسلم: ۱/۲۵۴] [5] [صحیح مسلم: ۱/۲۵۸]

کرے گا تو ابتدا سر سے کرے گا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے عمل سے یہ ثابت ہے۔ سر کے بعد پہلے دائیں پھر بائیں کندھے پر پانی ڈالے، کیونکہ تیمن مستحب ہے۔ پھر دائیں ٹانگ، پھر بائیں ٹانگ پر پانی ڈالے، پہلی بار جسم کے تمام اعضاء کو خوب ملے اور باقی دو مرتبہ پانی کو سارے بدن پر بہائے۔ اعضاء کو ملنا سنت ہے، لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ واجب ہے، اس لیے کہ (غسل کے حکم میں) صیغہ (مبالغہ کے ساتھ) ''اِطَّهَّرُوا'' آیا ہے۔

غسل کے آداب

غُسل کے آداب بھی وضو کے آداب کی طرح ہیں، فرق یہ ہے کہ غسل کرنے والا غُسل کی حالت میں قبلے کی طرف رخ نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ زیادہ تر برہنہ ہوتا ہے۔ اور اگر لباس پہنے ہوئے ہو تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔ غسل کے چند آداب یہ ہیں:

(۱) ایسی جگہ پر غسل کرنا مستحب ہے جہاں اس کو کوئی ایسا شخص نہ دیکھ رہا ہو جس کے لیے اس کی شرمگاہ کو دیکھنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ غسل کی حالت میں یا کپڑے پہننے کے وقت ستر کے ظاہر ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ غسل کے لیے پانی رکھو، چنانچہ انہوں نے غسل کے لیے پانی رکھ دیا، پھر آپ ﷺ نے ان کو کپڑا دیا اور فرمایا کہ ''میرے لیے پردہ کرو اور اپنی پشت کو مجھ سے پھیر لو۔''[۱] نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بے شک اللہ تعالیٰ حیاداری اور پردہ داری کو پسند کرتے ہیں۔''[۲]

جب مردوں سے پردے کی صورت نہ ہو تو ایسی صورت اختیار کرے جس میں زیادہ سے زیادہ ستر ہو سکے۔ عورتیں بھی غسل میں ایک دوسرے سے پردہ کریں۔ مردوں کے درمیان ہوں تو غسل کو مؤخر کر دیں۔ بعض کہتے ہیں کہ غسل کے لیے برہنہ ہونا بھی جائز ہے۔ ہمبستری کے لیے بھی برہنہ ہو سکتا ہے۔

مکروہاتِ غسل

غسل میں بھی وہی چیزیں مکروہ ہیں جو وضو میں مکروہ ہیں۔ لیکن غسل کے دوران دعا پڑھنا (مانگنا) بھی مکروہ ہے۔

جس پانی کے ذریعہ وضو اور غسل میں پاکی حاصل کی جاتی ہے، اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کے حالات مختلف ہیں، اس لیے پانی بے جا بھی صرف نہ کرے اور ضرورت

[۱] [مسند احمد بشرح البناء: ۲/۱۲۳] [۲] [مسند احمد بشرح البناء: ۲/۱۲۳]

سے کم بھی خرچ نہ کرے بلکہ معتدل صورت اختیار کرے۔

موجباتِ غسل

(۲) انزال یعنی نیند یا بیداری کی حالت میں منی کا دفق (کودنا) اور شہوت کے ساتھ نکلنا۔
انزال کا معنی ہے اپنے مقر (جگہ) سے جدا ہونا۔ مرد کا مقر پشت ہے اور عورتوں کا ان کی چھاتی ہے۔
منی وہ سفید رنگ کا گاڑھا پانی ہے جس کے نکلنے سے ذکر (آلۂ تناسل) ڈھیلا ہو جائے اور کھجور کے شگوفے کی طرح اس کی بو ہوتی ہے۔ عورت کی منی پتلی زرد رنگ کی ہوتی ہے۔ پس جب منی اپنے محل سے شہوت کے ساتھ جدا ہو کر جسم کے ظاہر حصہ تک پہنچ جائے، خواہ جماع کے بغیر ہو جیسے احتلام اور خواہ سوچنے سے ہو یا کسی کو دیکھنے سے ہو یا شرمگاہ کے ساتھ کھیلنے سے ہو تو وہ شخص جنبی ہو جائے گا، اور اس پر بالاجماع غسل واجب ہوگا۔ اس کی دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:
"الماء من الماء" یعنی پانی (مادہ منویہ) کے خروج سے پانی (غسل کرنا) واجب ہوگا۔ [1]
نیز جب حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا کہ عورت کو احتلام ہو جائے تو کیا اس پر غسل کرنا واجب ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نعم إذا رأت الماء" یعنی ہاں، اس پر غسل واجب ہوگا جب وہ پانی (مادہ منویہ) دیکھے۔ [2]
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موجبِ غسل چیز منی کا صلب (پشت) سے شہوت کے ساتھ جدا ہونا ہے، اگرچہ شرمگاہ سے شہوت کے ساتھ خارج نہ ہو۔ لہٰذا اگر کسی شخص کو احتلام ہوا ہو اور منی اپنے محل سے شہوت کے ساتھ جدا ہوئی، جب خارج ہونے کے قریب ہوئی تو اس نے ذکر (آلہ تناسل) کو پکڑ لیا اور شہوت ختم ہونے کے بعد اس کو چھوڑا اور پانی بغیر شہوت کے بہہ گیا تو ان دونوں کے نزدیک غسل واجب ہوگا، لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نہیں ہوگا۔
اسی طرح جب جماع کرنے والا شخص سونے سے پہلے یا پیشاب کرنے سے پہلے غسل کرے، غسل کرنے کے بعد منی کا باقی حصہ خارج ہو تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دوبارہ غسل کرنا واجب ہوگا، لیکن امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب نہیں ہوگا۔ اور اگر پیشاب کرنے کے بعد یا سونے کے بعد باقی حصہ خارج ہو تو بالاجماع غسل کا اعادہ نہیں کرے گا۔
امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، جیسا کہ "المحیط" کے حوالہ سے البحر الرائق کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر شادی شدہ آدمی جو فرطِ شہوت میں مبتلا ہو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ شہوت کو ختم کرنے کے لیے بطور علاج کے استمناء (جلق) کرلے، لیکن اس پر نہ اس کو اجر ملے

---

[1] [صحیح مسلم: ۱/۲۶۹] [2] [صحیح البخاری: ۱/۷۶]

گا اور نہ وزر (گناہ)۔ مؤلفؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس صورت میں ہے جب اس کو اپنے بارے میں یہ خدشہ ہو کہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو زنا وغیرہ میں مبتلا ہو جائے گا، پس یہ اخف الضررین (دو گناہوں میں سے ہلکے) کے ارتکاب کے باب سے ہوگا۔ لیکن اگر محض حصولِ شہوت کے لیے عبث کے طور پر کرتا ہے تو جائز نہیں ہے۔ کوئی شخص سو کر بیدار ہوا اور اس نے اپنے کپڑوں پر منی یا مذی کا نشان دیکھا تو اس پر غسل واجب ہوگا۔ اسکی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں مسئلہ دریافت کیا گیا جو تری کو پاتا ہے مگر اس کو احتلام یاد نہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یغتسل''. یعنی وہ غسل کرے گا۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک ایسے آدمی کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کو معلوم ہے کہ اس کو احتلام ہوا تھا مگر وہ تری کو نہیں دیکھتا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''لاغسل علیه'' یعنی اس پر غسل واجب نہیں ہے۔ پھر ام سلیم رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ کیا عورت پر بھی غسل واجب ہوگا جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نعم، انما النساء شقائق الرجال'' یعنی ہاں، کیونکہ عورتیں بھی مردوں کی طرح ہیں۔[1]

لیکن کتاب ''الاختیار'' میں مذکور ہے کہ عورت کے لیے احتیاط یہ ہے کہ جب اس کو احتلام ہو اور وہ تری نہ دیکھے تو اگر اس حالت میں بیدار ہوئی ہو کہ چت لیٹی ہوئی تھی تو غسل واجب ہوگا اس لیے کہ اس بات کا احتمال ہے کہ پانی (مادہ منویہ) خارج ہونے کے بعد واپس ہو گیا ہو، کیونکہ احتلام کی صورت میں ظاہر یہی ہے کہ خروج ہو گیا ہو۔ مرد کا معاملہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ محل کے تنگ ہونے کی وجہ سے عود کا احتمال نہیں ہے۔ اور اگر عورت بیدار ہوئی تو اس کے علاوہ کسی اور جہت پر تھی تو غسل واجب نہیں ہوگا۔ مذی کے بارے میں بھی ظاہر یہی ہے کہ یہ بھی پتلی منی ہے لہٰذا اس کے خروج سے احتیاطاً غسل واجب ہوگا۔

(۲) انزال کے بغیر دو شرمگاہوں کا آپس میں مل جانا۔ یہ بھی موجبِ غسل ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب ایک شرمگاہ دوسری شرمگاہ میں متجاوز ہو جائے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم نے ایسا کیا تو ہم نے غسل کیا۔[2]

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''جب ایک شرمگاہ دوسری شرمگاہ سے متجاوز ہو جائے (یعنی غائب ہو جائے) تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔''

جن احادیث میں یہ بات صراحت کے ساتھ آئی ہے کہ انزال کے بغیر غسل واجب نہیں

---

[1] [مسند احمد بشرح البناء: ۲/۱۱۶] [2] [سنن الترمذی: ۱/۷۳]

ہوتا وہ ابتدائے اسلام میں رخصت تھی، پھر منسوخ ہوگئی، جیسا کہ مسند احمد بشرح البناء میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''الماء من الماء'' یعنی انزال ہو تو غسل واجب ہوتا ہے، یہ بات شروع میں رخصت کے طور پر تھی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائے اسلام میں اس کی رخصت دی تھی، پھر اغتسال (غسل کرنے) کا حکم دے دیا۔ اسی طرح حدیثِ رفاعہ بن رافع العقمی البدری رضی اللہ عنہ مروی ہے، حضرت رفاعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان سے کسی نے کہا کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیٹھ کر اپنی رائے کے مطابق لوگوں کو یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ جو شخص جماع کرے اور اسے انزال نہ ہو تو بھی غسل واجب ہے، آپؓ نے فرمایا کہ ان کو جلدی سے میرے پاس لاؤ، چنانچہ وہ بلائے گئے (جب وہ آئے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: ''اے اپنی جان کے دشمن! مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ تم مسجدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بیٹھ کر اپنی رائے کے مطابق لوگوں کو فتویٰ دیتے ہو؟ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے ایسا نہیں کیا، لیکن مجھے میرے چچا کے رشتہ دار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالہ سے یہ حدیث بیان فرمائی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ میری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ یہ جوان کیا کہتا ہے؟ میں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں ایسا کرتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم نے یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معلوم کی تھی؟ انہوں نے کہا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کرتے تھے اور غسل نہیں کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کیا، تمام لوگوں نے اس بات پر اتفاق کیا کہ انزال کی صورت میں ہی غسل واجب ہے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اختلاف کیا، انہوں نے کہا کہ جب ایک شرمگاہ دوسری شرمگاہ سے متجاوز ہو جائے (یعنی دخول ہو جائے) تو غسل واجب ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: اے امیر المؤمنین! اس مسئلہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سب لوگوں سے زیادہ جانتی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو پیغام بھیجا، انہوں نے فرمایا کہ مجھے کوئی علم نہیں، پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب ایک شرمگاہ دوسری شرمگاہ سے متجاوز ہو جائے (یعنی باہم مل جائیں اور صرف دخول ہو جائے) تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ (یہ سن کر) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ غصے میں آگئے اور فرمایا: ''مجھے کسی کے بارے میں یہ بات نہ پہنچے کہ اس نے ایسا کیا ہو (یعنی بیوی کے ساتھ ملاپ کیا ہو اور انزال نہ ہوا ہو) اور غسل نہ کرے ورنہ میں اس کو سخت سزا دوں گا۔''[1]

---

[1] [مسند احمد بشرح البناء: ۲/۱۱۰]

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''صحیح المسلم'' میں حضرت ابوالعلاء بن الشخیر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث کو ایک دوسرے سے منسوخ کرتے تھے، جیسا کہ قرآن کے بعض احکام بعض کے لیے ناسخ ہوتے ہیں، پس یہ حدیث ''إنما الماء من الماء'' منسوخ ہے۔

اسی طرح دُبر میں ایلاج (دخول) بھی موجب غسل ہے، اس لیے کہ وجوب کا سبب کامل طور پر پایا جاتا ہے اور مفعول پر بھی احتیاطاً غسل واجب ہوگا۔

دبر نجاست کا محل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حیض کی حالت میں فرج میں وطی کرنے کو اس لیے حرام قرار دیا ہے کہ اس میں نجاست موجود ہوتی ہے۔ صحیح اور حسن احادیث میں عورت سے دبر میں جماع کرنے کی ممانعت آئی ہے، دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان احادیث کو روایت کیا ہے، چند احادیث بیان کی جاتی ہیں:

(۱) امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتے، اپنی عورتوں کے پاس دُبر کے راستہ سے نہ آؤ۔''[۱]

(۲) آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ملعون ہے وہ شخص جو اپنی بیوی کے پاس دُبر کے راستہ سے آئے۔''[۲]

(۳) نیز حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنی بیوی کے پاس اس کی دُبر کے راستہ سے آئے (یعنی اس راستہ سے جماع کرے) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف (نگاہِ کرم سے) نہیں دیکھیں گے۔''

(۴) حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ ''قومِ لوط نے جو کام پہلے شروع کیا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے بیویوں سے دُبر کے راستے سے جماع کرنا شروع کیا، جو شخص اس ممنوع کام میں مبتلا ہو فاصلہ دیں اسے چاہیے کہ اللہ سے توبہ کرے اور اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔''

امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور صاحبین یعنی امام محمد اور امام ابو یوسف رحمھم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ دُبر میں وطی کرنا فرج میں وطی کرنے کی طرح ہے۔ قرآن نے دونوں کو ''فاحشہ'' کہا ہے۔ قومِ لوط کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ'' [العنکبوت: ۲۸] یعنی تم فاحشہ (بے حیائی کے کام) کا ارتکاب کرتے ہو اور زانی عورتوں کے متعلق ارشاد ہے:

---

۱ [مسند احمد بشرح البناء: ۲۲۴/۱۶] ۲ [جامع الرضوی: ۱۱۹/۱]

''وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ'' [النساء:۱۵]

''اور تمہاری عورتوں میں سے جو عورتیں فاحشہ کا ارتکاب کرتی ہیں۔''

اس لیے فاعل اور مفعول دونوں پر احتیاطاً غسل واجب ہوگا۔

(۳،۴) حیض اور نفاس کا انقطاع:

حیض کے انقطاع پر غسل کا وجوب اس آیت قرآنی سے ثابت ہے: ''حَتّٰی یَطَّهَّرْنَ'' [البقرة:۲۲۲] تشدید کے ساتھ (بھی) پڑھا گیا ہے۔ یعنی عورتوں کے پاس جانا ممنوع ہے جب تک کہ وہ غسل نہ کرلیں۔ نیز امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمرو بن مسعود رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کی ہے کہ دونوں کہتے ہیں کہ حیض والی عورت جس کا خون بند ہو چکا ہو وہ اس وقت تک حیض والی ہی شمار ہوگی جب تک کہ غسل نہ کرلے، اگر انقطاعِ حیض موجب غسل نہ ہوتا تو اس کے پاس جانے سے منع نہ کیا جاتا۔ اور نفاس پر دلیل اجماع ہے۔ نیز حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جب نفاس والی عورت کے سات دن گزر جائیں، پھر وہ طہر دیکھے تو اس کو چاہیئے کہ غسل کر کے نماز پڑھے۔''[1]

یہی حکم مستحاضہ عورت کا ہے کہ جب اس کے ایامِ حیض پورے ہو جائیں تو اس پر غسل واجب ہے، اس لیے کہ وہ ایامِ استحاضہ میں پاک عورتوں کی طرح ہے۔

جن چیزوں سے غسل واجب نہیں ہوتا

(۱) مذی، یہ پتلی سفیدی مائل ہوتی ہے جو شہوت کے ساتھ بوس و کنار کرنے سے بغیر دفق کے اور بغیر لذت و شہوت کے نکلتی ہے اور اس کے نکلنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور اس کے نکلنے پر شہوت قائم رہتی ہے اور جوش کم نہیں ہوتا بلکہ زیادہ ہو جاتا ہے، یہ عورتوں میں مردوں کی بہ نسبت زیادہ پائی جاتی ہے، اس بات پر علماء کا اجماع ہے کہ مذی اور ودی کے نکلنے سے غسل واجب نہیں ہوتا البتہ وضو واجب ہوتا ہے۔[2]

اس کی دلیل حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں کثرت سے مذی کے نکلنے پر بار بار غسل کرتا تھا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آپ کے لیے وضو کافی ہے'' میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے کپڑے کو لگ جائے تو کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بس تم پانی کا ایک چلو لے کر اپنے کپڑے کے اس حصہ کو دھولو جس جگہ پر مذی کے لگنے کا تمہیں خیال ہو۔''[3]

---

[1] [المستدرک:۱/۱۷۶] [2] [البحر الرائق] [3] [سنن ابی داود:۱/۵۴]

(۲) ودی، یہ منی کی طرح گاڑھی سفید رطوبت ہوتی ہے، لیکن اس میں منی کی طرح بو نہیں ہوتی، یہ پیشاب کے بعد شہوت کے بغیر نکلتی ہے یا کسی وزنی چیز کے اٹھاتے وقت یا غسل اور جماع کے بعد شہوت کے بغیر قطرہ دو قطرے یا اس کی مانند نکلتی ہے، اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

اگر کوئی یہ سوال کرے کہ جب اس سے پہلے پیشاب کے نکلنے سے وضو واجب ہو جاتا ہے تو ودی کے نکلنے پر وضو کے واجب ہونے کا کیا فائدہ ہے؟ جواب یہ ہے کہ کبھی ودی کا خروج پیشاب کے بغیر بھی ہوتا ہے یا اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے وجوب کا فائدہ سلس البول کے مریض میں ظاہر ہوگا، کیوں کہ اس کا وضو پیشاب سے تو نہیں ٹوٹتا لیکن ودی سے ٹوٹ جاتا ہے۔

(۳) بغیر تری کے احتلام ہونا۔

(۴) حقنہ (پچکاری) کرنا یا سبیلین میں سے کسی میں انگلی وغیرہ داخل کرنا۔

(۵) چوپائے یا مردے سے مجامعت کرنا اور انزال نہ ہونا۔ اور یہ حرام ہے۔

(۶) ناقابلِ جماع چھوٹی لڑکی سے جماع کرنا اور انزال نہ ہونا۔

مسنون غسل

یہ چار طرح کا ہے اور یہ جمعہ وعیدین وعرفہ کے دن اور حج وعمرہ کا احرام باندھنے کے وقت کا ہے۔ اس کی دلیل حضرت فاکہ بن سعد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن، عرفہ کے دن، عید الفطر اور یوم النحر کو غسل فرمایا کرتے تھے۔ حضرت فاکہ رضی اللہ عنہ اپنے گھر کے افراد کو بھی ان ایام میں غسل کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔[۱]

ایک آدمی نے حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے مسنون غسل کے بارے میں پوچھا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جمعہ کے روز عرفہ کے دن اور عید الفطر کے دن غسل کرنا مسنون ہے۔"[۲]

نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ "جو جمعہ کے لیے آئے اسے غسل کرنا چاہیئے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ عیدین کے دن ایسے (اہتمام سے) غسل کرتے تھے جیسے غسل جنابت (کے لئے اہتمام) کرتے ہیں۔

احرام باندھنے کے وقت غسل کے مسنون ہونے کی دلیل حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام باندھنے کے لیے کپڑے اتارے اور غسل فرمایا۔[۴]

---

۱ [مسند احمد بشرح البناء:۲/۱۴۴] ۲ [سنن البیہقی:۳/۲۷۸]

۳ [سنن الترمذی:۱/۳۰۸] ۴ [سنن البیہقی:۵/۳۳]

اہم تنبیہ:

طہارتِ ظاہری کا فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب طہارتِ باطنی بھی حاصل ہو، یعنی دل، حسد وکینہ اور ماسوی اللہ سے پاک ہو۔ صرف اسی ذات کے لیے مخلصانہ طور پر عبادت ہو۔ جب اس ذات کے بے شمار احسانات ہیں کہ محض اپنی مہربانی سے محتاج بندوں کی حاجات کو پورا کرتی ہے تو بندوں کو بھی چاہیئے کہ وہ اس اکیلے مالک کی بے غرض عبادت کریں اور ان کی تمام خواہشات اسی کے تابع ہوں۔ حضرت حسن البصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رب مستور سبته شهوته　　　قد عری من ستره و انهتکا

صاحب الشهوة عبد فإذا　　　ملک الشهوة أضحی ملکا

''بہت سے ستر پوش ایسے ہیں کہ ان کی خواہشِ نفس نے ان کو اپنا قیدی بنا لیا ہے، وہ بے ستر اور برہنہ ہو گئے ہیں، خواہش پرست انسان غلام ہے، لیکن جب وہ اپنی خواہش پر غلبہ پالے تو بجائے غلام کے اس کا مالک ہو جاتا ہے۔''

پس جب بندہ اللہ کی رضا کی خاطر عمل کرے اور اس کے احکامات کو بجالائے اور خلوص و للّٰہیت کے ساتھ عبادت کرے تو پھر اللہ تعالیٰ کی عنایات ومہربانیاں اس کی طرف متوجہ ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو ایسی باتیں سکھاتا ہے جو اس کو معلوم نہیں ہوتیں۔

☆☆☆

جس پانی سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے

احداث یہ ہیں: حدثِ اصغر، حدثِ اکبر یعنی جنابت، حیض اور نفاس۔ انجاس یہ ہیں: بول و براز، دمِ سائل، دمِ حیض ونفاس، مذی، ودی، شراب اور قے جب کہ منہ بھر کر ہو۔

وہ پانی جن سے احداث کو دور کرنا درست ہے، وہ یہ ہیں: بارش، دریا، ندی، نالہ، نہر، سمندر، تالاب، پگھلی ہوئی برف اور اولوں کا پانی، چشمہ کا پانی اور کنوئیں کا پانی وغیرہ۔

بارش کے پانی سے پاکی حاصل ہونے کے جواز پر دلیل یہ آیتِ قرآنی ہے:

"وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا" [الفرقان:۴۸]

"اور ہم نے آسمان سے پاک پانی اتارا۔"

نیز ارشادِ ربانی ہے:

"وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ" [الانفال:۱۱]

"اور وہ آسمان سے تمہارے لیے پانی اتارتا ہے تاکہ وہ تم کو اس کے ذریعے پاک کرے اور شیطان کی گندگی کو تم سے دور کرے۔"

سمندر کے پانی سے طہارت حاصل ہونے کے جواز پر دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص حاضرِ خدمتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوا اور اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم لوگ سمندر میں سفر کرتے ہیں، تھوڑا سا پانی اپنے ساتھ اٹھا لیتے ہیں، اگر اس سے وضو کریں تو پیاس ستاتی ہے تو کیا ہم سمندر کے پانی سے ہی وضو کر لیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مردار حلال ہے۔"[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو جانور پانی میں زندگی گزارتے ہیں اگر ان میں سے کوئی جانور پانی میں مر جائے تو پانی ناپاک نہیں ہوتا، اور اس سے مراد وہ حیوانات ہیں کہ جن کی پیدائش بھی پانی میں ہوتی ہو اور زندگی بھی پانی میں ہی گزارتے ہوں، خواہ ان میں دمِ سائل ہو یا نہ ہو، جو حیوان پانی میں رہتا ہو لیکن اس میں سانس نہ لیتا ہو اس کے مرنے سے پانی ناپاک ہو جائے گا۔ جیسے

[1] [الموطأ:۱/۳۵]

دریائی پرندے۔

پگھلی ہوئی برف اور اولوں کے پانی سے پاکی حاصل ہونے کے جواز پر دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو کچھ دیر سکوت فرماتے، میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہوں، آپ تکبیر اور قراءت کے درمیان سکوت (وقفہ) کے وقت کیا پڑھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں یہ پڑھتا ہوں: ''اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدتَّ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، اَللّٰھُمَّ نَقِّنِیْ مِنْ خَطَایَایَ کَمَا یُنَقَّی الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰھُمَّ اغْسِلْنِیْ مِنْ خَطَایَایَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ''۔[۱]

دریا کے پانی سے پاکی حاصل ہونے کے جواز پر دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''دو دریا ایسے ہیں کہ ان دونوں میں سے جس سے تم وضو کرنا چاہو تو کوئی حرج نہیں ہے ایک سمندر کا پانی اور دوسرا دریائے فرات کا پانی۔''[۲]

کنوئیں کے پانی سے پاکی حاصل ہونے کے جواز پر دلیل حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک بار میرا گزر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیر بضاعہ سے وضو فرما رہے ہیں، میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ اس کنوئیں سے وضو فرماتے ہیں، حالاں کہ اس میں بدبودار چیزیں ڈالی جاتی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''الماء لا ینجّسه شیء'' ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: ''الماء طهور لا ینجّسه شیء'' یعنی کوئی چیز پانی کو ناپاک نہیں کرتی۔ اور دوسری روایت کے مطابق پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔[۳]

''لا ینجّسه شیء'' کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی چیز پانی کو متغیر نہ کرے وہ پاک رہتا ہے، لیکن جب وہ متغیر ہو جائے تو وہ اپنی صفتِ طہوریت پر باقی نہیں رہتا۔

بیر بضاعہ اور اس کے پانی کے متعلق کافی بحث کی گئی ہے۔ البتہ یہ بات اتفاقی ہے کہ قلیل پانی میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام دونوں میں لوگوں کی عادت یہ تھی کہ وہ پانی کو نجاستوں سے محفوظ رکھتے تھے، اس لیے کسی کو یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (حالانکہ وہ بڑے صفائی پسند تھے) پانی کی قلت کے باوجود قصداً ایسا کرتے تھے، اصل وجہ یہ تھی کہ وہ کنواں (بیر بضاعہ) نشیبی اور پست زمین میں تھا، سیلاب اور ہوائیں راستوں پر پڑی گندگیوں کو اٹھا کر اس میں ڈال دیتی

---

۱ [سنن النسائی: ۱۲۹/۲] ۲ [مصنف ابن ابی شیبۃ: ۱۳۰/۱] ۳ [سنن النسائی: ۱۷۴/۱]

تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ منافقین ایسا کرتے تھے۔ بیرِ بضاعہ کا پانی باغات کی طرف جاتا تھا، پانی اس میں ٹھہرتا نہیں تھا، اس کا حکم دریا کے پانی کی طرح تھا۔ جس پانی کا بھی یہ وصف ہو اور اس میں کوئی نجاست گر جائے تو اس کا پانی ناپاک نہیں ہوگا۔ اِلّا یہ کہ پانی کا ذائقہ یا رنگ یا بو بدل جائے تو وہ ناپاک ہو جائے گا۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پانی پاک ہے، مگر جب اس کی بو یا اس کے ذائقے میں تغیر آجائے۔''[1]

راشد بن سعد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابو امامہ الباھلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: ''پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جو چیز اس کی بو کو یا اس کے ذائقے کو تبدیل کر دے۔''[2]

یہ حدیث آبِ کثیر پر محمول ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ جب پانی چالیس مٹکے ہوں تو کوئی چیز اس کو ناپاک نہیں کرتی۔[3]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب پانی چالیس مٹکوں کے برابر ہو تو وہ خباثت کو نہیں اٹھاتا۔ ابن المنکدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب پانی چالیس مٹکوں تک پہنچ جائے تو ناپاک نہیں ہوتا۔[4]

پانی کو گرم کر کے اس سے طہارت اور پاکی حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی دلیل حضرت زید بن اسلم رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ان کے والد اسلم، جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے ایک برتن میں پانی گرم کیا جاتا تھا جس سے آپ غسل فرماتے تھے۔[5]

عورت کے وضو سے بچے ہوئے پانی سے پاکی حاصل کرنا جائز ہے، اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی زوجۂ مطہرہ نے ایک بڑے برتن میں غسل کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پانی سے وضو کرنا چاہا تو وہ فرمانے لگیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں حالت جنابت میں تھی (میں نے اس پانی سے غسل کیا تھا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ان الماء لا یجنب'' یعنی پانی ناپاک نہیں ہوتا۔''[6]

ایسے پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا جائز ہے جس میں کوئی ایسا جانور مر جائے جس میں خون (بہنے والا) نہیں ہوتا، اس کی دلیل حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے: وہ فرماتے ہیں کہ ہر ایسا جانور جس میں بہنے والا خون ہو (وہ پانی میں مر جائے) تو اس سے وضو نہ کیا جائے، لیکن انہوں

---

[1] [سنن الدار قطنی: ۱/۲۸] [2] [سنن الدار قطنی: ۱/۲۸] [3] [سنن الدار قطنی: ۱/۲۷]
[4] [سنن الدار قطنی: ۱/۲۷] [5] [سنن البیہقی: ۱/۶] [6] [سنن الترمذی: ۱/۴۴]

نے گبریلا، بچھو، ٹڈی اور جھینگر وغیرہ میں رخصت دی ہے کہ جب یہ جانور پانی کے برتن میں گر کر مر جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔

شعبہ بن الحجاج رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ انہوں نے چھپکلی کا ذکر بھی کیا ہے۔
نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی مکھی تم میں سے کسی کے برتن میں گر جائے تو اس کو ڈبو کر نکال دو، کیونکہ اس کے ایک پَر میں شفاء اور دوسرے میں بیماری ہوتی ہے۔''[1]

مشرکین کے برتنوں میں موجود پانی سے طہارت حاصل کرنا جائز ہے۔ اس کی دلیل حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ ایک شخص لوگوں سے الگ رہا، اس نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ: ''اے فلاں! تم نے ہمارے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ اس نے کہا: اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے جنابت پیش آ گئی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو تیمّم کرنے کا حکم دیا، اس نے پاک مٹی سے تیمّم کیا، پھر نماز پڑھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چند سواروں کے ساتھ مجھے آگے بھیجا کہ ہم پانی تلاش کریں، ہم سخت پیاسے ہو گئے تھے، پھر ہم چلے جا رہے تھے کہ ایک عورت کو دیکھا کہ اپنے دونوں پیر لٹکائے دو پکھالوں پر بیٹھی جا رہی ہے (یعنی اونٹ پر بیٹھی جا رہی ہے)...... (آگے یہ مذکور ہے کہ) آپؐ نے حکم دیا کہ اس کے اونٹ کو بٹھایا جائے، سو وہ بٹھا لیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے پکھالوں کے اوپر کے دہانوں پر کلی فرمائی اور اونٹ کو پھر کھڑا کر دیا، پھر ہم نے پانی پیا اور ہم سب چالیس آدمی تھے بہت پیاسے تھے، یہاں تک کہ ہم سب نے اپنی سب مشکیں اور چھاگلیں بھر لیں اور جس ساتھی کو جنابت تھی اس کو بھی غسل کے لیے پانی دیا............ (الحدیث)[2]

اہل کتاب کے پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا جائز ہے، اس کی دلیل حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ان کے والد (اسلم) فرماتے ہیں کہ ''جب ہم (ملک) شام میں تھے تو میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے پاس پانی لایا، آپ رضی اللہ عنہ نے اس سے وضو کیا، آپ نے پوچھا: ''یہ پانی کہاں سے لائے ہو؟ میں نے اس سے زیادہ شیریں پانی نہیں دیکھا اور نہ ہی اس سے زیادہ عمدہ آسمانی پانی دیکھا؟! وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: میں یہ پانی فلاں نصرانی بڑھیا کے گھر سے لایا ہوں، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضو فرما لیا تو اس عورت کے پاس آئے اور اس سے فرمایا: ''اے بڑھیا! مسلمان ہو جاؤ، سلامت رہو گی، اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین حق دے کر بھیجا ہے، (راوی) کہتے ہیں کہ اس عورت نے اپنے سر سے چادر ہٹائی تو وہ درخت ثغامہ (سفید پھولوں والا درخت) کی

1. [صحیح البخاری: ۸/۱۷۱]
2. [صحیح مسلم: ۱/۴۷۵]

طرح سفید ہو چکا تھا، اس نے کہا کہ میں تو بہت عمر رسیدہ اور بوڑھی ہو چکی ہوں، میں اب مر رہی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: "اللّٰھم اشھد" یعنی اے اللہ! گواہ رہنا۔"[۱]

ایسے پانی سے طہارت حاصل کرنا بھی جائز ہے جس میں کوئی پاک چیز مل گئی ہو اور اس نے اس کے اکثر اوصاف کو بدل دیا ہو۔ اوصاف تین ہیں: رنگ، بو اور ذائقہ، اگر دو وصف بدل جائیں تو صحیح قول کے مطابق اس سے وضو کرنا جائز ہے۔ اگر خریف کے موسم میں درختوں کے پتوں کے گرنے سے پانی کے اوصافِ ثلاثہ متغیر ہو جائیں تو اکثر علماءِ احناف کے نزدیک اس سے وضو کرنا جائز ہے۔[۲]

اس مسئلہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت اصل ہے کہ ایک آدمی، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حالت احرام میں تھا کہ اس کی اونٹنی نے اس کو گرا کر اس کی گردن توڑ دی اور وہ مر گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو، اس کے دو کپڑوں میں ہی اس کو کفنا دو، اس کو خوشبو نہ لگاؤ اور اس کا سر نہ ڈھانکو، بے شک یہ قیامت کے روز اس حالت میں اٹھایا جائے گا کہ اس کے بال چپکے ہوئے ہوں گے" ایک روایت میں ہے کہ "تلبیہ پڑھتا ہوا اٹھے گا۔"[۳]

امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ام ھانی رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ ﷺ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ہی برتن سے غسل کیا، اس برتن میں آٹے کا نشان موجود تھا۔"[۴]

بڑے حوض و تالاب سے بھی طہارت حاصل کرنا جائز ہے، اس کے کثیر ہونے میں مبتلی بہ کا گمان غالب معتبر ہے، اگر اس کے گمان غالب میں پانی کو حرکت دینے سے نجاست ایک جانب سے دوسری جانب نہیں پہنچتی تو اس پانی سے وضو جائز ہے ورنہ ناجائز ہے۔ دہ در دہ (۱۰×۱۰) کی مقدار کے بارے میں کوئی شرعی نص وارد نہیں ہوئی، اکابر علماءِ متاخرین کی یہی رائے ہے جیسے صاحب ہدایہ اور قاضی خان وغیرہ۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جس چیز کی تقدیر شرعاً درست نہ ہو اس میں آپ کوئی مقدار متعین نہیں فرماتے تھے، بلکہ مبتلی بہ کی رائے پر موقوف فرماتے تھے۔ لہٰذا جب اس کے گمان غالب میں وہ کثیر ہو تو کثیر شمار ہوگا۔ صاحبینؒ سے بھی یہی مروی ہے۔

جب پانی کثیر ہو تو کسی چیز سے وہ ناپاک نہیں ہوگا، مگر جب اس کا کوئی وصف (رنگ، بو، ذائقہ) اس پر غالب ہو جائے۔ قلتین والی حدیث ثابت نہیں ہے، جیسا کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ امام علی بن المدینی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے بھی اس کی تضعیف کی ہے۔

---

۱ [سنن الدار قطنی: ۱/۳۲] ۲ [قالہ فی الجوھرۃ]

۳ [صحیح مسلم: ۲/۸۶۶] ۴ [سنن البیہقی: ۱/۷]

نیز ایسے پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا جائز ہے جو (برتن کی صورت میں) دباغت شدہ کھال میں موجود ہو، اس کی دلیل حضرت ابن وعلہ السبئی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ ہم لوگ مغرب (کے علاقے) میں ہوتے ہیں، مجوسی لوگ پانی اور چربی کی مشکیں ہمارے پاس لاتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ پانی استعمال کرلیا کرو، میں نے پوچھا کہ کیا یہ آپ کی رائے ہے؟ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**دباغہ طہور**" یعنی اس کی دباغت اس کو پاک کرنے والی ہے۔"[1]

دباغت زدہ کھالوں پر نماز پڑھنا اور اس سے وضو کرنا جائز ہے (یعنی اس کے مصلے اور برتن کو استعمال کرسکتے ہیں)، خنزیر اور انسان کی کھال مستثنیٰ ہے، خنزیر، نجس العین ہے، اس لیے اس کو استعمال نہیں کرسکتے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ" [الانعام: ۱۴۵] اور انسان کی کھال اس کی تکریم کی وجہ سے ناقابل استعمال ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب کچی کھال کو دباغت دے دی جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔"[2]

مردار کے بال اور اون پاک ہیں (پانی میں گر جانے سے پانی ناپاک نہیں ہوگا)۔ اس کی دلیل حضرت یزید بن ابی حبیب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ابو الخیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو یہ حدیث بیان کی ہے کہ "میں نے ابن وعلہ السبئی کو پوستین پہنے ہوئے دیکھا، میں نے اس کو مَس (چھونا) کیا تو انہوں نے کہا کہ تم کیوں چھوتے ہو؟ (کیا تم اس کو ناپاک سمجھتے ہو) میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے کہا کہ ہم مغرب کے علاقے میں ہوتے ہیں، وہاں کے بربر کے کافر اور آتش پرست بہت رہتے ہیں، وہ دنبہ ذبح کر کے لاتے ہیں، ہم تو ان کا ذبح کیا ہوا جانور نہیں کھاتے اور وہ مشکیزیں لاتے ہیں، ان میں چربی ڈالتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں پوچھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "**دباغہ طہورہ**" یعنی دباغت دینے سے کھال پاک ہو جاتی ہے۔"[3]

بال اور اون اس وقت پاک ہیں جب ان کو خوب مونڈا جائے، لیکن جب ان کو اکھاڑا جائے تو ناپاک ہوں گے۔

---

[1] [صحیح مسلم: ۱/۲۷۸] [2] [صحیح مسلم: ۱/۲۷۸] [3] [صحیح مسلم: ۱/۲۷۸]

جس پانی سے طہارت حاصل کرنا ناجائز ہے

قلیل پانی جس میں کوئی نجاست گر جائے اس سے طہارت حاصل کرنا جائز نہیں ہے، اس کی دلیل حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: ''کھڑے پانی میں جو جاری نہ ہو پیشاب نہ کرو کہ پھر اس سے غسل کرنے لگو۔''[۱]

اس حدیث میں ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے، اور کسی چیز سے ممانعت اس کی مخالف چیز کا حکم (اثبات) ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص حالتِ جنابت میں ہوتے ہوئے کھڑے پانی میں غسل نہ کرے۔'' راوی نے پوچھا کہ اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! پھر کیسے غسل کرے؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاتھوں سے پانی لے کر غسل کرے۔''[۲]

ایسے پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا ناجائز ہے جس میں نجاست کا رنگ یا بو یا اس کا ذائقہ غالب آجائے۔ اس کی دلیل حضرت ابو امامہ الباھلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''پانی کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی مگر جو چیز اس کی بو یا ذائقہ کو بدل دے'' (اس سے پانی ناپاک ہو جائے گا)[۳]

ماءِ مستعمل سے بھی طہارت حاصل کرنا ناجائز ہے۔ ماءِ مستعمل اس پانی کو کہتے ہیں جو رفعِ حدث یا قربت وثواب کے لیے استعمال کیا گیا ہو، رفعِ حدث کی مثال، جیسے محدث (بے وضو) کا بغیر نیت کے وضو کرنا اور قربت وثواب کی مثال، جیسے باوضو آدمی کا قربت وثواب کی نیت سے وضو کرنا۔ جیسے کوئی شخص مغرب کی نماز پڑھے، پھر عشاء تک اس کا وضو برقرار رہے، پھر نمازِ عشاء کے لیے دوبارہ وضو کرے۔ دونوں صورتوں میں اعضاءِ وضو سے جدا ہونے والا پانی ماءِ مستعمل ہے کہ اگر اس کو ایک برتن میں جمع کیا جائے تو اس سے دوسری مرتبہ طہارت حاصل کرنا جائز نہیں ہے خواہ حدثِ اصغر ہو یا حدثِ اکبر۔

اگر ایک مجلس میں دو مرتبہ وضو کیا تو یہ اس کے لیے مکروہ ہے اور دوسری بار لیا ہوا پانی مستعمل نہیں ہوگا۔ اگر کسی باوضو شخص نے کھانا کھانے کے لیے یا کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے تو پانی مستعمل ہوگا، کیونکہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھونا سنت ہے، اس لیے اس کے ساتھ قربت یعنی ثواب قائم ہوا۔ اس سے یہ حکم مستفاد ہوتا ہے کہ اگر اس نے قربت وثواب کے ارادے کے بغیر صرف صفائی کے قصد سے ہاتھ، منہ وغیرہ دھوئے تو پانی مستعمل نہیں ہوگا، جیسے کپڑے وغیرہ کے دھونے کا حکم ہے۔

---

۱ [صحیح مسلم:۱/۲۳۵] ۲ [صحیح مسلم:۱/۲۳۵] ۳ [سنن الدار قطنی:۱/۲۸]

اگر اسقاطِ فرض کے لیے وضو کے بعض اعضاء کو دھویا تو وہ پانی مستعمل ہو جائے گا، کیونکہ اس کا فرض بالاتفاق ساقط ہو گیا، اگرچہ وضو سے فارغ ہونے کے بعد ہی رفع حدث کہلائے گا، کیونکہ اس میں تجزّی نہیں ہو سکتی۔

ماءِ مستعمل پاک ہے، لیکن پاک کرنے والا نہیں ہے۔ انجاس کا ازالہ کر دیتا ہے لیکن احداث کو رفع نہیں کرتا۔ وہ پانی جو درختوں، پھلوں اور نباتات سے نچوڑ کر نکالا جائے یا ان سے ٹپک کر نکلے یا گلاب کا پانی وغیرہ اس سے طہارت حاصل کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس پر مطلق پانی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ نیز ایسے پانی سے بھی طہارت حاصل کرنا ناجائز ہے جس کی طبیعت زائل ہو جائے یعنی جس پانی کی رقت وسیلان اور انبات کا وصف اس سے ختم ہو جائے اس سے طہارت حاصل کرنا ناجائز ہے۔

اسی طرح جب پانی کو بیری کے پتوں کے ساتھ پکایا گیا ہو تو اس سے بھی وہ گاڑھا ہو جاتا ہے، اس سے طہارت حاصل کرنا ناجائز ہے، لیکن اگر اپنی رقت پر باقی ہو تو جائز ہے۔

پانی میں پکائے بغیر ملائی جانے والی پاک چیز جامد ہوتی ہے یا مائع، اور وہ مائع اوصاف میں پانی کے موافق ہوتی ہے یا مخالف، پس پاک جامد چیز کے پانی میں مل جانے سے اس کا غالب ہونا اور پانی کا مغلوب ہو جانا اس وقت پایا جاتا ہے جب کہ پانی کا پتلا پن جاتا رہے کہ وہ کپڑے سے نچوڑا نہ جا سکے اور اس کے بہنے کی صفت باقی نہ رہے کہ جس سے وہ اعضاء پر پانی کی طرح بہہ نہ سکے، لیکن اگر اس کا پتلا پن اور بہنے کی صفت باقی رہے تو وہ وضو کے جائز ہونے کو مانع نہیں ہے جیسا کہ حدیث محرم ہے کہ ایک شخص اونٹنی سے گر کر مر گیا تو حضور ﷺ نے پانی اور بیری کے پتوں سے غسل کرنے کا حکم دیا۔ خواہ جامد چیز مثلاً زعفران یا پھل یا درختوں کے پتے مل جانے سے پانی کے تمام اوصاف بدل جائیں جب تک کہ اس پانی سے رنگا نہ جا سکے، جیسا کہ زعفران کا پانی یا اس پانی کا کچھ اور نام نہ پڑے جیسا کہ شربت وغیرہ۔ مائع چیز کے پانی میں مل جانے سے اس کو پانی پر غلبہ اس وقت حاصل ہوتا ہے جب کہ پانی میں اس مائع کا جس کے دو وصف ہوں، کوئی ایک وصف مثلاً رنگ یا صرف ذائقہ ظاہر ہو جائے اور جس مائع میں تین وصف ہوں، اس کے کوئی سے دو وصف پانی میں ظاہر ہو جانے سے اس چیز کو پانی پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے اور اس پانی سے وضو کرنا جائز نہیں ہے اور اگر اس کا صرف ایک وصف پانی میں ظاہر ہو تو قلت کے باعث وہ جوازِ وضو کو مانع نہیں ہے۔ پس اگر پانی میں خوشبو والی پاک مائع چیز پانی سے صرف ایک وصف میں مخالف ہے تو صرف اس وصف کے لحاظ سے غلبہ کا اعتبار کیا جائے گا، جیسا کہ گلاب کا پانی کہ یہ مطلق پانی سے صرف خوشبو میں مخالف

ہوتا ہے تو اس کے پانی میں مل جانے کی صورت میں خوشبو کے لحاظ سے غلبہ کا اعتبار کیا جائے گا اور اگر وہ مائع دو وصف میں پانی کا مخالف ہے جیسا کہ دودھ رنگ اور ذائقہ میں پانی کا مخالف ہے تو دونوں وصفوں میں سے کسی ایک وصف کے لحاظ سے غلبہ کا ظہور معتبر ہوگا، اگر دودھ کا رنگ یا ذائقہ پانی میں غالب ہے تو اس سے وضو کرنا جائز نہیں ہے اور اگر دونوں نہیں پائے گئے تو وضو جائز ہے، اور اگر وہ مائع تمام اوصاف میں پانی کا مخالف ہے جیسا کہ سرکہ کہ اس میں رنگ، ذائقہ اور بو تینوں وصف ہوتے ہیں تو اس کے اکثر اوصاف کا غالب ہونا معتبر ہوگا، پس اگر پانی کو تینوں اوصاف کے لحاظ سے یا ان میں سے اکثر یعنی دو وصفوں کے لحاظ سے متغیر کر دیا تو اس سے وضو جائز نہیں ہے ورنہ جائز ہے، پس اگر اس نے صرف ایک وصف کے لحاظ سے پانی کو متغیر کر دیا تو اس سے وضو جائز ہے اور اگر وہ مائع تینوں اوصاف میں سے کسی وصف میں بھی پانی کا مخالف نہیں ہے جیسا کہ مستعمل پانی، مفتی بہ قول کی بناء پر وہ پاک ہے اور پاک کرنے والا نہیں ہے اور گلاب کا وہ پانی جس کی خوشبو ختم ہو چکی ہو جب یہ مطلق پانی میں مل جائے تو اس کے اجزاء کا مطلق پانی کے اجزاء سے زیادہ ہونا معتبر ہے پس اگر مطلق پانی زیادہ ہو تو اس تمام پانی سے وضو کرنا جائز ہے اور اگر مطلق پانی مغلوب ہو تو اس سے وضو جائز نہیں ہے، یعنی وزن کے لحاظ سے غلبہ ہوگا، پس اگر مثلاً دو رطل (پونڈ/ لیٹر) مستعمل پانی یا گلاب کا وہ پانی جس کی خوشبو ختم ہو چکی ہو ایک رطل (پونڈ) مطلق پانی میں ملا دیا جائے تو اس سے وضو جائز نہیں ہے، کیونکہ مقید پانی کا غلبہ ہے۔ اور اس کے برخلاف اگر مطلق پانی زیادہ ہو تو اس تمام پانی سے وضو جائز ہے۔

کنوئیں کی طہارت

جب کنوئیں میں کوئی انسان یا حیوان گر کر مر جائے یا نجاست گر جائے تو اس نجاست کو نکالنے اور اس کنوئیں کا سارا پانی نکال دینے کے بعد وہ پاک ہو جاتا ہے، اس کی دلیل ''سنن دار قطنی'' میں حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ ایک حبشی چاہِ زمزم میں گر کر مر گیا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے نکالنے کا حکم دیا، چنانچہ اس کو نکالا گیا، پھر اس کنوئیں کا سارا پانی نکالنے کا حکم دیا۔''[1]

ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ابن سیرین کی مراسیل سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کی صحاح کی طرح ہیں۔

---

1 [سنن الدار قطنی: ۱/۳۳]

کنوئیں میں بلی یا پرندہ یا اس کے برابر کوئی جانور گر کر مر جائے اور نہ پھولے تو اس کو نکال کر چالیس ڈول پانی کے نکال دیئے جائیں تو کنوئیں کا پانی پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے بلی اور پرندے وغیرہ کے بارے میں فرمایا کہ یہ کنوئیں میں گر جائیں تو چالیس ڈول اس کنوئیں سے نکال دیئے جائیں۔[۱]

اگر کنوئیں میں مرغی گر کر مر جائے لیکن نہ پھولے تو اس کو کنوئیں سے نکال کر اس کے ستر ڈول نکال دیئے جائیں تو اس کا پانی پاک ہو جاتا ہے، جیسا کہ حماد بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ کنوئیں میں مرغی گر جائے اور مر جائے تو اس کنوئیں سے چالیس یا پچاس کی مقدار میں ڈول نکالے جائیں، پھر اس سے وضو کیا جائے۔''[۲]

اگر کنوئیں میں چوہا گر کر مر جائے لیکن نہ پھولے تو اس کو کنوئیں سے نکال کر اس کے بیس ڈول نکال دیئے جائیں تو اس کا پانی پاک ہو جاتا ہے، جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ کنوئیں میں چوہا گر کر مر جائے اور اسی وقت نکال دیا جائے تو اس کنوئیں سے بیس ڈول (پانی کے) نکال دیئے جائیں۔[۳] اگر مذکورہ جانور کنوئیں میں گر کر مر جائیں اور پھول اور پھٹ بھی جائیں تو اس کنوئیں کا پانی اس وقت پاک ہوگا جب پہلے اس مردار جانور کو نکالا جائے، پھر اس کنوئیں کا سارا پانی نکالا جائے۔ جیسا کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے میسرہ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کنوئیں میں چوہا گر کر مر جائے تو اس کا پانی نکالا جائے گا۔''[۴]

اگر کنوئیں سے سارا پانی نکالنا ممکن نہ ہو (مثلاً وہ چشمہ دار ہو) تو دو سو سے تین سو ڈول نکالے جائیں، دو سو ڈول واجب اور تین سو ڈول مستحب ہیں۔

کنواں مینگنی، لید اور گوبر کے گرنے سے ناپاک نہیں ہوتا، جب تک کہ دیکھنے والا اس کو کثیر نہ سمجھے، اور قلیل وہ ہے جس کو دیکھنے والا قلیل سمجھے، اسی پر فتویٰ ہے۔ کنوئیں کا پانی کبوتر اور چڑیا کی بیٹ سے فاسد (ناپاک) نہیں ہوتا، اسی طرح اگر کنوئیں میں کوئی آدمی یا حلال جانور گر جائے اور زندہ نکال لیا جائے اور اس کے جسم پر نجاست نہ ہو تو اس کا پانی ناپاک نہیں ہوتا۔

اگر خچر یا گدھا یا کوئی شکاری پرندہ مثلاً شکرہ یا شاہین یا چیل وغیرہ کنوئیں میں گرا اور زندہ نکل آیا یا صحیح قول کے مطابق کوئی درندہ اور بندر وغیرہ جنگلی جانور کنوئیں میں گر کر زندہ نکل آیا تو وہ پانی ناپاک نہیں ہوگا، کیونکہ ان جانوروں کے بدن پاک ہیں اور یہ موت سے ناپاک ہوتے ہیں اور یہ حکم اس وقت ہے کہ جب کہ اس جانور کا منہ پانی تک نہ پہنچا ہو اور اگر اس کا منہ پانی تک پہنچ گیا تو اس

---

۱ [الطحاوی: ۱/ ۱۷] ۲ [الطحاوی: ۱/ ۱۷] ۳ ایضاً ۴ ایضاً

کے جھوٹے کا اعتبار کیا جائے گا اور اس کے مطابق پانی نکالنے یا نہ نکالنے کا حکم لگایا جائے گا۔ اگر کنوئیں میں مرنے والے جانور کے کنوئیں میں گرنے کا وقت معلوم ہو تو اس جانور کے گرنے کے وقت سے اس کنوئیں کے ناپاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا خواہ وہ علم خود دیکھ کر یا ظن کے ذریعہ حاصل ہو یا دو گواہوں نے گواہی دی ہو کہ فلاں وقت یہ جانور گرا تھا، اور اگر جانور کے گرنے کا وقت معلوم نہ ہو اور نہ ہی اس کا گمان غالب ہو تو اگر وہ جانور پھولا اور پھٹا نہیں ہے تو ایک دن رات سے اس کنوئیں کی ناپاکی کا حکم لگایا جائے گا اور اگر وہ جانور پھول یا پھٹ گیا ہو تو استحساناً تین دن رات سے اس کنوئیں کی ناپاکی کا حکم لگایا جائے گا، یہ حکم وضو، غسل اور اس آٹے کے بارے میں ہے جو اس پانی سے گوندھا گیا ہو کہ اس آٹے کو کتوں کو کھلا دیا جائے۔ اسی طرح جو نمازیں اتنے عرصے میں ادا کی گئیں یا جنابت کا غسل کیا گیا اس کا اعادہ ضروری ہوگا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے اور یہی احوط اور معتمد ہے۔

آدمی اور جانوروں کے جھوٹے پانی اور پسینے کے احکام

حیض والی عورت کا جھوٹا پاک ہے، جیسا کہ حضرت شریح رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ کیا عورت اپنے خاوند کے ساتھ حالتِ حیض میں کھانا کھا سکتی ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ہاں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے (کھانے کے لیے) بلاتے تھے؟ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھانا تناول کرتی تھی، حالاں کہ میں حالت حیض میں ہوتی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گوشت والی ہڈی کو لیتے اور اس میں مجھے بھی شریک کرتے، میں دانتوں سے گوشت اتارتی پھر اس کو رکھ دیتی پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو لیتے اور اسے دانتوں سے نوچتے اور ہڈی کی اسی جگہ پر اپنا منہ رکھتے جس جگہ پر میں نے رکھا ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی منگواتے تو اس میں بھی مجھے شریک کرتے قبل اس کے کہ خود اس میں سے نوش کریں، پس میں پانی کو لے کر اس میں سے کچھ پی لیتی، پھر اسے رکھ دیتی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو لیتے اور اس میں سے پیتے اور اپنا منہ پیالے کی اسی جگہ پر رکھتے جس جگہ پر میں نے رکھا ہوتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی جگہ پر اپنا دہن مبارک رکھتے جس جگہ سے میں (پانی وغیرہ) پیتی، پس آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پس خوردہ کو نوش فرماتے حالانکہ میں حالتِ حیض میں ہوتی تھی۔

بلی کا جھوٹا پاک ہے، اس کی دلیل حضرت کبشہ بنتِ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے،

حضرت کبشہ ابن ابی قتادہ الانصاری رضی اللہ عنہا کی بیوی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ آئے، میں نے ان کے لیے وضو کا پانی رکھا، اتنے میں ایک بلی آئی اور اس کو پینے لگی، میں نے وہ برتن اس بلی کے لیے جھکا دیا، یہاں تک کہ اس نے پانی پی لیا، حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھا کہ میں ان کی طرف (تعجب سے) دیکھ رہی ہوں تو کہنے لگے اے میری بھتیجی! کیا تم تعجب کرتی ہو؟ میں نے کہا کہ ہاں! کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلی ناپاک نہیں ہے، یہ تو ان جانوروں میں سے ہے جو تمہارے پاس آتے جاتے ہیں۔''

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلی کے جھوٹے میں کوئی حرج نہیں ہے مگر یہ کہ اس کے منہ پر نجاست دکھائی دے تو ناپاک ہے۔[1]

حلال چرندوں اور پرندوں کا جھوٹا بالاتفاق پاک ہے (خواہ نر ہوں یا مادہ)، اسی طرح اونٹ، گائے اور بھیڑ، بکری اور گھوڑے کا جھوٹا بھی پاک ہے، بشرطیکہ وہ نجاست نہ کھاتے ہوں، کیونکہ جو نجاست کھاتے ہیں ان کا جھوٹا مکروہ ہے۔

کتے کا جھوٹا نجس ہے، خواہ وہ شکاری کتا ہو یا کھیت کا یا حفاظتی یا آوارہ کتا ہو۔

اس لیے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب کتا تمہارے برتن میں منہ ڈالے تو اس پانی کو بہا دو پھر سات مرتبہ اس کو دھوؤ'' حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے (اولاً) تمام کتوں کے مار دینے کا حکم دیا، پھر فرمایا: لوگوں کو کیا ہوا کہ کتے پالتے ہیں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شکاری کتے اور بھیڑ بکریوں اور کھیت کی حفاظت کے لیے کتا رکھنے کی اجازت دی اور فرمایا:

''جب کتا برتن میں منہ ڈالے تو اس کو سات مرتبہ دھو لو اور آٹھویں مرتبہ مٹی سے مانجھ لو۔''[2]

خنزیر کا جھوٹا ناپاک ہے، اس لیے کہ وہ نجس العین ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ''فَاِنَّهٗ رِجۡسٌ'' [الانعام:۱۴۵]

شکاری درندوں کا جھوٹا بھی ناپاک ہے، کیونکہ ان کا لعاب گوشت سے پیدا ہوتا ہے جیسے ان کا دودھ ناپاک ہے اسی طرح ان کا گوشت بھی ناپاک ہے۔ (لہٰذا لعاب بھی ناپاک ہوگا)۔

بلی کا جھوٹا مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ وہ نجاست سے نہیں بچتی، لیکن جس بلی کا ایک جگہ رہنا یقینی ہو اور گھروں میں گھومتی پھرتی نہ ہو تو اس کا جھوٹا یقیناً مکروہ نہیں ہے جیسا کہ شارع نے اس کی تصریح کی ہے۔

آزاد کوچہ گرد مرغی کا جھوٹا بھی مکروہ ہے، کیونکہ اس کی چونچ کا نجاست سے پاک ہونا

---

[1] [الموطا:۱/۳۶]   [2] [صحیح مسلم:۱/۲۳۵]

مشکوک ہے اسی شک کی وجہ سے اس کا جھوٹا مکروہ ہوگا۔ اگر اس کی چونچ کا نجاست سے پاک ہونا معلوم ہوتو پھر مکروہ نہیں ہے۔ شکاری پرندوں کا جھوٹا بھی مکروہ ہے جیسے چیل، کوا وغیرہ۔ اس لیے کہ ان کا مردار چیزوں کے ساتھ اختلاط رہتا ہے، پس وہ آزاد پھرنے والی مرغی کے متشابہ ہوئے، یہاں تک کہ اگر اس بات کا یقین ہو کہ ان کی چونچ پر کوئی نجاست نہیں ہے تو ان کا جھوٹا مکروہ نہیں ہوگا۔

باب التیمّم

تیمّم، اس امتِ محمدیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: ''مجھے پانچ چیزیں عطا کی گئیں ہیں کہ مجھ سے پہلے وہ چیزیں کسی کو عطا نہیں کی گئیں۔ (۱) ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا گیا جب کہ میں ہر سرخ وسیاہ آدمی (تمام انسانوں) کی طرف مبعوث کیا گیا ہوں۔ (۲) میرے لیے مالِ غنیمت حلال کیا گیا، جب کہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے حلال نہیں کیا گیا۔ (۳) میرے لیے ساری زمین پاک وطاہر اور سجدہ گاہ بنائی گئی، لہٰذا جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے آدمی نماز پڑھ سکتا ہے۔ (۴) میری ایک ماہ کی مسافت کے بقدر رعب سے مدد کی گئی ہے۔ (۵) مجھے شفاعت کا حق عطا کیا گیا ہے۔''[۱]

تیمّم کی مشروعیت، غزوۃ المریسیع میں ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ہمراہ تھے کہ جب ہم مقامِ بیداء یا ذات الجیش میں تھے کہ میرا ہار گم ہوگیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس ہار کی تلاش کے لیے ٹھہر گئے۔ لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ٹھہر گئے۔ لوگوں کے پاس بھی پانی نہ تھا اور اس جگہ پر بھی پانی موجود نہ تھا۔ لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ کو معلوم نہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا کام کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور تمام لوگوں کو بھی روک دیا، جب کہ ان کے پاس بھی پانی نہیں ہے اور نہ ہی وہ پانی والی جگہ پر ہیں؟ (یہ سن کر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے، اس وقت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنا سر مبارک میری ران پر رکھے آرام فرما رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہنے لگے، تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی اور تمام لوگوں کو بھی روک رکھا ہے جب کہ ان کے پاس پانی ہے اور نہ وہ پانی والی جگہ پر ٹھہرے ہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے ڈانٹا اور جو انہوں نے چاہا کہا، اور اپنے ہاتھ سے میری کوکھ کو مارنے لگے، میں نے حرکت صرف اس لیے نہیں کی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میری ران پر سر مبارک رکھے آرام فرما رہے تھے، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صبح تک سوئے رہے اور پانی کہیں موجود نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے آیتِ تیمّم نازل فرمائی۔ جب آیت نازل ہوئی تو حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کہنے لگے اے آلِ ابی بکر رضی اللہ عنہ! یہ تمہاری پہلی برکت نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس اونٹ

---

۱ [صحیح مسلم: ۱/ ۳۷]

پر میں سوار تھی جب وہ کھڑا ہوا تو اس کے نیچے سے وہ ہار بھی مل گیا۔[۱]

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت اسید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جزاک اللہ خیراً یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو بہترین بدلہ عطا فرمائے، خدا کی قسم! آپ کی وجہ سے جو حکم بھی نازل ہوا اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ پیدا کیا اور مسلمانوں کے لیے بھی اس میں برکت رکھی۔[۲]

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک پاک مٹی مسلمان کے لیے طہارت کا ذریعہ ہے، اگرچہ دس سال تک پانی دستیاب نہ ہو، جب پانی ملے تو اس کو استعمال کرے کیونکہ یہ بہتر ہے۔''[۳]

تیمّم کا مفہوم اور مسائل

تیمّم کا لغوی معنی ہے قصد اور ارادہ کرنا، شرعی تعریف یہ ہے کہ پاک مٹی یا کسی ایسی چیز سے جو مٹی کے حکم میں ہو بدن کو نجاست سے پاک کرنا یا پاک مٹی سے چہرے اور دونوں ہاتھوں کے مسح کرنے کو تیمّم کہتے ہیں۔ پس جو شخص پانی سے ایک میل دور ہو خواہ شہر میں ہو یا باہر، مسافر ہو یا مقیم، سفر قلیل ہو یا کثیر، اس کو تیمّم کرنا جائز ہے۔ صحیح قول یہ ہے کہ میل فرسخ کی تہائی ہے اور وہ چار ہزار گز ہے ہر گز چوبیس انگشت کا اور انگشت کی چوڑائی چھ جَو کے برابر ہوتی ہے۔ اس طرح کہ ہر جَو کا پیٹ دوسرے جَو کی پیٹھ سے ملا ہو اور جَو خچر کے چھ بالوں کے برابر ہے (مذکورہ بالا چار ہزار گز کا فاصلہ ہمارے زمانے کے اعتبار سے دو ہزار گز کے برابر ہے یعنی انگریزی میل کے اعتبار سے ایک میل ایک فرلانگ بیس گز یا ایک اعشاریہ آٹھ کلومیٹر ہوا (یعنی اٹھارہ سو میٹر) اور اعتبار مسافت کا ہے، وقت چلے جانے کا خوف معتبر نہیں ہے۔ پس اگر آدھے میل پر پانی ہو اور وقت تنگ ہو تو وضو کر کے نماز پڑھے چاہے وقت قضا ہو جائے۔ جب پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمّم کرے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ''فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا'' [النساء:۴۳] ''پھر پاک مٹی سے تیمّم کرو۔''

اگر پانی موجود ہو لیکن وہ مریض ہو اور اسے پانی کے استعمال سے مرض بڑھ جانے یا صحت میں تاخیر ہونے کا خوف ہو تو تیمّم کر لے اور اس میں فرق نہیں کہ حرکت سے مرض بڑھ جائے جیسے پھوڑا ہو یا دست آتے ہوں یا پانی کے استعمال سے مرض زیادہ ہو جائے جیسے چیچک نکلی ہو یا کوئی اور بیماری ہو۔ اس کی دلیل حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

---

۱ [سنن النسائی:۱/۱۶۳]　　۲ [سنن البیہقی:۱/۲۱۲]　　۳ [سنن البیہقی:۱/۲۱۲]

''مریض کو رخصت ہے کہ وہ پاک مٹی سے تیمّم کر لے''۔[1]

نیز حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ عہدِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک شخص کو جنابت لاحق ہوگئی، کسی نے اس کو غسل کرنے کا کہا، اس نے غسل کیا تو مر گیا، جب یہ بات حضور نبی کریمؐ کو پہنچی تو فرمایا: ''انہوں نے اس کو مار دیا، اللہ ان کو مارے، کیا جاہل شخص کا علاج پوچھ لینے میں نہیں ہے''۔

اسی طرح اگر بیمار خود وضو نہ کر سکے، چاہے اس کو وضو کروانے والا ملے یا نہ ملے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ عاجز شمار ہوگا اور صاحبین کے نزدیک قادر شمار ہوگا، اس مسئلے کو مسئلۃ القادر بقدرۃ الغیر کہتے ہیں۔ اصل میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قادر بقدرۃ الغیر کو مکلّف قرار نہیں دیتے، اس لیے کہ انسان اس وقت قادر شمار ہوتا ہے جب وہ ایسی حالت میں ہو کہ جب ارادہ کرے تو اس کے لیے کام کرنا میسر ہو، اور یہ بات اس میں متحقق نہیں ہوتی ہے۔ یہی حکم ہے جب بیٹا اپنے باپ کے لیے مال و طاقت خرچ کرے تو اس پر حج لازم نہیں ہوتا اور جس پر کفارہ واجب ہو اور وہ تنگدست ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کے لیے مال خرچ کر دے تو اس کا بھی عندالامام یہی حکم ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیقاً روایت نقل کی ہے کہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر ایک مریض کے پاس پانی ہو لیکن اس کو دینے والا نہ ملے تو تیمّم کر لے۔[2]

جنبی کو اگر یہ خوف ہو کہ نہانے میں سردی سے مر جائے گا یا بیمار ہو جائے گا تو بالاجماع تیمّم جائز ہے۔ اگر جنگل کے اندر ہو اور پانی گرم کرنے کا انتظام نہ ہو، اور اگر شہر کے اندر ہو تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک یہی حکم ہے اور صاحبینؒ کا اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ جائز نہیں ہے کیونکہ یہ نادر الوقوع ہے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ جب اس کا عجز حقیقتاً ثابت ہے تو اس کا ضرور اعتبار کیا جائے گا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ذات السلاسل کی طرف بھیجا تو کہتے ہیں کہ مجھے سخت سرد رات میں احتلام ہوگیا، مجھے خوف ہوا کہ اگر میں نے غسل کیا تو مر جاؤں گا، پس میں نے تیمّم کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ لی، پھر جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس واپس آئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات ذکر کی تو آپؐ نے فرمایا: ''اے عمرو! کیا تم نے حالتِ جنابت میں ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھ لی؟ میں نے کہا کہ جی ہاں، یا رسول اللہ! مجھے سخت سرد رات میں احتلام ہوگیا تھا، مجھے خوف ہوا کہ اگر میں نہایا تو مر جاؤں گا اور مجھے یہ آیت یاد آئی:

---

[1] [سنن الدار قطنی: ۱/۱۷۸]　[2] [صحیح البخاری: ۱/۸۸]

”وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِیْمًا“ [النساء:۲۹]

”اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں۔“

پس میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی، (یہ سن کر) آپ ﷺ ہنس دیئے اور کچھ نہیں فرمایا۔

تیمّم دو ضربوں کا نام ہے

ابوجہیم بن الحارث الصمۃ الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ بیر جمل سے واپس آئے تو راستے میں ایک آدمی آپ ﷺ سے ملا اور اس نے سلام کیا۔ آپ ﷺ نے اس کو سلام کا جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ آپ ﷺ دیوار کے پاس آئے، اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا، پھر اس کو سلام کا جواب دیا۔[۱]

ایک دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ ابوجہیم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ بیرِ جمل سے پیشاب یا پاخانہ کر کے واپس آئے تو میں نے آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے مجھے سلام کا جواب نہیں دیا۔ آپ ﷺ نے دیوار پر اپنا ہاتھ ایک دفعہ مارا، پھر اس کو اپنے چہرے پر پھیرا، پھر دوسری ضرب لگائی اور اس سے اپنے بازوؤں کا کہنیوں سمیت مسح کیا، پھر سلام کا جواب دیا۔[۲]

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ تیمّم میں دو ضربیں ہیں، ایک ضرب چہرے کے لیے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کے لیے کہنیوں تک۔[۳]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”تیمّم میں دو ضربیں ہیں، ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری ضرب سے دونوں ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرے۔“[۴]

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے تیمّم کا طریقہ دریافت کیا گیا اور پوچھا گیا کہ کہاں تک مسح کرے؟ فرمایا کہ ایک ضرب لگائے چہرے کے لیے اور ایک ضرب دونوں ہاتھوں کے لیے لگائے کہ اس سے ہاتھوں کا کہنیوں تک مسح کرے۔[۵]

مٹی کا بدن کو لگنا بھی دو ضربوں کے قائم مقام ہے جب کہ تیمّم کی نیت کر لے۔

کمال رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: نظر اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ ضرب کا اعتبار نہ ہو جو کہ تیمّم کا شرعی مفہوم ہے، کیونکہ مامور بہ تو صرف مسح ہے اور کوئی چیز نہیں ہے۔

---

۱ [صحیح البخاری:۱/۸۸]　۲ [سنن الدارقطنی:۱/۱۷۷]　۳ [سنن الدارقطنی:۱/۱۸۰]

۴ [المستدرک:۱/۱۸۰]　۵ [المؤطا:۱/۵۸]

کتاب اللہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ عالی: "فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَ أَيْدِيكُمْ" [النساء: ۴۳] اور حدیث نبوی میں پیغمبر ﷺ کا فرمانِ مبارک: "التیمم ضربتان" تیمّم کرنے والوں کے عام حالات کے مطابق ہے، کیونکہ وہ مسح کے لیے دو ضربوں کا استعمال کیا کرتے تھے۔

تیمّم کے قائم مقام وضو ہونے کیلئے استیعاب شرط ہے، اسی لیے فقہاء کہتے ہیں کہ تیمّم کرنے والا انگلیوں کا خلال بھی کرے اور انگوٹھی کو بھی اتار دے اور چہرے کی ظاہری کھال کا مسح کرے۔

تیمّم کا طریقہ

جب امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تیمّم کا طریقہ دریافت کیا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی کہ آپ دونوں ہاتھوں کو پاک مٹی پر مارتے ہوئے آگے کو لائے اور پھر پیچھے لے گئے، پھر ان کو اٹھا کر جھاڑا، پھر اپنے چہرے کا مسح کیا، پھر پہلے کی طرح دونوں ہاتھ مٹی پر مارے اور جھاڑے اور ہر ہتھیلی سے دوسرے بازو کا اور ان کے اندرونی حصوں کا کہنیوں تک مسح کیا۔

تیمّم کی سنتیں

تیمّم کی سات سنتیں ہیں: (۱) شروع میں بسم اللہ پڑھنا (۲) ترتیب کا لحاظ رکھنا، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ (۳) پے در پے تیمّم کرنا، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا عمل منقول ہے۔ (۴) ہاتھوں کو مٹی پر رکھ کر آگے کو لانا۔ (۵) پھر پیچھے کو لانا (۶) پھر ان کو جھاڑنا (۷) انگلیوں کو کشادہ رکھنا تاکہ ان کے درمیان میں غبار آ جائے۔

حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ "ہم نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ تیمّم کیا، ہم نے اپنے ہاتھ پاک مٹی پر مارے، پھر ہم نے اپنے ہاتھوں کو جھاڑا، پھر ان سے اپنے چہروں کا مسح کیا، پھر ہم نے پاک مٹی پر ایک اور ضرب لگائی، پھر اپنے ہاتھوں کو جھاڑ کر اپنے ہاتھوں سے کہنیوں سے لے کر ہتھیلیوں تک مسح کیا، بالوں کے اگنے کی جگہ تک یعنی ہتھیلیوں کے اندرونی اور بیرونی حصے تک۔[۱]

سوال: تیمّم چہرے اور ہاتھوں کے ساتھ کیوں خاص ہے (باقی اعضائے وضو کیوں شامل نہیں)؟
جواب: اس لیے کہ تیمّم اصل کا بدل ہے اور اصل غسل ہے۔ اور سر کا مسح کیا جاتا ہے اور پاؤں مسح اور

---

[۱] [سنن الدار قطنی: ۱/۱۸۰]

غسل میں متردد ہیں (یعنی کبھی ان کو دھویا جاتا ہے اور کبھی ان پر مسح کیا جاتا ہے)۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روایت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پر عمل کرنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے، جس میں یہ ہے کہ چہرے اور دو ہتھیلیوں کا تیمّم کیا جائے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چہرے اور دونوں بازوؤں کا مسح کیا ہے اور یہ بات زیادہ قرین قیاس بھی ہے اور اشبہ بالقرآن بھی، کیونکہ کسی چیز کا بدل اس کے ہی مثل ہوتا ہے۔

حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ میں چہرے اور ہتھیلیوں کا مسح ثابت ہے اور یہ مسح ذراعین والی حدیث سے زیادہ ثابت اور قوی ہے جس میں یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے ہاتھوں کا مسح اپنے کندھوں اور بغلوں تک کیا۔ لیکن مسح ذراعین والی حدیث بھی مذکورہ شواہد کی بناء پر جید ہے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ کی حدیث اس وقت کی ہے کہ جب آیتِ تیمّم ابھی نازل ہوئی تھی جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آنحضورؐ کے پاس واپس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بتایا کہ انہوں نے جو عمل کیا، تیمّم میں اس سے کم مقدار پر اکتفاء کرنا ان کے لیے جائز تھا، معلوم ہوا کہ مسح ذراعین والی حدیث اس کے بعد کی ہے، یہی اتباع کے زیادہ لائق ہے اور کتاب وقیاس کے زیادہ موافق ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا عمل بھی اس کے مطابق ہے۔ حدث، جنابت اور حیض ونفاس سب تیمّم میں برابر ہیں۔

حضرت عمران بن حصین الخزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ لوگوں سے علیحدہ بیٹھا ہوا ہے، لوگوں کے ساتھ اس نے نماز نہیں پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ اے فلاں! تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! مجھے جنابت پیش آ گئی تھی پانی بھی نہیں ملا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پاک مٹی کو استعمال کرو، وہ تیرے لیے کافی ہے۔"[1]

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ، حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے کسی کام کے لیے بھیجا، مجھے جنابت پیش آئی، پانی نہ ملا تو میں مٹی میں ہی لوٹ پوٹ ہوا جیسے جانور لوٹ پوٹ ہوتا ہے، پھر میں نے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "تمہارے لیے تو بس یہ کافی تھا کہ تم اس طرح کر لیتے۔" (الحدیث)
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو تیمم کا طریقہ بتایا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تیمّم ہر اس چیز سے جائز ہے جو زمین کی جنس میں سے ہو۔
امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اُگانے والی مٹی سے تیمّم جائز ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک روایت یہی ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ آیت ہے: "فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا"[2]

[1] [صحیح البخاری: ۹۲/۱] [2] [النساء: ۴۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق ''صعیدًا طیباً'' سے مراد تراب منبت (اگانے والی مٹی) ہے۔ طرفین کی دلیل یہ ہے کہ ''صعید'' روئے زمین کو کہتے ہیں، یعنی زمین کا بالائی حصہ، اس کو صعید اسی بناء پر کہتے ہیں کہ وہ زمین کا بالائی حصہ ہوتا ہے، اور ''طیب'' کے معنی میں احتمال ہے کہ اس کا معنی طاہر اور پاک کا ہو، اور یہ مقام، مقام طہارت ہے اس لیے یہ معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ تیمّم کے لیے گرد و غبار کا ہونا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شرط نہیں ہے، اس کے بغیر بھی تیمّم جائز ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت یہی ہے اور ان کی دوسری روایت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق ہے کہ گرد و غبار کا ہونا شرط ہے، اس کے بغیر تیمّم جائز نہیں ہے۔ ان کی دلیل، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ''فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ'' اس آیت میں ''منه'' سے مراد مٹی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل سورۃ النساء کی یہ آیت ہے: ''فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ'' [النساء:۴۳] (جس میں ''منه'' نہیں ہے)

نیت کا حکم

تیمّم میں نیت کرنا فرض ہے۔ اس لیے کہ مٹی حقیقت میں ملوث ہے مطہر نہیں ہے، چنانچہ نیت سے ہی وہ مطہر بنے گی۔ مٹی وغیرہ پر ہاتھ مارتے وقت یا اعضاء پر مسح کرتے وقت نیت کرے اور تیمّم سے نماز جائز ہونے کے لیے حدث اور جنابت کو دور کرنے کی یا نماز جائز ہونے کی یا اس عبادتِ مقصودہ کی جو طہارت کے بغیر درست نہ ہو' نیت کرے۔

نواقضِ تیمّم

(۱) جو چیز وضو کو توڑتی ہے وہ وضو کے تیمّم کو بھی توڑتی ہے اور جو چیز غسل کو واجب کرتی ہے وہ غسل کے تیمّم کو توڑتی ہے کیونکہ تیمّم وضو کا خلیفہ ہے لیکن وضو کے توڑنے والی چیز سے غسل کا تیمّم نہیں ٹوٹتا۔

(۲) پانی مل جائے اور اس کے استعمال پر قادر بھی ہو تو تیمّم ٹوٹ جاتا ہے، اس سے مراد اتنا پانی ہے جو رفعِ حدث کے لیے کافی ہو، لیکن اگر اتنا پانی دستیاب ہوا جو اس کے لیے کافی نہ ہو یا وہ پیاسا ہو، اسے پینے کی ضرورت ہو تو اس کا تیمّم نہیں ٹوٹے گا۔

(۳) اگر تیمّم سے نماز پڑھ لینے کے بعد پانی ملے تو نماز کا اعادہ نہ کرے، اس لیے کہ اس نے اس حکم کو ادا کیا ہے جس کا اسے مامور بنایا گیا تھا اور وہ ہے تیمّم سے نماز ادا کرنا، لہٰذا وہ اس سے عہدہ برا ہو چکا۔

(۴) اگر نماز کے دوران پانی مل جائے تو وضو کر کے از سر نو نماز پڑھے، اس لیے کہ وہ اصل پر قادر ہو گیا ہے قبل اس کے کہ وہ اس کے خلیفہ (بدل) کے ساتھ مقصود کو حاصل کرے۔ نیز اس لیے کہ تیمّم پانی کے مِل جانے کی وجہ سے ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا اس کی طہارت ختم ہو جائے گی اور وہ وضو کر کے از سر نو نماز پڑھے گا۔

ایک تیمّم سے کتنی نمازیں پڑھ سکتا ہے؟

ایک تیمّم سے جتنی چاہے نمازیں پڑھے خواہ فرض نماز ہو یا نفل، جیسے وضو سے جتنی چاہے نمازیں پڑھ سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پاک مٹی مسلمان کے لیے بمنزلہ وضو ہے، اگر چہ دس سال تک پانی نہ پائے۔''[۱]

صحیح بخاری میں ہے کہ پاک مٹی، مسلمان کے لیے وضو کی طرح ہے (جس میں) اس کو پانی کافی ہوتا ہے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لیے تیمّم کافی ہے جب تک کہ وہ بے وضو نہ ہو۔[۲]

اس بارے میں فرض نماز اور نفل نماز میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی قبل از وقت اور بعد از وقت کا فرق ہے، جب تک پانی معدوم ہو ہر طرح کی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں تیمّم کو ذریعہ طہارت قرار دیا ہے، فرمایا: وَلٰكِن يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ'' [المائدۃ:٦] یعنی لیکن اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے۔'' اسی طرح وَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰٓى (سے) فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً (تک) [المائدۃ:٦] آیت کا عموم اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس طرح وضو وقت سے پہلے بھی جائز ہے اسی طرح تیمّم بھی اس کا بدل ہونے کی وجہ سے وقت سے پہلے جائز ہے۔

جس شخص کو پانی کے مِل جانے کی امید ہو اس کے لیے مستحب ہے کہ وہ نماز میں تاخیر کرے، تاکہ نماز کامل اور مکمل طہارت کے ساتھ ادا ہو۔

جب نمازِ جنازہ تیار ہو تو تندرست آدمی شہر کے اندر بھی تیمّم کر سکتا ہے جب کہ اس میت کا ولی کوئی اور شخص ہو، اور اسے خوف ہو کہ اگر وہ وضو میں مشغول ہو گیا تو نماز چھوٹ جائے گی۔ اس لیے کہ نمازِ جنازہ کی قضاء نہیں ہوتی، پس اس کا عجز ثابت ہو گیا۔ اسی طرح عید کی نماز میں خوف ہو کہ وضو میں مشغول ہو گیا تو عید کی نماز چھوٹ جائے گی تو تیمّم کر لے، کیونکہ اس نماز کا بھی اعادہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن اگر وہ شخص خود میت کا ولی ہو تو اس کے لیے تیمّم کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس کو اعادہ کا حق حاصل ہے۔ پس اس کے حق میں نماز کے فوت ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے۔

---

۱ [سنن النسائی: ۱/۱۷۱] ۲ [صحیح البخاری: ۱/۸۹]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب اچانک کوئی جنازہ آجائے اور تو بے وضو ہو تو تیمّم کرلو۔''[۱]

نمازِ جمعہ میں آنے والے کو یہ خوف ہو کہ اگر وضو میں مشغول ہو گیا تو نمازِ جمعہ فوت ہو جائے گی تو اس کو تیمّم کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس نماز کا قائم مقام اور بدل موجود ہے۔ اس لیے اس کو چاہیئے کہ وضو کرے، اگر نمازِ جمعہ مل جائے تو نمازِ جمعہ ادا کرے اور اگر جمعہ کی نماز نہ ملے تو ظہر کی چار رکعتیں پڑھے۔ اسی طرح جب نماز کا وقت تنگ ہو، خوف ہو کہ اگر وضو کرے گا تو وقت ختم ہو جائے گا تو تیمّم کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ وضو کر کے نماز پڑھے، خواہ وقت نکل جائے قضاء پڑھ لے۔

مسافر اگر اپنی گاڑی وغیرہ میں پانی بھول جائے اور تیمّم کر کے نماز پڑھ لے، پھر اس کو پانی یاد آئے تو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کا اعادہ نہیں کرے گا اور امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ نماز کا اعادہ کرے گا۔ اور ائمہ کا یہ اختلاف اس صورت میں ہے کہ جب وہ پانی اس نے خود رکھا ہو یا کسی دوسرے نے اس کے حکم سے رکھا ہو یا بغیر حکم کے رکھا ہو مگر اس کو معلوم ہو اور اگر اس کو معلوم نہ ہو تو بالاتفاق نماز کا اعادہ نہ کرے خواہ وقت کے اندر یاد آئے یا وقت کے بعد یاد آئے برابر ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے کہ وہ پانی کو پانے والا ہے، اس پر پانی کو تلاش کرنا لازم تھا، اس لیے اعادہ کرے۔ طرفین کی دلیل یہ ہے کہ علم کے بغیر قدرت کا تحقق نہیں ہوتا اور پانی کے پائے جانے سے یہی مراد ہے۔

اگر اس کو قریب میں پانی ہونے کا گمان غالب نہ ہو اور نہ کوئی خبر دے تو پانی طلب کرنا (تلاش کرنا) واجب نہیں ہے۔ اگر گمان غالب ہو کہ پانی قریب ہے تو اس کے لیے تیمّم کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ایک غلوہ کی مقدار طلب کرنا واجب ہے۔ غلوہ ایک تیر کے پھینکنے کے بقدر فاصلہ ہوتا ہے اور یہ مقدار تخمیناً چار سو گز شرعی ہے، بعضوں نے تین سو گز بتائی ہے۔ اصح یہ ہے کہ اتنی دور تک طلب کرے کہ اس کو خود جان و مال کا ضرر نہ ہو اور ساتھیوں کو انتظار کی مشقت نہ ہو، اگر ایسا ہو تو طلب نہ کرنا مباح ہے۔ اگر اس کے ساتھی کے پاس پانی ہے تو تیمّم کرنے سے پہلے اس سے مانگے، کیونکہ عام طور پر اس سے کوئی انکار نہیں کرتا، اگر وہ نہ دے تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لے، کیونکہ اب اس کا عجز ثابت ہو گیا۔ اگر ساتھی سے مانگنے سے پہلے ہی تیمّم کرلیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کافی ہو جائے گا، اس لیے کہ دوسرے کی مِلک سے اس کو طلب کرنا اس پر لازم نہیں ہے۔ صاحبینؒ کہتے ہیں کہ وہ تیمّم اس کے لیے کافی نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ پانی ایسی چیز ہے جو عام طور پر دوسرے کو دے دی جاتی ہے، اگر

---

[۱] [جامع الرضوی: ۱/۱۶۵]

وہ معمول کی قیمت کے بغیر نہ دے اور اس کے پاس اس کی قیمت ہو تو قدرت پائے جانے کی وجہ سے اس کے لیے تیمّم کرنا جائز نہیں ہے اور اگر اس کو لینے میں نقصان ہو، وہ یہ کہ وہ ساتھی معمول سے دو چند قیمت مانگتا ہو اور اس سے کم میں نہ بیچتا ہو تو تیمّم کرلے۔

فاقد الطهورین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز کو مؤخر کرے گا اور صاحبین کے نزدیک اس وقت نمازیوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرے گا اور بعد میں نماز کا اعادہ کرے گا۔ وضو اور تیمّم دونوں کو جمع نہیں کرے گا۔

جس شخص کو کوئی زخم ہو، پانی اس زخم کو نقصان پہنچاتا ہو اور اس پر غسل واجب ہو تو اس جگہ کے سوا باقی سارے بدن کو دھولے اور اس زخم کا تیمّم نہ کرے، یہی حکم ہے کہ جب زخم وضو کے اعضاء میں سے کسی عضو میں ہو تو اس کو چھوڑ کر باقی حصے کو دھولے اور اس جگہ کا تیمّم نہ کرے، اگر زخم جسم کے اکثر حصے میں ہو تو تیمّم کرے، باقی جسم کو نہ دھوئے، اگر آدھا بدن زخمی ہو اور آدھا صحیح ہو تو بعضوں نے تیمّم کو واجب قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہ کامل طہارت ہے، اور بعضوں نے صحیح حصے کا غسل (دھونا) اور زخمی حصے کا مسح لازم قرار دیا ہے جب کہ مسح اس کو ضرر نہ دے، اس لیے کہ یہ طہارت حقیقی وحکمی ہے، لہٰذا یہ زیادہ بہتر ہے، لیکن پہلا قول احسن ہے۔

جس شخص کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں مقطوع ہوں تو اگر اس کے چہرے پر بھی زخم ہو تو بغیر طہارت کے نماز پڑھے اور بعد میں اعادہ نہیں کرے گا اور یہی اصح ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کے ذمہ سے نماز ساقط ہے اور یہ صحیح نہیں ہے۔ مفلوج آدمی اپنے چہرے اور بازوؤں کا زمین سے مسح کرے گا، نماز کو ترک نہ کرے۔

موزوں پر مسح کرنے کا بیان

موزوں پر مسح کرنا جائز اور سنت سے ثابت ہے۔ اس کے جواز پر احادیثِ مشہورہ وارد ہوئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ثبوت اس درجے کا ہے کہ اس سے یہ بات بلاشک وشبہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی موزوں پر مسح فرمایا کرتے تھے اور اپنے اصحابِ کرامؓ کو بھی اس کی اجازت دیا کرتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے ستر اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا۔ جو شخص مسح خفین کو جائز نہ سمجھتا ہو وہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بدعتی ہے، لیکن جو شخص اس کو ثابت مانتا ہو اور عزیمت پر عمل کرتے ہوئے مسح نہ کرے تو وہ ماجور ہے۔

حضرت افلح رحمۃ اللہ علیہ مولی ابوایوب فرماتے ہیں کہ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ ہمیں موزوں پر مسح کرنے کا حکم دیتے تھے، لیکن خود اپنے پاؤں کو دھوتے تھے، کسی نے اس کی وجہ پوچھی کہ آپ ہمیں تو مسح کرنے کا امر کرتے ہیں لیکن خود پاؤں دھوتے ہیں؟ فرمایا کہ میری بدنصیبی! تم مبارکباد کے قابل ہو اور میں گناہ کے لائق! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا حکم دیتے تھے، لیکن میں ایسا آدمی ہوں کہ مجھے وضو سے ہی محبت ہوگئی ہے۔[۱]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہمام بن حارث تک اپنی سند کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے وضو کیا اور اپنے موزوں پر مسح کیا۔ ان سے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ سورۃ المائدہ کے نزول کے بعد میں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اختیار کی ہے۔[۲]

نیز امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے سالم بن عبداللہ بن عمرؓ تک اپنی سند کے ساتھ یہ روایت ذکر کی ہے کہ سالمؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا مسح خفین کے بارے میں اختلاف ہوا۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں مسح کروں گا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تیرا چچا سنت میں تجھ سے زیادہ فقیہ ہے۔''[۳]

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قضاء حاجت کے لیے نکلے، جب واپس آئے تو میں نے وضو کا برتن لیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے پانی انڈیلا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھوں کو دھویا، پھر چہرہ دھویا، پھر بازو دھونے لگے تو جبہ تنگ ہوگیا (یعنی اس کی آستینیں تنگ تھیں) تو آپ نے جبے کے نیچے سے بازوؤں کو نکالا، پھر ان کو دھویا، اور سر کا مسح کیا اور پھر اپنے موزوں پر مسح کیا، پھر ہمیں نماز پڑھائی۔''[۴]

موزوں پر مسح ہر ایسے حدث کی وجہ سے درست ہے جو موجب وضو ہو۔

حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں حکم فرماتے تھے کہ جب ہم مسافر ہوں تو اپنے موزوں پر مسح کریں اور پیشاب، پاخانہ اور نیند کی وجہ سے تین روز تک ان کو نہ نکالیں مگر جنابت کی وجہ سے

---

۱ [سنن البیہقی: ۱/۲۹۳] ۲ [جامع الرضوی: ۱/۱۷۰]

۳ [جامع الرضوی: ۱/۱۷۰] ۴ [صحیح مسلم: ۱/۲۲۹]

(موزے نکالنے کا حکم فرماتے)''۔[۱]

جو موزہ مسح کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ موزہ ٹخنوں کو ڈھانکنے والا ہو، چمڑے کا ہو اور بغیر باندھے خود ہی تھمنے والا ہو اور پاؤں کی کھال تک پانی کے پہنچنے سے مانع ہو اور اس کو پہن کر مسلسل چلنا معمول کے مطابق ممکن ہو۔

جوازِ مسح کی شرائط:

جوازِ مسح کے لیے ضروری ہے کہ کامل طہارت پر موزے پہنے ہوں، جیسا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسافر کو تین دن اور تین رات اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات کی رخصت دی ہے کہ جب طہارت حاصل کرنے کے بعد اپنے موزوں کو پہنا ہو تو موزوں پر مسح کرلے۔''[۲]

معلوم ہوا کہ موزے پہننے سے پہلے وضو کرنا شرط ہے، یعنی جوازِ مسح کے لیے ضروری ہے کہ موزہ پہننے کے بعد حدثِ اصغر لاحق ہونے کے وقت طہارت کامل ہو، موزہ پہننے کے وقت طہارت کامل ہونا ضروری نہیں۔ خواہ موزہ پہننے سے پہلے طہارت کامل ہو چکی ہو یا اس کے بعد۔ پس اگر پہلے دونوں پاؤں دھوئے پھر دونوں موزے پہنے، پھر حدث سے پہلے وضو پورا کرلے تو حدث کے بعد اس پر مسح جائز ہے۔

چنانچہ موزہ پہننے کے بعد جب حدث ہو تو اس کے بعد مقیم ایک دن اور ایک رات تک مسح کرسکتا ہے اور مسافر تین دن اور تین رات تک مسح کرسکتا ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے کی طہارت غسل کی ہے مسح کی نہیں ہے، اور موزہ حدث کے وقت ہی حدث کی سرایت سے مانع قرار دیا گیا ہے اس سے قبل نہیں۔

موزوں کے ظاہر حصے پر مسح کرے گا، اس کی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میں نے موزوں کے ظاہر حصے پر مسح کرتے ہوئے دیکھا۔[۳]

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر دین کا دار و مدار (محض) رائے اور عقل پر ہوتا تو موزے کا نیچے والا حصہ اس کے اوپر والے حصے کی بہ نسبت مسح کرنے کے زیادہ لائق ہوتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موزوں کے اوپر والے حصے پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[۴]

---

۱ [سنن النسائی: ۱/۸۴]　۲ [سنن الدار قطنی: ۱/۱۹۴]

۳ [سنن الترمذی: ۱/۶۷]　۴ [سنن ابی داؤد: ۱/۴۲]

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ موزوں پر مسح انگلیوں سے خط کھینچتے ہوئے کرے۔[1]

سنت یہ ہے کہ انگلیوں کے کناروں سے مسح شروع کرے اور پنڈلی کی جڑ تک لے جائے، اس کی دلیل حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر ایک آدمی کے پاس سے ہوا وہ وضو کر رہا تھا۔ اور اپنے موزوں کا مسح کر رہا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فرمایا مجھے مسح کرنے کا اس طرح کم دیا گیا ہے کہ انگلیوں کے کناروں سے مسح کو شروع کر کے پنڈلی کی جڑ تک لے جائے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں سے خط کھینچا۔[2]

اگر اس کا عکس کرے یعنی پنڈلی سے شروع کر کے انگلیوں کے کناروں پر ختم کرے تو جائز ہے کیونکہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خلافِ سنت رہے۔

ہاتھ کی تین چھوٹی انگلیوں کے برابر مسح کرنا فرض ہے۔ جیسا کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے۔ اس لیے کہ یہ مسح کا آلہ ہے اور مسح کرنے کی جگہ پر بقدر تین انگشت پانی لگ جائے تو جائز ہے۔

بہت پھٹے ہوئے موزے پر مسح کرنا جائز نہیں ہے جس میں پاؤں (پیر) کی چھوٹی تین انگلیوں کے برابر ظاہر ہو جائے۔ اس لیے کہ پاؤں میں اصل اعتبار انگلیوں کا ہے اور تین انگلیاں اکثر حصہ ہیں، پس اکثر کو کل کے قائم مقام کر دیا گیا اور چھوٹی انگلیوں کا اعتبار احتیاط کے پیش نظر کیا گیا ہے اور یہ مقدار ہر موزے میں علیحدہ علیحدہ شمار ہوگی۔ چنانچہ ایک موزے کے خرق (سوراخ اور پھٹن) کو جمع کیا جائے گا اور دو موزوں کے جمع نہیں کیا جائے گا اس لیے کہ ایک موزے کا شگاف دوسرے کے ساتھ سفر طے کرنے سے مانع نہیں ہے۔ لیکن متفرق نجاست کا مسئلہ اس کے خلاف ہے۔ یعنی اگر دونوں موزوں پر تھوڑی نجاست لگی ہو درآنحالیکہ دونوں میں سے ہر ایک کی نجاست ایک درہم سے کم ہے مگر دونوں مل کر ایک درہم سے زائد ہو جاتی ہے تو اس صورت میں نماز جائز نہیں ہوگی، کیونکہ یہ شخص سب نجاست کا اٹھانے والا ہے اور جو شخص ایک درہم سے زائد نجاست کا اٹھانے والا ہو خواہ وہ متفرق ہو یا مجتمع تو اس پر طہارت واجب ہے، اس کے بغیر نماز درست نہ ہوگی اور ستر کا کھلنا نجاست کی نظیر ہے، چنانچہ اگر عورت کی شرمگاہ سے کچھ حصہ کھلا اور کچھ پیٹ سے، کچھ پنڈلی سے اور کچھ بالوں سے، پس اگر یہ سب مل کر چوتھائی عضو کے برابر ہو جائے تو اس کی نماز جائز نہیں ہے۔

---

[1] [سنن الدارقطنی ۱/۱۹۴] [2] [سنن ابن ماجہ ۱/۵۵۱]

موزوں کے اوپر جرموق (جو موزے کے اوپر پہنا جاتا ہے تاکہ موزہ کو کیچڑ اور نجاست وغیرہ سے بچایا جاسکے) پر مسح کرنا جائز ہے جبکہ اس کو حدث سے پہلے موزوں پر پہنا ہو، اگر حدث کے بعد یا موزوں پر مسح کرنے کے بعد پہنا ہو تو جرموق پر مسح کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ حدث موزہ میں سرایت کرچکا ہے۔

جرابوں پر مسح کرنے کا حکم؟

اگر جرابیں موٹے کپڑے کی ہوں اور ان سے پانی نہ چھنتا ہو تو اس پر مسح کرنا جائز ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا یہی قول ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف رجوع کرلیا تھا اور اسی پر فتویٰ ہے۔ اس کی دلیل حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضو کیا اور جوربین اور نعلین پر مسح کیا۔[1]

امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب اور صورت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوربین کے اوپر نعلین پہنے ہوئے ہوں۔ اسلاف کی ایک جماعت مسح علی الجوربین کو جائز قرار دیتی ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام اسحاقؒ اور فقہائے امصار کی ایک جماعت کا یہ مذہب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مسح علی الجوربین جائز نہیں ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اس طرح منعل ہوں کہ ان میں مسلسل چلنا ممکن ہو تو تب مسح جائز ہے۔[2] اور پتلی باریک جرابوں پر مسح کرنا درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اسلاف کے عرف میں "جورب" وہ ہے جو پاؤں کو گرم رکھنے کے لیے بنائی جائے اور وہ گاڑھی اور موٹی ہوتی ہے جو اون سے بنائی جاتی ہے جیسا کہ المسند کی شرح میں مذکور ہے۔

مسح توڑنے والی چیزیں

جو چیزیں وضو کو توڑتی ہیں وہ مسح موزہ کو بھی توڑتی ہیں۔ کیونکہ مسح اس کا خلیفہ (بدل) ہے، لہٰذا جو چیز اصل (وضو) کے لیے ناقض ہوگی وہ مسح کے لیے بھی ناقص ہوگی۔ دونوں موزوں یا ایک موزے کا پاؤں سے نکالنا یا نکلنا بھی ناقض مسح ہے، کیونکہ قدم میں حدث سرایت کرنے سے موزہ مانع تھا، جب یہ مانع دور ہوگیا تو حدث سرایت کرگیا اور مسح ٹوٹ گیا۔ اب اس کا دھونا ضروری ہوگیا۔ اکثر قدم (آدھے سے زیادہ) کا موزے سے نکلنا پورے پاؤں کے نکل آنے کے حکم میں ہے۔ چنانچہ سعید بن ابی مریمؒ ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ ایک شخص موزوں پر

---

[1] [سنن الترمذی ۱/۶۷] [2] [معالم السنن ۱/۶۳]

مسح کرتا ہو پھر وہ ان کو اتار دے تو کیا کرے؟ فرمایا کہ اپنے قدموں (پاؤں) کو دھوئے گا۔[۱]

اگر موزہ کھلا ہے، جب پاؤں اٹھاتا ہے تو ایڑی موزہ سے نکل جاتی ہے اور جب پاؤں رکھتا ہے تو پھر اپنی جگہ پر آجاتی ہے تو اس پر مسح جائز ہے۔ موزے میں کسی ایک قدم (پاؤں) کے اکثر حصے کا پانی سے بھیگ جانا بھی ناقض مسح ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے سارا پاؤں پانی سے بھیگ جائے تو مسح ٹوٹ جاتا ہے۔ پس موزہ اتار کر دونوں پاؤں کو دھونا واجب ہے تاکہ غسل اور مسح کو جمع کرنے سے احتراز ہو۔ مدت مسح گزر جانے سے بھی مسح ٹوٹ جاتا ہے اور اس مدت کی ابتدا اس حدث سے ہوتی ہے جو کامل طہارت پر موزوں کو پہننے کے بعد لاحق ہو۔ موزے کے نکلنے اور اکثر پاؤں کے پانی سے بھیگ جانے کے بعد اور مدت مسح کے گزر جانے کے بعد صرف پاؤں کو دھولے، سارا وضو دوبارہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ پہلے سے باوضو ہو کیونکہ حدث سابق صرف اس کے پاؤں میں سرایت ہوئی ہے۔

متفرق مسائل

(۱) اگر مسافر نے مسح کیا، پھر ایک دن اور ایک رات کے بعد مقیم ہو گیا تو موزہ اتار دے، کیونکہ تین دن مدت سفر ہے اور یہاں سفر تو ہے نہیں، لہٰذا مسح جائز نہیں ہے۔ (۲) اگر مسافر مسح کرے پھر ایک دن اور رات سے پہلے ہی مقیم ہو جائے تو ایک دن اور ایک رات پورا کرے اس لیے کہ وہ مقیم ہے، لہٰذا مدت اقامت کو مکمل کرے۔ (۳) اگر مقیم مسح کرے، پھر ایک دن اور ایک رات سے پہلے ہی مسافر ہو جائے تو مدت سفر کو پورا کرے، اس لیے کہ وہ مسافر ہے اور حکم کا تعلق آخری وقت سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایک دن اور ایک رات کے بعد مسافر ہو جائے تو اس کا حکم اس کے خلاف ہے یعنی پاؤں کا دھونا ضروری ہے جبکہ باوضو ہو۔ اس لیے کہ (مدت گزرنے کی وجہ سے) حدث پاؤں میں سرایت کر گئی ہے۔

جبیرہ اور عصابہ پر مسح کرنا:

جبیرہ ان کھپچیو کو کہتے ہیں جو لکڑی یا بانس وغیرہ سے چیر کر ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھتے ہیں اور عصابہ کپڑے کی پٹی کو کہتے ہیں جو پھوڑے پھنسی اور زخم وغیرہ پر باندھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جبیرہ اور عصابہ پر مسح کرنا فرض نہیں ہے بلکہ واجب ہے، صاحبینؒ کے نزدیک ان پر مسح کرنا فرض ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ امام صاحبؒ نے بھی ان ہی کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا۔

---

[۱] [سنن البیہقی ۱/۲۸۹]

اور یہ مسح اس وقت کرے جب ان کے نچلے حصے کو دھونے یا مسح کرنے پر قادر نہ ہو۔ اگر جبیرہ اور عصابہ پر مسح کرنے سے ضرر ہو تو بالاجماع ترکِ مسح بھی جائز ہے۔ اگر ضرر نہ ہو تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تب بھی ترک جائز ہے یعنی فرض ادا ہو جائے گا۔ مگر اس کا لوٹانا واجب ہوگا اور صاحبین کے نزدیک ترک جائز نہیں، اسی پر فتویٰ ہے۔ امام صاحبؒ نے بھی اس کی طرف رجوع فرمالیا۔

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں نکلے۔ (راستہ میں) ہم میں سے ایک آدمی کو پتھر لگا جس سے اس کا سر زخمی ہوگیا، پھر اسے احتلام کی نوبت آئی اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا تم میرے لیے تیمم کی رخصت پاتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نہیں تم تو پانی پر قادر ہو، تم تیمم نہیں کر سکتے، چنانچہ اس نے غسل کیا تو فوت ہوگیا، جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ کو واقعہ کی خبر ملی تو فرمایا۔ ''انہوں نے اس شخص کو مار ڈالا، اللہ ان کو مار ڈالے، جب مسئلہ ان کو معلوم نہیں تھا تو کسی سے پوچھ کیوں نہیں لیا؟ کیونکہ جاہل کی شفاء پوچھ لینے میں ہے۔ اس کو تو تیمم کرنا ہی کافی تھا اور اپنے زخم پر پٹی باندھ لیتا، پھر اس پر مسح کر لیتا اور باقی جسم کو دھو لیتا۔''[1]

اگر جبیرہ و عصابہ زخم سے زیادہ جگہ پر ہو اور اس کو کھولنا اور زخم پر مسح کرنا دونوں نقصان دیں تو جس قدر زخم کے مقابل اور صحیح بدن کے مقابل ہے، سب پر مسح کرے اور اگر مسح نقصان دے اور کھولنا نقصان نہ دے تو کھولنا واجب ہے، چنانچہ اسے کھول کر اس قدر پر پٹی پر مسح کرے جو زخم کے اوپر اور اس کے آس پاس کو دھولے اور اگر کھولنا اور مسح دونوں نقصان نہ دیں تو زخم پر مسح کرے اور اس کے آس پس کو دھولے۔

جس عضو پر پٹی باندھی ہے اس کے اکثر حصے پر مسح کرے اور دو باندھی ہوئی پٹیوں کے درمیان جسم کے ظاہری حصے پر مسح کرنا کافی ہے، اگر درمیان کے صحیح حصے کو دھویا تو پانی زخم تک سرایت کر جائے گا۔

جبیرہ پر مسح کرنا ایسا ہی ہے جیسے اس کے نیچے کو دھونا۔ اس کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اصل ہے، بدل نہیں ہے۔ یہاں مسح کے صحیح ہونے کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ اسے طہارت پر باندھا ہو، کیونکہ وہ (جبیرہ وغیرہ) ضرورت کی صورت میں باندھی جاتی ہے، ایسی حالت میں طہارت کی شرط لگانا حرج اور تنگی کا باعث ہوگا۔

اگر ایک پاؤں کے جبیرہ پر مسح کرے اور دوسرے پاؤں کو دھوئے تو جائز ہے کیونکہ یہ خود اصل ہے لہٰذا یہاں پر اصل اور بدل کا جمع کرنا لازم نہیں آتا۔

---

[1] [سنن ابی داؤد ۱/۹۳]

اگر جبیرہ زخم کے ٹھیک ہونے سے پہلے گر جائے تو مسح باطل نہیں ہوتا، کیونکہ عذر ابھی موجود ہے، اس پر مسح کرنا ایسا ہی ہے جیسے اس کے نیچے کو دھونا، جبیرہ میں جنابت اور حدث دونوں برابر ہیں۔ اگر اوپر نیچے دو جبیرہ باندھے ہوئے ہوتا کہ وہ مضبوط رہے تو اوپر والے پر مسح کرنا جائز ہے۔ نیچے والے جبیرہ پر مسح کرنے کے لیے اوپر والے کو کھولنا ضروری نہیں ہے۔

اگر جبیرہ میں مسح کرنے کے بعد کسی طرح پانی داخل ہو جائے تو مسح باطل نہ ہوگا۔ اگر پہلے جبیرہ اور عصابہ کو بدل ڈالے تو دوسرے پر مسح کا لوٹانا واجب نہیں' ہاں مستحب ہے۔ اگر مسح کرنے کے بعد دوسرا جبیرہ باندھا تو یہ بھی جائز ہے۔ اگر ناخن ٹوٹ جائے اور اس پر دوا لگائی جائے اور اس کا چھڑانا نقصان دیتا ہو تو اگر ہو سکے تو اس کے اوپر پانی بہائے اگر اس پر قادر نہ ہو تو اس کے اوپر مسح کرے اور اگر مسح بھی نقصان دے تو اس کو چھوڑ دے یعنی عذر کی وجہ سے دونوں ساقط ہو گئے۔ موزے، جبیرہ اور سر کے مسح میں نیت کی ضرورت (شرط) نہیں ہے، نیت کے شرط نہ ہونے میں یہ سب برابر ہیں، کیونکہ یہ پانی سے طہارت حاصل کرنا ہے۔

﴿باب الحیض﴾

حیض کی ابتداء

امام دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الافراد'' میں نیز امام دیلمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''جبرائیل علیہ السلام نے مجھے بتایا کہ جس وقت حضرت حواء علیہا السلام کو حیض آیا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے حواء علیہا السلام کے پاس بھیجا، حضرت حواءؑ نے پکارا کہ بعض اوقات مجھے خون آتا ہے مجھے اس کی حقیقت اور وجہ معلوم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آواز دی کہ میں تجھے اور تیری اولاد کو ضرور خون آلود کروں گا اور اس کو تیرے لیے کفارے اور طہارت کا ذریعہ بناؤں گا۔''[۱]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کی ہے کہ ہم حج کے لیے روانہ ہوئے، جب ہم مقام ''سرف'' میں تھے تو مجھے حیض شروع ہوگیا۔ رسول کریمؐ میرے پاس تشریف لائے تو دیکھا کہ میں رو رہی ہوں۔ پوچھا کہ تجھے کیا ہوا، کیا حیض شروع ہوگیا ہے؟ میں نے کہا کہ جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''بے شک یہ ایسی چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بنات آدم کے لیے لکھ دیا ہے (یعنی مقرر کر دیا ہے) تم وہ تمام افعال بجالاؤ جو حاجی بجالاتے ہیں، لیکن بیت اللہ کا طواف نہ کرو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کی طرف سے گائے کی قربانی دی۔[۲]

حیض کا لغوی معنی سیلان (بہنا) کا ہوتا ہے اور شریعت مطہرہ میں حیض کی تعریف یہ ہے کہ حیض وہ خون ہے جو عورت کے رحم سے بغیر ولادت یا بیماری کے ہر مہینے فرج کے راستے سے نکلتا ہے۔

حیض کی مدت

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔[۳]

حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ خبر پہنچی ہے

۱ [جامع الرضوی ۱/۱۷۱] ۲ [صحیح البخاری ۱/۷۸] ۳ [سنن الدار قطنی ۱/۲۱۰]

کہ حیض کی ادنیٰ مدت تین دن ہے۔ حضرت یونس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حسنؒ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عورت اپنے حیض کے زمانے میں سات روز تک نماز سے باز رہے گی، پھر اگر پاک ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ سات اور دس روز کے درمیان کے زمانہ تک (نماز وغیرہ سے) رکی رہے۔ پھر اگر پاک ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ غسل کر کے نماز پڑھے اور وہ مستحاضہ ہے۔ ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ حیض (کی مدت) دس دن ہے، پس اگر اس سے زیادہ ہو تو وہ مستحاضہ ہوگی۔ ربیع بن صبیح رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کے حوالہ سے حدیث بیان کی ہے جس نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ (حیض کا خون) دس دن سے زیادہ ہو تو عورت مستحاضہ شمار ہوگی۔[۱]

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ عثمان بن ابی العاص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حیض والی عورت کا خون جب دس ایام سے تجاوز کر جائے تو وہ مستحاضہ ہوگی، یعنی غسل کر کے نماز پڑھے گی۔ عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیض کا ادنیٰ وقت ایک دن ہے اور حیض کا اکثر وقت پندرہ دن ہے۔[۲]

شافعیہ اور حنابلہ اسی کے قائل ہیں۔

حیض کے خون سے عورت بالغ ہو جاتی ہے جو شروع ہو کر مدت معلوم تک برابر جاری رہے۔ جو خون تین دن سے کم یا دس دن سے زیادہ ہو جائے وہ استحاضہ ہے۔ اسی طرح حاملہ عورت جو خون دیکھے وہ بھی استحاضہ کے حکم میں ہے، کیونکہ حمل کی وجہ سے رحم کا منہ بند ہو جاتا ہے اس سے کوئی چیز خارج نہیں ہوتی یہاں تک کہ بچہ پیدا ہو جائے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اس حاملہ عورت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت نقل کرتے ہیں جو دوران حمل خون کو دیکھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وہ خون نماز سے مانع نہیں ہے۔[۳]

اسی طرح حضرت یونس رحمۃ اللہ علیہ ایسی حاملہ کے بارے میں حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا۔ وہ مستحاضہ عورت کے حکم میں ہے، مگر وہ نماز کو ترک نہیں کرے گی۔

ایسی حاملہ عورت جو دوران حمل خون دیکھے اس کے بارے میں حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ اس خون کو دھوئے گی اور وضو کر کے نماز پڑھے گی۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ حمل کی صورت میں حیض کا حکم نہیں ہوگا۔ حضرت یونس رحمۃ اللہ علیہ ایسی حاملہ عورت کے بارے میں جو درد ولادت میں مبتلا ہو اور بچے پر خون دیکھے، حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کرتے ہیں کہ وہ نماز سے باز رہے۔

---

[۱] [سنن الدارمی ۱/۲۱۰] [۲] [سنن الدار قطنی ۱/۲۰۸] [۳] [سنن الدارمی ۱/۲۲۸]

حضرت عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ نماز پڑھتی رہے جب تک کہ وضع حمل نہ ہو۔[1]

حیض کی صفت

حیض مائل بہ سیاہی خون ہے جس میں عموماً بدبو ہوتی ہے۔ عورت زمانہ حیض میں سرخ رنگ، زرد رنگ یا مٹیالا رنگ (کا خون) دیکھے تو وہ بھی حیض ہے، یہاں تک کہ وہ خالص سفید رنگ کو دیکھ لے۔ بعض کہتے ہیں کہ حیض ایک چیز ہے جو ناک کی ریزش کی مانند ہوتی ہے جو حیض کے ختم ہونے پر نکلتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حیض وہ روئی ہے جس کے ذریعہ عورت اپنے آپ کو جانچتی ہے، جب سفید رنگ نکلے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''جب عورت حیض سے پاک ہو جائے۔ پھر طہر کے بعد ایسی چیز دیکھے جس سے وہ شک وتردد میں مبتلا ہو تو وہ شیطان کی طرف سے اس کے رحم پر اثر اور اس کو تکلیف دینا ہے۔ پس جب وہ نکسیر کے مثل یا قطرۂ خون یا گوشت کا دھوؤں دیکھے تو وضو کرے جیسے نماز کیلئے وضو کیا جاتا ہے، پھر نماز پڑھے، اگر تازہ خون دیکھے کہ جس میں کوئی تردد نہ ہو تو نماز نہ پڑھے۔[2]

جو عورت چھ دن یا سات دن حیض کے گزارنے کے بعد زرد رنگ یا مٹیالا رنگ دیکھے یا ایک قطرہ یا دو قطرے خون کے دیکھے اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ باطل ہے، اس سے کوئی ضرر نہیں ہوتا۔[3]

حیض کے احکام

حیض سے نماز ساقط ہو جاتی ہے، کیونکہ نمازوں کی تعداد بہت بڑھ جانے کی وجہ سے ان کو قضا کرنے میں حرج لازم آتا ہے۔ روزہ رکھنا بھی حرام ہو جاتا ہے، کیونکہ روزہ اس کے منافی ہے لیکن روزہ اس سے ساقط نہیں ہوگا، کیونکہ اس کو قضاء کرنے میں حرج نہیں لازم آتا۔ لہٰذا روزے کی قضاء واجب ہوگی لیکن نماز کی قضاء نہیں ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روزے تو پورے سال میں ایک ہی مرتبہ آتے ہیں، لہٰذا اس کو قضاء کرنے میں کوئی مشقت لاحق نہیں ہوگی۔ مگر دن رات میں پانچ نمازیں ہوتی ہیں۔ اس طرح حیض کی مدت میں پچاس نمازیں ہوں گی۔ اسی طرح ہر ماہ اتنی نمازیں ہوں گی...... جب کہ اس دوران اس کو نماز سے منع کیا گیا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب ماہواری شروع ہوئی تو انہوں نے تمام مناسک حج کو ادا کیا لیکن بیت اللہ کا طواف اور نماز ادا نہیں کی۔[4]

---

۱ [سنن الدارمی: ۱/۲۱۰] ۲ [سنن الدارمی ۱/۲۱۶]

۳ ایضاً ۴ [صحیح البخاری ۱/۸۰]

حیض والی عورت کے لیے مسجد میں داخل ہونا بھی حرام ہے، جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ ''لیکن تم بیت اللہ کا طواف نہ کرو، جب تک کہ پاک نہ ہو جاؤ۔''[۱]

حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حیض والی عورت مسجد سے کوئی چیز لے سکتی ہے لیکن اس میں داخل نہیں ہوسکتی۔[۲]

(مؤلف فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ اگر حیض والی عورت کے گھر میں کوئی کھڑکی وغیرہ ہو جو مسجد کی طرف کھلتی ہو جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تھی تو اس کے لیے جائز ہے کہ مسجد سے کوئی چیز لے لے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضور ﷺ مسجد سے اپنا سر مبارک نکالتے، اس وقت آپ اعتکاف میں ہوتے تو میں آپ ﷺ کا سر مبارک دھوتی حالاں کہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔[۳]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ مجھے مسجد سے کپڑا دے دو، میں نے کہا کہ میں حالت حیض میں ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا۔ ''کپڑا اٹھالو، کیونکہ حیض تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔''[۴]

اس سے معلوم ہوا کہ حیض والی عورت کے لیے مسجد میں داخل ہونا تو جائز نہیں ہے لیکن مسجد سے کوئی چیز لے لینا جائز ہے، البتہ مسجد کی طرف کوئی چیز داخل نہ کرے۔

جنبی شخص بھی حیض والی عورت کے حکم میں ہے، اس کے لیے بھی مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے، آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھروں کے رخ مسجد کی طرف تھے یعنی مسجد میں ان کا عام راستہ تھا تو آپؐ نے فرمایا: ''ان گھروں کے رخ مسجد سے پھیر دو۔'' کچھ عرصہ کے بعد حضور ﷺ تشریف لائے مسجد میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے ابھی تک کوئی کاروائی نہیں کی تھی اس امید پر کہ شاید ان کے حق میں رخصت نازل ہو جائے۔ آں حضرت ﷺ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔ ''ان گھروں کے رخ مسجد سے پھیر دو، کیوں کہ میں حیض والی عورت اور جنبی شخص کے لیے مسجد میں داخل ہونا حلال نہیں قرار دیتا۔''[۵] حیض والی عورت پر بیت اللہ کا طواف بھی حرام ہے۔

سوال: بیت اللہ کا طواف مسجد حرام میں داخل ہو کر ہی ہوسکتا ہے تو جب مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت پہلے معلوم ہوگئی ہے تو پھر طواف کے ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے؟

---

۱. [صحیح البخاری ۱/۱۷۱]　۲. [سنن الدارمی ۱/۲۶۴]　۳. [صحیح البخاری ۳/۶۰]
۴. [صحیح مسلم ۱/۲۴۵]　۵. [سنن ابی داؤد ۱/۶۰]

جواب: ایسا ہوسکتا ہے کہ مسجد میں داخل ہونے کے بعد اسے حیض آ جائے اور وہ طواف شروع کر چکی ہو۔

حیض والی عورت کے لیے قرآن پڑھنا بھی ناجائز ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''حیض والی عورت اور جنبی آدمی قرآن کا کچھ حصہ بھی نہ پڑھے۔''[1]

نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت الخلاء سے نکلتے تھے۔ پھر ہمیں قرآن پڑھاتے تھے اور ہمارے ساتھ گوشت کھاتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنابت کے سوا کوئی چیز قرآن کے پڑھنے سے نہیں روکتی تھی۔[2]

احادیث کے ظاہری مفہوم سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواہ ایک آیت ہو یا اس سے کم ہو تحریم (ناجائز ہونے) میں برابر ہے۔ فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر ایک آیت سے کم پڑھنے کا قصد کرے تو جائز ہے جیسے کہے: الحمدللہ اور مقصد اللہ کا شکر ادا کرنا ہو یا کھانے وغیرہ کے موقع پر بسم اللہ پڑھے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں ذکر اللہ سے مانع نہیں ہیں، اور قرآن کے ہجے کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، یعنی ایک آیت کو کلمہ کلمہ کرکے توڑ توڑ کر پڑھنا جائز ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جب حیض یا نفاس والی عورت معلّمہ ہو تو اس کے لیے جائز ہے کہ بچوں کو ایک ایک کلمہ کرکے سکھائے، پوری آیت (ایک ہی دفعہ) نہ سکھائے کیونکہ وہ تعلیم پر مجبور ہے اور اپنے حدث کو رفع کرنے پر قادر نہیں ہے لیکن اس پر قیاس کرتے ہوئے جنبی آدمی کے لیے یہ جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ اپنے حدث کو دور کرنے پر قادر ہے۔ جنبی اور حیض ونفاس والی عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ تسبیح وتحمید اور تہلیل کریں۔ حیض والی عورت پر حرام ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے نفس پر قدرت دے جیسا کہ فرمان رب العالمین ہے: ''فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ...... الآية'' [البقرۃ:۲۲۲] ''جب وہ پاک ہو جائیں تو پھر ان کے پاس جاؤ۔'' اگر خاوند اس کے پاس حالت حیض میں آئے تو اور اس حالت میں صحبت کو حلال سمجھے تو کافر ہو جائے گا اگر حلال نہیں سمجھتا تو کافر نہیں ہوگا، البتہ توبہ و استغفار کرنا لازم ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں مستحب ہے کہ ایک دینار صدقہ کردے، بعض کے نزدیک نصف دینار صدقہ کرے، ان میں تطبیق یوں ہوگی کہ اگر حیض کی ابتداء میں صحبت کی ہو تو ایک دینار اور اگر آخر میں صحبت کی ہو تو نصف دینار صدقہ کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اگر (حیض کا) خون سرخ ہو تو ایک دینار اور اگر زرد رنگ کا ہو تو نصف دینار ہے۔''[3]

---

[1] [سنن الترمذی ۱/۸۷]   [2] [سنن ابی داؤد ۱/۶۰]   [3] [سنن الترمذی ۱/۹۱]

ایک دینار ساڑھے چار ماشے سونے کا ہوتا ہے۔

کیا یہ صدقہ صرف مرد پر ہے یا دونوں پر؟ بظاہر مرد پر ہے عورت پر نہیں ہے اور اس کا مصرف (مد) وہی ہے جو زکوٰۃ کا مصرف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک خاوند کے لیے جائز ہے کہ وہ اس (حیض والی) عورت کے ساتھ لیٹے، اس سے بوس وکنار کرے اور سارے جسم سے استمتاع کرے لیکن ناف اور گھٹنے کے درمیان کے بدن سے لذت نہ اٹھائے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سارے بدن سے لذت اٹھا سکتا ہے صرف شعار دم سے اجتناب کرے یعنی خون نکلنے کے مقام سے احتراز کرے۔

ایسی عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر سے حیض کو اس لیے مخفی رکھے تا کہ وہ لاعلمی میں اس کے ساتھ صحبت کرے، اسی طرح اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ خاوند کو جماع سے روکنے کے لیے حیض کا اظہار کرے حالانکہ وہ حقیقت میں حیض والی نہیں ہے۔

حیض اور طہر دونوں حالتوں میں دبر میں وطی کرنا حرام ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ" [البقرۃ:۲۲۲] یعنی عورتوں کے پاس اس جگہ سے آؤ جس جگہ سے تم کو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا "لوگو! بے شک اللہ تعالیٰ حق بات کہنے سے نہیں شرماتے، تم اپنی بیویوں کے پاس ان کے پچھلے راستہ سے نہ آؤ"۔[1]

ایک شخص حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اس نے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! کیا میں اپنی بیوی سے جیسے چاہوں صحبت کر سکتا ہوں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں! اس نے کہا کہ جہاں سے چاہوں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں۔ اس نے پوچھا کہ جس طرح چاہوں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں۔ کسی نے آپ رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ اس شخص کا مقصد برائی کرنا ہے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں، عورت سے برائی کرنا حرام ہے! حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ ایسا کہتے ہیں؟ فرمایا ہاں!۔[2]

حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ، حضرت سعید رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ سب کے سب عورتوں سے دبر کے راستے سے وطی کرنا ناپسند کرتے تھے اور اس عمل کو کفر کہتے تھے۔[3]

عقلی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زوجہ بیوی کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے جس طرح زراعت کے لیے زمین ہے۔ اسی طرح اولاد کے لیے بیوی ہے۔ لواطت کی حرمت پر یہ دلیل ہے کہ وہ

---

۱ [سنن الدارمی ۱/۲۶۱] ۲ [سنن الدارمی ۱/۲۶۱] ۳ ایضاً

فرث (گندگی) کی جگہ ہے، حرث (کھیتی) کی نہیں۔

جب بے وضو آدمی کے لیے قرآن پاک کو چھونا جائز نہیں ہے تو جنبی اور حیض ونفاس والی عورت کے لیے بطریق اولیٰ قرآن کا چھونا جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ پڑھنے کا حکم چھونے کے حکم سے خفیف تر ہے تو جب ان کے لیے پڑھنا جائز نہیں تو ان کیلئے چھونا بطریق اولیٰ ناجائز ہونا چاہیے۔

بے وضو آدمی کے بارے میں قرآن کے پڑھنے اور چھونے کا فرق اس لیے ہے کہ حدث تو صرف اس کے ہاتھ میں سرایت ہوا ہے لیکن جنابت اس کے ہاتھ اور منہ دونوں میں سرایت کر چکی ہے، کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ جنابت میں ہاتھ اور منہ دونوں کا دھونا فرض ہے اور حدیث میں صرف ہاتھ کا دھونا فرض ہے، منہ کا دھونا فرض نہیں ہے۔ سالم بن عبداللہ بن عمر رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کو پاک آدمی ہی ہاتھ لگائے۔''[1]

بے وضو آدمی کے لیے جائز ہے کہ وہ مصحف (قرآن پاک) کے غلاف کو ہاتھ لگائے جب کہ غلاف اس سے الگ ہو کہ چھونے والے شخص اور مصحف کے درمیان کوئی تیسری چیز ہو، جیسے رومال وغیرہ۔ لیکن جو غلاف مصحف شریف سے متصل ہو اس سے جدا اور علیحدہ نہ ہو اس کو چھونا جائز نہیں ہے کیونکہ وہ مصحف کے تابع ہے بے وضو کے لیے جائز نہیں ہے کہ مصحف شریف کے اوراق پر اپنی انگلیاں رکھے یا ان کو پلٹے مگر جب کوئی چیز حائل ہو جیسے قلم وغیرہ۔ اسی طرح اگر کسی ورق یا کپڑے وغیرہ پر کوئی آیت لکھی ہوئی ہو اس کو چھونا بھی جائز نہیں ہے۔ گرایک آیت سے کم ہو تو تب بھی بہتر یہی ہے کہ ہاتھ نہ لگائے۔ تفسیر کی کتابوں میں قرآن کی جگہ پر ہاتھ لگانا جائز نہیں ہے اس کے علاوہ جگہ کو چھونا جائز ہے لیکن جب قرآن والا حصہ تفسیر سے زیادہ ہو تو ناجائز ہے۔

خلاصہ

احداث کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) حدث صغیر (۲) حدث متوسط (۳) حدث کبیر۔ حدث صغیر وہ ہے جو صرف وضو کو واجب کرتا ہو، جیسے پیشاب، پاخانہ، مذی، ودی، منہ بھر کرتے اور بدن سے خون اور پیپ کا نکل کر ایسی جگہ تک پہنچنا جس کو پاک کرنے کا حکم ہے۔ حدث متوسط جنابت ہے اور حدث کبیر، حیض ونفاس ہے۔

حدث صغیر پر یہ احکام مرتب ہوتے ہیں: نماز، سجدہ تلاوت اور مصحف شریف کا چھونا ناجائز ہے اور طواف مکروہ ہے۔ حدث متوسط پر یہ احکام مرتب ہوتے ہیں: مذکورہ امور کے عدم جواز

[1] [معجم الطبرانی ۲۴۴/۱۲]

کے علاوہ قرآن کا پڑھنا اور مسجد میں داخل ہونا بھی ناجائز ہے۔حدث کبیر کے احکام یہ ہیں: مذکورہ تمام امور کے ناجائز ہونے کے ساتھ ساتھ روزہ رکھنا اور خاوند کو اپنے اوپر قدرت دینا بھی ناجائز ہے اور ایسی حالت میں عورت کو طلاق دینا مکروہ ہے۔جنبی، حیض اور نفاس والی عورت کے لیے مصحف شریف کو دیکھنا مکروہ نہیں ہے۔

جب حیض کا خون دس دن سے کم مدت میں بند ہو جائے اور یہ انقطاع دم اس کی عادت کے مطابق ہو تو اس سے ہم بستری جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ غسل نہ کر لے یا مکمل نماز کا وقت اس پر نہ گزر جائے۔ کیونکہ خون کبھی بند ہوتا ہے اور کبھی جاری ہوتا ہے۔اس لیے غسل کرنا ضروری ہے تاکہ انقطاع دم کی جانب راجح قرار پائے اور وقت کو مکمل نماز کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔تاکہ اس صورت سے احتراز ہو جائے کہ جب خون ناقص نماز کے وقت میں منقطع ہو، جیسے نماز عید الفطر، نماز عید الضحیٰ، کیونکہ صحبت جائز نہیں ہے جب تک کہ وہ عورت غسل نہ کر لے یا ظہر کی نماز کا وقت نہ گزر جائے۔

جب حیض کا خون دس دن سے کم مدت میں بند ہو اور یہ انقطاع اس کی عادت کے خلاف ہو تو اس سے جماع جائز نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ غسل کر لے یا جب تک کہ اس کی عادت پوری نہ ہو جائے اس لیے کہ عادت کا واپس آنا غالب ہے۔لیکن وہ غسل کر کے احتیاطاً روزہ رکھے گی۔ جب اس کی عادت پوری ہو جائے تو اس کا شوہر اس سے صحبت کر سکتا ہے۔اگر یہ صورت عورت کی عدت کے آخری حیض میں پیش آئے تو رجعت کا حق باطل ہو جائے گا، عورت کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی اور سے شادی کرے جب تک کہ اس کی عدت نہ گزر جائے۔

جب مسافر عورت کا خون بند ہو جائے اور اسے پانی نہ ملے تو تیمّم کرے۔اس کے پاک ہونے کا حکم لگایا جائے گا، یہاں تک کہ تیمّم سے نماز پڑھ لینے کے بعد اس کے خاوند کو اس کے ساتھ صحبت کرنے کا حق حاصل ہوگا، عند ابی حنیفہ وابی یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ۔ رجعت کے انقطاع میں اختلاف ہے۔امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رجعت منقطع نہیں ہوگی، جب تک کہ تیمّم سے نماز نہ پڑھ لے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تیمّم کرنے سے ہی منقطع ہو جائے گی۔ جیسا کہ غسل کرنے سے منقطع ہو جاتی ہے۔اگر نماز کے وقت کے اندر حیض آ جائے تو اس نماز کی قضاء طہر کے بعد واجب نہیں ہوگی، خواہ نماز شروع کرنے کے بعد حیض آئے یا شروع کرنے سے پہلے آئے۔ نیز خواہ اتنا وقت باقی ہو جس میں فرض کی ادائیگی کی گنجائش ہو یا نہ ہو، بہر صورت اس نماز کی قضاء واجب نہ ہوگی۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ (چار رکعت والی نماز کے دوران) دو رکعتیں پڑھنے

کے بعد عورت کو حیض آجائے تو پاک ہونے کے بعد اس کی قضاء نہیں کرے گی۔[1]

علماء کا اس پر اجماع ہے کہ اگر وقت نکل جانے کے بعد حیض آئے اور اس نے نماز نہ پڑھی ہو تو اس کی قضاء اس پر واجب ہوگی۔ جو عورت نماز میں کوتاہی کرتی رہے حتیٰ کہ اسے حیض آجائے تو اس کے بارے میں حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ، حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شعبیؒ فرماتے ہیں کہ غسل کرکے پاک ہونے کے بعد اس نماز کی قضا کرے۔[2]

اگر نفل نماز یا نفل روزہ شروع کردیا تھا اس دوران حیض میں مبتلا ہوگئی تو اس کی قضاء واجب ہوگی۔ جب حیض کا خون دس دن پورے ہونے پر بند ہو تو غسل سے پہلے بھی اس کے ساتھ وطی کرنا جائز ہے۔ کیونکہ دس دن سے زیادہ حیض کا خون نہیں ہوتا۔ البتہ غسل سے پہلے ہم بستر ہونا مستحب نہیں ہے۔ کیونکہ "حَتّٰی یَطَّهَّرْنَ" [البقرۃ:۲۲۲] میں تشدید والی قرأت کی بناء پر ممانعت وارد ہوئی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں اس کے ساتھ ہمبستری نہ کرے۔ جب تک کہ وہ غسل نہ کرلے۔ جب نفاس کا خون چالیس دن پورے ہونے پر منقطع ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔ حیض میں دس دن پر خون کا بند ہونا شرط (ضروری) نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں خون بند نہ ہونے کے باوجود وطی کرنا جائز ہے۔

طہرِ متخلل کا حکم

جب حیض کی مدت میں دو خونوں کے درمیان طہر آجائے تو وہ جاری خون کی طرح ہے، لہٰذا جب کوئی عورت ایک دن خون دیکھے اور آٹھ دن طہر اور پھر ایک دن خون، یا ایک ساعت خون دیکھے اور دس دن طہر رہے اور پھر ایک ساعت خون دیکھے تو یہ تمام (مدت یعنی دس دن) امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حیض ہوگا اور طہر متخلل جاری خون کی طرح ہوگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب طہر متخلل تین دن سے کم ہو خواہ ایک لمحہ بھی کم ہو تو وہ جاری خون کے حکم میں ہے (یعنی حیض ہوگا) اور اگر تین دن یا اس سے زیادہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر طہر ان دو خونوں کے مثل ہے یا وہ دو خون اس طہر سے زیادہ ہوں اور وہ خون حیض کی مدت میں ہوں تو اس کو بھی جدا نہیں کیا جائے گا۔ وہ جاری خون کی مانند ہے، اور اگر طہر ان دو خونوں سے زیادہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر دو جانبوں میں سے کسی جانب کو حیض قرار دینا ممکن ہو تو اس کو حیض قرار دیں گے اور دوسری جانب کو استحاضہ قرار دیں گے۔ اور اگر ان میں سے کسی جانب کو بھی حیض قرار نہ دیا جاسکتا ہو تو سب کو استحاضہ قرار دیں گے۔ پس جب کوئی عورت ایک روز خون دیکھے اور آٹھ دن طہر اور پھر ایک دن خون دیکھے تو کوئی دن حیض نہیں ہوگا، کیونکہ طہر کی مدت

---

[1] [سنن الدارمی ۱/۲۱۸] [2] ایضاً

دونوں خونوں سے زیادہ ہے اور اگر ایک دن خون آئے اور چھ دن طہر رہے، پھر تین دن خون آئے تو پہلا خون استحاضہ کا ہوگا اور آخری خون حیض کا ہوگا، اور اگر تین دن خون آئے اور چھ دن طہر رہے اور پھر ایک دن خون آئے تو پہلا خون حیض کا ہوگا اور آخری استحاضہ کا ہوگا۔

اور اگر چار دن خون آئے اور پانچ دن طہر رہے اور ایک دن خون آئے تو سارا حیض کا ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک دن خون آئے اور پانچ دن طہر رہے اور پھر چار دن خون آئے تو سب حیض کا خون شمار ہوگا، کیونکہ طہر دو خونوں کے برابر ہے۔ لہٰذا اس کو جدا نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر ایک دن خون آئے اور دو دن طہر رہے اور پھر ایک دن خون آئے تو چاروں دن حیض کے ہوں گے، یہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے، اس لیے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طہر تین دن سے کم ہے۔ اور اگر تین دن خون آئے اور چھ دن طہر رہے اور پھر تین دن خون آئے تو یہ کل بارہ دن ہیں۔ پس امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پہلے دس دن حیض کے ہوں گے اور باقی دو دن استحاضہ کے ہوں گے اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پہلا خون حیض کا ہوگا اور باقی تمام دن استحاضہ کے ہوں گے۔ کیونکہ طہر کی مدت ان دو خونوں سے زیادہ ہے جو کہ اس عورت نے دس دن میں دیکھے ہیں، اس لیے کہ دس دنوں میں دو خون، چار دن آئے اور طہر چھ دن رہا۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دینے میں آسانی ہے اور ''الوجیز'' میں ہے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا قول اصح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے اور ''الفتاوی'' میں ہے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے قول پر فتویٰ دینے میں عورتوں کے لیے آسانی ہے۔

دو حیضوں یا حیض و نفاس کے درمیان آجانے والے طہر کی کم از کم مدت پندرہ دن اور پندرہ راتیں ہیں اور دو نفاسوں کے درمیان آجانے والے طہر کی کم از کم مدت نصف سال ہے۔ اگر نصف سال سے کم ہو تو وہ توامین (جڑواں بچے) ہوں گے اور نفاس صرف پہلے سے شمار ہوگا۔ طہر کی زیادہ سے زیادہ کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔ اگر ساری عمر بھی حالتِ طہر میں رہے تو نماز روزے کی پابند رہے گی۔

امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سفیان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت نقل کی ہے کہ ''طہر کی مدت پندرہ دن ہے۔'' حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی مروی ہے کہ جب کسی عورت کو ایک مہینہ یا چالیس دنمیں تین حیض آئیں اور چند عادل عورتیں اس کے حق میں گواہی دیں کہ اس کو ایسی چیز پیش آئی ہے جس کی وجہ سے نماز پڑھنا حرام ہو جاتا ہے تو اس کی عدت گزر گئی۔[1]

---

[1] [سنن الدارمی: ۲۱۲/۱]

(مؤلف فرماتے ہیں!) میں کہتا ہوں کہ ایک مہینہ میں تین حیض کیسے ہوں گے؟ چالیس دنوں میں تو ہو سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ عورت کو تین دن حیض آئے اور پھر پندرہ دن طہر رہے پھر تین دن حیض آئے پھر پندرہ دن طہر رہے، پھر تین دن حیض آئے، پھر پاک ہو جائے تو چالیسویں دن اس کا طہر ثابت ہو سکتا ہے جبکہ ایک ماہ میں یہ ممکن نہیں!

استحاضہ کے احکام

استحاضہ کا خون:

عورت جو خون تین دن سے کم اور دس دن سے زیادہ دیکھے وہ خونِ استحاضہ ہے، اسی طرح حاملہ عورت دورانِ حمل جو خون دیکھے وہ بھی استحاضہ کا خون ہے۔ نیز نفاس میں جو خون چالیس روز سے زیادہ ہو وہ بھی استحاضہ ہے۔ استحاضہ اور حیض کے خون میں فرق یہ ہے کہ استحاضہ کا خون سرخ اور پتلا ہوتا ہے، اس کی بدبو نہیں ہوتی، اور حیض کا خون گاڑھا بدبودار اور متغیر اللون ہوتا ہے۔

عروۃ بن الزبیر رضی اللہ عنہ ذکر کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش ؓ کو استحاضہ کا خون آتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: ''حیض کا خون سیاہ رنگ کا ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے، پس جب حیض کا خون آئے تو نماز سے رک جاؤ اور جب کوئی اور خون آئے تو وضو کرو اور نماز پڑھو، کیونکہ وہ ایک رگ (کا خون) ہے۔''[1]

دمِ استحاضہ کا حکم نکسیر کی طرح ہے کہ نہ نماز کے لیے مانع ہے اور نہ ہی روزے اور وطی سے مانع ہے۔ جب نماز سے مانع نہیں تو روزے سے بطریقِ اولیٰ مانع نہیں ہوگا، کیونکہ نماز میں طہارت کی زیادہ ضرورت ہے۔ جب خون دس دن سے تجاوز کر جائے اور عورت کے لیے عادت معروف ہو تو اس کو اپنی عادت کے ایام کی طرف لوٹایا جائے گا اور جو خون اس سے زیادہ ہو وہ استحاضہ ہے اور جب اس کو اپنی عادت کے ایام کی طرف لوٹایا جائے گا تو عادت کے بعد چھوڑی ہوئی نماز کی قضاء اس کے ذمے ہوگی۔

اگر وہ بالغ ہوتے ہی مستحاضہ ہوگئی تو اس کا حیض ہر مہینے میں دس دن ہوگا اور باقی دن استحاضہ کے ہوں گے۔ اور نفاس چالیس روز کا ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نماز، روزہ اور رجعت میں اقلِ مدت پر عمل کیا جائے گا یعنی تین دن پر۔ چنانچہ اس کے بعد وہ غسل کر کے نماز و روزہ رکھے گی۔ جب خاوند طلاق دے تو تین حیض عدت گزارے گی اور ہر حیض تین دن کا ہوگا اور

---

[1] [سنن الدار قطنی: ۲۰۶/۱]

آخری تین دن ختم ہونے سے پہلے اس عورت کو لوٹانا ممکن ہوگا۔ نیز فرماتے ہیں کہ زوج کے حق میں اکثر مدت پر عمل کیا جائے گا، چنانچہ دس روز گزر جانے کے بعد ہی خاوند کو وطی کرنے کا حق ہوگا۔

معذور کے احکام

مستحاضہ عورت اور وہ شخص جس کو سلسل البول (ہر وقت پیشاب کے قطرے آتے رہنے) کی بیماری ہو یا دست جاری ہوں یا بار بار ریح نکلتی ہو یا نکسیر جاری ہو یا کوئی زخم ہو جو بند نہ ہوتا ہو یا بدن کے کسی مقام مثلاً آنکھ، کان، ناف، پستان وغیرہ سے تکلیف و درد کے ساتھ پانی نکلتا ہو تو یہ سب لوگ معذور ہیں۔

معذور وہ شخص ہے جس کو ایسا عذر لاحق ہو جس کا روکنا اس کے قابو سے باہر ہو اور اس کا وہ عذر ایک نماز کے پورے وقت تک برقرار رہے اور اتنا وقت نہ ملے کہ اس وقت کی نمازِ فرض و واجب طہارت کے ساتھ پڑھ سکے۔ اگر اتنا وقت مل جائے جس میں طہارت سے نماز پڑھ سکے تو اس کو معذور نہیں کہیں گے۔ عذر کا منقطع ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جب ایک نماز کے پورے وقت تک عذر منقطع رہے۔

اگر معذور اس بات پر قادر ہے کہ باندھنے سے یا روئی وغیرہ رکھنے سے یا بھرنے سے خون وغیرہ عذر کو روک سکتا ہے یا کم کرسکتا ہے یا بیٹھنے میں خون جاری نہیں ہوتا اور کھڑے ہونے میں جاری ہوتا ہے تو اس کا بند کرنا واجب ہے اور اس کے بند کر سکنے کے سبب سے اب وہ صاحبِ عذر نہیں رہتا۔ اگر جھکنے سے یا سجدہ کے وقت جاری ہوتا ہے ورنہ جاری نہیں ہوتا تو کھڑا ہو کر یا بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھ لے لیکن اگر لیٹنے سے جاری نہیں ہوتا ورنہ جاری ہوتا ہے تو لیٹ کر نہ پڑھے، اب وہ معذور ہے۔

مستحاضہ (نیز دیگر معذورین) کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے وضو کریں۔ اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا، بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں مستحاضہ عورت ہوں، پاک نہیں ہوتی تو کیا میں نماز کو چھوڑ دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، وہ تو ایک رگ (کا خون) ہے، حیض نہیں ہے، جب حیض آئے تو نماز پڑھنا چھوڑ دو، اور جب ختم ہو تو اپنے سے خون دھو کر نماز پڑھو'' حضرت ھشام بن عروہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہر نماز کے لیے وضو کرو، یہاں تک کہ (حیض کا) وقت دوبارہ آجائے[1]

---

[1] [سنن الترمذی: ۸۲/۱]

ایک روایت میں اس طرح ہے کہ ہشام کہتے ہیں: میرے والد کہتے تھے کہ "وہ (مستحاضہ) پہلے (دم استحاضہ) کے لیے غسل کرے گی، اس کے بعد وہ پاک ہو جائے گی اور نماز پڑھے گی۔"

قمیر، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مستحاضہ کے بارے میں فرمایا: اپنے حیض کا انتظار کرے جس میں وہ اس سے قبل نماز ترک کیا کرتی تھی، پھر جب طہر کے ایام آئیں جن میں وہ پاک ہوتی تھی تو غسل کرے، پھر ہر نماز کے وقت وضو کرے اور نماز پڑھے۔"[1]

حضرت عدی بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "مستحاضہ عورت ہر مہینے میں حیض کے دنوں میں نماز نہیں پڑھے گی، پھر جب حیض کے ایام ختم ہوں تو غسل کر کے نماز روزہ ادا کرے اور ہر نماز کے وقت وضو کرے۔"[2]

وقت نکلنے سے ان (معذورین) کا وضو بھی باطل ہو جائے گا، پھر طرفین (امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہ اللہ) کے قول کے مطابق دوسری نماز کے لیے نیا وضو کرنا ان پر واجب ہوگا۔ اور اس وضو سے جو واجب وسنت اور قضاء نمازیں چاہیں پڑھیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "مستحاضہ عورت کا وضو ادائے فرض کے بعد باطل ہو جاتا ہے لیکن نفل نماز کے لیے کیا ہوا وضو باقی رہتا ہے۔ معذورین کا وضو خروجِ وقت سے پہلے باطل نہیں ہوگا لیکن جب کوئی دوسرا حدث لاحق (پیش آنا) ہو جو ان کے عذر کے خلاف ہو تو باطل ہو جائے گا۔

خروجِ وقت حقیقت میں ناقضِ وضو نہیں ہے، لیکن چونکہ وقت، ظہورِ حدث سے مانع ہے اور اس میں دفع حرج ہے، پس جب مانع دور ہوا تو حدثِ سابق ظاہر ہو گیا۔ یہاں تک کہ اگر وضو کے بعد خون بند رہا یہاں تک کہ وہ وقت نکل گیا تو وہ وضو باقی ہے اور اس کو اختیار ہے کہ اس وضو سے نماز پڑھے، جب تک کہ خون جاری نہ ہو یا کوئی دوسرا حدث نہ ہو۔

ثبوتِ عذر کے لیے یہ شرط ہے کہ ایک نماز کے پورے وقت تک عذر قائم رہے یعنی اس کو اتنا وقت نہ ملے جس میں محض فرائض وضو ادا کر کے مختصر سی فرض یا واجب نماز ادا کر سکے اور ثبوتِ عذر کی یہ شرط ابتدا میں ہے، بقاءِ عذر کے لیے (نماز کے) ہر وقت میں عذر (محض ایک مرتبہ) کا پایا جانا ہی کافی ہے اور زوالِ عذر کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ عذر ایک نماز کے پورے وقت تک منقطع رہے یعنی پورے وقت کے کسی حصہ میں بالکل نہ پایا جائے۔

---

[1] [سنن الدارمی: ۱/۲۰۲] [2] ایضاً

تنبیہ:

اگر کسی کا زخم بہتا تھا اور اس پر کپڑا باندھ لیا تھا، پھر اس پر قدرِ درہم سے زیادہ خون لگ گیا یا اس کے پہننے کے کپڑے پر لگ گیا دھونے سے نماز کے دوران ہی دوبارہ نجس ہو جائے تو اس کو دھوئے بغیر نماز پڑھنا جائز ہے اور اگر ایسا نہیں تو جائز نہیں، کیونکہ اب اس کا دھونا فرض ہے، یہی مختار ہے۔

باب النفاس

نفاس کا لغوی معنی ہے عورت کا بچہ جننا (حمل ضائع ہوکر) بچہ جننے کے بعد زچہ کو ''نفساء'' کہتے ہیں اور بچہ کو ''منفوس'' کہتے ہیں۔ نفاس کی شرعی تعریف یہ ہے کہ نفاس وہ خون ہے جو بچہ پیدا ہونے کے بعد رحم سے نکلے۔ اگر اکثر (نصف سے زیادہ) بچہ باہر نکل آیا تو نفاس ہوگا ورنہ نہیں، اور یہی حکم اس وقت بھی ہے جب کہ رحم کے اندر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے اور اکثر باہر نکل آئے۔ اگر بچے کی تھوڑی خلقت ظاہر ہوگئی جیسے ہاتھ، پاؤں یا انگلی یا ناخن یا بال، اگر چہ بچہ ابھی نا تمام ہے کہ اسقاط ہوگیا (خواہ دوائی وغیرہ سے ہو یا خود ہی ساقط ہو جائے) تو وہ بچہ ہے، اس کے نکلنے سے عورت نفساء میں شمار ہوگی اور اگر اس کی خلقت میں سے کچھ ظاہر نہیں ہوا (بلکہ خون کا صرف لوتھڑا نکلا) تو نفاس نہ ہوگا۔ اگر بچہ سیدھا نکلے تو اعتبار اس کے سینے کا ہے (اور اگر پاؤں کی طرف سے) الٹا نکلے تو اعتبار اسکی ناف کا ہے یعنی اتنا حصہ باہر آجانے کے بعد نفاس کا حکم ہوگا۔ اور اس پر احکام ثابت ہوں گے چنانچہ وضعِ حمل سے ہی طلاق کی عدت ختم ہوجائے گی اور ولادت سے قسم میں حانث ہوجائے گا لیکن ایسا بچہ وارث نہیں ہوگا اور نہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی مگر جب اس کا اکثر حصہ زندہ نکلے۔

اگر عورت ولادت کے بعد خون نہ دیکھے تو صحیح قول کے مطابق وہ نفساء نہیں ہوگی، صاحبینؒ کے نزدیک اس پر صرف وضو کرنا لازم ہوگا، لیکن امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احتیاطاً غسل کرنا ضروری ہوگا۔

حاملہ عورت دورانِ حمل جو خون دیکھتی ہے یا بچے کے اکثر حصے کے نکلنے سے پہلے ولادت کی حالت میں جو خون دیکھتی ہے وہ استحاضہ ہے، اگرچہ حیض کی اکثر مدت (دس دن) کو پہنچ جائے، کیونکہ حاملہ عورت کو حیض نہیں آتا اس لیے کہ رحم کا منہ حمل کی وجہ سے بند ہوجاتا ہے۔

حیض ونفاس کا خون رحم سے نکلتا ہے، جب کہ استحاضہ کا خون فرج سے نکلتا ہے، نہ کہ رحم سے۔ نیز اس لیے کہ اگر ہم حاملہ عورت کے اس خون کو حیض کا خون قرار دیں تو حیض ونفاس کے خون کا اجتماع لازم آتا ہے۔ پس جب حاملہ عورت ولادت سے قبل خون دیکھے اور اس کو حیض قرار دیا جائے، پھر وہ بچے کو جنم دے اور خون کو دیکھے تو نفساء ہو تو ایک ہی حالت میں وہ حیض والی بھی ہوگی اور نفاس والی بھی، یہ جائز نہیں ہے۔ ورنہ اکثر بچے کے نکلنے سے ذرا پہلے تک اس پر نماز واجب ہو،

اگر نہ پڑھے تو گنہگار ہو!

نفاس کی اقل واکثر مدت

نفاس کی کم سے کم کچھ مدت مقرر نہیں اور اکثر مدت چالیس دن ہے۔ اقل مدت مقرر کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ خود بچے کا نکلنا ہی رحم سے خون کے نکلنے کی علامت ہے، پس اس میں کسی مدت کی تعیین کی ضرورت نہیں ہے جس کو اس کے لیے بطورِ علامت قرار دیا جائے، لیکن حیض میں خون کا رحم سے نکلنا اسی وقت معلوم ہوگا جب اس کے لیے تین دن کی مدت مقرر کی جائے گی (یعنی تین دن مسلسل آئے گا تو معلوم ہوگا کہ یہ خون رحم سے آرہا ہے لیکن نفاس میں تو بچے کا باہر آنا ہی اس پر علامت ودلیل ہوگا) لیکن نماز وروزے کے حق میں نفاس کی بھی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔

نفاس کی اکثر مدت چالیس دن ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مُسہ الازدیہ روایت کرتی ہیں کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں نفاس والی عورت چالیس دن (عدت میں) بیٹھا کرتی تھی۔''......الحدیث[1]

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ساٹھ دن ہے، ان کی دلیل حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ جب اس کا خون لمبا ہو جائے (زیادہ ہو جائے) تو ساٹھ روز تک انتظار کرے گی، پھر غسل کر کے نماز پڑھے گی۔''[2]

اس کی وجہ یہ ہے کہ رحم کا منہ بچے کی وجہ سے بند ہوتا ہے تو پھر حیض کا خون نہیں آتا اور خون چار مہینے میں جمع ہوتا ہے، اس کے بعد بچے میں جان پڑتی ہے اور وہ بچہ حیض کے خون سے غذا حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ماں اس کو جنم دیتی ہے، جب ماں اس کو جنم دیتی ہے تو وہ خون جو چار مہینے میں جمع ہوا تھا، باہر نکلتا ہے اور عام طور پر عورت کو ایک مہینے میں ایک مرتبہ ہی حیض آتا ہے اور حیض کی اکثر مدت دس دن ہے تو چار مہینوں میں چار مرتبہ حیض آیا تو کل چالیس دن ہوئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک چوں کہ حیض کی اکثر مدت پندرہ دن ہے تو چار مہینوں میں جو خون جمع ہوتا رہا اس کو ملائیں گے تو ساٹھ دن ہوں گے۔

جو خون چالیس دن سے زیادہ ہوا وہ استحاضہ ہے جب کہ عورت مبتدۂ ہو، اگر عورت معتادہ ہو، نفاس میں اس کی عادت مقرر ہو اور چالیس دن سے اس کا خون تجاوز کر جائے تو اس کو اپنی عادت کے ایام کی طرف لوٹایا جائے گا، چنانچہ عادت کا زمانہ گزرنے کے بعد جو نماز چھوڑی ہو اس کو قضاء

---

[1] [سنن الترمذی: ۱/۹۲] [2] [سنن البیہقی: ۱/۳۴۲]

کرے گی۔ اگر کسی عورت کے ایک حمل سے دو بچے پیدا ہوئے کہ دونوں کے درمیان چھ مہینے سے کم زمانہ ہے تو پہلا ہی بچہ پیدا ہونے کے بعد سے نفاس سمجھا جائے گا یہ شیخین رحمہ کا قول ہے پس اگر دوسرا بچہ پہلے بچے کی پیدائش کے بعد سے چالیس دن کے اندر پیدا ہوا اور خون آیا تو بھی یہی حکم ہے کہ پہلے بچے کی پیدائش سے چالیس دن تک نفاس ہے پھر استحاضہ ہے اور اگر چالیس دن کے بعد دوسرا بچہ پیدا ہوا تو اس پچھلے کے بعد جو خون آیا وہ استحاضہ ہے، نفاس نہیں ہے، مگر دوسرے بچے کے پیدا ہونے کے بعد بھی نہانے کا حکم دیا جائے گا، یعنی دوسرا بچہ پیدا ہونے کے بعد غسل کرے اور نماز پڑھے، اس لیے کہ نفاس کی اکثر مدت چالیس دن ہے اور وہ گزر چکی ہے پس اس پر اس کے بعد نفاس واجب نہیں ہوگا۔

اور اگر دونوں کے درمیان چھ مہینے یا اس سے زیادہ کا وقفہ ہو تو دو حمل اور دو نفاس ہوں گے اور اگر تین بچے پیدا ہوں اور پہلے اور دوسرے کی ولادت میں اور اسی طرح دوسرے اور تیسرے کی ولادت میں چھ چھ مہینے سے کم کا وقفہ ہو لیکن پہلے اور تیسرے کی ولادت میں چھ مہینے سے زیادہ کا وقفہ ہو تو صحیح یہ ہے کہ ایک حمل سمجھا جائے گا اور پہلے کی پیدائش کے بعد سے زیادہ سے زیادہ چالیس دن تک نفاس ہے اور باقی استحاضہ ہے۔ یہ بعض فقہاء کا مذہب ہے جن میں امام ابوعلی الدقاق رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں اور یہی اصح ہے۔

باب الانجاس

نمازی کا بدن، اس کے کپڑے اور اس جگہ کا پاک ہونا واجب ہے جس جگہ پر وہ نماز پڑھتا ہے یعنی دونوں پاؤں رکھنے کی جگہ، سجدہ کی جگہ اور بیٹھنے کی جگہ کا بھی پاک ہونا واجب ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ''وَ ثِیَابَکَ فَطَهِّرْ'' [المدثر:۴] یعنی اپنے کپڑوں کو بھی پاک کیجئے۔'' جب کپڑوں کی تطہیر واجب ہے تو بدن اور مکان کی تطہیر بھی واجب ہوگی، کیونکہ حالتِ نماز میں استعمال کرنا سب کو شامل ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آدمی آیا اور مسجد کے ایک گوشے میں پیشاب کرنے لگا، لوگوں نے اس کو ڈانٹا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو ڈانٹنے سے منع کیا، جب وہ پیشاب سے فارغ ہوگیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی کا ایک ڈول بہانے کا حکم دیا، چنانچہ وہ اس پر بہادیا گیا۔[۱]

نیز وہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک دیہاتی شخص آیا اور مسجد میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کو روکا کہ ٹھہر جاؤ ٹھہر جاؤ! رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اس کو پیشاب کرنے سے نہ روکو، اس کو چھوڑ دو۔'' پس انہوں نے اس کو چھوڑ دیا یہاں تک کہ اس نے پیشاب کیا، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بلایا اور فرمایا: ''پیشاب اور اس طرح کی گندی چیزیں مساجد کی شایانِ شان نہیں ہیں، مسجدیں تو اللہ تعالیٰ کے ذکر نماز اور قرآن پڑھنے کے لیے ہوتی ہیں۔'' (او کما قال علیہ السلام۔) پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں میں سے ایک آدمی کو حکم دیا، وہ پانی کا ڈول لایا اور اس پر بہادیا۔[۲]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک شیر خوار بچہ لایا گیا، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں پیشاب کردیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی منگوایا اور اس پر انڈیل دیا۔''[۳]

نجاست حقیقیہ کو پانی سے زائل کرنا بالاتفاق جائز ہے جیسا کہ اس سے قبل احادیث مبارکہ بیان ہوئی ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر ایسی چیز کے ساتھ نجاست کا زائل کرنا جائز ہے جو بہتی ہو (اور پاک ہو) اور نجاست کو اکھاڑ دینے والی ہو، کیونکہ اصل مقصود نجاست کا ازالہ ہے جو کسی بھی پاک چیز کے ساتھ ہو، اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر نجاست کی جگہ کو قینچی سے کاٹ دیا

[۱] [صحیح البخاری:۱/۶۲] [۲] [صحیح مسلم:۱/۲۳۷] [۳] [سنن ابی داود:۱/۱۰۵]

جائے تو جائز ہوتا ہے۔

نجاستِ حکمیہ میں نجاست کی ذات تو ہوتی نہیں کہ جس کا ازالہ کیا جائے، پس اس میں استعمال کرنا عبادتِ محضہ ہے لہٰذا نجاستِ حکمیہ کا ازالہ مطلق پانی سے ہی جائز ہوگا۔ بہنے والی چیز میں یہ شرط ہے کہ وہ نجاست کو اکھاڑنے والی ہو جیسے سرکہ، گلاب کا پانی، ماءِ مستعمل وغیرہ، تیل، گھی اور دودھ کا حکم اس کے خلاف ہے، کیونکہ یہ چیزیں نجاست کو اکھاڑنے والی نہیں ہیں۔ امام ابو یوسفؒ نے بدن اور کپڑے میں فرق کیا ہے کہ بدن کو صرف پانی کے ساتھ پاک کرنا جائز ہے اور کپڑے کو پانی اور بہنے والی پاک چیزوں کے ساتھ بھی پاک کیا جاسکتا ہے۔

اور امام محمد، امام شافعی اور امام زفر رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ پانی کے علاوہ دوسری بہنے والی چیزوں سے پاکی حاصل کرنا ناجائز ہے۔ ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ پاک کرنے والی چیز نجاست سے مِل کر اولِ وہلہ میں ناپاک ہو جاتی ہے، جو چیز خود ناپاک ہو وہ دوسرے کو پاک نہیں کرسکتی، اس لیے قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ نہ پانی مفیدِ طہارت ہو اور نہ کوئی دوسری بہنے والی چیز، لیکن ضرورت کی وجہ سے پانی کے حق میں یہ قیاس ترک کر دیا گیا اور پانی کو مفیدِ طہارت اور پانی کے علاوہ کو غیر مفید طہارت قرار دیا گیا ہے، دوسری دلیل قیاس ہے کہ جس طرح نجاستِ حکمیہ (حدث) پانی کے علاوہ سے زائل نہیں ہوتی، اسی طرح نجاستِ حقیقیہ بھی پانی کے علاوہ سے زائل نہیں ہوگی۔

اگر موزے پر ایسی نجاست لگ گئی جو جرم اور جسم رکھتی ہے اس سے مراد ہر وہ نجاست ہے جو خشک ہونے کے بعد دکھائی دے (جیسے گوبر، پاخانہ، بہنے والا خون وغیرہ) پھر وہ خشک ہوگئی، پھر اس کو زمین پر مَل دیا یا لکڑی وغیرہ سے کھرچ کر صاف کر دیا تو وہ موزہ پاک ہوگیا۔ کیونکہ موزے اور جوتے وغیرہ میں نجاست کے اجزاء اس (موزے، جوتے وغیرہ) کے ٹھوس ہونے کی وجہ سے داخل نہیں ہوسکتے مگر بہت کم۔ اس کو بھی اس کا جرم خشک ہونے کے بعد جذب کر لیتا ہے لہٰذا جب وہ جرم زائل ہوگیا تو اس پر لگی ہوئی نجاست بھی زائل ہوگئی اور موزہ دوبارہ پاک ہوگیا، لیکن ایسا جوتا جو تر نجاست سے ملوث ہو اور ابھی خشک نہیں ہوا وہ دھوئے بغیر پاک نہیں ہوگا، کیونکہ زمین پر اس کو مَلنے سے نجاست اور پھیلے گی اور وہ جگہ پاک نہ ہوگی۔ جیسا کہ مقبری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے جوتوں کے ساتھ لگی گندگی کو زمین پر روندے تو مٹی اس کو پاک کرنے والی ہے۔[1]

---

[1] [سنن ابی داؤد: ۱/۱۰۵]

مَنی کا حکم

مَنی (نجاستِ مغلظہ) ناپاک ہے، اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے سے جنابت (یعنی منی کے دھبے) کو دھوتی تھی، پھر (اس کو پہن کر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور پانی کے دھبے آپ کے کپڑے میں ہوتے تھے۔[1]

حضرت سلیمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس منی کے بارے میں پوچھا جو کپڑے کو لگ جائے تو انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے سے منی کو دھوڈالتی تھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے باہر تشریف لے جاتے تھے اور دھونے کا نشان (یعنی) پانی کے دھبے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے میں ہوتے۔"[2]

معلوم ہوا کہ جب منی تر ہو تو اس کو دھونا واجب ہے، جب کپڑے پر لگنے کے بعد خشک ہو جائے تو اس کو کھرچ دینا کافی ہے، جیسا کہ حضرت اسودؒ اور حضرت ہمامؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے سے خشک منی کو کھرچ دیتی تھی۔"[3]

عمرہؒ روایت کرتی ہیں کہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے سے منی کو کھرچ دیتی تھی جبکہ وہ خشک ہوتی اور جب تَر ہوتی تو دھوڈالتی تھی۔[4]

نجاست اگر آئینے کو لگ گئی یا صیقل شدہ تلوار یا چھری وغیرہ کو تو یہ چیزیں زمین پر رگڑنے سے پاک ہو جاتی ہیں، پانی وغیرہ سے دھونا شرط نہیں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ان چیزوں میں نجاست کے اجزاء داخل نہیں ہوتے ہیں اور رہی وہ نجاست جو اوپر لگی ہے سو وہ پونچھنے سے زائل ہو جائے گی۔

اگر زمین پر نجاست لگی، پھر وہ خشک ہو گئی سورج سے یا آگ سے یا ہوا سے یا اس کے علاوہ کسی اور چیز سے اور نجاست کا اثر، رنگ، بو وغیرہ بھی جاتا رہا تو اس جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ اس کی دلیل محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالبؒ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "زمین کی پاکی اس کا خشک ہو جانا ہے۔"[5]

زمین کے حکم میں ہے ہر وہ چیز جو زمین پر قائم اور ثابت ہو جیسے دیواریں، درخت، گھاس، بانس وغیرہ جب تک وہ زمین پر قائم ہو تو خشک ہونے سے پاک ہو جائیں گے لیکن جب درخت اور

---

۱ [صحیح البخاری: ۱/۶۴] ۲ ایضاً ۳ [صحیح مسلم: ۱/۲۳۸]

۴ [سنن الدار قطنی: ۱/۱۲۵] ۵ [صحیح البخاری: ۱/۲۰۰]

بانس وغیرہ کو کاٹ لیا جائے پھر اس کو نجاست لگ جائے تو دھونے سے ہی پاک ہوں گے۔

کنکریاں بھی زمین کے حکم میں ہیں، ایسی زمین سے تیمّم کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ تیمم کے لیے مٹی کے پاک ہونے کی شرط کا ثبوت نصِ کتاب "فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا" سے ہے اور جو حکم نصِ کتاب سے ثابت ہوتا ہے وہ قطعی ہوتا ہے، لہٰذا تیمّم کے لیے مٹی کی طہارت کا قطعی اور یقینی ہونا ضروری ہے، جب کہ یہاں زمین کی طہارت خبرِ واحد "ذكاة الأرض يبسها" سے ثابت ہوئی ہے اور جو حکم خبرِ واحد سے ثابت ہوتا ہے وہ غیر قطعی یعنی ظنی ہوتا ہے، پس تیمم، جس کے لیے مٹی کی طہارت قطعی الثبوت ہے، اس مٹی سے ادا نہیں ہوگا جس کی طہارت ظنی الثبوت ہے۔ نیز نماز تو معمولی نجاست سے جائز ہوتی ہے لیکن وضو اس پانی سے جائز نہیں ہوتا جس میں معمولی نجاست بھی موجود ہو اور تیمّم وضو ہی کا قائم مقام ہے۔

نجاست کی اقسام

نجاست کی دو قسمیں ہیں: نجاست غلیظہ، نجاست خفیفہ۔ ان دونوں کی تعریف میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور صاحبینؒ کا اختلاف ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نجاست غلیظہ وہ نجاست ہے جس کا ثبوت ایسی نص سے ہو جس کے معارض دوسری نص طہارت کو ثابت کرنے والی نہ ہو اور اگر دو نص باہم متعارض موجود ہوں کہ ایک نجاست کو ثابت کرتی ہے اور دوسری طہارت کو تو یہ نجاستِ خفیفہ کہلائے گی۔ صاحبینؒ کے نزدیک نجاستِ غلیظہ وہ نجاست ہے جس کے نجس ہونے پر اجماع واقع ہو گیا ہو اور خفیفہ وہ نجاست ہے جس کی نجاست اور طہارت میں علماء کا اختلاف واقع ہو۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ نجاست کی کتنی مقدار معاف ہے اور کتنی معاف نہیں ہے؟

نجاست غلیظہ کا حکم

نجاست غلیظہ (جیسے بہنے والا خون، حرام جانوروں کا پیشاب، مرغی اور بطخ وغیرہ کی بیٹ کی صورت میں) ایک درہم کی مقدار یا اس سے کم معاف ہے، اگر اس قدر نجاست کے ساتھ نماز پڑھی تو نماز درست ہو جائے گی۔ دلیل یہ ہے کہ قلیل نجاست ایسی چیز ہے کہ اس سے بچاؤ ممکن نہیں ہے اس لیے اس کو معاف کر دیا گیا، اور ایک درہم کی مقدار کو موضع استنجاء پر قیاس کیا گیا ہے، یعنی موضعِ استنجاء بالاتفاق معاف ہے، پس اسی کی مقدار کا اندازہ کر کے ایک درہم عفو کی تقدیر بیان کی گئی ہے۔

اور اگر ایک درہم سے زائد لگی ہو تو معاف نہیں چنانچہ اس کے ساتھ نماز جائز نہیں ہوگی۔

پھر واضح ہو کہ درہم کا اعتبار کرنے میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ

ہے کہ درہم کی مقدار مساحت کے اعتبار سے مراد ہے یعنی ہاتھ کی ہتھیلی کے عرض کی مقدار، یعنی انگلیوں کے جوڑوں کے اندر کی گہرائی کے بقدر ایک درہم ہوتا ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ درہم کی مقدار وزن کے اعتبار سے مراد ہے، یعنی درہم سے مراد یہ ہے کہ اس کا وزن ایک مثقال (تقریباً ۴ گرام) کے وزن کے برابر ہو۔

فقیہہ ابو جعفر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں روایتوں میں یوں تطبیق دی جا سکتی ہے کہ پہلی روایت یعنی مساحت کا اعتبار رقیق نجاست میں ہے اور دوسری روایت یعنی وزن کا اعتبار گاڑھی نجاست میں ہے۔ جو چیزیں آدمی کے بدن سے ایسی نکلتی ہیں کہ جن کے نکلنے سے وضو یا غسل واجب ہو جاتا ہے جیسے پاخانہ، پیشاب، منی، مذی، ودی، کچا لہو، پیپ اور قے جو منہ بھر کے آئے اگرچہ بچے کی ہو، حیض ونفاس واستحاضہ کا خون، بچے کا پیشاب خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، اناج کھاتے ہوں یا نہ کھاتے ہوں، شراب، خشکی کے ہر جانور کا خون، مُردار، جو جانور نہیں کھائے جاتے ان کا پیشاب و گوبر اور پاخانہ، اور جو جانور کھائے جاتے ہیں ان کا گوبر، مثلاً گائے، بیل، بھینس وغیرہ کا گوبر اور بھیڑ، بکری اور اونٹ کی مینگنی، کتے کا گوہ، مرغابی، بطخ، مرغی اور کونج کی بیٹ، درندے جانوروں اور بلی چوہے کی مینگنیاں، یہ سب نجاستِ غلیظہ ہیں۔

اس کی دلیل حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ایک عورت نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر ہم میں سے کسی عورت کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے تو وہ کیا کرے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی عورت کے کپڑے کو حیض کا خون لگ جائے تو اسے چاہیئے کہ اس کو کھرچ کر پانی سے دھو ڈالے، پھر اس میں نماز پڑھے۔''[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم میں سے کسی کو حیض آتا تو جب پاک ہو جاتی تو کپڑے سے خون کو کھرچ دیتی اور پھر اس کو دھو ڈالتی اور باقی حصے پر پانی ڈال لیتی تھی اور پھر اس میں نماز پڑھ لیتی تھی۔[2]

نفاس کا خون اور قے جو منہ بھر کر ہو بالاتفاق نجاستِ غلیظہ ہیں، کیونکہ امام صاحبؒ اور صاحبینؒ نے نجاستِ غلیظہ کی جو تعریف کی ہے وہ اس پر بالاتفاق صادق آتی ہے۔

گھوڑے، خچر اور گدھے کی لید اور گائے کا گوبر اور بھیڑ بکری کی مینگنی امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نجاستِ غلیظہ ہے، کیونکہ اس بارے دو نص باہم متعارض نہیں ہیں اور صاحبینؒ کے نزدیک نجاستِ خفیفہ ہیں کیونکہ ان کے زمانہ میں علماء کا اس کی نجاست وطہارت میں اختلاف ہوا ہے، لیکن

---

[1] [صحیح البخاری: ۸۱/۱] [2] ایضاً

آج کے زمانہ میں اس سے احتراز ممکن ہے لہٰذا اس میں کوئی بلویٰ (ابتلاءِ عام) نہیں پایا جاتا ہے۔

نجاستِ خفیفہ کا حکم:

نجاست خفیفہ چوتھائی کپڑے سے کم معاف ہے، چوتھائی کپڑے کے حساب میں اختلاف ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ کپڑے کے اس طرف کی چوتھائی کا اعتبار ہے جہاں نجاست لگی ہو جیسے دامن اور آستین اور کلی، اور اگر بدن پر ہو تو اس عضو کی چوتھائی کا اعتبار ہے جس پر نجاست ہے جیسے ہاتھ اور پاؤں۔ یہی صحیح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ نجاست کے غلیظہ یا خفیفہ ہونے کا حکم کپڑے اور بدن میں جاری ہوتا ہے، پانی یا دیگر پتلی چیزوں میں جاری نہیں ہوتا، یعنی اگر ان میں نجاست گرے تو کل ناپاک ہوں گے، اگر چہ نجاست کا ایک ہی قطرہ گرے، جب تک کہ وہ پانی جاری نہ ہو یا کثیر نہ ہو۔ گھوڑے اور حلال جانوروں کا پیشاب اور حرام پرندوں کی بیٹ نجاستِ خفیفہ ہیں۔ جو پرندہ ہوا میں اچھی طرح نہیں اُڑسکتا جیسے مرغی، بطخ وغیرہ تو ان کی بیٹ نجاستِ غلیظہ ہے اور جو پرندے اڑتے ہیں، اگر وہ حلال ہیں جیسے کبوتر، چڑیا وغیرہ تو ان کی بیٹ پاک ہے اور اگر حرام ہوں تو یہ نجاستِ خفیفہ ہے جیسے باز، شکرا اور چیل وغیرہ، لیکن ان کی بیٹ سے کنواں ناپاک نہیں ہوگا، کیونکہ اس سے بچنا مشکل ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حلال جانوروں کا پیشاب پاک ہے، ان کی دلیل حدیثِ عرینہ ہے، اگر ناپاک ہوتا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو اس کے پینے کا حکم نہ دیتے، اس لیے کہ ناپاک چیز کا استعمال حرام ہے۔ حدیثِ عُرینہ کی تفصیل حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت میں موجود ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ قبیلہ عُرینہ اور عُکل سے (مدینہ منورہ) آئے، مدینہ کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی، حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ اونٹوں کا پیشاب اور دودھ پئیں، پس وہ ان اونٹوں کی طرف چلے گئے، جب تندرست ہو گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چرواہے کو قتل کر دیا اور خود ان اونٹوں کو لے کر بھاگ گئے، دن کے شروع حصے میں خبر آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے تعاقب میں چند آدمیوں کو بھیجا، جب دن چڑھا تو ان کو لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سزا دینے کا حکم دیا، چنانچہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے گئے، آنکھوں میں گرم سلائیں پھیری گئیں اور انہیں (مقام) حرہ میں پھینک دیا گیا، جہاں وہ پانی مانگتے تھے لیکن پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوقلابہ رحمۃ اللہ علیہ (راوی) کہتے ہیں کہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے چوری کی تھی، قتل بھی کیا تھا اور ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑائی مول لی تھی۔[1]

[1] [صحیح البخاری: ۱/۶۵]

ایک دوسری نص جو اس کے معارض وارد ہوئی ہے جس سے پیشاب کا ناپاک ہونا معلوم ہوتا ہے اور اس میں حکم ہے کہ ہر طرح کے پیشاب سے بچو، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے راوی ہیں، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قبر کا عذاب عام طور پر پیشاب (کی چھینٹوں) سے ہوتا ہے، لہٰذا اس سے بچا کرو۔''[1]

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری دلیل حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حرام چیزوں میں شفاء نہیں رکھی ہے''[2]

شیخین رحمہما اللہ کی دلیل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی کے ذریعہ ان لوگوں کی اس میں شفاء کا ہونا معلوم ہوا تھا، آج کل اس جیسی صورت حال موجود نہیں ہے، اور حرام چیز کے ذریعہ جب شفاء کا حصول یقینی ہو تو اس کا استعمال مباح ہوتا ہے، جیسا کہ مُردار کا کھانا اضطراری حالت میں مباح ہوتا ہے کہ بس اتنا کھالیا جائے جس سے جان محفوظ ہو سکے، کیونکہ اس کے کھانے سے جان کا بچاؤ یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے۔

محلِ نجاست کا پاک کرنا:

محلِ نجاست جس کا دھونا واجب ہے، کی تطہیر کی دو صورتیں ہیں، اگر وہ نجاست جسم دار اور مرئیہ (نظر آنے والی) ہے تو اس کی طہارت کی صورت یہ ہے کہ اس کی ذات (عین نجاست) کو دور کردیا جائے خواہ ایک مرتبہ ہی ہو اور یہی صحیح ہے۔ اگر اس نجاست کا اثر (نشان) جیسے رنگ، بو وغیرہ باقی رہے جس کا ازالہ دشوار ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، گرم پانی یا صابن کو استعمال کرنا واجب (ضروری) نہیں ہے بلکہ خالص پانی ہی کافی ہے۔ اور اگر وہ نجاست مرئیہ نہ ہو، جیسے پیشاب، تو اس کی طہارت کی صورت یہ ہے کہ اس کو دھویا جائے یہاں تک کہ دھونے والے کا غالب گمان یہ ہو کہ وہ پاک ہوگیا ہے۔ اس لیے کہ استخراج کے لیے ضروری ہے کہ بار بار دھویا جائے۔ اس لیے غالب گمان کا اعتبار کیا گیا ہے۔ تین بار دھونے کی حد اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ تین بار دھونے سے گمان غالب حاصل ہو جاتا ہے۔ پس آسانی کی خاطر ظاہری سبب کو اس کے قائم مقام کردیا گیا۔ حدیث مستیقظ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ پھر واضح ہو کہ ہر بار خوب نچوڑنا ضروری ہے، کیونکہ اسی طریقے سے نجاست دور ہوگی۔

اگر کپڑے کو نجاست لگ جائے اور اس کی جگہ معلوم نہ ہو تو سارے کپڑے کو دھونا چاہیے۔

---

[1] [معجم الطبرانی:۱۱/۶۶] [2] [معجم الطبرانی:۹/۳۴۵]

کتاب الصلوٰۃ

نماز کی فرضیت وفضیلت، قرآن وحدیث کی روشنی میں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَاتَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" [الروم:۳۱]

"اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ بنو"

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ" [البقرة:۴۳]

"اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو"

نیز فرمانِ رب العالمین ہے:

"وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ" [البقرة:۴۳]

"رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو"

اللہ جل شانہٗ کا فرمان ذی شان ہے:

"وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَ يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ" [البينة:۵]

"اور ان کو حکم یہی ہوا کہ اللہ کی عبادت کریں اس کیلئے بندگی کو خالص کر کے، ابراہیم کی راہ پر، اور قائم کریں نماز اور ادا کریں زکوٰۃ اور یہ ہے راہ مضبوط لوگوں کی۔"

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا "اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے ان نمازوں کے لیے خوب اچھے طریقے سے وضو کیا اور وقت پر نمازیں ادا کیں، ان کے رکوع کو اور خشوع کو پورا کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو جاتا ہے کہ اس کی مغفرت فرما دیں اور جو شخص ایسا نہ کرے تو پھر اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہیں ہوتا، چاہے تو معاف کر دے اور چاہے تو عذاب دے۔"[1]

---

[1] [سنن ابی داؤد:۱/۱۱۵]

حدیثِ اسراء (معراج) کے سلسلے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض کیں، میں ان کو لے کر واپس آیا تو میرا گزر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے ہوا، انہوں نے پوچھا کہ "اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا کہ پچاس نمازیں فرض کی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اپنے رب کے پاس واپس جاؤ، آپ کی امتِ اس کی طاقت نہیں رکھتی، پس انہوں نے مجھے واپس بھیجا تو آدھی نمازیں معاف ہوگئیں، میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا تو میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آدھی نمازیں معاف کر دیں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اپنے رب کے پاس واپس جاؤ، آپ کی امت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے، پس انہوں نے مجھے واپس بھیجا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اب پانچ نمازیں ہیں، حقیقت میں پچاس ہی ہیں۔ میرے ہاں کوئی قول (حکم) تبدیل نہیں ہوتا، پس میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس واپس آیا تو انہوں نے پھر کہا کہ اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ۔ میں نے کہا کہ اب مجھے اپنے رب سے حیا آتی ہے۔"[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، کہ سفر و حضر میں دو دو رکعت نماز فرض ہوئی تھی، پھر سفر کی نماز برقرار رہی اور حضر کی نماز میں اضافہ ہوگیا۔[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا "تم مجھے بتاؤ کہ اگر کسی کے دروازے کے پاس نہر ہو، وہ ہر روز پانچ مرتبہ اس سے غسل کرے تو کیا اس کے بدن پر ذرا بھی میل باقی رہے گا؟ لوگوں نے کہا کہ اس کے جسم پر ذرا بھی میل باقی نہیں رہے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہی مثال ہے پانچوں نمازوں کی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ (انسان کے) گناہ مٹا دیتے ہیں۔[3]

عبدالملک بن الربیع اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "بچے کو سات سال کی عمر ہونے پر نماز سکھاؤ، اور دس سال کی عمر ہو جانے پر مارو۔"[4]

نیز ان ہی سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تمہاری اولاد سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو ان کے بستر الگ کردو، جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز پر ان کو مارو۔"[5]

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نجد کے رہنے والے لوگوں میں سے ایک آدمی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا جس کے سر کے بال پراگندہ تھے، ہم اس کی آواز کی بھنبھناہٹ

---

[1] [صحیح البخاری ۱/۹۳] [2] [صحیح مسلم ۱/۲۷۸] [3] [صحیح مسلم ۱/۲۶۲]

[4] [المستدرک ۱/۲۵۸] [5] [سنن الدار قطنی ۱/۲۳۰]

تو سن رہے تھے لیکن وہ کیا کہہ رہا تھا، اس کو نہیں سمجھ رہے تھے، یہاں تک کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ہو کر اسلام (کے احکام) دریافت کرنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو فرمایا: دن رات میں پانچ نمازیں ہیں۔'' اس نے کہا کہ کیا ان کے علاوہ بھی کوئی نماز مجھ پر فرض ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، ہاں اگر تم نفل نماز پڑھنا چاہو تو پڑھو۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رمضان کے مہینے کے روزے بھی فرض ہیں۔'' اس نے پوچھا کہ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی روزہ مجھ پر فرض ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، ہاں اگر تم نفل روزہ رکھنا چاہو تو اور بات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر اس کے سامنے زکوٰۃ کا ذکر فرمایا۔ اس نے پوچھا کہ کیا اس کے علاوہ بھی میرے ذمہ کچھ فرض ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ نہیں، ہاں اگر تم نفلی صدقات وغیرہ دینا چاہو تو اور بات ہے۔ پھر وہ آدمی یہ کہتے ہوئے واپس چلا گیا کہ خدا کی قسم! میں اس پر نہ اضافہ کروں گا اور نہ کمی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔'' کامیاب ہو گیا، اگر اس نے سچ کہا۔''[1]

قرآن میں نمازوں کا ذکر

ابورزین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ (ایک مرتبہ) نافع بن الازرق رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ کیا قرآن میں پانچوں نمازوں کا ذکر آیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ ہاں، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ پڑھی: فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ [الروم:۱۷] فرمایا کہ اس میں نماز مغرب کا ذکر ہے اور ''وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ'' میں نماز فجر کا ذکر ہے۔ پھر یہ آیت پڑھی: وَلَهُ الْحَمْدُ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا'' اس میں عصر کی نماز کا ذکر ہے اور ''وَحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ'' [الروم:۱۸] اس میں نماز ظہر کا ذکر ہے، پھر یہ آیت پڑھی۔ ''وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ [النور:۵۸] کہ اس میں عشاء کا ذکر ہے۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کریمہ: ''وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ'' [ہود:۱۱۴] کے بارے میں مروی ہے کہ دن کی دو طرفوں سے مراد نماز فجر اور نماز ظہر وعصر ہے اور ''وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ'' سے مغرب وعشاء کی نمازیں مراد ہیں۔[2]

نماز، ایمان اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی ہے

حضرت عبداللہ بن بریدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد (حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''بے شک وہ عہد جو ہمارے اور ان کے درمیان ہے وہ نماز کا ہے،

---

1. [سنن النسائی ۱/۲۲۸]
2. [سنن البیہقی ۱/۳۵۹]

پس جو اس نماز کو ترک کرے اس نے کفر کیا۔" حدیث مذکور میں "عہد" سے مراد وہ عمل ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے عہد و پیمان لیا تھا۔[۱]

نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے نمازوں پر بیعت لی تھی، یہی اللہ تعالیٰ کا عہد و میثاق تھا۔ نماز وہ چیز ہے جو مسلمانوں اور کافروں کے درمیان فرق کرتی ہے اور اسی کے ذریعے وہ ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اگر نماز ادا نہ کی جائے تو ان دونوں میں وجہ امتیاز باقی نہیں رہتی۔ اس لیے نماز کا تارک صورت اور ظاہر کے اعتبار سے کافروں کے مشابہ ہے یا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بارے میں اندیشہ ہے کہ اس کا ترک صلوٰۃ کہیں اس کو کفر تک نہ پہنچادے۔ یا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نماز کو انکار کرتے ہوئے ترک کرتا ہے وہ کافر ہو گیا۔

پہلا سوال نماز ہی کا ہوگا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "قیامت کے روز بندے سے جس چیز کا سب سے پہلے حساب لیا جائے گا وہ نماز کا ہوگا۔ اگر وہ پوری نکلی تو پوری ہی لکھی جائے گی، اگر اس میں کچھ کمی نکلی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دیکھو! کیا اس کے (نامہ اعمال میں) کوئی نفل نماز بھی ہے جس سے فرض نمازوں کی کمی کو پورا کیا جاسکے؟ اس کے بعد باقی اعمال کا اسی کے مطابق حساب و کتاب ہوگا۔"[۲]

نماز کی برکت سے جنت کے دروازوں کا کھلنا

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "بندہ جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو جنت کے دروازے اس کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں اور بندے اور اس کے رب کے درمیان جو پردے حائل ہوتے ہیں ان کو دور کر دیا جاتا ہے اور جنت کی حوریں اس کا استقبال کرتی ہیں، جب تک کہ وہ (نماز میں) ناک صاف نہ کرے یا بلغم نہ نکالے۔"[۳]

نماز گناہوں کا کفارہ ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: پانچ نمازیں اور ایک جمعہ دوسرے جمعہ تک درمیان کے گناہوں کے لیے کفارہ کا باعث ہوتے ہیں۔[۴]

---

۱ [سنن النسائی ۱/۲۳۱] ۲ ایضاً
۳ [معجم الطبرانی ۸/۲۵۰] ۴ [صحیح مسلم ۱/۲۰۹]

نماز اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین عمل ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ کونسا عمل اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا ''نماز اپنے وقت پر پڑھنا'' میں نے عرض کیا کہ پھر کونسا عمل اللہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ فرمایا ''پھر والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنا'' میں نے عرض کیا پھر کونسا؟ فرمایا کہ ''پھر جہاد فی سبیل اللہ''[۱]

بندہ کس حالت میں زیادہ مقرب ہوتا ہے؟

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بندہ حالت سجدہ میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ مقرب ہوتا ہے، لہٰذا (اس حالت میں) دعا زیادہ کیا کرو''[۲]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم مبارک کا متورم ہونا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز پڑھتے تو اتنا (طویل) قیام فرماتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں پاؤں مبارک متورم (سوجنا) ہو جاتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اس قدر عمل بجالاتے ہیں، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اگلے پچھلے گناہ بخشے ہوئے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! تو کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔[۳]

نماز، آتش دوزخ کو بجھاتی ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر نماز کے وقت ایک اعلان کرنے والا بھیجا جاتا ہے، وہ اعلان کرتا ہے کہ لوگو! اٹھو! وہ آگ جو تم نے اپنی جانوں کے لیے جلا رکھی ہے۔ اس کو بجھاؤ، پس لوگ اٹھتے ہیں، وضو کرتے ہیں تو گناہ ان کی آنکھوں سے جھڑتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں تو دو نمازوں کے درمیان کے عرصہ میں ہونے والے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، اس کے بعد لوگ پھر آگ جلاتے ہیں، ظہر کی نماز کے وقت وہ منادی پھر اعلان کرتا ہے، لوگو! اٹھو! جو آگ تم نے اپنی جانوں کے لیے جلا رکھی ہے اس کو بجھاؤ، لوگ اٹھتے ہیں وضو کرتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں تو دونوں نمازوں کے درمیان ہونے والے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، عصر کا وقت ہوتا ہے تو پھر اسی طرح اعلان ہوتا ہے، مغرب کے وقت بھی اسی طرح اعلان ہوتا

---

۱ [صحیح مسلم ۱/۹۱] ۲ [صحیح مسلم ۴/۲۱۷۲] ۳ [صحیح ابن حبان: ۴/۱۲۷۵]

ہے اور عشاء کے وقت بھی اسی طرح اعلان ہوتا ہے اور لوگ نماز پڑھتے ہیں پس لوگ اس حال میں (رات کو) سوتے ہیں کہ ان کی مغفرت ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پھر کچھ لوگ خیر کی راہ پر چلنے والے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ شر کے راستہ پر چلنے والے ہوتے ہیں۔[1]

نماز فجر کی فضیلت

حضرت انس بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے، کہ میں نے حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص صبح کی نماز پڑھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی امان میں ہے، پس اللہ تعالیٰ اپنی امان کے بارے میں باز پرس نہ فرمائیں ورنہ اس کو پکڑ کر جہنم کی آگ میں اوندھے منہ ڈال دیں گے۔''[2]

حضرت عمارہ بن رویبہ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ ایسا کوئی شخص دوزخ میں نہ جائے گا جس نے طلوع آفتاب سے قبل اور غروب آفتاب سے پہلے نماز پڑھی۔[3]

حضرت ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جو شخص دو ٹھنڈے وقت کی نمازیں پڑھے، جنت میں داخل ہوگا۔''[4] اس سے مراد نماز فجر اور نماز عصر ہے۔

نماز ظہر کی فضیلت

حضرت عبدالرحمٰن بن حمید رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''دوپہر کی نماز رات کی نماز میں سے ہے۔'' (راوی) کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبدالرحمٰن بن حمید رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث میں مذکورہ لفظ ''الھجیر'' کا مطلب پوچھا تو فرمایا کہ جب سورج ڈھلتا ہے تو جو نماز (ظہر) پڑھی جاتی ہے وہ نماز تہجد کا مقام رکھتی ہے۔

نماز عصر کی فضیلت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ'' [البقرة:۲۳۸] ''تمام نمازوں کی پابندی کرو (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور اللہ تعالیٰ کے لیے عاجزی کرتے ہوئے کھڑے ہو جاؤ۔''

---

۱ [معجم الطبرانی ۱۰/۱۴۱] ۲ [صحیح مسلم ۱/۴۵۴]
۳ [سنن النسائی ۱/۲۴۱] ۴ [مسند احمد بشرح البناء ۲/۲۲۰]

حضرت فضالہ اللیثی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بارگاہِ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا، میں نے سلام عرض کیا، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تعلیم دی، یہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے پانچوں نمازیں اپنے اوقات سمیت سکھائیں، میں نے عرض کیا کہ ان اوقات میں مشغول ہوتا ہوں، آپ مجھے کسی جامع امر کا حکم دیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا: اگر تم مشغول ہوتے ہو تو ''عصرین'' سے کوتاہی نہ کرو، میں نے پوچھا کہ ''عصرین'' سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''صبح کی نماز اور عصر کی نماز'' [1]

حضرت ابو بصرہ الغفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں مقام مخمصی میں عصر کی نماز پڑھائی پھر فرمایا: ''یہ نماز تم سے قبل لوگوں پر پیش کی گئی مگر انہوں نے اس کو ضائع کیا، پس جو شخص اس نماز کی حفاظت (پابندی) کرے گا اس کو دوہرا اجر ملے گا'' [2]

نمازِ مغرب کی فضیلت:

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک افضل نماز، مغرب کی نماز ہے، اور جو شخص اس کے بعد دو رکعتیں پڑھے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتے ہیں'' [3]

نمازِ عشاء کی فضیلت:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ''جس نے عشاء کی نماز باجماعت ادا کی، اس نے گویا نصف شب قیام کیا اور جس نے صبح کی نماز (بھی) باجماعت ادا کی اس نے گویا ساری رات نماز پڑھی۔'' [4]

نمازِ وتر کی فضیلت:

حضرت ابو الولید العدوی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لائے تو فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک نماز کے ساتھ تمہاری مدد کی ہے جو تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے اور وہ وتر کی نماز ہے، اللہ تعالیٰ نے اس نماز کو عشاء سے طلوع فجر کے درمیانی وقت میں رکھا ہے۔ [5]

حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، کہ میں نے رسول اللہ

[1] [مسند احمد بشرح البناء: ۲/۲۲۰]　[2] [صحیح مسلم: ۱/۵۶۸]
[3] [المعجم الاوسط کما فی کنز العمال: ۷/۳۸۸]　[4] [صحیح مسلم: ۱/۴۵۴]　[5] [سنن ابی داؤد: ۲/۶۱]

کو فرماتے ہوئے سنا کہ ''نماز وتر لازم ہے، پس جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے، نمازِ وتر لازم ہے، پس جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے، وتر کی نماز لازم ہے، پس جو شخص وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔''[۱]

فرضیتِ قبلہ

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سولہ یا سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، پھر قبلہ کی طرف رخ پھر دیا گیا۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے سولہ مہینے نماز پڑھی پھر کعبہ کی طرف آپ کا رخ پھیر دیا گیا، پس ایک شخص جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ چکا تھا انصار کی ایک قوم کے پاس سے گذرا اور اس نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رخ کعبہ کی طرف پھیر دیا گیا ہے، چنانچہ ان لوگوں نے (بیت المقدس سے) کعبہ کی طرف رخ پھیر لیا۔[۲]

سوال: نماز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کی طرف رخ کرنا قرآن سے ثابت ہے یا اجتہاد نبوی سے ثابت ہے؟

جواب: قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اکثر علماء یہ کہتے ہیں کہ یہ امر سنت سے ثابت ہے، قرآن سے نہیں۔

تحری کے بعد غلطی کا ظاہر ہونا

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ دریں اثنا کہ لوگ صبح کی نماز قباء میں ادا کر رہے تھے، ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس رات حکم نازل ہوا ہے، کہ کعبہ کی طرف رخ کریں، پس تم کعبہ کی طرف منہ کرو، ان کے چہرے شام کی طرف تھے، چنانچہ پھر وہ (نماز ہی میں) کعبہ کی طرف گھوم گئے۔[۳]

نماز کی فرضیت اور ''صلوٰۃ'' کا معنی اور اس کی حکمت

نماز کی فرضیت کتاب وسنت اور اجماع امت سے ثابت ہے ارشاد خداوندی ہے ''اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا [النساء:۱۰۳]'' بے شک نماز مسلمانوں پر مقررہ وقت میں فرض کی گئی ہے۔'' حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عالی ہے۔ ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم

---

۱ [سنن ابی داؤد: ۲/۲۱] ۲: [سنن النسائی ۱/۲۴۳] ۳ [سنن النسائی ۱/۲۴۳]

کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔[1]

نماز کی فرضیت پر امت کا اجماع بھی ہے۔

''صلوٰۃ'' کا لغوی معنی دعاء کا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''وَ صَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ'' [التوبہ:۱۰۳] ''ان کے لئے دعا کریں، بے شک آپ کی دعا ان کے لیے راحت وسکون کا باعث ہے۔''

''صلوٰۃ'' کا شرعی معنی یہ ہے کہ صلوٰۃ ان مخصوص افعال کا نام ہے جن کا آغاز تکبیر سے اور اختتام تسلیم سے کیا جائے۔

نماز کی فرضیت شب معراج میں ہوئی، نماز کے اوقات کی تحدید، حدیث اور اجماع سے ثابت ہے، وتر کی نماز واجب ہے فرض نہیں ہے۔ اصل میں دو دو رکعتیں فرض ہوئی تھیں مغرب کے علاوہ، پھر سفر میں تو یہ تعداد برقرار رہی لیکن حضر میں نماز فجر کے سوا دو دو رکعتیں بڑھا دی گئیں۔

نماز کی فرضیت کی حکمت منعم حقیقی کا شکر اور گناہوں کی تکفیر ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تم جلتے ہو، تم جلتے ہو، جب تم صبح کی نماز پڑھتے ہو تو وہ نماز اس کو دھو ڈالتی ہے، پھر تم جلتے ہو تم جلتے ہو، پھر جب ظہر کی نماز پڑھتے ہو تو وہ نماز اس کو دھو ڈالتی ہے، پھر تم جلتے ہو، تم جلتے ہو، لیکن جب تم عصر کی نماز پڑھتے ہو تو وہ نماز اس کو دھو دیتی ہے، پھر تم جلتے ہو، تم جلتے ہو، لیکن جب تم مغرب کی نماز پڑھتے ہو تو وہ اس کو دھو دیتی ہے۔ پھر تم جلتے ہو، تم جلتے ہو، لیکن جب تم عشاء کی نماز پڑھتے ہو تو وہ اس کو دھو ڈالتی ہے، پھر تم سوتے ہو تو بیدار ہونے تک تمہارے خلاف کوئی بات نہیں لکھی جاتی۔''[2]

نماز کے اوقات

نماز کے وجوب کا اصل سبب، اللہ تعالیٰ کا خطاب ازلی ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات احکام کو واجب کرنے والی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا عمل ایجاب (واجب کرنے کا عمل) ہم سے پوشیدہ ہے ہم اس پر مطلع نہیں ہو سکتے اس لئے اس ذات نے ہماری آسانی کے لیے اسباب مجازی وظاہری مقرر فرما دیئے، یعنی اوقات مقرر کر دیئے کہ اوقات کے تجدد سے وجوب کا تجدد ہوتا ہے، ہر وقت کا سبب ایک جزء ہے جس سے ادا متصل ہوتی ہے، اگر ادا اس کے جزء سے متصل نہ ہو تو آخری جزء سببیت کے لیے متعین ہوگا، اگرچہ ناقص ہو، جیسے عصر کی نماز اصفرارِ شمس کے وقت پڑھنا، یہ وقتِ ناقص ہے۔ پس اگر دیوانہ اور بے ہوش آدمی اصفرار کے وقت میں باہوش ہو جائیں تو عصر کی نماز ان

---

[1] [صحیح مسلم ۱/۴۵] [2] [الترغیب:۱/۲۳۴]

پر لازم ہو جائے گی۔اسی طرح اگر حیض ونفاس والی عورت اس وقت میں پاک ہو جائے تو نماز عصر لازم ہوگی۔اسی طرح بچہ بالغ ہو جائے تو عصر کی نماز فرض ہو جائے گی اور مرتد وقت کے آخر میں مسلمان ہو جائے تو بھی یہی حکم ہے۔وقت کے نکلنے کے بعد سببیت کی اضافت سارے وقت کی طرف کی جائے گی اور واجب اپنی صفت کمال کے ساتھ ثابت ہوگا،لہٰذا اگر ان (مذکورہ) لوگوں نے وقتِ ناقص میں نماز ادا نہ کی تو وقتِ کامل میں اس کی قضاء ان پر لازم ہوگی۔

نماز کو اول وقت ادا کرنا افضل ہے،جیسا کہ مذکورہ احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں اگر وقت نکل جائے اور نماز نہ پڑھی اور وہ معذور بھی نہیں تھا تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔

نمازوں کے اوقات

نماز کے اوقات پانچ ہیں

(۱) وقت فجر

فجر کی نماز کا وقت صبح صادق سے شروع ہو کر طلوع آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے۔صبح صادق وہ سفیدی ہے،جو عرضاً (شمالاً جنوباً) افق پر پھیلتی ہے۔اور صبح کاذب وہ سفیدی ہے جو طولاً (شرقاً غرباً) آسمان پر ظاہر ہوتی ہے،پھر اس کے بعد تاریکی آجاتی ہے،عرب والے فجر کاذب کو ''ذنب السرحان'' (بھیڑیئے کی دم) کہتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز اس وقت ادا فرماتے جب آپؐ کے لیے صبح واضح ہو جاتی۔[۱]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور اس نے صبح کی نماز کا وقت دریافت کیا تو اگلے روز جب فجر طلوع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا اور ہمیں نماز پڑھائی پھر جب اس سے اگلا دن آیا اور روشنی ہوگئی تو پھر نماز پڑھنے کا حکم دیا اور ہمیں نماز پڑھائی پھر فرمایا کہ نماز کا وقت معلوم کرنے والا شخص کہاں ہے؟ (پھر اسے فرمایا) ان دونوں کے درمیان فجر کی نماز کا وقت ہے۔[۲]

فجر کی نماز میں اسفار افضل ہے،یعنی جب صبح کی روشنی واضح ہو جائے تو اس وقت فجر کی نماز پڑھنا زیادہ افضل ہے۔کیونکہ اس صورت میں طلوع فجر کا یقین ہو جاتا ہے۔بعض علماء کہتے ہیں کہ اسفار چاندنی راتوں کے ساتھ مخصوص ہے،کیونکہ ان راتوں میں صبح کا آغاز واضح طور پر معلوم

---

[۱] [سنن النسائی ۱/۲۸۰]　[۲] ایضاً

نہیں ہوتا اس لیے احتیاطاً اسفار کا حکم دیا گیا ہے یا اسفار سے مراد نماز فجر میں قرأت لمبی کرنا ہے اور یہ بات اس حدیث کے بھی زیادہ موافق ہے جس میں ہے کہ فجر کی نماز اسفار میں ادا کرنا اجر و ثواب میں زیادتی کا باعث ہے علمائے احناف میں سے امام طحاویؒ کا مختار قول یہی ہے۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اسفروا بالفجر" یعنی فجر کی نماز اسفار سے پڑھو۔[1]

محمود بن لبیدؒ اپنی قوم انصار کے چند آدمیوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ما أسفرتم بالفجر فانه أعظم بالأجر"[2] یعنی فجر کی نماز اسفار میں ادا کرنا اجر و ثواب میں زیادتی کا باعث ہے۔

طلوع فجر کے بعد نماز پڑھنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ جب طلوع فجر ہو جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو مختصر رکعتوں کے سوا اور کوئی نماز نہیں پڑھتے تھے۔[3] اس حدیث کی بناء پر طلوع فجر کے بعد فجر کی دو سنتوں کے سوا کوئی نفل نماز پڑھنا خواہ تحیۃ المسجد کی نماز ہو، مکروہ ہوگا۔

ظہر کا وقت

ظہر کا وقت سورج ڈھلنے سے شروع ہوتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ ہر چیز کا سایہ سایہءاصلی کے علاوہ دو مثل (دوگنا) ہو جائے یہی صحیح ہے۔ لیکن صاحبینؒ کہتے ہیں کہ ایک مثل تک رہتا ہے، اس کے بعد عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ امام زفرؒ اور ائمہ ثلاثہؒ (امام مالک، امام احمد، امام شافعی رحمہم اللہ) بھی یہی کہتے ہیں، ان کی دلیل حدیث امامتِ جبریل علیہ السلام ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور لوگوں کا بھی آج اسی پر عمل ہے اور اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ لیکن امام صاحبؒ کے قول پر عمل کرنا زیادہ احتیاط پر مبنی ہے، کہ ظہر ایک مثل سے پہلے پڑھ لے اور عصر دو مثل کے بعد پڑھے تاکہ دونوں نمازیں یقیناً اپنے وقت میں ادا ہوں اور دونوں روایتوں پر عمل ہو جائے۔

حضرت ابو برزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز اس وقت پڑھتے تھے جب سورج ڈھل جاتا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اس وقت (نماز کے

---

[1] [سنن النسائی: ۱/۲۷۲] [2] [سنن النسائی: ۱/۲۷۲] [3] [سنن النسائی ۱/۲۸۳]

لیے) نکلتے جب سورج ڈھل جاتا، پھر لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھاتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے، پس انہوں نے صبح کی نماز اس وقت پڑھی جب طلوع فجر ہوگئی اور ظہر کی نماز سورج کے ڈھلنے کے وقت ادا کی، پھر عصر کی نماز اس وقت میں پڑھی جب ہر چیز کا سایہ اس کے مثل ہوگیا، پھر مغرب کی نماز اس وقت پڑھی جب سورج غروب ہوگیا اور روزے دار کے لیے افطار کرنا جائز ہوگیا، پھر عشاء کی نماز غروب شفق ہونے پر ادا کی پھر اگلے روز صبح کی نماز اس وقت پڑھی جب تھوڑی سی روشنی ہوگئی، پھر ظہر کی نماز اس وقت پڑھی جب سایہ ہر چیز کے دو مثل ہوگیا، پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھی جب سورج زرد ہوگیا پھر مغرب کی نماز ایسے وقت میں پڑھی جب سورج غروب ہوگیا اور روزے دار کے لیے افطار کرنا حلال ہوگیا پھر عشاء کی نماز اس وقت پڑھی جب رات کی ایک ساعت جا چکی تھی، پھر فرمایا: نماز کا وقت کل گذشتہ اور آج کے دن پڑھی جانے والی نمازوں کے درمیان ہے[۱]

سردی کے موسم میں ظہر کی نماز میں تعجیل کرنا مستحب ہے۔ جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گرمی کے دنوں میں نماز کو تاخیر سے ادا فرماتے تھے اور سردی کے دنوں میں جلدی ادا فرماتے تھے۔[۲]

اور گرمی کے موسم میں ظہر کی نماز میں تاخیر کرنا مستحب ہے، یعنی گرمی کے موسم میں اتنی دیر کرکے پڑھنا کہ گرمی کی تیزی کم ہوجائے مستحب ہے، اور تاخیر کی حد یہ ہے کہ ایک مثل سے پہلے پہلے پڑھ لی جائے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جب گرمی زیادہ ہوجائے تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں ادا کرو، کیونکہ گرمی کی شدت جہنم کی شدتِ حرارت سے ہے۔

عصر کا وقت

عصر کا اول وقت، ظہر کا وقت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے، خواہ ظہر کا وقت دو مثل پر ختم ہو جیسا امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے خواہ ایک مثل پر ختم ہو جیسا کہ صاحبین رحمہما اللہ کا مذہب ہے اور عصر کا آخر وقت غروب آفتاب سے (لحظہ بھر) پہلے تک ہے۔

دلیل حدیثِ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ ہے کہ جبریل علیہ السلام اوقات نماز کی تعلیم دینے کے لئے آئے تو جبریل علیہ السلام آگے بڑھے، ان کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

۱ [سنن النسائی ۱/۲۴۹] ۲ [سنن النسائی ۱/۲۴۸]

کے پیچھے لوگ کھڑے ہوئے، پس انہوں نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھی جب سورج ڈھل چکا تھا۔ اور جس وقت سایہ اس کے مثل ہوگیا تو جبریل علیہ السلام آئے اور ایسا ہی کیا جیسے پہلے کیا تھا کہ جبریل علیہ السلام آگے ہوئے، ان کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے لوگ کھڑے ہوئے، پھر انہوں نے عصر کی نماز پڑھی پھر دوسرے دن اس وقت آئے جب سایہ ایک مثل ہوگیا پھر اسی طرح کیا جس طرح کل گذشتہ کیا تھا پھر ظہر کی نماز پڑھی، پھر اس وقت آئے جب سایہ دو مثل ہوگیا تھا اور اسی طرح کیا جس طرح کل گذشتہ کیا تھا اور عصر نماز پڑھی...... الحدیث[۱]

عصر کی نماز کو اصفرارِ شمس تک مؤخر کرنے پر وعید

حضرت علاء رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے پاس بصرہ میں ان کے گھر اس وقت آئے جب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تھے اور ان کا گھر مسجد کے ساتھ ہی تھا جب ہم ان کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے پوچھا کہ کیا تم نے عصر کی نماز پڑھ لی ہے؟ ہم نے کہا کہ نہیں ہم تو ابھی ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے ہیں، انہوں نے فرمایا ''تم عصر کی نماز پڑھ لو'' (راوی علاء) کہتے ہیں کہ (ان کے کہنے پر) ہم اٹھے اور ہم نے نماز پڑھی، جب ہم فارغ ہوگئے تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا عصر کی نماز کا انتظار کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ہوتا ہے تو اٹھتا ہے اور چار ٹھونگیں مارتا ہے اس نماز میں اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت کم کرتا ہے۔[۲]

جیسا کہ پہلے بھی یہ مسئلہ بیان ہوچکا ہے کہ آج کے دن کی عصر کی نماز اصفرار شمس کے وقت بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ اگر تاخیر کی کوئی جائز وجہ یا مجبوری نہ ہو تو گنہگار ہوگا ورنہ نہیں۔

حضرت سالمؒ اپنے والدؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا: جس شخص کی عصر کی نماز فوت ہوجائے (رہ جائے) تو گویا اس کا گھر بار تباہ ہوگیا۔[۳]

عصر کی نماز میں تعجیل کرنا

تعجیل عصر پر صاحبینؒ کی دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عصر کی نماز ادا فرماتے، پھر جانے والا قباء جاتا، پس وہ ان کے پاس ایسے وقت آتا کہ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے، ایک روایت میں ہے کہ ابھی سورج بلند ہوتا (ایضاً) بادل کے دن میں عصر کی نماز میں تعجیل (جلدی ادا کرنا) مسنون ہے، تاکہ مکروہ وقت میں نماز واقع نہ ہو۔

---

۱ [سنن النسائی ۱/۲۵۵] ۲ [سنن النسائی ۱/۲۵۵] ۳ ایضاً

فجر اور عصر کے بعد نفل نماز کا حکم

حضرت نصر بن عبدالرحمٰن اپنے دادا معاذؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ کے ساتھ طواف کیا تو انہوں نے (طواف کی) نماز نہیں پڑھی، میں نے پوچھا کہ آپ نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''عصر کے بعد کوئی نماز نہیں ہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے۔ اور نہ ہی صبح کی نماز کے بعد کوئی نماز ہے یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے۔[1]

مغرب کا وقت

جب سورج غروب ہو جائے تو مغرب کا وقت شروع ہوتا ہے اور شفق کے غائب ہونے تک رہتا ہے، صاحبینؒ کے نزدیک شفق اس سرخی کو کہتے ہیں جو غروبِ آفتاب کے بعد مغرب کی طرف رہتی ہے۔ اس میں آسانی اور وسعت ہے۔ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شفق وہ سفیدی ہے جو سرخی کے بعد شمالاً جنوباً (چوڑائی میں) صبح صادق کی طرح پھیلی ہوئی رہتی ہے اس میں احتیاط زیادہ ہے اور اسی پر فتویٰ اور عمل ہے احتیاط اس میں ہے کہ نماز مغرب سرخ شفق سے پہلے پہلے پڑھ لیں اور عشاء سفید شفق چھپنے کے بعد پڑھیں تا کہ نماز بالاتفاق ادا ہو۔ ائمہ ثلاثہ کا مذہب بھی صاحبینؒ کے قول کے مطابق ہے کہ شفق سے مراد سرخی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے اپنے قول سے رجوع بھی منقول ہے۔ آپؒ بھی اسی کے قائل ہو گئے تھے کہ اس سے مراد سرخی ہے کیونکہ ان کے نزدیک یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی شفق کا معنی سرخی کا لیا ہے۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے نماز کے اوقات دریافت کیے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اس کو) فرمایا تم دو دنوں تک ہمارے ساتھ رہو۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا تو انہوں نے فجر کے وقت اقامت کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز پڑھائی، پھر زوال شمس کے وقت ان کو (اقامت کا) حکم دیا، پھر ظہر کی نماز پڑھائی، پھر اس وقت حکم دیا جب سورج کو (ابھی) روشن دیکھا، پھر عصر ادا فرمائی، پھر اس وقت (اقامت کا) حکم دیا جب سورج غروب ہو گیا پھر مغرب کی نماز پڑھائی، پھر غروبِ شفق ہونے پر حکم دیا (اور عشاء کی نماز پڑھائی) پھر اگلے دن اجالے میں حکم دیا اور نماز ادا فرمائی اور ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھا، پھر خوب ٹھنڈا ہونے دیا، پھر عصر کی نماز اس وقت پڑھی جب سورج ابھی روشن تھا اور پھر مغرب کی نماز شفق غائب ہونے سے پہلے پڑھی، پھر ان (حضرت بلال رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا اور عشاء کی اقامت اس وقت کہی جب رات کا تہائی

[1] [سنن النسائی ۱/ ۲۵۸]

حصہ جاچکا تھا پھر عشاء کی نماز پڑھی، پھر فرمایا أین السائل عن وقت الصلوة؟ یعنی نماز کے اوقات پوچھنے والا شخص کہاں ہے؟ پھر فرمایا تمہاری نماز کے اوقات وہ ہیں جو تم نے دیکھ لیے۔[۱]

مغرب کی نماز میں مطلقاً تعجیل مسنون ہے۔

کیا مغرب سے پہلے دو رکعت نفل ادا کرنا مکروہ ہے۔؟ اگر اس سے مغرب کی نماز میں تاخیر ہوتی ہو تو مکروہ ہے ورنہ نہیں۔ جیسا کہ حضرت حسان بن بلال، قبیلہ اسلم کے ایک صحابیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے تھے، پھر اقصائے مدینہ میں اپنے گھروں کو لوٹتے اور تیر پھینکتے اور تیر کے گرنے کی جگہیں دیکھ لیتے''۔[۲]

مغرب کی نماز میں بلا عذر اتنی تاخیر کرنا کہ ستارے خوب چھٹک جائیں یعنی بکثرت نظر آنے لگیں اور گتھ جائیں مکروہ تحریمی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اول وقت میں نماز ادا کرنے کا شوق تھا، جیسا کہ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں موجود ہے کہ جبریل علیہ السلام دونوں دن اس وقت آئے جب سورج غروب ہو چکا تھا، نیز حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں بھی ہے کہ ''پھر مغرب کی نماز اس وقت پڑھی جب سورج غروب ہو گیا اور روزے دار کے لیے روزہ افطار کرنا جائز ہو گیا''۔

مغرب کے بعد سونے کی کراہت

مغرب کے بعد سونا مکروہ ہے، کیونکہ ابو برزۃ الاسلمی رضی اللہ عنہ فرض نماز کی کیفیت والی حدیث روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز عشاء کو مؤخر کرنا مستحب جانتے تھے، (وہ نماز عشاء) جس کو عتمہ کہتے ہیں اور عشاء سے پہلے سونے کو اور اس کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔''[۳]

عشاء کا وقت

شفق غائب ہونے کے بعد عشاء کا وقت شروع ہوتا ہے اور صبح صادق ہونے سے پہلے تک رہتا ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں وہ جبریل علیہ السلام کی امامت کا ذکر کرتے ہیں، میں یہ ہے کہ ''یہاں تک کہ جب شفق جا چکی تو جبریل علیہ السلام آئے اور کہا کہ اٹھیئے عشاء کی نماز پڑھیئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور عشاء پڑھی .... الحدیث[۴]

نیز حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نماز عشاء کا وقت تمام لوگوں سے

---

۱ [سنن النسائی ۱/۲۵۸] ۲ [سنن النسائی ۱/۲۵۸]
۳ [سنن النسائی ۱/۲۶۲] ۴ [سنن النسائی: ۱/۲۶۲]

زیادہ جانتا ہوں، رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز تیسری رات کے چاند کے غروب ہوتے وقت پڑھتے تھے۔اور تیسری رات میں چانداس وقت چھپتا ہے جب شفق ختم ہو جاتی ہے۔

نماز عشاء کا مستحب وقت

حدیث امامت جبریل میں ہے کہ ''پھر عشاء کے لیے اس وقت آئے جب رات کا اول تہائی حصہ ختم ہو چکا تھا، پھر فرمایا کہ اٹھو! نماز پڑھو، پس آپ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھی''[1]

اسی طرح حدیث ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ میں ہے کہ ''پھر آپؐ ہماری طرف نہیں نکلے یہاں تک کہ رات کا نصف حصہ ختم ہو گیا (الحدیث) اس میں ہے کہ اگر کمزور کی کمزوری اور بیمار کی بیماری کا خوف نہ ہوتا تو میں اس نماز کے بارے حکم دیتا کہ اسے نصف شب تک مؤخر کیا جائے۔[2]

عشاء کا آخری وقت

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے نماز عشاء میں اتنی تاخیر کی کہ رات کا اکثر حصہ ختم ہو گیا اور مسجد والے سو گئے، پھر باہر نکلے اور نماز پڑھی، اور فرمایا ''یہ اس کا وقت ہے، اگر مجھے اپنی امت پر مشقت میں پڑ جانے کا خوف نہ ہوتا''[3]

حدیثِ ھذا میں موجود لفظ ''عامة الليل'' سے مراد رات کا سارا وقت ہے، جیسا کہ لغت سے معلوم ہوتا ہے نیز آنحضور ﷺ کی یہ حدیث مبارکہ اس پر شاہد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ میری امت کو عام قحط سے ہلاک نہ فرمانا۔اس میں بھی لفظ ''بسنة عامة'' موجود ہے جس کا معنی ہے کہ ایسے قحط سے ہلاک نہ ہو جو سب کو شامل ہو کہ سب کے سب اس کی زد میں آجائیں۔

نماز وتر کا وقت

نماز وتر کا وقت وہی ہے جو عشاء کا ہے۔حضرت خارجہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک نماز سے تمہاری مدد فرمائی ہے جو کہ سرخ اونٹوں سے زیادہ قیمتی ہے وہ وتر کی نماز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نماز عشاء اور طلوع فجر کے درمیانی وقت میں مقرر کیا ہے۔[4]

---

[1] [سنن النسائی ۱/ ۲۶۳] [2] [سنن النسائی ۱/ ۲۶۸]
[3] [سنن النسائی ۱/ ۲۶۷] [4] [سنن الترمذی ۱/ ۲۸۱]

سونے سے پہلے وتر کی نماز ادا کرے یا رات کو اٹھنے کے بعد؟ احتیاط اس میں ہے کہ سونے سے قبل ہی ادا کرلے، جیسا کہ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ہے کہ میرے خلیل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تین وصیتیں فرمائیں (۱) وتر کی نماز ادا کرکے سونا (۲) ہر ماہ تین دن روزے رکھنا (۳) چاشت کی دو رکعتیں پڑھنا۔[۱]

جب نیند سے بیدار ہوتے تو قیام لیل کرتے اور وتر نہ پڑھتے۔ نیز حضرت طلق بن علی کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔[۲]

جن اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے

حضرت عقبہ بن عامر الجہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین اوقات ایسے ہیں کہ ان میں رسول اللہؐ نے ہمیں نماز پڑھنے اور اپنے مردوں کو دفنانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ (۱) جب سورج طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ بلند ہوجائے (۲) جس وقت سورج ڈھل رہا ہو، یہاں تک کہ جھک جائے (۳) جس وقت غروب ہونے کو ہو یہاں تک کہ غروب ہوجائے''۔[۳]

معلوم ہوا کہ ان اوقات میں نماز کی قضاء کرنا، سجدہ تلاوت کرنا اور نماز جنازہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ البتہ غروب کے وقت آج کے دن کی عصر کی نماز پڑھنا جائز ہے، کیونکہ اس کا سبب وہ جزء ہے جو وقت سے متصل اور قائم ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، لہٰذا (اس صورت میں) نماز جس طرح واجب ہوئی اسی طرح اس کو ادا کیا ہے۔

حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ایسا کوئی وقت ہے جو دوسرے وقت سے زیادہ باعث قرب خداوندی ہو؟ یا انہوں نے کہا کہ کیا ایسا کوئی وقت ہے جسے بندہ تلاش کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں! رات کا آخری وقت ایسا ہے کہ اس میں رب تعالیٰ اپنے بندے کے قریب ہوتا ہے، پس اگر تم سے ہوسکے کہ تم ان لوگوں میں سے بنو جو اس ساعت میں اللہ عزوجل کا ذکر کرتے ہیں تو بن جاؤ، کیونکہ اس وقت نماز میں فرشتے طلوع آفتاب تک حاضر رہتے ہیں، سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے، اور وہ وقت کفار کی نماز کا ہے پس اس وقت نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ سورج بلند ہوجائے ایک نیزے کے برابر، اور اس کی شعاع جاتی رہے، پھر نماز میں فرشتے موجود رہتے ہیں یہاں تک کہ نصف نہار پر سورج نیزے کی طرح سیدھا ہوجائے۔ یہ ایسا وقت ہے کہ اس میں جہنم کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور جہنم کو بھڑکایا جاتا ہے، پس اس وقت نماز نہ پڑھو، یہاں

---

[۱] [سنن النسائی ۲/۲۲۹] [۲] [سنن النسائی ۲/۲۳۰] [۳] [سنن النسائی ۱/۲۷۵]

تک کہ سایہ لوٹ آئے، پھر نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے، سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور وہ کفار کی نماز (کا وقت) ہے۔"[۱]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصر کے بعد (نفل) نماز پڑھنے سے منع فرمایا یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے اور صبح کی نماز کے بعد (بھی نفل) نماز پڑھنے سے منع فرمایا، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے۔[۲]

معلوم ہوا کہ ان دو وقتوں میں نفل نماز نہیں پڑھنی چاہیے، فوت شدہ نمازیں پڑھنا جائز ہیں اور سجدہ تلاوت بھی۔ طواف کی دو رکعتیں نہ پڑھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا کہ طلوع آفتاب یا غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھی جائے۔[۳]

جس وقت میں مسافر نمازوں کو جمع کر سکتا ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب سفر میں جلدی ہوتی تو ظہر کو عصر تک مؤخر کرتے، پھر دونوں کو (اپنے اپنے وقت میں) جمع کرتے اور مغرب کو اتنا مؤخر کرتے کہ مغرب اور عشاء کو جمع کر کے پڑھتے یہاں تک کہ شفق غائب ہو جاتی۔

حضرت سالم، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب دو نمازوں کو جمع کرنا ہوتا تو (سواری سے) اترتے اور فرماتے "اقامت کہو" پھر جب میں سلام پھیرتا تو پھر فرماتے "اقامت کہو" پھر نماز پڑھ کر سوار ہو جاتے۔......الحدیث[۴]

حضرت نافع کہتے ہیں کہ ہم حضرت عبداللہ ابن عمر کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے واپس آئے۔ آپ ہمیں لے کر چلے، یہاں تک کہ شام ہو گئی، ہم نے خیال کیا کہ آپ نماز پڑھنا بھول گئے، ہم نے آپ سے کہا کہ "الصلاۃ" یعنی نماز پڑھنی ہے، آپ خاموش رہے اور چلتے رہے یہاں تک کہ شفق چھپنے کے قریب ہوئی تو (سواری سے) نیچے اترے اور نماز پڑھی، پھر شفق غائب ہوئی تو عشاء کی نماز پڑھی، پھر ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "هكذا كنا نصنع مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا جدبه السير"[۵] یعنی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جلدی سفر کرنا مقصود ہوتا تو ہم آپ کے ساتھ اسی طرح کیا کرتے تھے۔

---

۱ [سنن النسائی ۱/۲۷۹] ۲ [سنن النسائی ۱/۲۷۶] ۳ ایضاً

۴ [سنن النسائی ۱/۲۸۵] ۵ [سنن النسائی ۱/۲۸۸]

ابن شمیل، کثیر بن قاروندا سے روایت کرتے ہیں کہ ہم نے سالم بن عبداللہؒ سے سفر میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا کہ کیا حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سفر کے دوران نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے تھے؟ فرمایا کہ نہیں مگر (صورت کے اعتبار سے) جمع کرتے تھے۔[1]

مذکورہ احادیث مبارکہ اور سالم بن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بیان سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ سفر میں نمازوں کو صورۃً جمع کیا جاتا تھا، حقیقتاً نہیں، یعنی ظہر کی نماز کو اس کے آخر وقت میں اور عصر کی نماز کو اس کے اول وقت میں ادا کرنا اور اسی طرح مغرب کی نماز کو اس کے آخر وقت میں اور عشاء کی نماز کو اس کے اول وقت میں ادا کرنا یہ سفر میں جائز ہے اور یہ صورۃً جمع بین الصلوتین ہے نہ کہ حقیقۃً اور اسی میں احتیاط ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی رعایت ہوجاتی ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰباً مَّوْقُوْتاً [النساء:۱۰۳]۔ "بے شک نماز مومنوں پر اپنے مقررہ اوقات میں فرض کی گئی ہے۔"

عرفات میں ظہر اور عصر کو جمع کرنا

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلتے ہوئے میدان عرفات میں پہنچے، یہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خیمہ دیکھا جو مقام نمرہ میں آپؐ کے لیے لگایا گیا تھا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں اترے جب سورج ڈھلا تو آپؐ نے قصواء (اونٹنی) پر کجاوہ رکھنے کا حکم دیا پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اس پر کجاوہ رکھ دیا گیا یہاں تک کہ جب آپؐ بطن وادی میں پہنچے تو لوگوں سے خطاب فرمایا، پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، پھر اقامت کہی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھائی پھر اقامت کہی تو عصر کی نماز پڑھائی ان دونوں کے درمیان کوئی نماز نہیں پڑھی۔[2]

مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو جمع کرنا

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما عرفات سے واپس آئے تو واپسی پر میں ان کے ساتھ تھا، جب وہ مزدلفہ میں پہنچے تو انہوں نے مغرب اور عشاء کو جمع کیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جگہ پر اسی طرح کیا تھا۔[3]

نماز کو اپنے وقت پر پڑھنے کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا

---

۱ [سنن النسائی ۱/۲۸۸] ۲ [سنن النسائی ۱/۲۹۰] ۳ [سنن النسائی ۱/۲۹۰]

کہ اللہ عزوجل کو کونسا عمل زیادہ محبوب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا، والدین کی فرماں برادری کرنا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا"۔[1]

جو شخص سو جائے یا نماز پڑھنا بھول جائے وہ کیا کرے؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسے آدمی کے بارے میں دریافت کیا گیا جو نماز پڑھے بغیر سو جائے یا اس سے غافل ہو گیا ہو؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب نماز یاد آئے پڑھ لے۔[2]

فوت شدہ نمازیں کس طرح قضاء کرے؟

جس کی بالغ ہونے یا مسلمان ہونے کے بعد کوئی نماز فوت نہ ہوئی ہو، پھر بعد میں کچھ نمازیں فوت ہو جائیں تو ان کو ترتیب کے ساتھ قضاء کرے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، ہماری ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ادا نہ ہو سکیں، یہ چیز مجھ پر گراں ہوئی، میں نے اپنے دل میں کہا کہ ہم ایک تو سرکار دو عالم ﷺ کے ہمراہ ہیں اور پھر اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں! رسول اللہؐ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اقامت کہی اور آنحضرت ﷺ نے ہمیں ظہر کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی اور آپ ﷺ نے ہمیں عصر کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی اور آپ ﷺ نے ہمیں مغرب کی نماز پڑھائی، پھر اقامت کہی اور آپ ﷺ نے ہمیں عشاء کی نماز پڑھائی، پھر آپؐ نے ہماری طرف توجہ فرمائی اور فرمایا "**ما علی الأرض عصابة یذکرون اللہ عزوجل غیر کم**"[3] یعنی روئے زمین پر تمہارے سوا کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہی ہو۔

نمازِ فجر کی قضاء کس طرح کی جائے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رات بھر چلتے رہے، پھر آخر شب میں ایک جگہ قیام فرمایا، (اور سو گئے) اور ایسے وقت بیدار ہوئے جب سورج طلوع ہو چکا تھا، آپ ﷺ نے نماز نہیں پڑھی، یہاں تک کہ سورج بلند ہو گیا تو آپ ﷺ نے نماز پڑھی اور وہ صلوٰۃ وسطیٰ ہے۔[4]

---

[1] [سنن النسائی ۱/۲۹۳]　[2] [سنن النسائی ۱/۲۹۴]

[3] [سنن النسائی ۱/۲۹۷]　[4] [سنن النسائی ۱/۲۹۹]

حدیث ابی مریم میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیا، اس نے اذان کہی، پھر فجر سے پہلے کی دو رکعتیں پڑھیں، پھر اقامت کہنے کا حکم دیا، اس نے اقامت کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔"

﴿باب الاذان﴾

حضرت ابوعمیر بن انس رحمۃ اللہ علیہ اپنے انصاری چچازاد بھائی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کونماز کی فکر ہوئی کہ اس کے لیے لوگوں کو کیسے جمع کیا جائے؟ کسی نے کہا کہ آپ نماز کے وقت ایک جھنڈا کھڑا کردیں، جب لوگ اس کو دیکھیں گے تو ایک دوسرے کو اطلاع دے دیں گے۔لیکن یہ رائے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پسند نہ آئی، کسی نے یہ رائے دی کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو بگل بجا دیا جائے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ رائے بھی پسند نہ آئی۔اور فرمایا کہ یہ تو یہود کا طریقہ ہے کسی نے کہا کہ ناقوس بجایا جائے، آپ نے فرمایا کہ یہ نصاریٰ کا طریقہ ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فکر مندی کے سبب حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہؓ بڑے فکر مند ہوئے۔چنانچہ خواب میں ان کو اذان سنائی گئی۔ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ حضرت عبداللہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں سورہا تھا کہ ایک شخص ناقوس اٹھائے ہوئے میرے پاس سے گزرا، میں نے کہا کہ اے اللہ کے بندے کیا یہ ناقوس بیچو گے؟ اس نے کہا کہ تم یہ لے کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اس کے ذریعہ ہم نماز کے لیے لوگوں کو بلائیں گے۔اس نے کہا کہ کیا اس سے بہتر چیز تمہیں نہ بتاؤں؟ میں نے کہا کہ کیوں نہیں! چنانچہ اس نے کہا کہ تم یہ الفاظ کہو: **"اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ، اشھدان لا الہ الا اللّٰہ، اشھد ان محمداً رسول اللّٰہ، اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الفلاح،حیّ علی الفلاح، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الہ الا اللّٰہ."**

جب صبح ہوئی تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا خواب بیان کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **"انھا لرؤیا حق ان شاء اللّٰہ"** یعنی ان شاءاللہ یہ سچا خواب ہے۔پھر فرمایا کہ تم بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو کر اس کو وہ کلمات بتاتے جاؤ جو تم نے خواب میں سنے تھے اور وہ ان کے ساتھ اذان کہے، کیونکہ اس کی آواز تم سے زیادہ اونچی ہے۔پس میں بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑا ہو گیا، میں ان کو کلمات اذان بتاتا گیا اور وہ ان کو سن کر اذان دیتے گئے، حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے آواز سنی، وہ اس وقت گھر میں تھے، تو اپنی چادر کو گھسیٹتے ہوئے نکلے اور یہ کہہ رہے تھے "قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو یارسول اللہ! حق کے ساتھ بھیجا ہے!، میں نے بھی ان کی

طرح یہ خواب دیکھا ہے۔''[1]

ترمذی کی روایت میں اس طرح ہے: ''میں نے بھی اسی طرح دیکھا ہے جس طرح یہ کہہ رہا ہے تو آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''فللّٰه الحمد، فذلک أثبت''[2] یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔ اس سے بات زیادہ پختہ ہوگئی۔''

اذان کی فضیلت

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، ابوالزنادؒ سے وہ اعرجؒ سے اور وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب نماز کے لیے اذان دی جاتی ہے تو شیطان حواس باختہ ہو کر اتنی دور بھاگتا ہے۔ کہ جہاں اس کو اذان کی آواز سنائی نہ دیتی ہو، پھر جب اذان ختم ہو جاتی ہے تو پھر واپس آجاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب نماز کے لیے تثویب ہوتی ہے تو پھر بھاگ جاتا ہے، تثویب ختم ہوتے ہی پھر واپس آجاتا ہے اور آکر انسان کے دل میں خیالات ڈالتا ہے اور کہتا ہے۔ ''اذکر کذا، اذکر کذا'' یعنی فلاں بات یاد کر، فلاں بات یاد کر، جو اس کو یاد نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اس آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔[3]

اذان میں آواز بلند کرنے کی فضیلت

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے عبداللہ بن عبدالرحمٰن بن ابی صعصعہ سے کہا کہ میں آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ بھیڑ بکریوں اور جنگل وصحرا نشینی کو پسند کرتے ہیں۔ جب آپ اپنی بکریوں میں مصروف ہوں یا جنگل میں ہوں اور نماز کے لیے اذان دیں تو آواز کو بلند کیا کریں۔ کیونکہ مؤذن کی آواز کو جو جن یا انس یا کوئی چیز سنے گی۔ قیامت کے روز وہ اس کے حق میں گواہی دے گی۔''[4]

اذان کا جواب کس طرح دے؟

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تم اذان سنو تو اسی طرح کہو جس طرح موذن کہتا ہے۔[5]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ حضرت بلالؓ

---

[1] [سنن ابی داؤد ۱/۱۳۴] [2] [سنن الترمذی ۱/۱۲۲] [3] [صحیح البخاری ۱/۱۴۹]

[4] [صحیح البخاری: ۱/۱۴۹] [5] [سنن النسائی ۲/۲۳]

اذان دینے لگے، جب وہ اذان دے کر خاموش ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص یقین کے ساتھ اس طرح کے کلمات کہے وہ جنت میں داخل ہوگا۔''[1] حضرت علقمہ بن ابی وقاص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے مؤذن نے اذان دی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مؤذن کی طرح کلمات کہے حتیٰ کہ جب اس نے کہا: ''حی علی الصلوٰۃ'' تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا: لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ پھر جب اس نے کہا: ''حی علی الفلاح'' تو انہوں نے کہا: ''لاحول ولاقوۃ إلا باللّٰہ'' اس کے بعد مؤذن کی طرح ہی الفاظ کہتے رہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح کہتے ہوئے سنا ہے۔[2]

اذان کے بعد درود شریف پڑھنا

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ''جب تم مؤذن کو سنو تو اسی طرح کہو جس طرح وہ کہتا ہے اور مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمتیں نازل فرماتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ سے میرے لیے ''وسیلہ'' مانگو، وسیلہ جنت میں ایک منزلت (مقام و درجہ) ہے۔ جو اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے ہی لائق ہے، مجھے امید ہے کہ وہ بندہ میں ہوں گا، پس جو شخص میرے لیے وسیلہ مانگے گا اس کے لیے (میری) شفاعت ثابت ہو جائے گی۔''[3]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اذان سن کر یہ کہتا ہے: اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّآمَّۃِ وَالصَّلَاۃِ الْقَآئِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَانِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابعثْہُ الْمقَامَ الْمَحْمُوْدَ الَّذِیْ وَعَدتَّہٗ تو قیامت کے دن میری شفاعت اس کے لیے واجب ہو جاتی ہے۔''[4]

اذان کا مفہوم

''اذان'' کا لغوی معنیٰ اطلاع دینے کے ہیں، اور اصطلاح شریعت میں اذان کہتے ہیں نماز کے وقت کی اطلاع دینا ایسے مقررہ الفاظ کے ساتھ جو مخصوص صفت پر منقول ہیں۔

اذان پانچوں نمازوں اور جمعہ کے لیے مردوں کے واسطے سنت مؤکدہ ہے۔ نماز عید، نماز وتر، نماز تراویح اور نماز جنازہ کے لیے اذان نہیں ہے۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

---

[1] ایضاً [2] [سنن النسائی ۲/۲۵]

[3] [سنن النسائی ۲/۲۵] [4] [سنن النسائی ۲/۲۶]

کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئی مرتبہ عیدین کی نماز پڑھی ہے۔ وہ بغیر اذان واقامت ہوتی تھی۔[1]

نماز کسوف کے لیے بھی اذان مسنون نہیں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عہد رسالت ﷺ میں سورج گہن ہوا تو آپ ﷺ نے ایک منادی بھیجا کہ وہ الصلوٰۃ جامعۃ (نماز سب کو جمع کرے گی) کہے، پس لوگ جمع ہوئے تو آپ ﷺ آگے بڑھے، تکبیر کہی گئی اور چار رکعت نماز ادا فرمائی۔ الحدیث[2]

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر چند لوگ شہر میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں لیکن اذان اور اقامت نہ کہیں تو سنت کے خلاف کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اہل شہر ترک اذان پر اتفاق کرلیں تو میں ان کے خلاف ضرور قتال کروں گا۔

اذان شعائر اسلام اور سنن ہدیٰ میں سے ہے۔ اذان کا ثبوت کتاب اللہ سے بھی ہے اور سنت رسول ﷺ سے بھی۔ کتاب اللہ میں تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ ”وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ“ [المائدۃ:۵۸] نیز ارشاد الٰہی ہے: ”اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ“ [الجمعۃ:۹] اور سنت سے اس کا ثبوت حضرت عبداللہ بن زید بن عبد ربہؓ کی سابقہ حدیث سے ملتا ہے۔ راجح قول کے مطابق ۱ ھ میں اس کا آغاز ہوا۔ اذان کا سبب دخول وقت ہے اور وقت اس کے لیے شرط ہے۔ حضرت بلالؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمایا: ”جب تک فجر خوب واضح نہ ہو جائے اذان نہ دو۔“[3]

فجر کا وقت داخل ہونے سے قبل اذان دینا جائز ہے، یعنی اذان اول۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”بلال رضی اللہ عنہ کی اذان تمہیں سحری کھانے سے نہ روکے، کیونکہ وہ تو اس لیے اذان دیتا ہے تاکہ کھڑا ہونے والا لوٹ آئے اور سونے والا بیدار ہو جائے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”بلال رات کو اذان دیتے ہیں، پس تم کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تم ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی اذان سنو“ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نابینا آدمی تھے، دکھائی نہیں دیتا تھا، اذان اس وقت کہتے جب لوگ کہتے کہ صبح ہوگئی ہے۔“

۱۔ [صحیح مسلم ۲/۶۰۴] ۲۔ [صحیح مسلم ۲/۶۲۰]

۳۔ [سنن ابی داؤد ۱/۲۴۷] ۴۔ [مسند احمد بشرح البناء ۳/۳۶]

اذان کی شرائط

اذان کا عربی الفاظ میں ہونا اس کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔ مؤذن بھی نیک وصالح ہو، اوقات نماز سے واقف ہو، باوضو ہو، پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والا ہو، نماز میں نہ آنے والوں سے پوچھتا ہو، خوش آواز اور بلند آواز ہو، بلند جگہ پر قبلہ رخ ہو کر اذان دے، تمام شرائط اس میں بدرجہ کمال موجود ہوں، عنقریب اس کی تفصیل آ جائے گی، ان شاء اللہ۔

اذان سننے کا حکم یہ ہے کہ اس کا جواب دینا لازمی اور ضروری ہے۔ اذان سنت مؤکدہ ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے اس اعرابی کو، جو نماز ٹھیک طریقے سے ادا نہیں کر رہا تھا، نماز کا طریقہ تو سکھایا تھا لیکن اذان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ البتہ حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ کو اذان کی تعلیم دی ہے۔ حضرت مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول ﷺ کے پاس حاضر ہوئے ہم نوجوان قرب العمر تھے۔ ہم نے آپ ﷺ کے ہاں بیس راتیں قیام کیا، رسول اللہ ﷺ بڑے رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ آپ ﷺ نے خیال کیا کہ ہمیں اپنے اہل وعیال کا اشتیاق ہوا ہے۔ پس آپ ﷺ نے ہم سے ہمارے اہل وعیال کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے آپ ﷺ کو اس کی خبر دی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا "اپنے اہل وعیال کے پاس واپس جاؤ، ان کے پاس رہو اور ان کو تعلیم دو، اور ان کو حکم دو کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو تم میں سے کوئی شخص اذان دے اور تم میں جو بڑا ہو وہ امامت کرے۔"[۱]

اذان فرض نمازوں کے لیے سنت موکدہ ہے خواہ تنہا نماز پڑھے۔ حضرت سلمان الفارسیؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "جب کوئی آدمی چکنی ہموار زمین میں ہو اور نماز کا وقت ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وضو کرے، اگر پانی نہ ملے تو تیمم کرے، پھر اگر اقامت کہے تو اس کے ساتھ اس کے دو فرشتے نماز پڑھتے ہیں اور اگر اذان اور اقامت (دونوں) کہے تو اس کے پیچھے خدا کا وہ لشکر نماز پڑھتا ہے جس کو اس کی نگاہیں نہیں دیکھتی ہیں۔"[۲]

اذان فرض نمازوں کے لیے سنت مؤکدہ ہے، خواہ نماز ادا ہو یا قضاء اور سفر میں ہو یا حضر میں۔ جیسا کہ حضور اقدس ﷺ نے کیا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ خیبر سے واپسی پر آنحضرت ﷺ نے رات کو ایک جگہ ہمیں ٹھہرایا، پھر فرمایا: "نماز کا کون خیال رکھے گا؟" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں رکھوں گا۔ سب سو گئے۔ یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اس جگہ سے نکلو جہاں غفلت نے تمہیں آ پکڑا۔" پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

---

۱ [سنن النسائی ۲/۹] ۲ [معجم الطبرانی ۶/۲۴۹]

اے بلال رضی اللہ عنہ! کیا تم سو گئے؟ انہوں نے کہا جس ذات نے آپ کو سلایا اسی نے مجھے بھی سلا دیا، پھر بلال رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا، انہوں نے اذان اور اقامت کہی...... الحدیث[۱]

عورتوں کے لیے اذان اور اقامت کہنا مکروہ ہے، کیونکہ ان کو ستر (پردے) میں رہنے کا حکم ہے، اور عورتوں کو بلا ضرورت آواز بلند کرنا حرام ہے، اقامت (تکبیر کہنا) بھی عام طور پر بلند آواز سے ہوتی ہے۔ اگرچہ اذان کی بہ نسبت اس میں آواز کم پست ہوتی ہے۔

کتاب ''الآثار'' میں امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے حماد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے یہ روایت ذکر کی ہے کہ ''عورتوں پر نہ اذان ہے اور نہ اقامت''[۲]

حضرت اسما بنت ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''عورتوں پر نہ اذان ہے اور نہ اقامت۔''[۳]

اذان کا طریقہ

اذان کا طریقہ یہ ہے کہ شروع میں چار مرتبہ تکبیر (اللّٰہ اکبر) کہی جاتی ہے۔ حضرت حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دو مرتبہ تکبیر کہنے کی روایت نقل کی ہے، قاضی ابو یوسفؒ سے بھی یہی روایت ہے اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے اور اذان کے باقی کلمات دو دو مرتبہ دہرائے جائیں گے، اور آخر میں تکبیر (اللّٰہ اکبر) دو مرتبہ کہی جائے گی، شہادتین کے کلمات میں ترجیع نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے تمام حالات میں ترجیع نہیں کی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ترجیع سنت ہے، کیونکہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ نے پیغمبر علیہ السلام کے حکم پر شہادتین میں ترجیع کی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تعلیم کے لیے تھا، انہوں نے اس کو ترجیع کے لیے خیال کر لیا۔ نیز حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ مکہ معظمہ میں موذن تھے اور وہ ابھی نو مسلم تھے، انہوں نے اپنی قوم سے حیاء کی وجہ سے کلمات شہادت کو پست آواز میں پڑھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی گوشمالی کی اور ان کو دوبارہ دہرانے اور اپنی آواز کو بلند کرنے کا حکم دیا تا کہ انہیں معلوم ہو کہ حق کے معاملے میں کوئی حیاء نہیں ہونی چاہیے۔[۴]

حضرت عبداللہ بن محیریز رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ (قبول اسلام سے قبل) میں چند لوگوں کے ہمراہ نکلا، ہم حنین کے کسی راستے میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حنین سے واپس آئے، راستے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہماری ملاقات ہوئی، پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

۱ [سنن البیہقی ۱/۴۰۳] ۲ [صحیح البخاری ۱/۳۲۸] ۳ ایضاً ۴ [طحاوی]

کے مؤذن نے اذن دی۔ ہم نے مؤذن کی آواز سنی تو ہم اس کی نقل اتارنے لگے اور اس کا مذاق اڑانے لگے، آنحضرت ﷺ نے آواز سنی تو پیش ہونے کا حکم دیا، ہم حاضر ہوئے تو فرمایا: ''تم میں سے کون ہے جس کی اونچی آواز میں نے سنی ہے؟'' سب نے میری طرف اشارہ کیا۔ آپ ﷺ نے سب کو بھیج دیا (چھوڑ دیا) اور مجھے روک لیا پھر فرمایا۔ ''قم فأذن بالصلوٰۃ'' 'اٹھو! نماز کے لیے اذان دو'' پس میں اٹھا مجھے اس وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات اور حکم سب چیزوں سے زیادہ ناپسند تھا، میں آپ ﷺ کے سامنے کھڑا ہو گیا، آنحضور ﷺ بذات خود مجھے اذان کے کلمات سکھانے لگے: فرمایا کہو: **اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اشهد ان لا اله الا اللّٰہ، اشهد ان لا اله الااللّٰہ، اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ، اشهدان محمدًا رسول اللّٰہ.** پھر مجھ سے فرمایا: ''لوٹاؤ اور آواز کو بلند کرو۔'' پھر فرمایا کہو: **اشهد ان لا اله الا اللّٰہ، اشهدان لا اله الا اللّٰہ، اشهد ان محمداً رسول اللّٰہ، اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الفلاح، حیّ علی الفلاح، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا اله الا اللّٰہ.**'' جب میں اذان سے فارغ ہوا تو مجھے بلایا اور مجھے ایک تھیلی عنایت فرمائی جس میں چاندی کی کوئی چیز تھی، پھر میری پیشانی پر اپنا دست اقدس رکھا اور پھر اس کو میرے چہرے پر پھیرا، پھر چھاتی پر پھیرتے ہوئے ناف تک لے گئے پھر فرمایا۔ ''**بارک اللّٰہ فیک وبارک علیک**'' یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے۔'' میں نے عرض کیا! یا رسول اللہ! مجھے مکہ میں اذان دینے پر مامور فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں نے آپ کو اس پر مامور کر دیا۔'' (یہ سنتے ہی) سارا بغض محبت نبوی ﷺ میں بدل گیا۔ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابو محذورہ! ہر نماز کی اذان میں پہلے کلمہ کو دہراؤ'' [۱]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ وہ اذان کے کلمات کو جفت عدد میں ادا کریں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں اذان کے کلمات کو دو دو بار دہرایا جاتا تھا۔ [۲]

اقامت

اقامت بھی اذان کے مثل ہے، جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ......

'' اتنے میں عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ (انصار کے ایک آدمی) آئے، انہوں نے کہا کہ وہ (فرشتہ) قبلہ رخ

۱ [سنن الدار قطنی ۱/۲۳۳] ۲ [سنن الدار قطنی ۱/۲۳۸]

ہوا اور اس نے یہ الفاظ کہے۔ ''اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ، اشھد ان لا الہ الااللّٰہ، اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ، اشھدان محمدًا رسول اللّٰہ، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الفلاح، حیّ علی الفلاح، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الہ الا اللّٰہ.'' پھر کچھ دیر توقف کرنے کے بعد کھڑا ہوا اور اسی طرح کے الفاظ کہے، لیکن فرق اتنا ہے کہ حی علی الفلاح کے بعد ''قد قامت الصلوٰۃ قدقامت الصلوٰۃ'' کے الفاظ کا اضافہ کیا۔ آپؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''لقّنھا بلا لاً'' یعنی یہ الفاظ بلال رضی اللہ عنہ کو تلقین کرو، چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان الفاظ کے ساتھ اذان دی۔[1]

اذان میں ترسّل سنت ہے، ترسّل یہ ہے کہ دو کلموں کے درمیان فصل کرے سکتہ کے ساتھ اور اقامت میں حدر کرے اور حدر یہ ہے کہ فصل نہ کرے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں اس بات کا امر فرمایا کرتے تھے کہ ہم اذان میں ترتیل اور اقامت میں حذف کریں۔[2]

اقامت میں حذف کا معنی ہے کہ اس میں تخفیف کریں۔ بیت المقدس کے مؤذن حضرت ابوالزبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ آئے اور فرمایا کہ جب تم اذان دو تو ترسّل کرو اور جب اقامت کہو تو حذم کرو۔[3] حذم کا معنی ہے جلدی جلدی کہنا۔

تثویب صرف فجر کی اذان میں سنت ہے، تثویب یہ ہے کہ حی علی الفلاح کے بعد یہ کہے: الصلاۃ خیر من النوم (دومرتبہ)۔ جیسا کہ حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اذان دیتا تھا اور فجر کی اذان اول میں یوں کہتا تھا۔ حی علی الفلاح، الصلاۃ خیر من النوم، الصلاۃ خیر من النوم، اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر، لا الہ الا اللّٰہ.''[4]

سنت یہ ہے کہ اذان واقامت کھڑے ہو کر کہے اور قبلہ رخ ہو۔ جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی سابقہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس میں ''فاستقبل القبلة'' کے الفاظ آتے ہیں۔

اگر سفر وغیرہ کی ضرورت کی وجہ سے سوار ہو اور سواری کی حالت میں اذان دے تو جائز ہے۔ جیسا کہ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر میں حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا تو انہوں نے اپنی سواری پر ہی اذان دی۔[5] حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بلا عذر بیٹھ کر اذان دینا مکروہ ہے۔

---

۱ [سنن ابی داؤد ۱/۱۴۰] ۲ [سنن الدار قطنی ۱/۲۳۸] ۳ [سنن الترمذی ۱/۱۲۴]

۴ [سنن النسائی ۲/۱۴] ۵ [سنن البیہقی ۱/۳۹۲]

حیعلتین کے وقت چہرے کو پھیرنا مستحب ہے، یعنی حی علی الصلاۃ کے وقت دائیں جانب اور حی علی الفلاح کے وقت بائیں جانب چہرہ پھیرنا مستحب ہے۔

جیسا کہ عون بن ابی جحیفہؒ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ اس وقت مقام ابطح میں سرخ رنگ کے خیمے میں موجود تھے۔ (اس طویل حدیث میں یہ بھی ہے کہ) پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی تو وہ حی علی الصلوٰۃ اور حی علی الفلاح کہتے وقت اپنا چہرہ دائیں اور بائیں پھیرنے لگے۔[۱]

مستحب ہے کہ اذان دیتے وقت اپنی انگلیاں کانوں میں ڈالے۔ جیسا کہ حدیث ابی جحیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے معلوم ہوتا ہے جس میں یہ بھی ہے کہ ''پھر اس نے اذان دی اور اپنی انگلیوں کو کانوں میں ڈالا اور اپنی اذان (کہنے والی) میں گھومے۔[۲]

بہتر یہ ہے کہ اذان منارہ پر ہو، جیسا کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ کے زمانے میں جمعہ کے دن پہلی اذان اس وقت ہوتی تھی جب آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوتے تھے، جب ممبر سے اترتے تو اقامت ہوتی، یہ طریقہ نبی کریم ﷺ اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانے میں رہا، لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا زمانہ آیا اور لوگوں کی کثرت ہوگئی تو انہوں نے مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیا، پس اس نے آپ رضی اللہ عنہ کے نکلنے سے پہلے مقام زوراء پر اذان دی۔[۳] تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جمعہ کا وقت ہو گیا ہے۔

مستحبات اذان

مستحب ہے کہ مؤذن نیک وصالح، امانت دار، متقی و پرہیز گار اور اذان کی سنتوں کا عالم ہو، جیسے اذان میں ترسّل اور حدر اور تکبیر (اللہ اکبر کہنا) کا چار مرتبہ کہنا۔ نیز اوقات نماز سے بھی واقف ہو کہ نمازوں کے اوقات کب شروع ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''امام ضامن ہے اور مؤذن امانت دار، اللہ تعالیٰ امام کی رہنمائی فرمائے اور مؤذن کو معاف فرمائے۔''[۴]

نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چاہیے کہ تم میں بہترین شخص اذان دے اور چاہیے کہ تم میں بڑا قاری (عالم) امامت کے فرائض انجام دے۔[۵]

---

۱ [سنن البیہقی ۱/۳۹۵] ۲ ایضاً ۳ [معجم الطبرانی ۶/۱۴۶]

۴ [سنن البیہقی ۱/۴۲۶] ۵ ایضاً

مؤذن کا بلند آواز ہونا مستحب ہے۔ جیسا کہ حدیث عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ ''فقم مع بلال فالق علیه ما رأیت فلیؤذن به'' یعنی پس تم بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ اور (خواب میں) جو کچھ دیکھا اس کے مطابق اس کو بتاتے جاؤ اور وہ اس کے ساتھ اذان کہے، کیونکہ اس کی آواز تجھ سے زیادہ اونچی ہے۔''

باوضو اذان دینا مستحب ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لا یؤذن إلا متوضی''[1] یعنی باوضو شخص ہی اذان دے۔''

اگر اذان واقامت کے بغیر نماز پڑھ لی گئی تو وہ درست ہو جائے گی۔ جیسا کہ سالم بن عبداللہؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی اکٹھی نمازیں ادا فرمائیں، ان دونوں میں سے کسی میں اذان نہیں دی گئی، صرف اقامت کہی گئی، اور ان دونوں نمازوں کے درمیان میں بھی اور ان کے بعد بھی کوئی نماز نہیں پڑھی گئی۔[2]

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے علقمہ رحمۃ اللہ علیہ اور اسود رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اذان اور اقامت کے بغیر نماز پڑھی، آپ رضی اللہ عنہ یہ فرماتے کہ محلّہ کی اذان اور اقامت ہمارے لیے کافی ہے۔[3]

مؤذن امام کے آنے سے پہلے اقامت نہ کہے اور امام کے آنے سے پہلے لوگوں کو کھڑا نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ''حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے پھر توقف کرتے، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تشریف لاتے ہوئے دیکھتے تو نماز کی اقامت کہتے۔''[4]

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب نماز کی اقامت کہی جائے تو جب تک مجھے نہ دیکھ لو کھڑے نہ ہوا کرو۔''[5]

نیز کھمس رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ ہم (مقام) منیٰ میں نماز کے لیے کھڑے ہوئے، امام ابھی نہیں آئے تھے اور کچھ لوگ بیٹھے تھے تو (میں بھی بیٹھ گیا) اہل کوفہ کے ایک بزرگ نے مجھ سے کہا کہ تم کیوں بیٹھ گئے، میں نے کہا کہ ابن بریدہؒ نے کہا کہ امام کے انتظار میں کھڑا رہنا! اس کو ''سمود'' کہتے ہیں۔[6] اور سامد اس شخص کو کہتے ہیں جو سر اٹھائے حیرانگی سے کھڑا ہو۔ ابن اثیرؒ کی ''النہایۃ'' میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کے لیے آئے تو دیکھا کہ لوگ ان کا کھڑے ہو کر انتظار کر رہے ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا بات ہے کہ میں تم کو سمود کرتے ہوئے دیکھتا ہوں؟

---

۱ [سنن الترمذی ۱/ ۱۲۹] ۲ [سنن البیہقی ۱/ ۴۰۷] ۳ ایضاً

۴ [سنن ابی داؤد ۱/ ۱۴۸] ۵ ایضاً ۶ ایضاً

اذان اور اقامت کے درمیان اتنی دیر بیٹھنا مسنون ہے کہ جس میں بے وضو آدمی وضو کر سکتا ہو۔ مغرب اس سے مستثنیٰ ہے۔ جیسا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے بلال! اپنی اذان اور اقامت کے درمیان اتنا وقفہ رکھو کہ کھانے والا اپنے کھانے سے با آسانی فارغ ہو جائے اور وضو کرنے والا با آسانی اپنی حاجت کو پورا کر سکے۔[1]

جو شخص مسجد میں ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اذان سننے کے بعد مسجد سے نکلے، جب تک کہ اس مسجد میں نماز ادا نہ کر لے، لیکن اگر اس ارادے سے نکلے کہ واپس آ کر نماز ادا کرے گا یا کسی دوسری مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا ارادہ ہو تو پھر نکلنا جائز ہے۔ جیسا کہ ابو الشعثاء رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک مسجد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے کہ مؤذن نے عصر کی اذان دی تو ایک آدمی (مسجد سے) باہر نکلا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **اما هذا فقد عصى ابا القاسم عليه السلام**'' [2] یعنی اس شخص نے ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی ہے۔''

نماز کے فرائض

نماز کے فرائض دو قسم کے ہیں: کچھ فرائض وہ ہیں جو نماز سے پہلے ادا کیے جاتے ہیں، ان کو شرائط صلوٰۃ کہا جاتا ہے اور کچھ فرائض ایسے ہیں جن کو نماز میں ادا کیا جاتا ہے۔ ان کو ارکان صلوٰۃ کہتے ہیں۔ پھر بعض شرائط ایسی ہیں کہ ان کا نماز کے آغاز سے اختتام تک قائم اور برقرار رہنا ضروری ہے۔ جیسے طہارت، ستر عورت، استقبال قبلہ اور بعض شرائط صرف انعقاد صلوٰۃ کے لیے ہیں، جیسے نیت کرنا، تکبیر تحریمہ کہنا، دخول وقت، اور نماز جمعہ کے لیے خطبے کا ہونا۔

شرائط صلوٰۃ

نماز کی شرائط پانچ ہیں: (۱) ہر طرح کے حدث اور نجاست سے جسم اور کپڑوں کی طہارت (۲) جگہ کی طہارت۔

احداث سے طہارت پر دلیل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت خبیب بن ابی ثابتؒ سے روایت کرتے ہیں کہ جنبی آدمی جب لوگوں کو نماز پڑھائے تو وہ خود بھی اور دوسرے لوگ بھی سب نماز کا اعادہ کریں۔[3]

نیز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ جو امیر المومنین رضی اللہ عنہ تک پہنچتی ہے روایت کی ہے، اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے عطا بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کے بارے میں جو اپنے ساتھیوں کو

---

[1] [مسند احمد بشرح البناء ۳/۴۱] [2] (ایضاً) [3] [رواہ الحافظ طلحہ بن محمد فی مسندہ]

بغیر وضو کے نماز پڑھائے، یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ بھی اعادہ کرے اور وہ لوگ بھی اعادہ کریں۔

نیز محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ وہ سب اعادہ کریں۔

رواهما الامام محمد وقال: وبه نأخذ، وهو قول ابى حنيفة[1]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بے وضو آدمی کی نماز نامقبول ہے جب تک کہ وضو نہ کرے۔[2]

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے اور ہم ایک ہی وضو سے کئی نمازیں پڑھتے تھے۔[3]

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو جب نکسیر آتی تو نماز چھوڑ کر وضو کرتے، پھر واپس آ کر اسی پر بناء کرتے اور (اس دوران) بات نہ کرتے۔" [الموطا/۱/۴۷]

لباس کی طہارت کی دلیل میں فرمان باری تعالیٰ ہے: "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ [المدثر:۴]" اور اپنے کپڑوں کو پاک کرو۔" مطلب یہ ہے کہ پانی کے ساتھ اس کی نجاست کو دور کرو، کیونکہ نماز اس کے بغیر درست نہیں ہوتی۔

ام جحدر العامریہؒ روایت کرتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حیض کا خون کپڑوں کو لگ جائے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھی، ہم نے اپنے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور اس پر چادر ڈال دی تھی، جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ چادر لی اور اس کو اوڑھ لیا، پھر نکلے اور صبح کی نماز پڑھائی، پھر بیٹھے تو ایک آدمی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس پر خون کا دھبہ لگا ہوا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے آس پاس کے حصے کو پکڑا اور ایک لڑکے کے ہاتھ اس چادر کو اسی طرح بھیجا اور فرمایا کہ: "اس کو دھوڈالو اور اس کو خشک کر کے میری طرف بھیج دو۔" پس میں نے (پانی کا) برتن منگوایا اور اس کو دھو کر خشک کیا پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اس کو بھیج دیا، جب دوپہر کا وقت ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور وہ چادر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زیب تن تھی۔[4]

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دریں اثنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب کو نماز پڑھا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچانک اپنے نعلین مبارک اتارے اور ان کو بائیں جانب کر دیا جب لوگوں نے دیکھا تو انہوں نے اپنے جوتے اتار دیئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ تم نے اپنے جوتے کیوں اتارے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ نے

---

۱ [جامع الرضوی ۱/۳۲۱] ۲ [صحیح مسلم ۱/۲۰۴]

۳ [سنن ابی داؤد ۱/۲۴] ۴ [سنن ابی داؤد ۱/۱۰۴]

اپنے نعلین مبارک اتارے ہیں تو ہم نے اپنے جوتے اتار دیئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جبریلؑ میرے پاس آئے تھے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ ان نعلین میں گندگی لگی ہوئی ہے۔'' اور آپؐ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص مسجد کی طرف آئے تو اس کو چاہیے کہ پہلے دیکھ لے، اگر جوتوں میں گندگی نظر آئے یا کوئی نجاست ہو تو اسکو پونچھ لے اور پھر ان میں نماز پڑھے۔[1]

حضرت سلمان بن یسار رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ کپڑے کو اگر منی لگ جائے تو کیا حکم ہے؟ فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے سے اس کو دھو ڈالتی تھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے تشریف لے جاتے اور دھونے کا نشان یعنی پانی کا دھبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کپڑے پر موجود ہوتا۔[2]

جگہ کی طہارت پر دلیل فرمان خداوندی ہے: ''وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ'' [الحج:۲۶] ''اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھیئے''۔ اس سے مقصود دونوں قدموں، دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنوں اور اصح قول کی بناء پر پیشانی کی جگہ کا پاک رکھنا ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں پیشانی (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ناک کی طرف اشارہ کیا)۔ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور دونوں پاؤں کی انگلیاں اور یہ کہ ہم کپڑوں کو اور بالوں کو نہ سمیٹیں'' [3]

(۳) ستر ڈھانپنا: اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد عالی ہے۔ ''يَا بَنِي آدَمَ خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ [الاعراف:۳۱] ائمہ تفسیر فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چیز ہے جو عورت (شرمگاہ) کو ڈھانپ لے نیز ارشاد خداوندی ہے۔ ''وَ لَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا'' [النور:۳۱] امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ، سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ''إِلَّا مَا ظَهَرَ'' سے مراد چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور کپڑے ہیں، چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ستر عورت میں شامل نہیں ہیں اور ظاہری زینت سے مراد وہ کپڑے ہیں جن سے عورت کے اعضاء اور بدن نہ جھلکتا ہو۔ امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء میں سے ابن خویز منداد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عورت جب خوبصورت ہو اور اس کے چہرے اور ہتھیلیوں کے کھلا رکھنے سے فتنے کا اندیشہ ہوتا ہو تو اس عورت پر ضروری ہے کہ ان کو چھپائے، اگر بوڑھی ہو یا بدصورت ہو تو چہرے اور ہتھیلیوں کا کھلا رکھنا اس کے لیے جائز ہے۔ امام محمد بن قنفد رحمۃ اللہ علیہ نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ عورت کن کپڑوں میں نماز پڑھتی ہے؟ تو جواب دیا کہ عورت چادر اور اس لمبی قمیض میں نماز پڑھتی ہے جو اس کے قدموں کے ظاہری

---

[1] [سنن ابی داود ۱/۱۷۵] [2] [صحیح البخاری ۱/۶۴] [3] [صحیح مسلم ۱/۳۵۴]

حصے کو چھپاتی ہو۔[۱]

دونوں قدموں کے بارے میں اختلاف ہے، صحیح یہ قول ہے کہ یہ بھی ستر عورت میں داخل ہے۔ "الھدایۃ" میں ہے کہ اصح یہ ہے کہ یہ ستر عورت میں داخل نہیں ہیں، پاؤں کا چوتھائی حصہ کھلنا مانع صلوٰۃ ہے، جیسا کہ عورت کے بال، پیٹ، پشت، یا ران اور کان کا چوتھائی حصہ کھل جائے تو نماز درست نہیں ہوتی جبکہ ایک رکن کی ادائیگی کے برابر کھلا رہے۔ اگر چوتھائی حصے سے کم کھلے تو پھر عورت کی نماز درست ہے، اگرچہ نماز کے آخر تک برابر کھلا رہے لیکن مکروہ ہے، کیونکہ تھوڑی مقدار سے بچنا دشوار ہے، اس لیے اتنی مقدار معاف کردی گئی اور اس کو مرد کے ستر یسیر (معمولی ستر کے کھلنے) پر قیاس کیا گیا ہے۔ البتہ چوتھائی مقدار، یسیر (معمولی) نہیں ہے اور اس سے بچنا بھی ممکن ہے، اس لیے تین تسبیحات کی مقدار میں اتنا ستر کھلا رہنا مفسد صلوٰۃ ہے۔

عورت کے لیے مستحب ہے کہ وہ ایسی لمبی قمیض میں نماز ادا کرے جو اس کے قدموں کو ڈھانکے اور ایک دوپٹہ ہو جو اس کے سر اور گردن کو ڈھانپ دے اور ایک بڑی چادر جسے وہ دوپٹے کے اوپر سے لپیٹے، رکوع اور سجدہ کی حالت میں اس کو دور رکھے تا کہ اس کا جسم اور مواقع عورت (ستر عورت کی جگہیں) اس کے کپڑوں سے نہ نظر آئیں۔

فقہاء کرامؒ کا اس پر اجماع ہے کہ عورت پر لازم ہے کہ وہ نماز اور احرام میں اپنے چہرے کو کھلا رکھے۔ مرد کا ستر ناف کے نیچے سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک ہے، اس کی دلیل حضرت عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ "اپنے بچوں کو سات سال کی عمر ہونے پر نماز کا حکم دو اور دس سال کے ہونے پر نماز کے لیے ان کو مارو اور ان کے بستر الگ کردو اور جب تم میں سے کوئی شخص اپنے خادم، غلام یا اجیر کا نکاح کرے تو اس کے ستر عورت (کے اعضاء) کو نہ دیکھے، کیونکہ اس کی ناف کے نیچے سے اس کے گھٹنے تک کا حصہ اس کے ستر میں سے ہے۔"[۲]

حدیث سے یہ امر مفہوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ کا حصہ دیکھنا جائز ہے لیکن شہوت کی صورت میں ناجائز ہے۔ ران، ستر عورت میں داخل ہے جیسا کہ حضرت جرہد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نبی کریم ﷺ نے حضرت جرہد رضی اللہ عنہ کو مسجد میں دیکھا کہ ان کے بدن پر ایک چادر ہے اور ران کھلی ہوئی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "الفخذ عورۃ"[۳] یعنی ران بھی ستر میں شامل ہے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، نیز محمد بن جحش رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے

---

۱ [سنن ابی داؤد ۱/۱۷۳] ۲ [مسند احمد بشرح البناء ۳/۸۳]

۳ [مسند احمد بشرح البناء ۳/۸۳]

کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مسجد کے صحن میں گزر ہوا تو دیکھا کہ معمر چادر میں لپٹے ہوئے ہیں اور ان کی ران کا ایک حصہ کھلا ہوا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو فرمایا: ''خمّر فخذک یا معمر فان الفخذ عورۃ'' [1] یعنی اے معمر! اپنی ران کو ڈھانکو، کیونکہ ران بھی ستر میں داخل ہے۔

ستر واجب وہ ہے جس سے جسم کا رنگ چھپ جاتا ہو، پس اگر کپڑا اتنا باریک ہو کہ اس کے پیچھے سے جلد کا رنگ ظاہر ہوتا ہو اور اس کی سفیدی یا سرخی معلوم ہو جاتی ہو ایسے کپڑے میں نماز جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے ستر حاصل نہیں ہوتا۔ اگر جلد کا رنگ نظر نہ آتا ہو اور (اعضاء کی) بناوٹ جھلکتی ہو تو نماز جائز ہے، کیونکہ اس سے بچاؤ ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ ساتر (کپڑا) دبیز اور موٹا ہو۔

جب اعضاء ستر عورت میں سے تھوڑا سا حصہ کھل گیا تو نماز باطل نہیں ہوگی۔ کیونکہ تھوڑی مقدار سے بچنا ممکن نہیں ہے، زیادہ مقدار وہ ہے جو دیکھنے میں بری لگے اور تھوڑی وہ ہے جو دیکھنے میں بری نہ لگے اور اس مسئلہ میں دارومدار عرف وعادت پر ہے البتہ ضابطہ یہ ہے کہ اعضاء عورت میں سے کسی عضو کا چوتھائی حصہ کھلنا صحت صلوٰۃ کیلئے مانع ہے۔ جبکہ ایک رکن کی ادائیگی کی مقدار برابر کھلا رہے، اگر اس مقدار سے کم کشادگی رہی تو وہ معاف ہے، اس سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ اسی طرح اگر عضو چوتھائی حصہ سے کم مکشوف ہو تو اس سے بھی نماز فاسد نہیں ہوگی، کیونکہ وہ معمولی مقدار ہے اس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ یہ سب حکم اس صورت میں ہے جب بلا ارادہ کشف عورت ہو، اگر قصداً ہو تو چاہے چوتھائی مقدار سے کم ہو اور اس کا چھپانا اس کے لیے ممکن ہو تو نماز درست نہ ہوگی۔

لباس چار طرح کا ہے۔

(۱) جواز والا (۲) فضیلت والا (۳) کراہت والا (۴) حرمت والا۔ تفصیل یہ ہے۔

جب صرف اتنا کپڑا پائے جو اس کے اعضاء ستر عورت کو ڈھانک دے تو یہ جواز والا لباس ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا کیسا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''أولکلکم ثوبان؟'' [2]

یعنی کیا ہر ایک کو دو کپڑے میسر ہیں۔ اور جب کوئی شخص دو یا اس سے زیادہ کپڑوں میں نماز پڑھے تو یہ اعلیٰ لباس ہے، جیسا کہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع رحمۃ اللہ علیہ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ''ألم تکس ثوبین'' یعنی کیا تم دو کپڑے نہیں پہنتے؟ انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں، پہنتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم گھر جاؤ تو کیا ایک کپڑے میں جاؤ گے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ

---

[1] [مسند احمد بشرح البناء ۸۳/۳] [2] [صحیح مسلم ۶۷/۱]

تعالیٰ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے لیے زینت اختیار کی جائے یا لوگ اس کے زیادہ حقدار ہیں؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ زیادہ حق رکھتے ہیں۔

امام کے لیے دوسروں سے زیادہ تاکید ہے، کیونکہ وہ مقتدیوں کے درمیان ہوتا ہے اور لوگوں کی نمازیں اسی کی نماز سے وابستہ ہوتی ہیں۔

سدل ثوب مکروہ ہے۔ سدل یہ ہے کہ کپڑے کو بغیر پہنے ہوئے سر یا مونڈھے پر اس طرح ڈالنا کہ لٹکتا رہے مکروہ تحریمی ہے، اگر چادر وغیرہ کا ایک سرا دوسرے کندھے پر ڈال لیا اور دوسرا سرا لٹک رہا ہے تو مکروہ نہیں ہے، اگر رومال سر پر یا دونوں کندھوں پر لٹکتا ہوا ڈال لیا تو مکروہ تحریمی ہے۔

کپڑے کو ٹخنوں سے نیچے تکبر کے طور پر دراز کرنا مکروہ تحریمی ہے۔

جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **من جر ثوبه من الخيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيامة**"[1] یعنی جو شخص تکبر کی وجہ سے اپنے کپڑے کو کھینچے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظر التفات نہیں فرمائیں گے۔"

اگر دو کپڑے موجود ہوں تو ایک کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن بریدہ اپنے والد (حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ ایسی چادر جسے پہنا ہوا نہ ہو، اس میں نماز پڑھی جائے اور دوسرا یہ کہ تم شلوار میں نماز پڑھو اور تمہارے بدن پر چادر نہ ہو (اس سے بھی منع فرمایا)[2] مغصوبہ کپڑے میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ایک قول کے مطابق ایسے کپڑے میں نماز پڑھنا حرام ہے۔ تحریم کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) پہلی قسم نجس ہے۔ نجس کپڑے میں اور نجس کپڑے پر نماز پڑھنا درست نہیں ہے کیونکہ نجاست سے پاک ہونا (نماز کے لیے) شرط ہے اور شرط پائی نہیں جاتی لہٰذا نماز نہیں ہوگی۔

جو شخص ازالہ نجاست کے لیے کوئی چیز نہ پائے تو اسی میں نماز پڑھ لے اور بعد میں نماز کا اعادہ نہ کرے اگر کپڑے کا ربع (چوتھائی حصہ) یا اس سے زیادہ حصہ پاک ہو تو اسی میں لازماً نماز پڑھے۔ اگر برہنہ پڑھی تو نہیں ہوگی۔ اگر پاک حصہ ربع سے کم ہو تو اختیار ہے کہ برہنہ بدن نماز پڑھے یا اسی میں پڑھے۔ البتہ اسی میں نماز پڑھنا افضل ہے، کیونکہ ستر تو نماز کے ساتھ خاص نہیں ہے جبکہ طہارت نماز کے ساتھ خاص ہے۔

(۲) دوسری قسم تحریم کی وہ ہے جو مردوں کے ساتھ خاص ہے، یعنی صرف مردوں کے لیے حرام ہے، عورتوں کے لیے حرام نہیں ہے جیسا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم

---

[1] [صحیح مسلم ۳/۱۶۵۲] [2] [سنن ابی داود: ۱/۱۷۲]

نے فرمایا: ''سونے چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیو اور نہ ہی ریشم اور دیباج (کے کپڑے) پہنو، کیوں کہ یہ چیزیں دنیا میں کفار کے لیے ہیں اور تمہارے لیے آخرت میں ہیں۔''[1]

ریشم کی دھاری اور نقش مباح ہے، جب کہ چار انگشت اور اس سے کم کم ہو، جیسا کہ ابو عثمان النہدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عتبہ بن فرقد کو لکھا کہ ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریشم سے منع فرمایا ہے مگر جو اتنا ہو یعنی دو انگل اور تین اور چار تک[2]

خارش کے لیے ریشم کا پہننا مباح ہے یا جس مریض کو ریشم کا کپڑا پہننا مفید ہو اس کے لیے مباح ہے۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور زبیر رضی اللہ عنہ کو سفر میں ریشم کے کرتے پہننے کی اجازت دی تھی کیونکہ وہ دونوں حضرات خارش میں مبتلا تھے۔[3]

جن کپڑوں پر تصاویر بنی ہوئی ہوں ان کو پہننا مکروہ تحریمی ہے، بعض کے نزدیک حرام ہے۔ اس کی دلیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس گھر میں کتا ہو یا تصویر ہو۔''[4]

جن کے نزدیک حرام نہیں ہے ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ جملہ استثنائیہ ہے: ''الا رقماً فی ثوب'' یعنی کپڑے میں نقش ونگار مستثنیٰ ہے۔

جو شخص کپڑا نہ پائے وہ بیٹھ کر برہنہ نماز پڑھے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پاؤں قبلہ کی طرف پھیلا کر اشارے سے رکوع وسجدہ کرے، کیونکہ اس میں زیادہ ستر ہے اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور رکوع وسجدہ کیا یا بیٹھ کر رکوع وسجدہ کے ساتھ نماز پڑھی تو ہو جائے گی، کیونکہ بیٹھ کر نماز پڑھنے میں دونوں شرمگاہوں کا ستر ہے اور کھڑے ہو کر پڑھنے میں ارکان کی ادائیگی ہے، لہٰذا افضل طریقے کی طرف متوجہ ہو۔

(۴) نیت کرنا

اس پر دلیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے: ''انما الأعمال بالنیات'' یعنی تمام اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عمل میں اخلاص نیت سے ہی پیدا ہوتا ہے اور ہمیں اخلاص کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

۱۔ [صحیح البخاری ۷/۱۴۶] ۲۔ [سنن ابی داؤد ۴/۴۷]
۳۔ [سنن ابی داؤد ۴/۵۰] ۴۔ [صحیح مسلم ۳/۱۶۶۵]

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ [البینۃ:۵]

ان کو اسی بات کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔''

جس نماز کو شروع کرنا ہو اس کی نیت کرے اور وہ نیت تکبیر تحریمہ سے متصل ہو، نیت یہ ہے کہ اس کا دل جانتا ہو کہ وہ کونسی نماز پڑھنے لگا ہے، زبان کا اعتبار (مدار) نہیں ہے، کیونکہ نیت، عمل قلب کا نام ہے، احتیاط اس میں ہے کہ وہ اس طرح نیت کرے کہ اس کی نیت شروع فی الصلوٰۃ کے مقارن (متصل) ہو۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو جماعت کے ساتھ فرض نماز ادا کرنے کی نیت سے گھر سے نکلے لیکن جب امام تک پہنچے تو تکبیر کہے اور نیت کا استحضار نہ کرے تو فرمایا کہ جائز ہے کیونکہ وہ اپنی نیت پر باقی (قائم) ہے کہ جو اس نے نیت کی تھی وہ ثابت ہے۔

اگر نفل نماز پڑھنے کا ارادہ ہو تو صرف نماز کا ارادہ کرنا کافی ہے، قضاء نماز میں فرض کی تعیین ضروری ہے اور وقتی نماز میں وقت کے فرض کی نیت کرے، اگر مقتدی ہو تو وقت کے فرض کے ساتھ متابعت کی بھی نیت کرے یا امام کی نماز میں شروع ہونے کی نیت کرے یا امام کی نماز میں اس کی اقتداء کی نیت کرے جیسا کہ امام محمد نے ''الآثار'' میں عن الامام عن حماد عن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ روایت ذکر کی ہے کہ ''جب تم لوگوں کی نماز میں شامل ہو اور تم ان کی نماز کی نیت نہ کرو تو تمہیں کافی نہیں ہے اور اگر امام اپنی نماز پڑھے اور پیچھے والا شخص کسی اور نماز کی نیت کرے تو امام کی نماز ہو گئی لیکن پیچھے والے کی نہیں ہوئی۔''

(۵) استقبال قبلہ

استقبال قبلہ پر دلیل، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ [البقرۃ:۱۴۴]

''اپنے چہرے اس کی جانب پھیر لو۔''

جو شخص کعبہ کے پاس موجود ہو وہ عین کعبہ کی طرف رخ کرے گا، اور جو اس سے دور ہو وہ جہت کعبہ کی طرف رخ کرے گا۔ کیونکہ عین کعبہ سے عاجز ہونے کے وقت جہت کعبہ اس کے قائم مقام ہے۔ اور انسان اپنی طاقت کے مطابق ہی مکلّف ہوتا ہے۔

امام مالکؒ، حضرت نافعؒ سے وہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عمر فاروقؓ نے فرمایا، مشرق ومغرب کے درمیان کا حصہ قبلہ ہے جبکہ بیت اللہ کی جانب رخ کیا جائے۔''[1]

خوف زدہ شخص جس جہت کی طرف قدرت رکھتا ہو نماز پڑھے، اس کی دلیل یہ آیت

---

[1] [المؤطا ۱/۱۵۵]

قرآنی ہے، فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ [البقرہ:۱۱۵] یعنی جہاں بھی تم منہ کرو گے وہاں اللہ کی ذات موجود ہے۔

خانہ کعبہ کی اس جگہ کی طرف منہ کرنے کا اعتبار ہے جو اس کی عمارت سے گھری ہوئی ہے اس کی عمارت کا اعتبار نہیں ہے اور قبلہ کی جگہ ساتویں زمین (تحت الثریٰ) سے لے کر کعبہ کے مقابل ومحاذ میں عرش معلیٰ تک ہے پس اگر کوئی شخص خانہ کعبہ کے اندر یا کعبہ کی چھت پر نماز پڑھے تو جدھر کو منہ کرے جائز ہے اور اگر کعبہ کی دیوار پر نماز پڑھی تو اگر اس کا منہ قبلہ کی چھت کی جانب کو ہے تو نماز جائز ہوگی اور اگر نہیں ہے تو نماز جائز نہ ہوگی۔

اگر قبلے میں اشتباہ ہو گیا اور پاس کوئی بتانے والا بھی نہ ہو تو خود غور کرے اور اپنے اجتہاد ورائے سے جس طرف چاہے رخ کر کے نماز پڑھے۔ اگر کوئی بتانے والا ہو تو اس سے پوچھنا واجب ہے اور اس کی بات پر عمل کرنا ضروری ہے اگرچہ اس کی رائے کے خلاف ہو، بشرطیکہ بتانے والا اس جگہ کا رہنے والا ہو اور مقبول الشہادۃ ہو۔ اگر معلوم ہوا کہ اس نے غلط بتایا ہے یا نماز پڑھ لینے کے بعد اس کا اجتہاد (رائے) تبدیل ہو گیا تو نماز کا اعادہ اس پر واجب نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنی وسعت کے مطابق اس کو ادا کر چکا ہے۔ اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہؓ کی روایت ہے وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے، رات انتہائی تاریک تھی، ہمیں قبلہ معلوم نہ ہو سکا تو ہر شخص نے اپنی سامنے کی جانب منہ کر کے نماز پڑھ لی، جب صبح ہوئی تو ہم نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے ذکر کی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ [البقرہ:۱۱۵][1]

اگر نماز کے دوران اپنی غلطی معلوم ہو تو نماز ہی میں قبلہ کی جانب گھوم جائے اور اس پر بناء کرے۔ اس کی دلیل امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ لوگ صبح کی نماز میں مسجد قباء میں مشغول تھے کہ ایک آنے والا آیا اور اس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ پر اس رات قرآن (کا حکم) نازل ہوا ہے، آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ خانہ کعبہ کی طرف منہ کریں پس سب نے کعبۃ اللہ کی طرف رخ کر لیا، ان کے منہ شام کی جانب تھے پھر وہ کعبہ کی طرف گھوم گئے۔[2]

جب تحری کر کے ایک جانب متعین کرے اور پھر کسی دوسری جانب نماز پڑھی تو نماز فاسد ہوگی، اگرچہ بعد میں قبلہ درست نکلے، یہ امام صاحبؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔ امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ اگر قبلہ درست نکلے تو جائز ہے۔ واللہ اعلم

---

[1] [سنن الترمذی:۱۲۱۶] [2] [سنن الترمذی ۵/۱]

ارکان صلوٰۃ

ارکانِ صلوٰۃ چھ ہیں ، (۱) تکبیر تحریمہ (۲) قیام (۳) قرات (۴) رکوع (۵) سجود (۶) قعدہ اخیرہ بقدر تشہد۔

(۱) تکبیر تحریمہ کی دلیل یہ حدیث مبارکہ ہے ''مفتاح الصلوٰۃ الطھور وتحریمھا التکبیر وتحلیلھا التسلیم'' یعنی نماز کی کنجی طہارت ہے اور اس کی تحریم تکبیر اور تحلیل تسلیم ہے''۔ تکبیر تحریمہ شیخینؒ کے نزدیک شرط ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک رکن صلوٰۃ ہے اور نماز کے فرائض میں سے ایک فرض ہے، کیونکہ وہ نماز سے متصل ہے، جیسے گھر کے لیے دروازہ، دروازہ اگرچہ گھر کے لیے غیر ہے لیکن اسی کا حصہ شمار ہوتا ہے۔ اس کو تحریمہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے پہلے جو کلام والتفات اور کھانا پینا وغیرہ مباح تھا اس تکبیر سے حرام ہو جاتا ہے۔

(۲) قیام کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ [البقرہ:۲۳۸] یعنی اور اللہ کے لیے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔'' نیز حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے نبی کریمؐ سے نماز کے بارے میں دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''کھڑے ہو کر نماز پڑھو اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو''[۱]

قیام، فرض نماز اور وتر کی نماز میں ضروری ہے قیام کی حد یہ ہے کہ اتنا کھڑا ہو کہ اگر اپنے ہاتھ دراز کرے۔ (لٹکائے) تو گھٹنوں تک نہ پہنچیں جبکہ قیام وسجدہ پر قادر ہو، پس اگر قیام پر قادر ہو لیکن سجدے پر قادر نہ ہو تو مستحب یہ ہے کہ بیٹھ کر اشارے سے نماز پڑھے۔

نفل نماز میں اگر قیام پر قادر ہو تو تب بھی بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز ہے لیکن کھڑے ہو کر پڑھنا افضل ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو رات کی نماز (نماز تہجد) کبھی بھی بیٹھ کر پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، یہاں تک کہ آپؐ عمر رسیدہ ہو گئے تو قرأت بیٹھ کر کرتے پھر جب رکوع کا ارادہ فرماتے تو کھڑے ہو جاتے اور تیس یا چالیس کے قریب آیات تلاوت (قرأت) کرتے پھر رکوع کرتے۔[۳]

کثرتِ قرأت سے طولِ قنوت حاصل ہوتا ہے اور وہ افضل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سی نماز افضل ہے؟ فرمایا کہ طولِ قنوت والی۔[۴]

---

۱ [سنن الترمذی ۱/۵] ۲ [صحیح بخاری: ۲/۵۷]

۳ [سنن ابی داؤد ۱/۲۱۶] ۴ [سنن الترمذی: ۱/۲۳۹]

(۳) قرأت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ''فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ'' [المزمل:۲۰] یعنی قرآن میں سے جو آسان لگے اسے پڑھو۔ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور قرأت غیر صلوٰۃ میں بالا جماع واجب نہیں ہے اس سے ثابت ہوا کہ قرأت نماز میں ثابت اور لازم ہے۔ حضرت ابوعثمان النہدی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ مجھے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ نے مجھے فرمایا ''جاؤ اور مدینہ میں اعلان کر دو کہ قرآن کے بغیر نماز جائز نہیں، اگرچہ سورہ فاتحہ اور اس سے زائد چیز سے ہو۔''[۱]

نماز میں سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز کے ارکان میں سے نہیں ہے۔ اور کوئی آیت متعین نہ کرے بلکہ جس جگہ سے بھی پڑھے کافی ہے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ایک قول یہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا، فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ [المزمل:۲۰] یعنی قرآن میں سے جو آسان لگے اسے پڑھو'' نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو ایک آدمی بھی مسجد میں آیا اور اس نے نماز پڑھی، (نماز کے بعد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا، آپ نے جواب دیا اور فرمایا! ارجع فصل فانک لم تصل'' یعنی واپس جاؤ اور نماز پڑھو، تم نے نماز نہیں پڑھی'' وہ واپس گیا اور اس نے پہلے کی طرح نماز پڑھی، پھر آیا اور سلام عرض کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر یہی فرمایا کہ ''جاؤ نماز پڑھو تم نے نماز نہیں پڑھی'' تین مرتبہ ایسا ہوا تو اس نے عرض کیا کہ اس ذات کی قسم! جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے میں اس کے سوا بہتر طریقہ نہیں جانتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی مجھے سکھا دیجئے! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تکبیر کہو، پھر جو قرآن میں سے آسان معلوم ہو وہ پڑھو۔ پھر رکوع کرو، یہاں تک کہ اطمینان کے ساتھ رکوع کرو، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ تم سیدھا کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ اطمینان کے ساتھ سجدہ کرو، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ، ساری نماز میں ایسا ہی کرو۔''[۲] ایک روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں یہ اعلان کروں کہ سورۂ فاتحہ اور اس سے زائد چیز کے بغیر نماز جائز نہیں۔[۳]

مقتدی اپنے امام کے پیچھے قرأت نہ کرے اس کی دلیل حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''کل صلوٰۃ لا یقرء فیھا بام الکتاب فھی خداج، إلا أن یکون وراء الامام''[۴] یعنی ہر وہ نماز جس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ناقص ہے مگر یہ کہ

---

[۱] [سنن ابی داود ۱/۲۱۶] [۲] [صحیح البخاری ۱/۱۸۲]

[۳] [صحیح البخاری ۱/۱۸۲] [۴] [سنن الدار قطنی ۱/۳۲۷]

وہ امام کے پیچھے ہو۔'' امام ذہبیؒ، یحی بن سلامؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ رواۃ حدیث میں سے ہیں۔ ابن عدی لکھتے ہیں کہ وہ ضعیف ہونے کے باوجود حدیث لکھتے ہیں۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی یہ روایت ہے اس کی سند میں کوئی ضعیف راوی نہیں ہے۔[1]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، امام اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب قرأت کرے تو تم خاموش رہو[2] نیز حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قرأت اس کے حق میں قرأت ہے۔[3] یہ حدیث مرسل ہے۔ نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ [الاعراف:۲۰۴]

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو غور سے سنو اور خاموشی اختیار کرو، شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے۔

سعید بن المسیب، حسن بن ابراہیم، محمد بن کعب اور امام زھری رحمتہ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے، زید بن اسلمؒ اور ابوالعالیہؒ کہتے ہیں کہ لوگ امام کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی، وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔[الاعراف:۲۰۴]

امام احمدؒ فرماتے ہیں، ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ امام جب قرأت بالجہر کرے تو پیچھے والوں کی نماز جائز نہیں ہوگی جب تک کہ وہ قرأت نہ کریں، نیز فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظامؒ، اہل حجاز میں امام مالکؒ، اہل عراق میں سفیان الثوریؒ، اہل شام میں امام اوزاعیؒ اور اہل مصر میں امام لیثؒ ان سب نے یہ نہیں فرمایا کہ جو شخص نماز پڑھے اور اس کا امام قرأت کرے اور وہ خود قرأت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔

حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے کہ لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب"[4] تو حضرت سفیان الثوریؒ نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ اس کے لیے حکم ہے جو اکیلا نماز پڑھتا ہو۔

(۴) رکوع کرنا: رکوع میں اتنا جھکنا فرض ہے کہ ہاتھ گھٹنوں تک پہنچیں، اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے "وَارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا" [الحج:۷۷] یعنی اور رکوع کرو اور سجدہ کرو۔

---

[1] ایضاً [2] ایضاً [3] ایضاً [4] [صحیح البخاری ۱/۱۸۲]

(۵) سجدہ کرنا۔ اور کمال سجدہ دونوں ہاتھوں، دونوں گھٹنوں، دونوں قدموں اور پیشانی اور ناک سب کو زمین پر رکھنے سے ادا ہوگا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ رکوع اور سجدے کو پورا ادا نہیں کر رہا تھا تو انہوں نے فرمایا: تم نے نماز نہیں پڑھی، اگر اسی حالت پر مر گیا تو اس فطرت پر نہیں مرے گا جس پر اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا کیا۔[1]

حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ایسی نماز قبول نہیں ہوتی جس میں انسان رکوع اور سجدے کی حالت میں اپنی کمر کو سیدھا نہ رکھے۔"[2]

(۶) قعدہ اخیرہ بقدر تشہد: یعنی التحیات سے لے کر عبدہ ورسولہ تک بیٹھنا یہاں تک کہ اگر مقتدی امام کے فارغ ہونے سے پہلے فارغ ہو جائے اور پھر سلام پھیر دے یا کلام کرلے تو اس کی نماز درست ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور تشہد فی الصلوٰۃ کی تعلیم دی، فرمایا کہ "کہو التحیات للّٰہ والصلوات والطیبات السلام علیک أیھا النبی ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ، السلام علینا وعلی عباد اللّٰہ الصالحین أشھد أن لا إلہ إلا اللّٰہ وأشھد أن محمدًا عبدہ ورسولہ" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جب تم اتنا ادا کرلو یا فرمایا جب تم یہ کرلو تو تمہاری نماز ادا ہوگئی، اگر کھڑے ہونا چاہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اگر بیٹھنا چاہو تو بیٹھ جاؤ"[3]

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "پھر اگر نماز کے درمیان میں ہو تو تشہد سے فارغ ہونے کے بعد کھڑا ہو جائے اور اگر آخر میں ہو تو تشہد کے بعد جو چاہے دعا پڑھے پھر سلام پھیر دے"[4]

اگر نمازی، نماز کی شرائط یا ارکان میں سے کوئی امر ادا کرنے کی قدرت رکھنے کے باوجود ترک کرے تو اس کی نماز باطل ہوگی اور اسے از سر نو پڑھنا واجب ہوگا۔

نماز کے واجبات

(۱) "اللہ اکبر" کا لفظ کہنا

اس کی دلیل حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک آدمی مسجد میں داخل ہوا اور اس نے نماز پڑھی الحدیث.......... (اس میں یہ ہے کہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سے

---

۱ [صحیح البخاری ۱/۱۹۰]   ۲ [سنن الترمذی ۱/۱۶۵]

۳ [مسند احمد بشرح البناء: ۲/۴]   ۴ ایضاً

کسی کی بھی نماز مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ وضو نہ کرے۔پس وضو کو (اس کی جگہوں پر) رکھے، پھر اللہ اکبر کہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرے۔"[1] ایک روایت میں ہے کہ "لوگوں میں سے کسی کی بھی نماز مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ وضو نہ کرے اور وضو کو اس کی جگہوں پر نہ رکھے، پھر کہے اللہ اکبر"[2]

(۲) سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا

اس کی دلیل حدیث عبادہ بن الصامتؓ ہے "لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب" یعنی جو شخص سورہ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔"

(۳) سورت کا پڑھنا

اس کی دلیل حضرت یزید الفقیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کو فرماتے ہوئے سنا کہ پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھے وہ فرماتے ہیں کہ ہم آپس میں یہ بات کیا کرتے تھے سورہ فاتحہ اور اس سے جو زائد ہے۔اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔"

امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی ہم نے روایات نقل کی ہیں جو اس مفہوم پر دلالت کرتی ہیں۔[3]

نیز حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سورہ فاتحہ اور جو (قرآن سے) آسان معلوم ہو اس کو پڑھیں۔[4]

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ میں اعلان کروں کہ سورۂ فاتحہ اور جو اس سے زائد (سورت) ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی"[5]

(۴) پہلی دو رکعتوں میں سورت کا ملانا

اس کی دلیل حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر اور عصر کی نماز کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ سورت پڑھتے تھے، اور بعض اوقات ایک آدھی آیت ہمیں بھی سناتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلی رکعت کو لمبا کرتے تھے۔[6]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں تو ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور

---

۱ [سنن ابی داؤد ا/۲۲۶] ۲ [معجم الطبرانی ۵/۳۸] ۳ [سنن بیہقی ۲/۶۳]
۴ [سنن البیہقی ۲/۶۰] ۵ ایضاً ۶ [صحیح البخاری ا/۱۸۷]

سورت پڑھتا ہوں اور آخری دو رکعتوں میں (صرف) سورہ فاتحہ پڑھتا ہوں۔[۱]

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دوسری کوئی سورت پڑھتے تھے اور آخری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔''[۲]

(۵) رکوع اور سجدہ کو پوری طرح کرنا

اس کی دلیل آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ رکوع اور سجدہ پورا کیا کرو، اللہ کی قسم! میں تمہیں اپنی پشت کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں جب تم رکوع کرتے ہو اور سجدہ کرتے ہو۔[۳]

رکوع اور سجدے میں تسبیحات کا ادا کرنا اس کے اتمام میں سے ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جب تم میں سے کوئی شخص رکوع کرے تو رکوع میں تین بار کہے۔ **سبحان ربی العظیم** اب اس کا رکوع پورا ہو گیا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے اور جب سجدہ کرے تو سجدے میں تین مرتبہ کہے، **سبحان ربی الأعلیٰ** اب اس کا سجدہ پورا ہو گیا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔[۴]

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لوگوں میں سب سے بدتر چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرتا ہے۔'' لوگوں نے عرض کیا! یا رسول اللہ! نماز میں کیسے چوری کرتا ہے؟ فرمایا کہ'' وہ نماز کا رکوع پوری طرح ادا نہیں کرتا اس کا سجدہ پوری طرح ادا نہیں کرتا۔[۵] رکوع اور سجدے کے درمیان قومے کے ساتھ فصل کرنا بھی اس کے اتمام میں سے ہے۔ اس کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کی نماز کی طرف نظر التفات نہیں فرماتے جو رکوع اور سجدے کے درمیان اپنی کمر کو سیدھا نہیں کرتا۔[۶] سجدے کی حالت میں کہنیوں کا زمین سے اونچا رکھنا اور ان کو نہ بچھانا اتمام سجود میں سے ہے۔ جیسا کہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا'' جب تم سجدہ کرو تو اپنی ہتھیلیوں کو (زمین پر) رکھو اور کہنیوں کو اونچا رکھو۔''[۷]

نیز حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:'' سجدہ اعتدال سے کرو اور کوئی شخص اپنے بازو یوں نہ پھیلائے جیسے کتا پھیلاتا ہے۔''[۸]

---

۱ [صحیح بخاری ۱/۳۶۸]　۲ [مصنف ابی شیبۃ ۱/۳۵۶]　۳ [صحیح مسلم ۱/۳۲۰]

۴ [سنن الترمذی ۱/۱۶۴]　۵ [سنن الدرامی ۱/۳۰۶]

۶ [مسند احمد بشرح البناء ۳/۲۶۸]　۷ [مسند احمد بشرح البناء ۳/۲۶۸]　۸ [صحیح مسلم ۱/۳۵۵]

(٦) ارکانِ نماز کو اطمینان سے ادا کرنا

اس کی دلیل حدیث مسیٔ فی الصلوٰۃ ہے، جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہوتو تکبیر کہو، پھر جو قرآن میں سے آسان معلوم ہو وہ پڑھو، پھر رکوع کرو، یہاں تک کہ تم پورے اطمینان سے رکوع کرو، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ تم سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ تم اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ تم اطمینان سے بیٹھو، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ اطمینان سے سجدہ کرو، پھر اسی طرح ساری نماز میں کرو۔'' [۱]

(٧) سات اعضاء پر سجدہ کرنا

اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں، پیشانی (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اپنے ناک کی طرف اشارہ کیا) دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور قدموں کی انگلیاں، اور یہ کہ ہم کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔'' [۲]

(٨) ناک پر سجدہ کرنا:

اس کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص سجدہ کے وقت زمین پر پیشانی کے ساتھ اپنی ناک کو نہ لگائے۔ اس کی نماز جائز نہیں ہے۔'' [۳]

(٩) دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا

جیسا کہ ابو حمید الساعدی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ نماز بیان کرتے ہوئے فرماتے کہ ''پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ اکبر کہتے ہوئے سجدے میں گئے، اپنے بازوؤں کو پیٹ سے جدا اور کشادہ کیا اور اپنے پاؤں کی انگلیاں بھی کشادہ کیں، پھر بایاں پاؤں موڑا اور اس پر بیٹھ گئے اور اعتدال کیا۔ یہاں تک کہ ہر ہڈی اپنی جگہ پر آ گئی۔ [۴]

---

۱ [صحیح البخاری ۱/۱۹۰] ۲ [صحیح مسلم ۱/۳۵۴]

۳ [معجم الطبرانی ۱۱/۲۶۳] ۴ [مسند احمد بشرح البناء ۳/۲۷۷]

(۱۰) قعدۂ اولیٰ

اس کی دلیل حدیث مسیٔ فی الصلوٰۃ جسے حضرت رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ اس میں یہ ہے: ''پس جب تم نماز کے درمیان میں بیٹھو تو اطمینان سے بیٹھو اور اپنی بائیں ران کو بچھا دو، پھر تشہد پڑھو، پھر جب کھڑے ہو تو اسی طرح کرو، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جاؤ''۔[۱]

نیز حضرت عبداللہ بن بُحَینہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں کسی نماز کی دو رکعتیں پڑھائیں، پھر کھڑے ہو گئے اور نہیں بیٹھے، لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہو گئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے اور ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلام پھیرنا دیکھ لیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی اور دو سجدے سلام سے پہلے بیٹھ کے کیے، پھر سلام پھیرا''۔[۲]

(۱۱) تشہد پڑھنا

اس کی دلیل سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کا آغاز تکبیر اور سورہ فاتحہ کی قرأت سے کرتے تھے، جب رکوع کرتے تو اپنے سر کو نہ زیادہ بلند کرتے اور نہ ہی پست، بلکہ اس کے درمیان میں رکھتے۔ جب رکوع سے سر اٹھاتے تو جب تک سیدھے کھڑے نہ ہو جاتے، سجدہ نہ کرتے اور جب سجدے سے سر اٹھاتے تو (دوسرا) سجدہ اس وقت تک نہ کرتے جب تک کہ ٹھیک ہو کر نہیں بیٹھ جاتے، اور فرماتے تھے کہ ہر دو رکعت پر التحیات ہے، اور (اس میں) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بایاں پاؤں بچھا دیتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیطان کی طرح بیٹھنے سے منع فرماتے تھے اور منع فرمایا کرتے تھے کہ آدمی درندے کی طرح اپنے بازو بچھائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کو سلام کے ساتھ ختم فرماتے تھے۔[۳] شیطان کی طرح بیٹھنا یہ ہے کہ سرین کو زمین کے ساتھ لگا کر پنڈلیاں کھڑی کر دے اور ہاتھ زمین پر رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد کی تعلیم دی، ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ کا نام سلام ہے، پس جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں قعدہ کرے تو یوں کہے: **التحیات للہ والصلوٰت والطیبات، السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین۔ اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ و رسولہ۔**'' اس کے بعد وہ جو چاہے دعا کرے، کیونکہ ان کلمات کے ادا کرنے سے ہر نیک بندے کو جو زمین پر ہو یا آسمان میں،

---

۱ [معجم الطبرانی ۵/۳۹] ۲ [صحیح مسلم ۱/۳۹۹] ۳ [صحیح مسلم ۱/۳۵۸]

سلام پہنچ جاتا ہے۔[1]

حضرت سمرة رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم نماز کے وسط میں یا نماز کے اختتام کے وقت میں سلام پھیرنے سے پہلے التحیات الخ پڑھا کریں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم دو رکعتوں پر بیٹھو تو یہ کلمات کہو ''التحیات للّٰہ والصلوٰت، والطیبات السلام علیک أیھا النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاتہ ....الخ۔[2]

(۱۲) لفظ ''السلام'' کہنا

اس کی دلیل حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دائیں بائیں ان الفاظ کے ساتھ سلام پھیرتے تھے۔''السلام علیکم و رحمة اللّٰہ، السلام علیکم و رحمة اللّٰہ۔''

(۱۳) جہر کے مقام پر جہر اور اخفاء کے مقام پر اخفاء کرنا

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہر نماز میں قرأت کی جائے گی، پس جس نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں قرأت سنائی اس میں ہم بھی تم کو سنائیں گے اور جس نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے اخفاء (آہستہ پڑھنا) کیا ہم بھی اس میں اخفاء کریں گے۔''[3]

حضرت ابو معمر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم نے خباب رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر اور عصر کی نماز میں قرأت کرتے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں، ہم نے کہا کہ آپ لوگ اس کو کیسے پہچانتے تھے؟ فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ڈاڑھی مبارک کے ہلنے سے۔''[4]

حضرت ام الفضل بنت الحارث رضی اللہ عنہا نے اپنے بیٹے ابن عباس رضی اللہ عنہ کو ''وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا'' کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو فرمانے لگیں: اے میرے بیٹے! تم نے اس سورت کی تلاوت سے مجھے یہ بات یاد دلا دی ہے کہ یہ وہ آخری سورت ہے کہ جو میں نے مغرب کی نماز میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنی۔''[5]

---

۱ [صحیح مسلم ۱/۳۰۲] ۲ [صحیح ابن حبان ۵/۱۹۵۱] ۳ [سنن ابی داؤد ۱/۲۱۲]
۴ ایضاً ۵ ایضاً

(۱۴) سجدۂ سہو کرنا

حضرت کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب کسی کو نماز میں شک ہو جائے تو اسے درست بات کے بارے میں تحری (غور و فکر کرنا) کرنی چاہیے، اور اسی کے مطابق نماز کو پورا کر لینا چاہیے، پھر سلام پھیرے اور اس کے بعد (سہو کے) دو سجدے کرے۔''[1]

(۱۵) سجدۂ تلاوت کرنا

حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی، انہوں نے ''اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ'' پڑھی اور اس میں سجدہ کیا۔ میں نے (بعد میں) ان سے پوچھا کہ یہ سجدہ کیسا ہے؟ فرمایا کہ میں نے یہ سجدہ ابو القاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے کیا تھا۔ پس میں ہمیشہ اسی طرح یہ سجدہ کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ ان سے جا ملوں۔''[2]

(۱۶) قرأت کے سوا تمام واجبات میں امام کی متابعت کرنا

اس کی دلیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''امام اسی لیے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، لہٰذا جب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھو، جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب رکوع سے سر اٹھائے تو تم بھی اٹھاؤ اور جب وہ ''سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ'' کہے تو تم کہو: ''رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ'' اور جب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم بھی کھڑے ہو کر پڑھو، اور جب وہ بیٹھ کر پڑھائے تو تم بھی سب بیٹھ کر نماز پڑھو۔'' حضرت ابو عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حمیدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمانا: ''جب بیٹھ کر نماز پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدیم مرض کے زمانہ میں تھا، لیکن پھر اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیٹھ کر نماز پڑھائی اور لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ اور آخری عمل لیا جاتا ہے۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری عمل یہی تھا۔[3]

حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہ مجھے براء رضی اللہ عنہ نے حدیث بیان کی اور وہ جھوٹے نہیں ہیں (وہ حدیث یہ ہے) کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع سے سر مبارک اٹھاتے تو میں کسی کو نہ دیکھتا کہ وہ اپنی پشت کو (سجدے

---

[1] [صحیح البخاری ۱/۱۰۵] [2] [صحیح مسلم ۱/۲۰۷] [3] [صحیح البخاری: ۱/۱۶۹]

کیلئے) جھکا تا جب تک کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی پیشانی مبارک زمین پر نہ رکھ لیتے، اس کے بعد وہ لوگ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے ہوتے سجدہ کرتے ہوئے جھکتے تھے۔[۱]

ایک روایت میں یہ ہے کہ "جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع سے سر اٹھاتے تو کہتے: "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" ہم برابر کھڑے رہتے جب تک کہ ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ نہ لیتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا چہرہ مبارک زمین پر رکھ دیا ہے۔ اس کے بعد ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کرتے۔"[۲]

نماز کی سنتیں

(۱) تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کا اٹھانا

حکم بن عمیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں تعلیم دیا کرتے تھے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اپنے ہاتھوں کو اٹھاؤ اور وہ تمہارے کانوں کے برابر ہوں، پھر یہ کہو: اللہ اکبر، سبحانک اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَآ اِلٰہَ غَیْرُکَ" اور اگر تکبیر سے زیادہ نہ کہو تو کافی ہے۔[۳]

حضرت وائل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے مقابل اٹھایا اور اپنے انگوٹھے کانوں کے محاذی (برابر) کیے، پھر تکبیر کہی۔[۴]

(۲) ہاتھ اٹھاتے وقت دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنے حال پر کھلی رکھنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کے لیے تکبیر کہتے تو اپنی انگلیوں کو کھلا رکھتے۔[۵]

نماز میں انگلیوں کو رکھنا تین طرح سے ہے، رکوع میں کشادہ رکھی جائیں، سجدے میں ملا کر رکھی جائیں اور باقی ساری نماز میں کھلی رکھی جائیں، جیسا کہ حضرت علقمہ بن وائلؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رکوع کرتے تو اپنی انگلیوں کو کشادہ رکھتے اور جب سجدہ کرتے تو انگلیوں کو ملاتے تھے۔[۶]

---

۱ [صحیح مسلم ۱/۳۴۵]　۲ [صحیح مسلم ۱/۳۴۵]　۳ [معجم الطبرانی ۳/۲۱۸]

۴ [سنن ابی داؤد ۱/۱۹۳]　۵ [سنن الترمذی ۱/۱۵۲]　۶ [معجم الطبرانی ۲۲/۱۹]

(۳) ہتھیلیوں کا قبلہ رخ رکھنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب تم میں سے کوئی شخص نماز شروع کرے تو اپنے ہاتھوں کو اٹھائے اور ہاتھوں کے اندرونی حصوں (ہتھیلیوں) کو قبلہ رخ کرے۔ پس بے شک اللہ تعالیٰ اس کے سامنے ہے۔[۱]

(۴) دونوں ہاتھوں کا کانوں تک اٹھانا

حضرت براء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کا آغاز کرتے تو اپنے ہاتھوں کو کانوں کے قریب تک اٹھاتے۔ پھر دوبارہ ایسا نہ کرتے۔[۲] حضرت علقمہ رحمۃ اللہ علیہ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: کیا میں تمہارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والی نماز نہ پڑھوں، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے نماز پڑھی اور ہاتھوں کو صرف پہلی بار اٹھایا۔[۳]

(۵) دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھنا

حضرت علقمہ بن وائل رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا ہوا ہے۔[۴]

حضرت حجاج بن حسان رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ میں نے ابومجلز رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، یا ان سے پوچھا کہ ہاتھ کیسے رکھے جائیں؟ انہوں نے فرمایا: اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھے اور ان کو ناف کے نیچے باندھے۔[۵] حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے (دل میں) کہا کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ضرور دیکھوں گا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کیسے پڑھتے ہیں؟ پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی اور ہاتھوں کو کانوں کے مقابل اٹھایا، پھر دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی پشت پر کلائی اور بازو کے درمیان رکھا۔"[۶]

(۶) تکبیر اور قرأت کے درمیان سکوت اختیار کرنا

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دو سکتے یاد کیے، ایک سکتہ اس وقت جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکبیر کہتے اور ایک سکتہ اس وقت جب قرأت سے فارغ

۱ [المعجم الاوسط: ۸/۸۰۱۷] ۲ [سنن ابی داؤد ۱/۲۰۰] ۳ [سنن الترمذی ۱/۱۶۲]

۴ [سنن الدارقطنی ۱/۲۸۴] ۵ [رواہ ابوبکر بن ابی شیبۃ جید ورواتہ کلھم ثقات]

۶ [معجم الطبرانی ۲۲/۳۵]

ہوتے اور رکوع کرنے لگتے۔[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب دوسری رکعت کے لیے اٹھتے تو سورۃ فاتحہ سے شروع کرتے اور سکتہ نہ کرتے۔[2]

(۷) ثناء پڑھنا

حضرت ابوالجوزاء رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو کہتے: "سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلآ اِلٰہَ غَیْرُکَ"[3]

(۸) نوافل میں دعاء پڑھنا

محمد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نفل نماز پڑھنے کیلئے اٹھتے تو کہتے۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ، اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْمَلِکُ لَآاِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحَانَکَ وَبِحَمْدِکَ" پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرأت کرتے۔[4]

(۹) تعوذ آہستہ کہنا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" [النحل:۹۸] استعاذہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کہے: "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ" حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کو اٹھتے تو تکبیر کہتے، پھر کہتے: "سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَآاِلٰہَ غَیْرُکَ" پھر کہتے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تین مرتبہ، پھر کہتے اَللّٰہُ اَکْبَرُ کَبِیْراً، تین مرتبہ، اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ ھَمْزِہٖ وَنَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ[5]

(۱۰) تسمیہ آہستہ کہنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، استعاذہ اور ربنا لک

[1] [المستدرک ۱/۲۱۵] [2] ایضاً [3] [المستدرک ۱/۲۳۵]

[4] [سنن النسائی ۲/۱۳۱] [5] [سنن ابی داود ۱/۲۰۶]

اَلْحَمْدُ سب آہستہ کہتے تھے۔[1]

حضرت ابراہیم النخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ چار چیزوں کو امام آہستہ کہے گا: تعوذ، بسم اللہ الرحمن الرحیم، سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ اور آمین[2] حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے والد نے مجھے نماز کی حالت میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کہتے ہوئے سنا تو مجھے فرمایا: بیٹا! یہ نو ایجاد چیز ہے، اس سے بچو! میں نے کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو ان (اپنے والد) سے زیادہ بدعت سے نفرت کرنے والا نہیں دیکھا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ میں نے کسی کو بھی (جہراً) تسمیہ کہتے ہوئے نہیں سنا، پس تم بھی نہ کہو، جب تم نماز پڑھو تو کہو: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ .... الخ

جامع الترمذی کے مؤلف حضرت ابوعیسیٰ الترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حدیث ابن مغفلؓ، حدیث حسن ہے۔ صحابہ کرامؓ جن میں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین عظامؒ شامل ہیں اور اکثر اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ حضرت سفیان الثوری، امام احمد، ابن المبارک رحمہم اللہ تمام جہراً تسمیہ کے قائل نہیں ہیں، یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ تسمیہ کو دل میں کہے۔[3]

(۱۱) سورہ فاتحہ سے قرأت شروع کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ سب اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے قرأت شروع کرتے تھے۔"[4]

(۱۲) آمین کہنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔"[5]

اور آمین کو آہستہ کہے، جیسا کہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھا: غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "آمین" کہا اور آواز کو پست کیا اور اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا

۱ [رواہ ابن ابی شیبۃ] ۲ [رواہ الامام محمد فی الآثار وعبدالرزاق فی مصنفہ]
۳ [سنن الترمذی ۱/۱۵۴] ۴ ایضاً ۵ [سنن الترمذی ۱/۱۵۸]

اور دائیں بائیں سلام پھیرا۔"[1]

(۱۳) رکوع اور سجدے میں جاتے اور اٹھتے وقت تکبیر کہنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رکن میں جاتے اور اٹھتے وقت اور قیام وقعود میں تکبیر کہتے تھے حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسا ہی کرتے تھے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (رکوع اور سجدے کے لیے) جاتے وقت تکبیر کہتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام میں سے اہل علم کا یہی قول ہے کہ آدمی رکوع اور سجدے میں جاتے ہوئے تکبیر کہے۔[2]

(۱۴) رکوع میں گھٹنوں کو پکڑنا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ گھٹنوں کو پکڑنا سنت ہے۔ نیز آپ ؓ نے فرمایا "تمہارے لیے گھٹنوں کا پکڑنا سنت قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا تم گھٹنوں کو پکڑو۔"[3]

(۱۵) رکوع میں انگلیوں کا کشادہ رکھنا

حضرت علقمہ بن وائل رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب رکوع کرتے تو انگلیوں کو کشادہ رکھتے تھے۔[4]

(۱۶) رکوع میں پیٹھ کو سیدھا رکھنا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رکوع کرتے تو پیٹھ مبارک کو سیدھا بچھاتے کہ اگر پانی (کا پیالہ) پیٹھ پر رکھ دیا جائے تو ٹھہر جائے۔[5]

(۱۷) رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت ہاتھ نہ اٹھانا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "سات جگہوں کے سوا اور کسی جگہ پر ہاتھ نہ اٹھائے جائیں: (۱) جس وقت نماز شروع کرو۔ (۲) جس وقت مسجد حرام میں داخل ہو اور بیت اللہ پر نظر پڑے۔ (۳) جس وقت صفا پہاڑی پر کھڑے ہو۔ (۴) جس وقت مروہ پہاڑی پر کھڑے ہو۔ (۵) جس وقت لوگوں کے ساتھ عرفات کی شام وقوف کرو۔

[1] [مسند احمد بشرح البناء ۳/۲۰۵]
[2] [سنن الترمذی ۱/۱۶۰]
[3] [سنن النسائی ۲/۱۸۵]
[4] [المستدرک ۱/۲۲۴]
[5] [معجم الطبرانی ۱۲/۱۲۹]

(۶) مزدلفہ میں (۷) جمرات کی رمی کے وقت دونوں مقاموں پر۔[۱]

(۱۸) رکوع میں سر کو نہ اونچا کرنا اور نہ جھکانا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ نماز بیان کرتی ہیں، اس میں یہ بھی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رکوع کرتے تو اپنے سر مبارک کو نہ زیادہ اونچا کرتے اور نہ ہی پست کرتے۔[۲]

(۱۹) رکوع میں تین بار تسبیح کہنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص (نماز میں) رکوع کرے تو رکوع میں تین مرتبہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ کہے، پس اس کا رکوع مکمل ہو گیا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔''[۳]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نفل نماز کے رکوع میں دعاء پڑھتے تھے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع اور سجدے میں اکثر یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ ''سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ بِحَمْدِکَ ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن پر عمل کرتے تھے۔[۴]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک رات میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بستر پر نہ پایا، میں نے تلاش کیا تو میرا ہاتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تلوے پر پڑا، آپؐ مسجد میں تھے، دونوں پاؤں کھڑے تھے اور یہ پڑھ رہے تھے: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّي أَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَبِمُعَافَاتِکَ مِنْ عُقُوْبَتِکَ ، وَأَعُوْذُبِکَ مِنْکَ لاَ أُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ أَنْتَ کَمَا أَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ.[۵]

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع اور سجدہ میں یہ کہتے تھے:

''سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّ الْمَلآئِکَۃِ وَالرُّوْحِ''[۶]

(۲۰) امام کا سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ اور مقتدی کا رَبَّنَالَکَ الْحَمْدُ کہنا

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے۔ ''جب امام کہے ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' تو تم کہو: ''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ'' کیونکہ جس کا قول فرشتوں کے قول کے موافق ہو گیا اس کے اگلے

۱۔ [معجم الطبرانی ۱۱/۳۰۵] ۲۔ [صحیح مسلم ۱/۳۵۷] ۳۔ [سنن الترمذی ۱/۱۶۴]
۴۔ [صحیح مسلم ۱/۳۵۰] ۵۔ [صحیح مسلم ۱/۳۵۰] ۶۔ ایضاً

گناہ بخش دیئے جائیں گے۔"[۱]

متنفل اور منفرد رکوع سے اٹھتے وقت یہ دعاء پڑھ سکتا ہے: "اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمٰوٰتِ وَ مِلْءَ الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، اَهْلُ الثَّنَاء وَالْمَجْدِ، لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وَ لَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ"[۲]

(۲۱) قومے، رکوع وسجود اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار کا برابر ہونا:

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رکوع وسجدہ اور دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مدت تقریباً برابر ہوتی تھی۔"[۳]

(۲۲) انتقال ارکان کے وقت تکبیر کہنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو کھڑے ہونے کے وقت تکبیر کہتے، پھر تکبیر کہتے جس وقت رکوع کرتے، پھر "سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ" کہتے جب رکوع سے اپنی کمر کو اٹھاتے، پھر قیام (قومہ) کی حالت میں کہتے "رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ" پھر تکبیر اس وقت کہتے جب سجدے کے لیے جاتے، پھر تکبیر اس وقت کہتے جب (سجدے سے) سر اٹھاتے، پھر تکبیر اس وقت کہتے جب (دوبارہ) سجدے میں جاتے، پھر اس وقت تکبیر کہتے جب سر (سجدے سے) اٹھاتے، اسی طرح ساری نماز میں کرتے حتی کہ نماز سے فارغ ہو جاتے، اور جس وقت دو رکعتوں سے اٹھتے تو بیٹھنے کے بعد تکبیر کہتے تھے۔[۴]

(۲۳) سجدے میں جاتے وقت گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے رکھنا

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ جب سجدہ کرتے تو اپنے گھٹنوں کو ہاتھوں سے پہلے (زمین پر) رکھتے اور جب (سجدے سے) اٹھتے تو ہاتھوں کو گھٹنوں سے پہلے اٹھاتے۔[۵]

حضرت عبدالجبار بن وائل اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب سجدہ کرے تو اس کے گھٹنے ہتھیلیوں سے پہلے زمین پر لگیں اور جب (سجدے سے) اٹھے تو اپنے گھٹنوں پر سہارا لے کر اٹھے اور اپنی ران پر سہارا لے۔[۶]

---

۱ [صحیح مسلم: ۱/۳۰۶] ۲ [صحیح مسلم: ۱/۳۴۷] ۳ [سنن ابی داوٗد: ۱/۲۲۵]

۴ [مسند احمد بشرح البناء: ۳/۲۴۷] ۵ [سنن ابی داوٗد: ۱/۲۲۲] ۶ [سنن ابی داوٗد: ۱/۲۲۲]

(۲۴) سجدے میں اپنے بازوؤں کو پہلوؤں سے جدا رکھنا

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سجدہ کرتے تو ہاتھوں کو جدا رکھتے، یہاں تک کہ اگر بکری کا بچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں کے نیچے سے گزرنا چاہتا تو گزر جاتا۔‘‘

(۲۵) سجدہ میں پاؤں کی انگلیوں کا قبلہ رخ رکھنا

حضرت ابوحمید الساعدی رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سجدہ کے لیے زمین کی طرف جھکتے تو اپنے بازوؤں کو بغلوں سے جدا رکھتے اور پاؤں کی انگلیوں کو کھڑا کر کے موڑتے تھے۔[۱]

(۲۶) سجدے میں سرین کو اونچا رکھنا

حضرت ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت براء رضی اللہ عنہ نے ہمیں سجدے کا طریقہ بیان کیا، پس انہوں نے اپنے ہاتھ زمین پر رکھے اور سرین کو اونچا کیا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہؐ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[۲]

(۲۷) سجدے میں ہاتھوں کی انگلیوں کا ملا کر قبلہ رخ رکھنا

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سجدہ کرتے تو اپنی انگلیوں کو ملاتے۔[۳]

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب سجدہ کرتے تو ہاتھوں کو زمین پر رکھتے اور ہتھیلیوں اور انگلیوں کو قبلہ رخ کرتے۔‘‘[۴]

(۲۸) سجدے میں دونوں ہتھیلیوں پر سہارا دینا

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہتھیلی کے گوشت پر سہارا لے کر سجدہ کرتے۔[۵]

(۲۹) دونوں ہتھیلیوں کے درمیان میں چہرے کا رکھنا

حضرت ابواسحاق رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ

---

۱ [سنن النسائی: ۲۱۱/۳] ۲ [سنن النسائی: ۲۱۲/۲] ۳ [سنن النسائی: ۲۱۲/۲]

۴ [سنن البیہقی: ۱۱۳/۲] ۵ [المستدرک: ۲۲۷/۱]

نبی کریم ﷺ سجدے میں اپنا چہرہ مبارک کہاں رکھتے تھے؟ فرمایا کہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان سے۔[1]

حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کی روایت میں یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جس وقت سجدہ کیا تو آپ ﷺ کے دونوں ہاتھ کانوں کے قریب تھے۔[2]

(۳۰) سجدے میں تین بار تسبیح کہنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ ''نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جب سجدہ کرے تو سجدے میں تین مرتبہ ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہے تو اس کا سجدہ پورا ہو گیا اور یہ ادنیٰ درجہ ہے۔''[3]

(۳۱) سجدے میں ایڑیوں کو ملا کر رکھنا

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ (ایک رات) میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہ پایا، آپ ﷺ میرے بستر پر میرے ساتھ تھے، پس میں نے آپ ﷺ کو حالت سجدہ میں پایا کہ ایڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں اور پاؤں کی انگلیاں قبلہ رخ تھیں، اور میں نے آپ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''أعوذ برضاک من سخطک و بعفوک من عقوبتک، و بک منک أثني علیک لا أبلغ کل ما فیک'' جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: اے عائشہ! تجھے تیرے شیطان نے آ پکڑا، میں نے کہا کیا آپ ﷺ کے لیے شیطان نہیں ہے؟ فرمایا کہ ہر بنی آدم کے لیے شیطان مقرر ہے، میں نے کہا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کے لیے بھی؟ فرمایا کہ ہاں میرے لیے بھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے میری اعانت فرمائی پس وہ میرا تابع ہو گیا۔[4]

(۳۲) زمین سے کہنیاں اونچی رکھنا

آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب تم سجدہ کرو تو اپنی ہتھیلیاں (زمین پر) رکھو اور کہنیوں کو اونچا رکھو۔''[5]

نیز فرمایا: ''سجدہ اعتدال سے کرو اور کتے کی طرح اپنے بازو نہ بچھاؤ۔''[6]

---

[1] [سنن الترمذی: ۱/۱۶۹] [2] [سنن البیہقی: ۲/۱۱۲] [3] [سنن الترمذی: ۱/۱۶۴]
[4] [المستدرک: ۱/۲۲۸] [5] [صحیح مسلم: ۱/۳۵۶] [6] ایضاً

(۳۳) دو سجدوں کے درمیان اقعاء کی حالت میں نہ بیٹھنا

حضرت حارث الاعور رحمۃ اللہ علیہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''اے علی! میں تیرے لیے وہی پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے کرتا ہوں اور تیرے لیے وہی کچھ ناپسند کرتا ہوں جو اپنے لیے کرتا ہوں، تم دو سجدوں کے درمیان اقعاء نہ کرو۔''[1]

حدیث ہذا اعور کی وجہ سے ضعیف ہے۔ (اقعاء یہ ہے کہ پنڈلی اور ران ملا کر کھڑی کرنا اور کولھوں پر بیٹھنا) لیکن اکثر اہل علم کا اس حدیث پر عمل ثابت ہے۔ اقعاء کو مکروہ خیال کرتے ہیں۔

(۳۴) نفل نماز میں دو سجدوں کے درمیان دعاء کرنا

حضرت سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریمؐ دو سجدوں کے درمیان (جلسہ استراحت میں) یہ دعاء کرتے تھے: ''**اللھم اغفرلی و ارحمنی و اجبرنی و اھدنی وارزقنی**''[2]

(۳۵) دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو پنجوں کے بل اٹھے

حضرت عطیہ العوفی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر، ابن عباس، ابن الزبیر اور ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہم کو دیکھا کہ وہ نماز میں اپنے پنجوں کے بل (اٹھتے ہوئے) کھڑے ہوتے تھے۔''[3]

(۳۶) بائیں پاؤں پر بیٹھنا اور دائیں پاؤں کو کھڑا رکھنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ دائیں پاؤں کو کھڑا رکھنا اور اس کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھنا اور بائیں پاؤں پر بیٹھنا سنت میں سے ہے۔[4]

(۳۷) ہر قعدہ میں دونوں ہاتھ رانوں پر رکھنا اور انگشت شہادت سے اشارہ کرنا

حضرت عامر بن عبداللہ بن الزبیر رحمۃ اللہ علیہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ''رسول اللہؐ جب قعدہ کرتے تو دائیں ہاتھ کو دائیں ران پر اور بائیں ہاتھ کو بائیں ران پر رکھتے تھے اور سبابہ (انگشت شہادت) سے اشارہ کرتے اور انگوٹھے کو درمیان والی انگلی پر رکھتے۔[5]

[1] [سنن الترمذی: ۱/۱۷۴]   [2] [سنن الترمذی: ۱/۱۷۴]
[3] [سنن البیہقی: ۲/۱۲۵]   [4] [سنن النسائی: ۲/۲۳۶]   [5] [سنن البیہقی: ۲/۱۳۱]

آپ ﷺ سبابہ سے اشارہ اس وقت کرتے جب تشہد پڑھتے، حضرت خفاف بن ایمان بن رحضہ الغفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اس وقت انگلی سے اشارہ کرتے جب نماز میں تشہد پڑھنے کے لیے بیٹھتے مشرکین کہتے تھے کہ یہ شخص ہم پر جادو کرتا ہے، حالانکہ نبی کریم ﷺ کا مقصد توحید ہوتا تھا۔[۱]

(۳۸) ہر قعدہ میں تشہد آہستہ آواز میں پڑھنا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ تشہد کو آہستہ پڑھنا سنت میں سے ہے۔[۲]

(۳۹) تشہد کے بعد درود شریف پڑھنا

حضرت عقبہ بن عمرو رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی آیا اور آنحضرت ﷺ کے سامنے آکر بیٹھ گیا، ہم آپ ﷺ کے پاس موجود تھے، اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ﷺ پر سلام بھیجنے کا طریقہ تو ہم پہچان گئے لیکن آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا کیا طریقہ ہے کہ جب ہم اپنی نماز میں ہوں تو آپ پر صلوٰۃ کیسے پڑھیں؟ آپ ﷺ خاموش رہے حتیٰ کہ ہم نے چاہا کہ یہ آدمی آپ ﷺ سے نہ ہی سوال کرتا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم مجھ پر درود بھیجو تو یوں کہو: ''**اللّٰھم صل علی محمد النبی الأمی و علی آل محمد، کما صلیت علی إبراھیم و علٰی آل إبراھیم، و بارک علی محمد النبی الأمی و علی آل محمد کما بارکت علی إبراھیم و علی آل إبراھیم، إنک حمید مجید**''[۳]

نماز کے آخر میں درود شریف پڑھنا واجب نہیں ہے جیسا کہ حدیث عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے تشہد سکھایا: ''**التحیات للّٰہ و الصلوٰت والطیّبات، السلام علیک أیّھا النبی و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہ، السلام علینا و علی عباد اللّٰہ الصالحین، أشھد أن لا إلہ إلا اللّٰہ و أشھد أن محمداً عبدہ و رسولہ**'' راوی (حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم یہ کہہ لو تو تم نے نماز کو پورا کر لیا جو تمہارے ذمے تھی، پس اگر تم اٹھنا چاہو تو اٹھ جاؤ اور اگر بیٹھنا چاہو تو بیٹھ جاؤ۔''[۴]

---

۱ [سنن البیہقی:۲/۱۳۳] ۲ [سنن البیہقی:۲/۱۴۳]
۳ [سنن الترمذی:۱/۱۷۹] ۴ [سنن الدار قطنی:۱/۳۵۵]

(۴۰) قعدۂ اخیرہ میں منقول دعائیں پڑھنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں یہ دعاء پڑھتے تھے۔

''اللّٰهم إني اعوذبک من عذاب القبر، و اعوذبک من فتنة المسيح الدجال، و أعوذبک، من فتنة المحيا و الممات، اللّٰهم إني أعوذبک من المأثم و المغرم''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ قرض سے اس قدر پناہ مانگتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''انسان جب مقروض ہو جاتا ہے تو بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے اور وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔''[۱]

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے دعاء سکھادیں جو میں اپنی نماز میں مانگا کروں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہا کرو: ''اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَلاَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلاَّ اَنْتَ، فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ''[۲]

(۴۱) دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرنا

لفظ ''السلام'' کہنا واجب ہے اور ''عليكم و رحمة اللّٰه'' کہنا سنت ہے۔ حضرت ابوالاحوص رحمۃ اللہ علیہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دائیں جانب اور بائیں جانب (اس طرح) سلام پھیرتے تھے'': السلام عليكم و رحمة اللّٰه، السلام عليكم و رحمة اللّٰه''.[۳]

حضرت عامر بن سعید رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں: ''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دائیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے دیکھتا تھا، یہاں تک کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار کی سفیدی کو دیکھتا تھا۔''[۴]

اب اس کے بعد نماز کا طریقہ بیان ہوگا جس میں نماز کے فرائض، واجبات اور سنن کا ذکر بھی ضمناً آئے گا۔

---

۱ [صحیح مسلم:۱/۴۱۲] ۲ [صحیح مسلم:۴/۴۷۸]

۳ [سنن الترمذی:۱/۱۸۱] ۴ [صحیح مسلم:۱/۴۰۹]

نماز ادا کرنے کا طریقہ

جب نماز شروع کرنے کا ارادہ کرے تو تکبیر تحریمہ کہے اور تکبیر کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں کو اس قدر اٹھائے کہ دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کی لوؤں کے محاذی (برابر) ہو جائیں۔

تکبیر تحریمہ کے سوا کسی اور مقام میں رفع یدین نہیں کریگا۔ پھر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر رکھ کر ناف کے نیچے رکھے اور عورت اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے پکڑ کر سینے پر رکھے۔ ہاتھ باندھنا حضرات شیخینؒ کے نزدیک قیام کی سنت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثناء پڑھتے وقت بھی ہاتھ باندھے گا۔ اس کا قاعدہ یہ ہے کہ جس قیام میں کوئی ذکر مسنون ہو تو ایسے قیام میں ہاتھ باندھے جائیں اور جو قیام ایسا نہ ہو اس میں ہاتھ باندھنا مسنون نہیں ہے۔ چنانچہ قنوت پڑھنے کی حالت میں، (نماز جنازہ پڑھتے ہوئے ہاتھ باندھے جائیں گے) قومہ میں اور عیدین کی تکبیرات کے درمیان ہاتھ چھوڑے جائیں گے۔ ہاتھ باندھنے کے بعد "**سبحانک اللهم وبحمدک وتبارک اسمک و تعالیٰ جدک ولا اله غیرک**" پڑھے۔ ثنا پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ الخ کہے گا۔ امام ہو یا منفرد۔ دلیل اس کی یہ آیت ہے۔ "**فاذ اقرء ت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطن الرجیم**" (النحل ۹۸) ترجمہ: "جب تم قرآن پڑھو تو شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ چاہو" یعنی **أعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** پڑھے گا۔ پھر **بسم اللہ الرحمن الرحیم** کہے۔ اعوذ باللہ اور بسم اللہ کو آہستہ آواز میں کہے۔ اگرچہ نماز جہری ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے بعد سورۃ فاتحہ پڑھے اور اس کے ساتھ ایک سورۃ یا کسی بھی سورت کی کم از کم تین آیات ملائے۔ سورۃ فاتحہ پڑھنا اور سورت ملانا واجب ہے۔ پھر اگر یہ امام ہو تو فجر کی نماز، مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں، وتر کی جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں جہر کریگا۔ رسول اللہ ﷺ سے یہی طریقہ منقول ہے اور آپ ﷺ کے عہد مبارک سے آج تک یہی طریقہ چلا آرہا ہے اور ظہر اور عصر کی نمازوں، مغرب کی تیسری، عشاء کی تیسری اور چوتھی رکعتوں میں قرات آہستہ کرے۔ کیوں کہ آپ ﷺ سے یہی طریقہ منقول ہے۔ امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "**المقاصد الحسنہ**" میں لکھا ہے کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے جس میں ظہر اور عصر کی نمازوں میں آہستہ قرأت کرنے کی طرف رہنمائی ہے اور منفرد کو اختیار ہے، چاہے جہراً پڑھے یا سراً۔

جب امام "**ولا الضالین**" کہے تو آمین بھی کہے اور مقتدی بھی آمین کہے۔ البتہ دونوں

اس کو آہستہ آواز میں کہیں گے پھر تکبیر کہہ کر رکوع کریگا۔ اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ ہر جھکتے اور اٹھتے وقت تکبیر فرمایا کرتے تھے اور ہاتھوں سے گھٹنوں کو پکڑے گا مگر انگلیاں کھلی رکھے گا۔ پیٹھ کو بالکل برابر رکھے گا سر کو نہ نیچے جھکائے گا نہ ہی اوپر کو اٹھائیگا۔ بلکہ سر کو سرین کی پیٹھ کے برابر رکھے گا۔ رکوع کے علاوہ کسی اور مقام پر انگلیوں کو کھلا رکھنا مستحب نہیں ہے۔ اور سجدے کے علاوہ کسی دوسری جگہ ملانا مستحب نہیں ہے۔ ان دو حالتوں کے علاوہ باقی احوال میں انگلیوں کو اپنی حالت پر چھوڑنا چاہئے۔

رکوع میں **سبحان ربی العظیم** کہے گا۔ اس کو تین مرتبہ کہے گا اور تین مرتبہ کہنا ادنیٰ کمال سنت ہے۔ تین سے زیادہ کہنا افضل ہے۔ البتہ امام کیلئے تین سے زیادہ کہنا اچھا نہیں ہے۔ کیوں کہ اس سے نماز طویل ہوگی۔ جس سے مقتدی متنفر ہوں گے۔ اس کے بعد سر کو اٹھائے گا۔ رکوع سے قومے کی طرف جاتے وقت ''**سمع الله لمن حمده**'' کہے۔ اور مقتدی ''**ربنا لک الحمد**'' کہے گا۔ مگر ''**اللهم ربنّا لک الحمد**'' کہنا افضل ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امام صرف ''**سمع الله لمن حمده**'' کہے گا۔ جبکہ حضرات صاحبینؒ کے مطابق امام ''**سمع الله**'' کے ساتھ ''**ربنا لک الحمد**'' بھی کہے گا قومے سے سجدے کی طرف جاتے وقت **الله اکبر** کہے۔ سجدے میں جاتے وقت پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھے گا۔ پھر ہاتھوں کو اور ہتھیلیوں کے درمیان چہرے کو رکھے گا اور ہاتھ کی انگلیوں کو قبلہ رخ کریگا۔ پیشانی اور ناک پر سجدہ کریگا۔ اور یہ واجب ہے بغیر عذر صرف ناک پر اقتصار جائز نہیں ہے اگر لوگوں کا رش نہ ہو تو کھلا سجدہ کریگا یعنی اپنے بازوؤں کو پیٹ کے ساتھ نہیں لگائے گا پیٹ کو رانوں سے جدا رکھے گا۔ جبکہ عورت سمٹ کر سجدہ کرے گی۔ پیٹ کو رانوں کے ساتھ لگائے گی۔ اس لئے کہ یہ طریقہ اس کے لئے زیادہ پردے اور ستر کا باعث ہے اور کہنیوں کو زمین سے جدا رکھے گا۔ بازوؤں کو زمین پر پھیلا کر نہیں رکھے گا۔ سجدے میں ''**سبحان ربی الاعلیٰ**'' کہے گا۔ اس کو بھی تین مرتبہ کہنا ادنیٰ کمال سنت ہے۔ پھر ''**الله اکبر**'' کہہ کر سجدے سے سر اٹھائیگا۔

جلسہ میں بیٹھنے کے بعد دوبارہ سجدے میں جاتے وقت تکبیر کہے گا۔ پہلے سجدے کی طرح سجدہ کریگا اور سجدے سے سر اٹھاتے ہی تکبیر کہے گا۔ پیروں کے سہارے سے اٹھے گا۔ اٹھنے کی کیفیت اس طرح ہوگی کہ پاؤں کی انگلیاں سجدے کی ہیئت میں ہوں زمین کا سہارا لے کر نہ اٹھے۔ بغیر عذر کے ایسا کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ دوسری رکعت کے تمام افعال پہلی رکعت کی طرح ادا کرے۔ الا یہ کہ دوسری رکعت میں ''**سبحانک اللهم**'' اور ''**اعوذ بالله**'' نہیں پڑھے گا۔ تکبیر اولیٰ کے

علاوہ کسی اور مقام پر رفع یدین نہیں کرے گا۔ تعدیل ارکان (اطمینان سے رکوع وسجود، قومہ اور جلسہ کو مکمل کرنا) حضرات طرفینؒ کے نزدیک فرض نہیں۔ جبکہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اس کو فرض کہتے ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ایک دیہاتی مسجد نبوی میں تعدیل ارکان کے بغیر نماز پڑھ رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا "صلّ فاء نک لم تصل" ترجمہ: ''نماز پڑھو، کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی'' حضرات طرفینؒ کہتے ہیں کہ اس پر لفظ رکوع (پشت کو جھکانا) اور سجود (پیشانی کو زمین پر رکھنا) صادق آتے ہیں۔ جس کی بنا پر حکم الٰہی "وار کعوا واسجد" کے تحت داخل ہوتے ہیں۔ جبکہ طمانیت (تعدیل) دوام کا نام ہے، کسی کام کا امر کرنا مقتضی دوام نہیں ہوتا۔ اور کتاب اللہ پر خبر واحد کے ذریعے اضافہ کرنا جائز نہیں ہے۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ دلیل کے طور پر جو حدیث پیش کرتے ہیں وہ مقتضائے وجوب ہے۔ اس کے ہم بھی قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھول کر تعدیل چھوڑنے پر سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔

جب دوسری رکعت کے دوسرے سجدے سے سر اٹھائے تو بائیں پیر کو پھیلا کر اس پر اس طرح بیٹھ جائے کہ اس کا قدم سرین کے نیچے آجائے اور دائیں پیر کو کھڑا کر دے۔ پیر کی انگلیوں کو قبلہ رخ کرنا مستحب ہے۔

اور عورت اپنی بائیں ران پر بیٹھ جائیگی اور بائیں پیر کو داھنی ران کے نیچے سے باہر نکالے گی۔ کیونکہ یہ نشست اس کے لئے زیادہ باعث ستر ہے۔ ہاتھوں کو رانوں پر رکھے۔ انگلیوں کے پورے گھٹنوں کے اوپر تھوڑا سا پھیلا کر رکھے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ والا تشہد پڑھے۔ شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے اور حضرت امام ابو یوسفؒ سے ایک روایت ہے کہ چھوٹی انگلی اور اس کے ساتھ والی انگلی کو بند کر کے درمیانی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ بنائے اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کرے۔ تشہد یہ ہے۔ ''التحیاتُ للّٰہ والصلوات والطیبات، السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللّٰہ وبرکاته، السلام علینا وعلی عباداللّٰہ الصالحین. أشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وأشھد أن محمدا عبده ورسوله"

تشہد کے الفاظ سے اس کے معانی کا قصد انشاء ہو، گویا وہ اللہ تعالیٰ کو سلام پیش کر رہا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، اپنے آپ کو اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو سلام عرض کر رہا ہے۔

قعدۂ اولیٰ میں اس سے زیادہ نہیں پڑھے گا۔ عمداً اس پر اضافہ کرنا مکروہ تحریمی ہے اور سہواً زیادہ پڑھے تو سجدۂ سہو کرے اگر "اللھم صلی علی محمد وعلی الِ محمد" تک پڑھ لیا ہو۔ دوسری رکعت میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھے گا اور یہ افضل ہے اور یہی صحیح ہے۔ اگر اس میں بجائے

سورۃ فاتحہ کے تین مرتبہ تسبیح پڑھے یا اس کی بقدر خاموش رہے تب بھی صحیح ہے۔

اور قعدہ اخیرہ کی نشست بھی قعدہ اولیٰ کی طرح ہے۔ اس میں بھی تشہد پڑھے گا اس میں تشہد پڑھنا واجب ہے۔ تشہد کے بعد درود ابراہیمی پڑھے گا۔ یہ سنت ہے مسبوق بھی اس کو پڑھے۔

درود کے سنت ہونے کی دلیل نبی علیہ السلام کا وہ فرمان ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تشہد کی تعلیم فرمانے کے بعد ارشاد فرمایا، "**اذا قلت هذا او فعلت هذا فقد تمت صلاتک**" جب تم یہ کہہ چکو یا کر چکو تو تم نے اپنی نماز مکمل کر لی۔

اس قول مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قول اور فعل میں سے ایک کے ساتھ تمام صلوٰۃ کو معلق فرمایا۔ ان میں سے ایک عمل کو بجا لانے سے نماز تمام ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا درود پڑھنا فرض نہیں ہے۔ البتہ خارج صلوٰۃ میں "**صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا**" کے فرمان کے مطابق ہمارے نزدیک واجب ہے تو داخل صلوٰۃ میں واجب نہیں ہوگا۔ درود کے بعد قرآن کے الفاظ کے مشابہ الفاظ سے دعاء مانگے، جیسے "**ربنا أٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الأٰخرة حسنة وقنا عذاب النار**" اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول دعاؤں میں سے پڑھے۔ جیسے: **اللهم أعوذبک فی الدنیا من عذاب جهنم و من عذاب القبر و من فتنة المحیا والممات، ومن فتنة المسیح الدجال، اللهم إنی ظلمت نفسی ظلما کثیرا، ولا یغفر الذنوب إلا أنت فاغفرلی، مغفرة من عندک وارحمنی إنک أنتَ الغفور الرحیم**" نماز کو فاسد ہونے سے بچانے کیلئے ایسے الفاظ سے دعا نہ مانگے جو انسانوں کے کلام کے مشابہ ہو۔ پھر دائیں اس طرح سلام پھیرے گا کہ اس کے رخسار پیچھے نظر آئیں اور **السلام علیکم و رحمة الله** کہے گا "**وبرکاته**" کہنا متوارث نہیں چلا آرہا اور بائیں طرف بھی اسی طرح سلام پھیرے گا۔ البتہ بائیں طرف سلام کے الفاظ کو پہلے سے آہستہ کہنا مستحب ہے۔ سلام پھیرتے وقت مردوں، عورتوں اور دائیں طرف بیٹھے ہوئے فرشتوں کی نیت کرے گا۔ مقتدی امام کے بعد سلام پھیرے۔ یہ قول صاحبینؒ کا ہے۔ امام صاحبؒ سے اس کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ مقتدی انتظار کرے گا اگر امام دائیں سلام سے فارغ ہو تو دائیں طرف سلام پھیرے اور بائیں سلام سے فارغ ہو تو بائیں طرف سلام پھیرے۔ اسی کو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا۔

مقدار جہر اور سر کا حکم

امام کیلئے حسب جماعت جہر کرنا واجب ہے۔ اس سے زیادہ زور سے پڑھنا مکروہ ہے۔

چنانچہ فجر کی دونوں رکعتوں، مغرب کی پہلی دو رکعتوں، عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں ادا ہوں یا قضا جہر کرنا واجب ہے۔ جمعہ، عیدین، تراویح اور رمضان المبارک میں وتر میں جہراً قراءت کرنا واجب ہے۔ حضور ﷺ سے یہ ماثور چلا آ رہا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ **فی کل صلوۃ قراءۃ، فما أسمعنا النبی صلی اللہ علیه وسلم أسمعنا منکم وماأخفی منا أخفیناہ منکم"**

"ہر نماز میں قراءت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے جو ہمیں سنایا وہ ہم آپ کو سنائیں گے جس میں آپ نے قرأت آہستہ کی اس میں ہم بھی آہستہ کریں گے۔"

آہستہ پڑھنے کی مقدار یہ ہے کہ حروف صحیح صحیح ادا ہو جائیں یا کم از کم اگر مانع نہ ہو تو خود کو سنا دے۔ یہ تو تھا امام کیلئے منفرد کو اختیار ہے چاہے آہستہ پڑھے چاہے اتنے زور سے پڑھے کہ اس کو سنائی دے۔ لیکن افضل جہر ہے۔ تاکہ جماعت کی ہیئت میں ادا ہو جائے۔ البتہ دن کے نوافل آہستہ پڑھے اور رات کے نوافل میں اختیار ہے ظہر اور عصر کی تمام رکعات میں امام ہو یا مقتدی سبھی آہستہ قرأت کریں گے۔ اگرچہ عرفہ میں ہی کیوں نہ ہو۔

باب صلوٰۃ الوتر

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وتر واجب ہیں۔ یہ ان کا آخری قول ہے اور یہی اصح قول ہے۔ دلیل اس کی حضرت بریدہ اسلمیؓ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: "فرمایا رسول اللہ ﷺ نے **"الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا" الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منا"** وتر واجب ہے جو وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔ یہ الفاظ آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔

وجوب کی دوسری دلیل حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو انہوں نے ایک جمعہ کے خطبے کے درمیان بیان فرمائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: **"ان اللہ زاد کم صلوۃ وھی الوتر، فصلوھا فیما بین صلاۃ العشاء الی صلاۃ الفجر"** [۲]

"اللہ تعالیٰ نے تم پر ایک اور نماز کا اضافہ فرمایا ہے۔ سنو، وہ وتر ہے اسے عشاء اور فجر کے درمیان ادا کرو"

حضرت ابو تمیم الجیشانی" حضرت عمروؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ میرا ہاتھ پکڑ کر ابو بصرہؓ کے پاس لے گئے اور ان سے کہا۔ عمروؓ نے جو حدیث بیان کی اس کو تم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے؟ فرمایا: ہاں! میں نے اس کو حضور اقدس ﷺ کی زبان سے سنا ہے۔ اس حدیث کے

---

[۱] [مسند احمد ۲/۲۷۴] [۲] [مسند احمد ۲/۲۷۶]

رجال صحیح ہیں۔ وتر کے وجوب کی تیسری دلیل، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے۔

﴿من نام عن وتره اونسيه فليصله اذا ذكره﴾[1]

ترجمہ: "جو وتر پڑھے بغیر سو گیا یا بھول گیا تو یاد آنے پر پڑھ لے۔"

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول وتر کے سنت ہونے کا بھی ہے۔ حضرات صاحبینؒ نے اس قول کو اختیار کیا ہے اور ایک قول فرضیت کا بھی ہے۔ امام زفر رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اختیار فرمایا ہے۔

ان تین اقوال میں بعض حضرات نے یوں تطبیق دی ہے۔ عملاً فرض، اعتقاداً واجب، ثبوتاً سنت ہے۔ البتہ اس پر تمام کا اجماع ہے کہ وتر کے منکر کو کافر نہیں کہا جائیگا۔ اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ بدون نیت اداء نہیں ہوگا۔ اس کی تمام رکعات میں قراءت ضروری ہے عذر کے بغیر اس کو بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہوگا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اوتروا قبل الفجر"[2] "عشاء سے پہلے وتر ادا کرو" وتر تین رکعات ہیں ایک سلام کے ساتھ درمیان میں سلام نہیں ہے۔ دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ جس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کی صفت بیان فرما رہی ہیں۔

فرماتی ہیں: پہلے چار رکعات اس انداز سے ادا فرماتے کہ ان کے حسن اور طول کے متعلق نہ پوچھیئے۔ پھر اسی طرح چار پڑھتے، پھر تین رکعات ادا فرماتے۔

دوسری دلیل: ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: "كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يسلّم في الركعتين الأوليين من الوتر" آپ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔"[3]

تیسری دلیل: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرماتی ہیں: "كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوتر بثلاث لايسلّم إلا في أٰخرهن" آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر ادا فرماتے اور صرف آخر میں سلام پھیرتے۔ اس طرح وتر کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا ان ہی سے تمام اہل مدینہ نے اس طریقے کو اخذ کیا۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ وتر کی دو رکعتوں پر سلام پھیرتے تھے۔ تو فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ فقیہ تھے وہ تیسری رکعت کیلئے تکبیر کہہ کر کھڑے ہو جاتے۔ اور دوسری رکعت پر اگر قعود نہ کرتے تو واپس قعود کی طرف نہیں لوٹتے تھے۔

---

[1] [سنن ابی داؤد] [2] [المستدرک ۱/۳۰۲] [3] [سنن دارمی ۲/۲۷۴]

وتر کی تینوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۃ ضرور ملاتے۔ تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھنے کیلئے تکبیر کہتے اور رفع یدین کرتے۔ پھر قنوت پڑھتے۔ حضرت عاصمؒ کہتے ہیں کہ، میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے قنوت کے متعلق پوچھا تو فرمایا: رکوع سے پہلے ہے۔ میں نے کہا: کسی نے آپ کے حوالے سے کہا ہے کہ آپ رکوع کے بعد قنوت کے قائل ہیں؟ تو فرمایا: اس نے جھوٹ بولا، پھر حدیث بیان کرتے ہوئے فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ایک مہینہ رکوع کے بعد قنوت پڑھی ہے۔ جس میں قبیلہ بنوسلیم کیلئے بددعائیں کیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز میں قنوت پڑھی ہے؟ فرمایا: ہاں پڑھی ہے۔ پوچھا گیا: رکوع کے بعد یا رکوع سے قبل؟ فرمایا: رکوع کے بعد۔ ابو محمد الدارمیؒ کہتے ہیں: میں اسی کو اختیار کرتا ہوں مگر صرف حالت جنگ میں عام حالت میں نہیں، یعنی قنوت نازلہ میں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ پہلی رکعت میں "سبح اسم ربک الاعلی" دوسری میں "قل یایھا الکافرون" اور تیسری رکعت میں "قل ھو اللہ احد" پڑھا کرتے تھے اور قنوت میں یہ مشہور و منقول دعا پڑھے۔

﴿اللّٰھم إنّا نستعینک ونستھدیک ونستغفرک ونتوب إلیک و نومن بک ونتوکل علیک ونثنی علیک الخیر کلہ، ونشکرک ولانکفرک ونخلع ونترک من یفجرک، اللھم إیاک نعبد، ولک نصلی ونسجد وإلیک نسعی و نحفد، نرجوا رحمتک ونخشی عذابک، إن عذابک الجدّ بالکفار ملحق﴾[1]

یا، حضرت حسن بن علیؓ کی وہ دعا پڑھے جو انہوں نے اپنے نانا مکرم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کی ہے۔ دعا یہ ہے:

﴿اللھمّ اھْدِ نِی فِیمَن ھَدَیْتَ، و عافنی فِیمَنْ عَافَیْتَ وَتَوَلَّنِی فِیمَنْ تَوَلَّیْتَ وَ قِنِی شَرَّماقَضَیْتَ، إِنَّکَ تَقْضِی وَ لا یُقْضٰی عَلَیْکَ، وَإِنَّہٗ لایَذِلُّ مَنْ وَالَیْتَ، تبارَکتَ رَبَّنَا و تعالَیْتَ﴾[2]

اگر یہ بھی نہ پڑھ سکتا ہو تو تین بار پڑھ لے "اللھم اغفرلنا" یا "رَبَّنا آتنا فی الدنیا

---

[1] [مصنف ابن ابی شیبۃ: ۲/۲۶۵] [2] [سنن النسائی: ۳/۲۴۸]

حسنة وفی الأخرة حسنة'' پڑھ لے۔

وتر کے علاوہ کسی اور نماز میں قنوت نہیں پڑھا جائیگا۔ الا یہ کہ کسی آفت یا مصیبت کے وقت نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دعاءِ قنوت پڑھتے وقت کیا ہاتھ اٹھائے جائیں گے؟ تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوائے استسقاء کے کسی دعاء میں ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے۔

سونے سے پہلے وتر پڑھنے کی ترغیب

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: تم کس وقت وتر ادا کرتے ہو؟ عرض کیا عشاء کی نماز کے بعد رات کے پہلے پہر میں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا اور آپ؟ فرمایا: رات کے آخر میں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: آپ احتیاط اور عقل پر عمل کرتے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: آپ قوت کے مطابق عمل کرتے ہیں۔[1]

لیکن حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرے خلیل علیہ السلام نے مجھے تین نصیحتیں فرمائی ہیں۔ (۱) وتر پڑھ کر سونا (۲) ہر مہینے میں تین دن روزے رکھنا (۳) چاشت کی دو رکعت نماز پڑھنا۔[2] چنانچہ حکم یہ ہے جس کو آخری پہر نہ اٹھنے کا اندیشہ ہو تو اس کے لئے وتر پڑھ کر سونا افضل ہے اور جس کو رات کے آخری حصے میں اٹھنے کا یقین ہو اس کیلئے تاخیر بہتر ہے۔

تکرار وتر جائز نہیں

کیوں کہ ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ ''لا وتران فی لیلة''[3] ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔

وتر میں کونسی سورت پڑھنی چاہیئے

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیٰ نے کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وتر کی نماز میں ''سبح اسم ربک الاعلی'' اور قل یا ایها الکفرون'' اور ''قل هو الله احد'' پڑھا کرتے تھے۔ اور نماز سے فارغ ہونے کیلئے بآواز بلند تین مرتبہ سبحان الملک القدوس'' پڑھا کرتے۔

نماز کیلئے سورۃ فاتحہ کے علاوہ کسی سورۃ کو مخصوص کرنا مکروہ ہے

کسی بھی نماز میں مخصوص طور پر کوئی خاص سورۃ پڑھنا واجب نہیں ہے۔ صرف سورۃ فاتحہ

---

[1] [مسند احمد ۴/۲۸۲] [2] [سنن النسائی ۳ ص ۲۲۹] [3] [النسائی ج ۳ ص ۲۵]

پڑھنا واجب ہے۔ نمازی کیلئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی نماز کیلئے کوئی ایک سورۃ مخصوص کرلے۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی سورۃ نہ پڑھے۔ کیوں کہ اس طرح کرنے سے دوسری سورتوں کو چھوڑنے اور اس مخصوص سورۃ کا دوسری سورتوں سے افضل ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ مثلاً ہر جمعہ کی فجر میں سورۃ سجدہ اور هل اتی پڑھنے کا معمول بنانا اور یہ خیال کرنا کہ ان کو پڑھنا واجب ہے۔ دوسری جائز نہیں ہے۔ ہاں اگر خیال یہ ہو کہ ان کے علاوہ کوئی بھی سورت اس میں پڑھی جاسکتی ہے مگر وہ اس کو تبرک کے طور پر پڑھ رہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر اسے جمعہ کی فجر میں پڑھا کرتے تھے تو یہ مستحب عمل ہوگا۔ بشرطیکہ کبھی کبھار دوسری کوئی سورہ بھی پڑھی جائے۔ تاکہ جہلاء یہ نہ خیال کر بیٹھیں کہ جمعہ کی فجر میں ان دو سورتوں کے علاوہ کوئی سورۃ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

نماز میں قرأت کا حکم

نماز میں کم از کم اتنا قرآن پڑھنا فرض ہے جس پر قرآن کا اطلاق ہوتا رہا ہو خواہ ایک آیت ہو۔ اگر آیت دو کلموں سے مرکب ہو تو بالاتفاق فرضیت ادا ہو جائے گی۔ جیسے "لَمْ يَلِدْ" (الاخلاص:۳) یا آیت کریمہ "ثُمَّ نَظَرَ" [المدثر: ۲۱] جو چھ حروف پر مشتمل آیت ہے، اور اگر آیت صرف ایک کلمہ پر مشتمل ہو تو ادائیگی فرضیت میں اختلاف ہے۔ جیسے: آیت "الرَّحْمٰنُ" یا "مُدْهَآمَّتٰنِ" یا "صٓ" اس میں اصح یہ ہے کہ فرضیت ادا نہیں ہوگی۔ صاحب "جوہرۃ" نے "المحیط" کے حوالے سے لکھا ہے: کہ نماز میں قرأت قرآن کی پانچ وجوہ ہیں (۱) فرض (۲) واجب (۳) سنت (۴) مستحب (۵) مکروہ۔

فرض اتنا ہے جس سے نماز بمشکل جائز ہو جائے جو اوپر ذکر ہوا۔ اور واجب یہ ہے کہ سورہ فاتحہ اور اسکے ساتھ سورۃ ملانا اور سنت یہ ہے کہ فجر کی نماز میں طوال مفصل سے پڑھنا، عشاء کی نماز میں اوساط مفصل سے اور مغرب میں قصار مفصل سے پڑھنا۔ سلیمان بن یسارؒ کہتے ہیں: حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کسی شخص کے متعلق فرمایا۔ "میں نے فلاں شخص سے بڑھ کر کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشابہ نماز پڑھاتے نہیں دیکھا، تو ہم نے اس شخص کی نماز کو دیکھا کہ وہ ظہر کی پہلی دو رکعتوں کو ذرا طویل اور بعد کی دو رکعتوں کو خفیف پڑھتے اور عصر کی نماز بھی خفیف ہوتی اور مغرب کی نماز میں وہ قصار مفصل، عشاء میں اوساط مفصل اور فجر کی نماز میں طوال مفصل میں سے پڑھتے۔[1]

طوال مفصل: سورۃ الحجرات سے سورۃ البروج تک، اوساط مفصل، سورۃ البروج سے سورۃ البینۃ تک اور قصار مفصل "سورۃ الزلزال" سے آخر قرآن تک۔

---

[1] [سنن النسائی:۲/۱۶۷]

فجر کی نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرأت

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز کی پہلی رکعت میں سورۃ البقرۃ کی آیت "وَقُولُوا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاأُنزِلَ اِلَيۡنَا" سے آخر آیت تک اور دوسری رکعت میں أمنّا باللّٰہ واشھد بانّا مسلمون" پڑھی ہے اور "قل یاایھا الکفرون" اور "قل ھو اللّٰہ احد" پڑھنا بھی ثابت ہے۔ سورۃ الروم اور سورۃ "ق"، سورۃ التکویر اور معوذتین پڑھنے کی روایت بھی موجود ہے اور جمعہ کی فجر میں حٰم سجدہ اور "ھل اتی علی الانسان" بھی پڑھا کرتے تھے اور فجر کی دونوں رکعتوں میں "اذا زلزلت" پڑھنا بھی حدیث کی کتب میں وارد ہے اور فجر کی نماز میں ساٹھ سے سو تک آیات پڑھنا بھی منقول ہے۔

ظہر اور عصر میں قرأت

حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم ظہر کی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پڑھا کرتے تھے کبھی کبھار سورۃ لقمان اور سورۃ الذاریات کی آیات سنائی دیتیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی آپ نے اس میں "سبح اسم ربک الاعلی" اور "ھل اتک حدیث الغاشیہ" پڑھی۔ اس روایت میں حضرات شیخین کیلئے دلیل ہے کہ ظہر کی دونوں رکعتیں برابر ہیں۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر کی نماز پڑھاتے وقت کبھی کوئی آیت سنا دیتے اور ظہر اور فجر کی پہلی رکعت طویل ہوتی۔ ان سے دوسری روایت ہے وہ فرماتے ہیں، پہلی رکعت طویل جبکہ دوسری رکعت کو خفیف ادا فرماتے۔

اسی طرح عصر کی نماز میں دوسری رکعت کی نسبت پہلی رکعت میں قرأت طویل ہوتی۔ اسی کو حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا: اور حضرات شیخینؒ فرماتے ہیں، صرف فجر کی نماز کی پہلی رکعت میں طویل قرأت ہوگی، تاکہ تاخیر سے آنے والا بھی شریک ہو سکے۔ اس میں اس کی اعانت ہے کیوں کہ یہ وقت غفلت اور نیند کا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اوقات اس طرح نہیں ہیں۔

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ظہر اور عصر کی نمازوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "والسماء ذات البروج"، "والسماء والطارق" وغیرہ سورتیں پڑھ لیا کرتے۔ حضرت جابرؓ سے دوسری روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر عصر کی نمازوں میں "والّیل اِذا یغشٰی" پڑھا کرتے[1]۔

عیدین اور جمعہ میں "سبح اسم ربک الاعلی" اور ھل اتک حدیث الغاشیہ" پڑھنے کا

[1] [النسائی ۲ ص ۱۶۷]

معمول تھا۔ اگر عید اور جمعہ ایک ہی دن میں ہوتے تب بھی دونوں نمازوں میں انہی سورتوں کی تلاوت فرماتے۔

مغرب کی نماز میں قرأت

مغرب کی نماز میں قصار مفصل، المرسلات، الطور، النجم اور الدخان پڑھا کرتے تھے۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز میں سورۃ اعراف تقسیم کر کے دو رکعتوں میں تلاوت فرمائی ہے۔[1]

عشاء میں قرأت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو عشاء کی نماز میں سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ" اور والضحٰی" پڑھنے کا امر فرمایا اور وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی اور اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّکَ" پڑھنے کے متعلق بھی ان کو فرمایا: اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز عشاء میں وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وغیرہ سورت پڑھنا ثابت ہے۔
حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عشاء کی نماز پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں "والتین والزیتون" پڑھا کرتے۔

جہری اور سری قرأت کا حکم

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دونوں رکعتوں میں، جہراً قرأت فرماتے تھے اور ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ سورت ملا کر آہستہ (سراً) پڑھا کرتے۔ اور ظہر کی آخری دو رکعتوں میں سورۃ فاتحہ سرًّا تلاوت فرماتے اور عصر میں ظہر کی قرأت فرماتے اور مغرب کی شروع دو رکعتوں میں جہراً قرأت فاتحہ معہ سورت فرماتے، اور آخری رکعت میں صرف سورۃ فاتحہ سراً پڑھتے اور عشاء کی نماز میں سورۂ فاتحہ مع ایک سورت جہراً پہلی دو رکعتوں میں تلاوت فرماتے اور آخری دو رکعتوں میں فاتحہ آہستہ تلاوت فرماتے اور مقتدی خاموشی کے ساتھ سنتے، امام کے پیچھے کوئی بھی نہ پڑھتا اور قعدہ کی حالت میں تشہد پڑھتے۔
امام ابوداؤدؒ نے اس کو اپنی مراسیل میں روایت کیا ہے اور حضرت حسن بصریؒ کے حوالے سے بھی روایت کیا ہے۔ اور حضرت حسنؒ کی مراسیل اصح ہیں۔

---

[1] [نسائی: ج۲ ص۱۷]

جمعہ اور عیدین میں جہر

جمعہ اور عیدین میں بھی جہر ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت حارثؓ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، کہ: صلاۃ العیدین میں جہر کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول رہا ہے اور عیدین کی نماز کیلئے باہر میدان کی طرف نکلنا بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے۔

فجر کی قضاء میں جہر

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا ہے "ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقام پر رات کے آخری پہر میں پڑاؤ ڈالا۔ صحابہؓ سے فرمایا: رات پہرہ کون دیگا؟ تو ایک انصاری نوجوان نے کہا: یارسول اللہ! آج رات میں آپ کی حفاظت کے لئے پہرہ داری کروں گا۔ چنانچہ وہ اس کام کیلئے مامور ہوئے۔ آخری شب میں ان پر نیند کا غلبہ ہوا۔ آنکھ لگ گئی۔ نماز کیلئے کوئی بھی بیدار نہ ہوا حتیٰ کہ سورج کی تپش سے بیدار ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے۔ وضو فرمایا، صحابہؓ نے بھی وضو کیا۔ مؤذن کو اذان دینے کا حکم دیا۔ اذان ہوئی۔ دو رکعت سنت پڑھی گئی پھر اقامت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی دو رکعت پڑھائیں اور اس میں بالکل اسی طرح جہراً قرأت فرمائی جس طرح وقت میں ادا کرتے ہوئے فرماتے تھے اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے۔[1]

مستحب قرأت

مقیم کیلئے فجر کی پہلی رکعت میں تیس سے چالیس آیات کی بقدر اور دوسری رکعت میں علاوہ سورہ فاتحہ کے بیس سے تیس آیات کی بقدر پڑھنا مستحب ہے۔ صرف سورت فاتحہ پر اکتفا کرنا یا فاتحہ کے ساتھ صرف ایک دو آیتیں پڑھنا مکروہ ہے۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ کو چھوڑ کر صرف سورۃ پڑھنا بھی مکروہ ہے۔ اسی طرح پہلی رکعت میں کم اور دوسری رکعت میں زیادہ پڑھنا بھی مکروہ ہے۔

اگر پہلی رکعت میں "قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ" پڑھی تو دوسری رکعت میں بھی "قل اعوذ برب الناس" کو پڑھنا چاہئے۔ اگر سورۃ فاتحہ کے بعد ایک چھوٹی آیت کو تین بار مکرر پڑھا تو بعض نے اس کو جائز نہیں کہا۔ بعض نے کہا ایسا کرنا جائز ہے۔ فتاوی کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آدھی آیت کو یا آیت کے ایک کلمے کو اتنا مکرر پڑھا جو ایک مکمل آیت کی مقدار کو پہنچ گیا تو جائز نہیں ہے۔

---

[1] [سنن بیہقی ج ۳ ص ۱۹۵] [2] [جامع الرضوی ج ۱ ص ۴۳۸]

جماعت کی نماز کا بیان

جماعت کی نماز کی فضیلت

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا "من مشی الی صلوة مکتوبة فی الجماعة فهی کحجة، ومن مشی الی صلوة تطوع فهی کعمرة تامة"[۱] جو شخص جماعت میں شامل ہو کر فرض نماز ادا کرنے کے چلا اس کو حج کے برابر اور جو نماز نفل کو چلا اس کو مکمل عمرے کا ثواب ملے گا۔ انہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ من مشی الی صلاة مکتوبة فهو متطهر، فاجره کاجر الحاج المحرم، و من مشی الی تسبیح الضحی فاجره کاجر المعتمر، وصلوة علی اثر صلاة لا لغو بینهما کتاب فی علین "[۲] جو شخص باوضو ہو کر فرض نماز کے لیے چلتا ہے اس کا اجر محرم حاجی کے اجر کی طرح اور جو نماز چاشت کے لیے چلتا ہے اس کا اجر عمرہ کرنے والے کی طرح ہے اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز پڑھنا کہ درمیان میں کوئی لغو بات نہ ہو اس کا اجر علیین میں لکھا جاتا ہے"

امام نافعؒ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان نقل کیا ہے۔ "صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرین درجة"[۳] "جماعت کی نماز کا ثواب اکیلے کی نماز سے ستائیس گنا زیادہ ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد مبارک حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں: "والذی نفسی بیده لقد هممت أن أمر بحطب فیحطب، ثم آمر بالصلوة فیؤذن لها' ثم آمر رجلا فیؤم الناس، ثم اخالف الی رجال فاحرق علیهم بیوتهم، والذی نفسی بیده لویعلم احدهم ان یجد عرقا سمینا، اومر ماتین یشهد حسنتین العشاء" [۴] قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں نے ارادہ کیا ہے کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں اور وہ جمع کی جائیں پھر نماز کا حکم دوں، اس کیلئے اذان ہو جائے پھر ایک شخص کو نماز پڑھانے کا حکم دوں وہ نماز پڑھائے، پھر میں ان لوگوں کی طرف نکلوں (جو نماز عشاء کی جماعت میں حاضر نہیں ہوئے) اور ان کے گھروں کو جلا دوں۔ اللہ کی قسم: اگر ان کو پتہ چل جائے کہ گوشت کا ایک فربہ حصہ یا دو اچھے قسم کے پائے مل جائیں گے تو ضرور عشاء کی نماز کیلئے حاضر ہوں گے۔"

---

۱ [معجم الطبرانی ۸ص ۱۲۷] ۲ [معجم الطبرانی ۸ص ۱۷۶]

۳ [معجم طبرانی ۸ص ۱۷۷] ۴ [صحیح بخاری: ۱/ ۱۵۶]

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے: **صلاۃ مع الامام افضل من خمس و عشرین صلاۃ یصلیھا وحدہٗ** [1] ''انفرادی نماز کے مقابلے میں امام کے ساتھ پڑھی گئی نماز کا درجہ پچیس گنا بڑھا ہوا ہے''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے جماعت کی نماز سے، سوائے معروف منافق کے کوئی پیچھے نہیں رہتا تھا۔ یا مریض، اور اگر مریض بھی دو آدمیوں کے سہارے جماعت میں شریک ہونے کی طاقت رکھتا ضرور حاضر ہوتا۔

فرمایا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سنن ہدیٰ کی تعلیم فرمائی ہے اور جس مسجد میں اذان ہوتی ہے اس میں نماز پڑھنا سنن ہدیٰ میں سے ہے۔[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ ترجمہ: ''کیا تمہیں ایسا عمل نہ بتاؤں جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا ڈالتے ہیں اور بلند درجات عطا فرماتے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتلا دیجئے۔ فرمایا: نفس کے نہ چاہنے کے باوجود مکمل وضو کرنا اور مسجد کی طرف کثرت سے قدم بڑھانا۔ ایک نماز ادا کرنے کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، بس یہی رباط ہے۔[3]

دو آدمی بھی جماعت کے حکم میں ہیں

حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: دو آدمی خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے جو سفر پر جا رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم جب نکلو، اذان دو، پھر اقامت کرو، تم سے جو بڑا ہو وہ امامت کرائے''[4] ایک دوسری روایت میں ارشاد ہے۔ اگر نماز کا وقت ہو جائے تو اذان دو، اقامت کرو اور تم سے جو بڑا ہو وہ نماز پڑھائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جماعت کی نماز کا ثواب گھر میں پڑھی گئی نماز سے پچیس گنا بڑھا دیا جاتا ہے وہ اس طرح ہے کہ جب انسان اچھی طرح وضو کر کے مسجد کی طرف چل پڑتا ہے اور اس میں نماز کے علاوہ اور کوئی غرض نہ ہو تو اس کو ہر ہر قدم پر ایک ایک درجہ بڑھ جاتا ہے۔ اور ایک ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور جب نماز پڑھنے لگتا ہے تو فرشتے اس کے لئے اس وقت تک دعا کرتے رہتے ہیں جب تک اپنی نماز کی جگہ سے نہ اٹھے اور کہتے ہیں اے اللہ! اس پر رحم فرما، اے اللہ اس پر اپنی مہربانی فرما۔ ایک نماز ادا کرنے تک دوسری نماز کے لئے منتظر رہنے والا بحالت نماز ہی شمار ہوتا ہے۔[5]

1۔ [صحیح مسلم ۱/۴۵۰] 2۔ [صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۵۳] 3۔ [صحیح مسلم: ۱ ص ۲۱۹]
4۔ [صحیح بخاری ۱ ص ۱۵۳] 5۔ [صحیح بخاری ج ۱: ص ۱۵۶]

بخاری شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد بھی موجود ہے۔ فجر کی نماز میں دن کے فرشتے اور رات کے فرشتے یکجا ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ روز فجر کی نماز میں چاہو تو یہ پڑھو "وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا"[1]

ترجمہ: "اور صبح کی نماز بھی۔ بے شک صبح کی نماز میں مجمع ہوتا ہے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "من توضأ فاحسن وضوء ہ ثم راح فوجدالناس قدصلوا، اعطاہ اللّٰہ مثل اجرمن صلاھا و حضرھا لاینقص ذلک من اجرھم شیئًا"[2] ترجمہ: "جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد کی طرف چلا، اور مسجد میں پہنچ کر دیکھا کہ جماعت ہوگئی ہے تو اس کو جماعت کا پورا ثواب ملے گا اور ان کے اجر میں سے تھوڑی سی بھی کمی نہیں ہوگی۔"

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک مرتبہ ایک شخص مسجد میں آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کون اس کے ساتھ تجارت کا معاملہ کریگا۔ تو ایک شخص کھڑا ہوا اور اسکے ساتھ نماز پڑھی۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ اٹھے۔ اس کے ساتھ نماز پڑھی۔ حالانکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ چکے تھے۔

نماز کی طرف چلنے کی کیفیت

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریکِ نماز تھے۔ اچانک پیچھے لوگوں کے شور مچانے کی آوازیں آنے لگیں۔ نماز پڑھانے کے بعد فرمایا: تمہیں آج کیا ہوا؟ کہنے لگے: نماز کیلئے ہم جلدی کر رہے تھے۔ فرمایا: ایسا نہ کیا کرو، جب نماز کیلئے آؤ تو آرام اور وقار کے ساتھ آؤ، جو تمہیں ملے اس کو پڑھو، جو رہ جائے مکمل کرو۔[3]

ادائیگی نماز کے بعد جماعت میں شریک ہونا

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ امام نافع سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ بعض دفعہ میں اپنے گھر میں نماز پڑھ کر مسجد آتا ہوں تو جماعت مل جاتی ہے تو کیا میں امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہو سکتا ہوں؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہو سکتے ہو۔ اس شخص نے کہا: ان میں سے کس نماز کو فرض نماز قرار دوں؟ فرمایا یہ تیرا کام ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ کا

---

[1] [الاسراء: ۷۸]　[2] [سنن البیہقی ۳ ص ۶۹]　[3] [صحیح بخاری ۳ ص ۳۹]

کام ہے جس کو چاہے اس کو فرض قرار دے۔[۱]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے جو شخص مغرب یا صبح کی نماز اکیلا پڑھ لے پھر اس کو جماعت مل جائے تو وہ جماعت کیساتھ شریک نہ ہو۔[۲] امام محمد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس پر ہم سب عمل پیرا ہیں۔

کیوں کہ مغرب کی نماز تین رکعات ہے اور تین رکعات نفل مسنون نہیں اور فجر کی نماز کے بعد نفل نہیں ہے۔ اسی طرح عصر کی نماز کے بعد بھی نفل نہیں ہے۔ امام اعظمؒ نے بھی اس کو اختیار فرمایا ہے۔

حضرت سلامۃ بنت الحر الفزاریؓ فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: "وان من اشراط الساعة ان يتدافع اهل المسجد، لايجدون إمامًا يصلي بهم"[۳] ترجمہ: "قیامت کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسجد والے نماز کیلئے ایک دوسرے کو آگے کرنے لگیں گے، نماز پڑھانے کیلئے ان کو کوئی امام نہیں ملے گا۔ حضرت عقبہ بن عامر الجہنی فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی قوم کی امامت کر رہا ہو۔ اور صحیح وقت پر نماز پڑھائے تو ثواب میں تمام شریک ہوں گے۔ اگر اس میں کچھ کمی کی تو اس کا وبال صرف امام پر ہوگا۔ لوگوں پر کچھ نہیں ہوگا۔

عذر کی وجہ سے جماعت چھوڑنے کا حکم

حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ جو شہداء بدر میں سے ہیں، نے ایک مرتبہ خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر کہا میری بصارت میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اور میں اپنی قوم کا امام ہوں۔ جب بارش ہوتی ہے تو وادی میں سیلاب آتا ہے جس کی وجہ سے نماز پڑھانے کیلئے مسجد نہیں جا سکتا ہوں۔ یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور میرے گھر کے ایک حصے میں نماز پڑھائیں اور میں اس جگہ کو جماعت کیلئے مقرر کر دوں اور اس میں نماز پڑھایا کروں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ان شاء اللہ ایسا کریں گے۔ عتبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ دن کے وقت آپ ﷺ اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ گھر میں داخل ہونے کیلئے اجازت طلب کی میں نے اندر آنے کی درخواست کی۔ چنانچہ گھر کے اندر تشریف لائے۔ بیٹھنے سے پہلے فرمایا: تمہارے گھر کے کس حصے میں نماز پڑھاؤں؟ میں نے عرض کیا، اس جگہ میں تو آنحضرت ﷺ نماز پڑھانے کیلئے کھڑے ہو گئے۔ ہم آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ آپ نے دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا۔[۴]

---

[۱] [الموطا ا ص ۱۱۷] [۲] [سنن ابو داؤد ا ص ۱۵۸]

[۳] [المستدرک ا ص ۲۱۰] [۴] [صحیح مسلم: ا ص ۴۵۵]

نفل نماز باجماعت پڑھنے کا جواز

ایک مرتبہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دادی حضرت ملیکہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانے کیلئے مدعو کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ کھانا تناول فرمایا پھر فرمایا: ''اٹھو نماز پڑھا دوں'' حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ایک چٹائی تھی جو کثرت استعمال کی وجہ سے کالی ہوگئی تھی میں نے اس کو پانی ڈال کر صاف کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر کھڑے ہوگئے ہیں، ایک یتیم لڑکا اور ایک بوڑھی عورت آپ کے پیچھے صف میں کھڑے ہوگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھا کر سلام پھیر دیا۔[1]

جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، بلکہ واجب کے قریب ہے۔ اور ''التحفہ'' میں آیت وارکعوا مع الراکعین'' کی وجہ سے جماعت کو واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کو سنت کہنے کی وجہ جماعت کو سنن ہدیٰ میں سے قرار دینا ہے۔

دوسری وجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی ہے، ترجمہ ''کسی بستی میں تین آدمی ہوں اور اگر اذان، اقامت اور جماعت کا اہتمام نہ کریں تو شیطان ان پر قابو پاتا ہے، تو تم جماعت کو لازم پکڑو، کیوں کہ بھیڑیا ریوڑ سے دور رہنے والی بکری کو کھا جاتا ہے۔[2]

دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ ترجمہ ''شیطان انسان کا بھیڑیا ہے جیسا کہ بکریوں کا بھیڑیا دور رہنے والی بکری کو لقمہ بنالیتا ہے۔ لہٰذا تم فرقہ بندی سے بچو، اور جماعت کو لازم پکڑو، اکثریت اور مسجد کے ساتھ چمٹے رہو۔''

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ جماعت سنت مؤکدہ اور قریب قریب واجب ہے تو عذر مثلاً بارش، سخت تند و تیز ہوا جورات کے وقت ہو سے جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔ یا سخت پیشاب کے تقاضے، بیماری، یا بیمار کی نگاہ داشت، مال کے تلف ہونے کے خوف کی وجہ سے جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔ اگر کھانا حاضر ہو اور نفس میں کھانے کا تقاضا ہو تو جماعت ساقط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نابینا پر بھی جماعت میں شریک ہونا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک واجب نہیں اگر چہ اس کو مسجد کی طرف لانے والا موجود ہو۔ جبکہ حضرات صاحبینؒ کے نزدیک اگر لے جانے والا موجود ہو تو اس پر واجب ہے۔

البتہ اپاہج اور چلنے سے معذور بوڑھے پر جماعت میں شریک ہونا واجب نہیں۔ جماعت کی کل مقدار دو افراد ہیں۔ اگر ایک چھوٹا بچہ ہو جو نماز پڑھنا جانتا ہو۔ اس کا موجود ہونا بھی جماعت کے صحیح ہونے کیلئے کافی ہے۔ اگر اپنے گھر میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ملکر جماعت کرائی تو جماعت کو پانے والا شمار ہوگا۔

---

[1] [صحیح مسلم ۱ص ۴۵۵] [2] [مسند احمد ۵ص ۱۷۵]

اگر نیند، یا بھول جانے یا کسی اور مصروفیت کی وجہ سے جماعت رہ جائے تو اپنی بیوی بچوں کو اکٹھا کر کے جماعت کرانا مستحب ہے۔

صف بندی کے احکام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مردوں کی صفوں میں بہترین صف پہلی اور بری صف آخری ہے اور عورتوں کی صفوں میں بہتر صف آخری ہے اور بری صف پہلی[۱] حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صف اول کیلئے تین بار دعائے مغفرت فرماتے جبکہ دوسری صف کیلئے ایک بار۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عقلمندوں کو (مردوں) کو پہلی صف میں پھر بچوں کو ان کے پیچھے رکھنے کا حکم فرماتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ اولوالاحلام کو چاہئے کہ وہ میرے قریب کھڑے ہوں۔ پھر ان کے قریب، پھر ان کے قریب پھر ان کے قریب والے۔ بازار کی ہیئت سے بچو۔[۲] یعنی اونچی آوازوں، فضول گفتگو، فتنوں اور لڑائی جھگڑوں سے بچتے رہو۔

حضرت قیس بن عباد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں مدینہ منورہ میں مسجد کے اندر پہلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا تھا۔ اچانک کوئی مجھے پیچھے زوردار انداز سے کھینچنے لگا اور مجھے پیچھے کر کے خود میری جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اللہ کی قسم مجھے نہیں معلوم ہے کہ میں نے نماز میں کیا کیا۔ جب نماز سے فارغ ہو کر دیکھا وہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تھے۔ مجھ سے فرمایا، ''اے نوجوان! اللہ تعالیٰ تیرے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب کھڑے ہوں یہ کہہ کر قبلہ رو ہو گئے۔[۳]

ایک مرتبہ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں تمہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز پڑھا دوں؟ چنانچہ انہوں نے پہلے مردوں پھر بچوں اور ان کے پیچھے عورتوں کو کھڑا کر دیا۔[۴]

صفوں کو سیدھا کرنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکبیر سے پہلے ہماری طرف رخ کر کے فرماتے: ''تراصّوا واعتدلوا فانّی أراکم من وراء ظهری'' کندھوں سے کندھا ملا

۱ [صحیح مسلم: ج ا ص ۳۲۶] ۲ [صحیح مسلم ا ص ۳۲۳]
۳ [المستدرک ا ص ۲۱۴] ۴ [مسند احمد ۵ ص ۲۹۸]

کر اعتدال سے کھڑے ہوا کرو کیونکہ میں تمہیں اپنی پشت کے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔[1] حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، جب ہم نماز کیلئے صف بندی کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے شانوں اور سینوں کو ہاتھ لگا لگا کر برابر کر کے فرماتے، "لا تختلفوا فتختلف قلوبکم"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "صفوں کو سیدھا کرو، تم ملائکہ کے ساتھ صف بندی میں ہو، اپنے شانوں کو برابر رکھو، درمیان میں خالی جگہ کو پر کرو اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں نرم ہو جاؤ۔ شیطان کیلئے خالی جگہ نہ چھوڑو، جو صفوں کو ملاتا اللہ تعالیٰ اس کو جوڑتا ہے۔ جو صفوں کو توڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسے توڑتا ہے۔

حضرت امام حماد کہتے ہیں: میں نے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: پہلی صف کو دوسری صف پر کیوں فضیلت دی گئی ہے؟ تو فرمانے لگے، جب تک پہلی صف پوری نہ ہو دوسری صف میں مت کھڑے ہو اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب الآثار میں نقل فرمایا ہے۔

ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ جب تک پہلی صف پوری نہ ہو دوسری صف میں نہیں کھڑا ہونا چاہئے۔ ہاں دوسروں کو تکلیف دیکر مزاحمت سے پہلی صف میں کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ دوسروں کو تکلیف دینے سے بہتر ہے کہ دوسری صف میں کھڑا ہو۔

عورت کی جماعت

حضرت ریطۃ الحنفیہ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عورتوں کی جماعت کرائی اور فرض نماز میں صف کے درمیان کھڑی ہوگئیں۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آپ رمضان المبارک میں عورتوں کی امام بنتیں اور صف کے درمیان کھڑی ہوتیں۔[2] حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو نفل نماز پر محمول فرمایا ہے۔ بہر حال عورتوں کی امامت کراہت کے ساتھ صحیح ہے۔ بعض حضرات نے بدون کراہت ہی صحیح قرار دیا ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ البتہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ عورت کی امامت کو مطلقاً (فرض ہو نفل) جائز نہیں سمجھتے جبکہ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ، ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نفل میں جواز اور فرض میں عدم جواز کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

بچے کی امامت

بچے کی امامت صرف نفل نماز میں جائز ہے۔ مگر مختار مذہب یہ ہے کہ نفل میں بھی جائز

---

۱ [مسند احمد ۵/۳۱۰] ۲ [دار قطنی ۱:/۴۴۴]

نہیں ہے۔ اس لئے کہ بچے کا نفل بھی بڑے کے نفل سے کم تر ہے اور بڑے کا قوی تر۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ "بچہ جب تک بالغ نہ ہو امامت نہ کرائے"۔[1]

متنفل کے پیچھے متفرض کی نماز

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر تم کسی جماعت کی نماز میں شریک ہو اور تمہاری نیت ان کی نماز کی نیت سے مختلف ہو تو تمہاری نماز درست نہیں ہوگی۔ امام اگر نماز پڑھا رہا ہو۔ مقتدیوں کی نیت امام کی نیت سے مختلف ہو تو مقتدیوں کی نماز نہیں ہوگی مگر امام کی نماز صحیح ہوگی۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کتاب الآثار میں نقل فرمایا۔[2] قبیلہ بنی سلمۃ کا ایک شخص جس کا نام سلیم تھا نے خدمت نبوی میں آکر عرض کیا۔ یارسول اللہ!؟ ہمارے سونے کے بعد معاذ بن جبلؓ ہمارے پاس آتا ہے اور ہم دن کے وقت محنت ومشقت کر کے تھک کر سورہے ہوتے ہیں وہ آکر نماز کیلئے منادی کرا دیتا ہے۔ اور ہم نماز پڑھنے کیلئے آتے ہیں اور لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو خطاب کر کے فرمایا: معاذ تم فتنہ نہ بنو، اگر میرے ساتھ ہی نماز پڑھنی ہے تو اپنی قوم کے ساتھ تخفیف کا معاملہ کرو۔

امام کے ساتھ ایک مقتدی ہو تو کہاں کھڑا ہو؟

امام کے ساتھ ایک مقتدی ہو تو اس کو اپنے دائیں طرف کھڑا کردے۔ دلیل اس کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ اپنی خالہ میمونہ کے گھر رات گزاری حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سونے کے بعد رات کے کچھ حصے میں اٹھے اور گھر میں لٹکے ہوئے مشکیزے کے پانی سے وضو فرمایا، پھر نماز کیلئے کھڑے ہوگئے۔ تو میں نے بھی اٹھ کر وضو کیا۔ جس طرح آپ نے وضو فرمایا تھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بائیں پہلو میں نماز کیلئے کھڑا ہوگیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے دائیں طرف کھڑا کردیا۔[3] چنانچہ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دو آدمی جماعت کرا رہے ہوں، تو امام بائیں طرف کھڑا ہو جائیگا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کتاب الآثار میں ذکر فرمایا اور فرمایا: ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں یہی قول امام اعظمؒ کا ہے۔

دو مقتدیوں کی موجودگی میں امام کی جگہ

اس صورت میں امام آگے کھڑا ہو جائیگا۔ دلیل حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مغرب کی نماز پڑھنے لگے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بائیں طرف کھڑا ہوا، پھر میرا

[1] [سنن بیہقی: ج۳ ص ۲۲۵] [2] [جامع الرضوی] [3] [صحیح بخاری ج۱ ص ۲۰۶]

ایک ساتھی آگیا ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف بنائی۔ آپ ﷺ نے نماز پڑھائی آپ ﷺ نے صرف ایک چادر زیب تن فرمائی ہوئی تھی۔[۱]

امام کے دائیں طرف کھڑا ہونا مستحب ہے

حضرت براء بن عاذب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو آپ ﷺ دائیں طرف کھڑے ہونے کو پسند کرتے تا کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ ﷺ کا رخ مبارک ہماری طرف ہو۔[۲]

امامت کا حقدار کون؟

حضرت ابی مسعود انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آنحضرت ﷺ نے فرمایا: سب سے اچھا قرآن پڑھنے والا امامت کرے، اگر قرأت میں سب برابر ہوں تو سنت رسول سے زیادہ واقف شخص امامت کا حقدار ہے، اگر اس میں بھی سب برابر ہوں تو سب سے پہلے ہجرت کرنے والا نماز پڑھائے۔ اگر اس میں بھی برابری ہو تو سب سے پہلے مسلمان ہونے والا بچہ، ایک روایت میں ہے کہ اس کے بعد سب سے زیادہ عمر والا[۳] امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو کتاب الآثار میں نقل کرنے کے بعد فرمایا: ہم اس کو اختیار کرتے ہیں۔ سب سے اچھا پڑھنے والے کا حقدار ہونا اس لئے تھا کہ اس زمانے میں سب سے بہتر پڑھنے والا سب سے زیادہ تفقہ فی الدین بھی رکھتا تھا۔

مسلمان کیلئے ہر نیک و فاجر کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ "**الصلوة المکتوبة واجبةٌ خلف کل مسلم برّاکان اوفاجراً و ان عمل الکبائر**"[۴] ترجمہ: "فرض نماز ہر مسلمان کے پیچھے پڑھنا واجب ہے نیک یا فاجر، اگرچہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو۔ اسی طرح نابینا کی امامت بھی درست ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آنحضرت ﷺ نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو نماز کے لئے آگے کیا حالانکہ وہ نابینا تھا۔[۵]

امام شافعیؒ کے نزدیک بھی نابینا کی امامت جائز ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے نابینا کے مقابلے میں بینا کی امامت افضل ہے۔ اس لئے کہ بینا اچھی طرح نجاست سے خود کو بچا سکتا ہے۔ آپ ﷺ نے جن لوگوں کو امام بنایا۔ ان میں اکثریت بینا کی ہے۔ حضرات حنفیہ، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک بھی بینا کی امامت اولیٰ ہے، کیوں کہ وہ نجاست سے بچنے اور درست سمت کھڑے

---

۱ [مسند احمد ج۵ص۲۹۴] ۲ [صحیح مسلم:ا ص۴۹۲] ۳ [صحیح مسلم:ا ص۴۶۵]
۴ [سنن ابی داؤد ا ص۱۶۳] ۵ [سنن ابی داؤد]

ہونے پر زیادہ قادر ہوتا ہے۔ باقی رہا حضور ﷺ کا حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو امام بنانا غزوات کے ایام میں تھا۔ کیوں کہ تمام حضرات غزوہ کیلئے نکل جاتے۔ صرف معذور حضرات رہ جاتے۔ اس لئے شاید کوئی اس لائق نہ ہو تو آپ ﷺ نے ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو امام مقرر فرمایا۔

کسی گھر میں لوگ اکٹھے ہوں تو امامت کا حقدار صاحب خانہ ہی ہے۔ ہاں اگر وہ مہمانوں میں سے کسی کو اجازت دے تو جائز ہے۔ دلیل اس کی حضرت ابوعطیہؒ کی روایت ہے کہ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ ہماری اس مسجد میں آیا کرتا تھا، ایک مرتبہ جماعت ہونے کے بعد ہم نے ان سے کہا کہ آگے ہو جائیے اور نماز پڑھائیے۔ تو فرمانے لگے، تم اپنے میں سے کسی شخص کو آگے کرو، میں کیوں نہیں پڑھا رہا ہوں۔ اس کے متعلق تمہیں بتلا دوں گا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا۔ "من زار قوماً فلایؤمهم ولیؤمهم رجل منهم" جو کسی کے ہاں مسافر بن کر جائے وہ وہاں امام نہ بنے بلکہ انہی مقیمین میں سے کوئی شخص امامت کرائے۔

ارشاد نبوی ہے۔ "ولا تؤمن الرجل فی اهله ولا فی سلطانه ولا تجلس علی تکرمته فی بیته الا ان یأذن لک او باذنه."

"تم کسی کے گھر میں یا اس کے تسلط و تصرف کی جگہ میں ہرگز امام نہ بنو اور کسی شخص کے گھر میں اس کی نشست میں اس کی اجازت کے بغیر نہ بیٹھو"۔[1]

کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر نماز پڑھائے اور مقتدی اس کے پیچھے کھڑے ہوں تو یہ صحیح و درست ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ گھوڑے کی ایڑ سے گرے اور آپ ﷺ کا دایاں پہلو زخمی ہو گیا۔ جس کی وجہ سے کوئی ایک نماز بیٹھ کر پڑھائی اور ہم نے بھی آپؐ کے پیچھے بیٹھ کر نماز پڑھی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا: ترجمہ "امام اس لئے ہوتا ہے کہ اس کی تابعداری کی جائے۔ جب وہ رکوع کرے تم بھی رکوع کرو، جب رکوع سے سر اٹھائے تم بھی سر اٹھاؤ، جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تم ربنا لک الحمد کہہ دو، اگر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو تم کھڑے ہو کر پڑھو، اگر وہ بیٹھ کر پڑھائے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو۔[2] یہ منسوخ ہے کیوں کہ حضور ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں بیٹھ کر نماز پڑھائی جبکہ لوگوں نے آپ ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ تشریف لائے اور ابوبکرؓ بائیں طرف بیٹھ گئے۔ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کھڑے تھے جبکہ رسول اللہ ﷺ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے ابوبکرؓ نے آپ

---

[1] [صحیح مسلم ا ص ۲۶۵] [2] [بخاری ا ص ۱۶۷]

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتداء میں اور باقی لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدار میں نماز پڑھی۔[1]

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کچھ لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد فرمایا: نماز پڑھانے سے پہلے تم سے اجازت لینا بھول گیا۔ پتہ نہیں تم میرے نماز پڑھانے سے خوش بھی ہوئے کہ نہیں؟ لوگوں نے کہا ہم خوش ہیں! اے صحابی رسول آپ کے پیچھے نماز پڑھ کر ہم لوگ کیوں ناراض ہوں گے؟ فرمانے لگے: میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے، کہ "ایما رجل ام قوما وھم له کارھون لم تجز صلوته اذنه"[2] "جو شخص کسی قوم کو نماز پڑھائے اور وہ اس کو پسند نہ کرتے ہوں تو اس کی نماز اس کے کانوں سے بھی متجاوز نہیں ہوگی"

خیادہ الازدی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جو شخص کسی قوم کا امام ہو اور وہ اس کو پسند نہ کرتے ہوں تو اس کی نماز اس کے کانوں سے آگے نہیں جاسکے گی۔ یہ جب ہے کہ جب وہ ظالم ہو اگر وہ ظالم نہ ہو تو ناپسندیدگی کا گناہ خود ان پر ہوگا۔

اگر لوگوں میں سے ایک دو یا تین آدمی ناپسند کرتے ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے، ہاں اکثریت مخالف ہو تو نماز پڑھانا مناسب نہیں ہے۔

نماز ہلکی پڑھانے کا حکم

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے اپنے محلے والوں کو عشاء کی نماز پڑھائی اور اس میں طویل قرأت کی۔ ایک شخص نے جماعت سے علیحدہ ہو کر اپنی نماز تنہا پڑھی، لوگوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اس کے متعلق بتادیا۔ تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ منافق ہوگیا۔ معاذ کا یہ جملہ اس شخص تک پہنچ گیا۔

انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی اور جو انہوں نے اس کے متعلق کہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتلادیا۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو فرمایا، "أترید ان تکون فتانا یامعاذ؟" "معاذ تم فتنہ بننا چاہتے ہو؟"

اگر امامت کراؤ تو سورۃ "وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا، سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی، اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّکَ اور وَالَّیْلِ اِذَا یَغْشٰی" پڑھا کرو۔

حضرت ابومسعود الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے خدمت نبوی میں آکر عرض کیا میں فجر کی نماز میں فلاں شخص کی وجہ سے دیر سے آتا ہوں کیوں کہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ میں نے اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنا غصہ ہوتے دیکھا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

---

[1] [بخاری ا/ص ۱۷۳]   [2] [معجم الطبرانی ا/ص ۱۱۵]

آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! تم میں سے بعض لوگ معمر ہیں۔ جو بھی تم میں سے جماعت کرائے اس کو چاہئے کہ مختصر نماز پڑھائے کیوں کہ اس کے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔[1]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے اذا أمّ احدكم الناس، فليخفف فان فيهم الصغير والكبير والضعيف والمريض، فاذا صلى وحده فليصل كيف شاء'' [2] ''جب تم لوگوں کو نماز پڑھاؤ، تو ہلکی نماز پڑھاؤ کیوں کہ پیچھے چھوٹے بچے بوڑھے، ضعیف اور مریض بھی کھڑے ہوتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے کسی کو آپ ﷺ سے بڑھ کر مختصر نماز پڑھانے والا نہیں دیکھا۔ انہی سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے، ''میں نماز پڑھاتے وقت جب نماز ذرا طویل کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو کسی بچے کی رونے کی آواز سن کر اس کی والدہ کی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے کر نماز میں تخفیف کرتا ہوں۔[3]

ارکان کی ادائیگی میں امام سے سبقت لے جانے کی حرمت

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ترجمہ: ''امام سے پہلے سر کو اٹھانے والا اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کے سر کی طرح کر دے''؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آنحضرت ﷺ ایک دفعہ نماز پڑھانے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: ترجمہ: ''میں تمہارا امام ہوں، رکوع میں مجھ سے سبقت کرو نہ سجود و قیام میں اور نہ ہی سلام پھیرنے میں۔ میں تمہیں اپنے سامنے دیکھتا ہوں۔ پیچھے بھی دیکھتا ہوں۔[4]

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب امام سلام پھیرے تو اس سے پہلے چہرے کو دوسری طرف امام سے قبل نہ پھیرو۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اس کو کتاب الآثار میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں، ہم اس کو اختیار کرتے ہیں۔ یہی قول امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔

مقتدیوں کی نماز امام کی نماز کے تابع ہے

حبیب بن ابی ثابت رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اگر جنبی شخص نماز پڑھائے تو خود بھی نماز لوٹا دے اور مقتدیوں پر بھی نماز لوٹانا فرض ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس روایت کو نقل فرمایا

[1] [صحیح مسلم ا ص ۳۴۰] [2] [صحیح مسلم: ا ص ۳۴۰]
[3] [صحیح مسلم ا ص ۳۴۲] [4] [مسلم ا ص ۳۲۰]

ہے۔ حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغرب کی نماز پڑھائی مگر ایک رکعت میں بھی قرأت نہیں کی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ساتھیوں نے کہا: آپ نے قرأت نہیں کی؟ فرمانے لگے، واقعی ایسا ہوا ہے؟ میں شام کی طرف فوج بھیجنے کی تیاری میں تھا حتیٰ کہ میں نے انہیں شام پہنچایا۔ پھر خود بھی نماز کا اعادہ فرمایا: ساتھیوں نے بھی اپنی نمازیں دہرادیں۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ یہی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ کوئی جنبی حالت میں نماز پڑھائے یا بغیر وضوء کے پڑھائے یا کسی اور وجہ سے نماز فاسد ہوجائے تو امام کی نماز بھی فاسد ہے مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہوجائیگی۔

اپنا نائب مقرر کرنے کا حکم

محمد بن الحارث بن ابی ضرار کہتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے تو ناک سے خون آنے لگا تو ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر آگے کر دیا اور جا کر وضو کر لیا پھر آ کر باقی نماز پوری کر لی۔ درمیان میں کوئی کلام نہیں کیا۔

مستحبات نماز

(۱) کھانے کو نماز پر مقدم کرنا

دلیل حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کھانا حاضر ہو اور نماز کا وقت ہو تو مغرب کی نماز کی ادائیگی سے قبل کھانا کھالو کھانے میں جلدی نہ کرو۔''

(۲) نماز سے پہلے قضائے حاجت سے فارغ ہونا

حضرت عبداللہ بن ارقم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث مبارک نقل کرتے ہیں۔ ''اذا حضرت الصلوة وأراد الرجل الخلاء فابدؤا و بالخلاء''[۱] اگر نماز تیار ہو اور آدمی کو قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو وہ پہلے [illegible]ئے حاجت کرے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے ''اذا حضرت الصلوة و حضر الغائط، فابدؤا بالغائط''[۲]

---

۱ [سنن دارمی: ا ص ۲۳۲] ۲ [المستدرک ا ص ۲۵۷]

(۳) آخری نماز سمجھ کر پڑھنا

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب تم نماز پڑھو تو آخری نماز سمجھ کر پڑھو۔ اس شخص کی طرح جس کو اگلی نماز ملنے کی امید نہ ہو"

(۴) اچھی طرح نماز پڑھنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھانے کے بعد فرمایا: اے فلاں! تم اچھی طرح نماز نہیں پڑھتے؟ کیا نماز پڑھنے والا یہ نہیں دیکھتا ہے کہ وہ کیسی نماز پڑھ رہا ہے۔ وہ تو اپنے نفس کیلئے پڑھتا ہے۔[۱]

(۵) رکوع وسجود کو مکمل کرنا

حضرت عبداللہ الاشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو ایک مرتبہ نماز پڑھتے دیکھا کہ وہ نہ رکوع کو مکمل کر رہا ہے نہ ہی سجدے کو۔ آپ نے فرمایا: "اگر یہ شخص اس حالت میں مرا تو وہ غیر ملت محمدؐ میں مرا" پھر فرمایا: ترجمہ: "رکوع کو پورا نہ کرنے اور چونچ مارنے کی طرح سجدہ کرنے والے کی مثال اس بھوکے شخص کی ہے جو صرف ایک یا دو کھجوریں کھالے جو اس کی بھوک کو دور کرنے کے لئے کافی نہیں"۔[۲]

(۶) سکون واطمینان کے ساتھ نماز پڑھنا

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔ ترجمہ "اللہ تعالیٰ مسلسل بندے کی طرف متوجہ رہتا ہے جب تک وہ کسی دوسری طرف التفات نہ کرے۔ جب انسان اپنا رخ کسی اور طرف کر دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنی توجہ ہٹا لیتے ہیں۔

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے فرمایا: "سفید گھوڑے کے دم ہلانے کی طرح تم ہاتھ کیوں اٹھا رہے ہو؟ سکون کے ساتھ نماز پڑھو۔"[۳]

(۷) خشوع

فرمان الٰہی ہے: قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خٰشِعُوْنَ"

[۱] [مسلم: ا ص ۳۱۹] [۲] [معجم طبرانی ۴ ص ۱۱۵] [۳] [مسلم: ا ص ۳۲۱]

[المومنون ۲:۱] ترجمہ: ''بے شک ایمان والے کامیاب ہوگئے جو اپنی نماز میں عاجزی کرنیوالے ہیں۔''

ارشاد نبوی ہے: ''الصلاة مثنی مثنی تشهد فی کل رکعتین، و تخشع وتضرع وتمسکن و تقنع یدیک ترفعهما الی ربک، مستقبلا ببطونها وجهک، وتقول یارب، یارب'' [1] نماز دو دو رکعتیں ہیں۔ ہر دو رکعتوں پر تشہد پڑھو اور خشوع وتضرع اور عاجزی کا اظہار کرو اور اپنے ہاتھوں کو اپنے رب کے سامنے اٹھاؤ، ہاتھوں کی ہتھیلیاں تمہارے چہرے کی طرف ہوں اور کہو یارب، یارب۔

(۸) تواضع

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ''نہیں پڑھتا کوئی نماز پڑھنے والا مگر میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری عظمت کے آگے جھک جائے، میرے حکم کے احترام میں اپنی خواہشات سے رک جائے اور میری نافرمانی پر مصر نہ ہو، بھوکے کو کھانا کھلائے اور ننگے کو کپڑا پہنائے''۔

(۹) نماز میں خلل ڈالنے والے اسباب کو ختم کرنا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ دھاری دار کپڑا زیب تن فرما کر نماز پڑھی اور نماز میں آپ کی نظر اس کے نقش ونگار پر پڑی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا اس قمیص کو ابوجہم بن حذیفہ کو دے آؤ اور اس کے آنجانیہ کپڑے کو لے آؤ۔ کیوں کہ یہ قمیص میری نماز میں خلل انداز ہوئی۔

(۱۰) نماز سے پہلے ہاتھ پر لگے ہوئے کھانے وغیرہ کے اثرات کو دھونا

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب تم میں سے کوئی شخص نماز کیلئے کھڑا ہونے کا ارادہ کرے تو ہاتھ میں لگے ہوئے طعام کے اثرات کو دھو ڈالے اس لئے کہ اس کی بو فرشتوں کیلئے سخت تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ جب بندہ نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو فرشتہ اس کے منہ میں گھس جاتا ہے اور بندے کے منہ والی بو فرشتے کے منہ میں داخل ہوتی ہے۔[2]

(۱۱) طویل قیام کرنا

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَ قُومُوا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ'' [بقرہ: ۲۳۸] ''اور اللہ کیلئے ادب سے کھڑے رہا کرو'' ارشاد نبوی ہے: ''افضل الصلاة طول القیام'' [3] حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

[1] [سنن الترمذی ۱/ص ۲۳۹] [2] [مسند الفردوسی ۱۷۹/۳] [3] [سنن الترمذی]

کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کونسی نماز افضل ہے؟

فرمایا: "طول القنوت" "طویل قیام والی"۔

(۱۲) شانے کے ساتھ شانہ ملانا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے "اقیموا صفوفکم فانی اراکم من وراء ظھری" اپنی صفوں کو سیدھا کرو، کیوں کہ میں تمہیں پیٹھ پیچھے بھی دیکھتا ہوں" چنانچہ ہم شانے کے ساتھ شانہ اور قدم کے ساتھ قدم ملا کر کھڑے ہوتے۔[۱]

(۱۳) فجر کی نماز کے بعد بیٹھنا

حضرت جابر بن سمرۃ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "حضور ﷺ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد اپنی جگہ میں طلوع شمس تک بیٹھے رہتے۔ جب طلوع ہوتا تو کھڑے ہوتے۔[۲]

وہ افعال جن سے نماز میں خلل نہیں آتا

(۱) خشیت الٰہی میں رونا

حضرت عبداللہ بن الشخیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا رونے کی وجہ سے آپؐ کے سینے سے چکی کی آواز کی طرح آواز آتی۔[۳]

(۲) چھینک کر الحمدللہ کہنا

رفاعۃ بن رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی۔ مجھے چھینک آئی، میں نے کہا: "الحمد لله حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه مبارکاً علیه کما یحب ربنا و یرضی" حضور ﷺ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "نماز میں کون بول رہا تھا؟ کسی نے بھی نہیں بولا، پھر پوچھا "من المتکلم" بولنے والا کون تھا، پھر بھی خاموشی رہی۔ جب تیسری مرتبہ آپ نے پوچھا تو میں نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! میں! فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ میں نے یہ الفاظ دہرا دیئے "الحمد لله حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه مبارکاً علیه، کما یحب ربنا ویرضی" تو حضور ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اسّی سے زیادہ فرشتے اس کو اوپر لے جانے کیلئے ایک دوسرے سے

[۱] [بخاری: ا ص ۱۷۵] [۲] [بیہقی ۳ ص ۱۰۱] [۳] [سنن ابوداود: ا ص ۲۲۸]

سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔"[1]

(۳) تبسم

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپؐ نے نماز میں تبسم فرمایا: سلام پھیرنے کے بعد کسی نے پوچھا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے اندر آپ تبسم فرما رہے تھے؟ فرمایا "ہوا یہ کہ میکائیل علیہ السلام میرے پاس سے گزرے اور آپ کے پر کے اوپر غبار تھا مجھے دیکھ کر ہنسے: میں بھی مسکرا دیا۔[2]

(۴) شیطان پر لعن کرنا

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے دوران فرمانے لگے "اعوذ باللہ منک" اس کے بعد تین بار "العنک بلعنة اللہ" فرمایا۔ پھر ہاتھ اس طرح آگے بڑھایا گویا کسی چیز کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ سے کچھ ایسے الفاظ سنے جو اس سے پہلے نماز کے اندر نہیں سنے تھے؟ اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ آپ ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے۔ فرمایا: "اللہ کا دشمن آگ کے شعلے میرے چہرے کی طرف ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں نے تین بار "اعوذ باللہ منک" کہا، پھر میں نے کہا: "العنک بلعنة اللہ التامة"، پھر میں نے اس کو پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اگر میرے بھائی حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو آج شیطان بندھا ہوا ہوتا اور مدینے کے بچے اس کے ساتھ کھیل رہے ہوتے۔[3]

(۵) ہاتھ سے سلام کا جواب دینا

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا آپ نماز پڑھ رہے تھے، میں نے سلام عرض کیا آپؐ نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔[4]

(۶) کسی شخص کی پیٹھ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا

حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھتے وقت کوئی سترہ نہ ملتا تو

---

۱ [ترمذی: ا ص ۲۵۱] ۲ [دار قطنی: ا ص ۱۷۵]

۳ [مسلم: ا ص ۳۸۵] ۴ [الدارمی ا ص ۳۶۶]

مجھ سے فرماتے میری طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاؤ۔ دوسری روایت میں امام نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کسی شخص کو بٹھا کر اس کی پشت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور لوگ بیٹھے ہوئے شخص کے سامنے سے گزرتے رہتے۔

(۷) جوتے پہن کر نماز پڑھنا

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "صلوا فی نعالکم خالفوا الیھود" اپنے جوتوں کے ساتھ نماز پڑھو، یہودیوں کی مخالفت کرو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جب تم نماز پڑھو تو اپنے جوتے پہن لو یا اپنے پیروں کے آگے رکھو، دوسروں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب نماز پڑھنے لگو تو اپنے جوتے اپنے دائیں یا بائیں طرف نہ رکھو یا اگر بائیں طرف کوئی نہ ہو تو رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ اپنے سامنے رکھو۔[۲]

(۸) کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر نماز پڑھنا

حضرت سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا کرتے میں حالت حیض میں ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے برابر بیٹھی ہوتی۔ جب سجدہ فرماتے تو بعض دفعہ آپؐ کے کپڑے میرے جسم کے ساتھ لگتے۔ آپ چٹائی پر نماز پڑھتے۔[۳]

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چٹائی پر اور دباغت دیے ہوئے چمڑے پر نماز پڑھتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہم سخت گرمی میں آپؐ کے ساتھ نماز ادا کرتے۔ جب زمین پر پیشانی رکھنا دشوار ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کپڑے بچھا کر اس پر سجدہ فرماتے۔[۴]

(۹) تھوڑی سی حرکت کرنا

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: بسا اوقات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لیٹی رہتی اور میرے پیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہوتے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ فرماتے تو مجھے ہلاتے تو میں اپنے پیر سکیڑ لیتی۔ جب آپ کھڑے ہوتے تو پیروں کو پھیلاتی۔[۵] اس زمانے میں گھروں میں روشنی کا انتظام نہیں ہوا کرتا تھا۔[۶]

---

۱ [معجم الطبرانی اص ۳۱۶] ۲ [المستدرک اص ۲۵۹] ۳ [ابوداؤد اص ۱۷۷]

۴ [ابوداؤد ص ۱۷۷] ۵ [مسند احمد: ۴/ ۱۲۳] ۶ [مسند احمد: ۴ص ۱۲۳]

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھا رہے ہوتے اور امامہ بنت زینب رضی اللہ عنہا آپ کے کندھے مبارک پر ہوتیں۔ جب آپ رکوع فرماتے تو نیچے اتارتے جب قیام فرماتے تو دوبارہ اپنے کندھے مبارک پر بٹھا لیتے۔[1]

(۱۰) کنکھیوں سے دیکھنا

روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسا اوقات گردن کو ہلائے بغیر کنکھیوں سے دیکھا کرتے۔[2]

مکروہات نماز

(۱) نماز میں کنکریوں کو برابر کرنا

حضرت معیقب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کے اندر کنکریوں کو برابر کرنے کے متعلق میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: "اگر ایسا کرنا ہی ہے تو صرف ایک مرتبہ ہو۔"[3]

(۲) اونگھنا

حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "اگر کوئی نماز میں اونگھے تو اس کو چاہیے کہ سو جائے تاکہ اس کی نیند پوری ہو جائے کیوں کہ اونگھنے کی حالت میں نماز پڑھتے ہوئے اسے یہ نہیں معلوم ہوگا کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے یا اپنے نفس کو گالیاں دیتا ہے۔"[4]

(۳) آنکھوں کو اوپر اٹھانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "**لینتھین اقوام یرفعون ابصارھم الی السماء فی الصلاۃ اولا ترجع الیھم**"[5]

ترجمہ: "لوگ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھانے سے باز رہیں ورنہ انکی نگاہیں اچک لی جائیں گی۔

---

۱ [مسند احمد: ۴ص ۱۱۵] ۲ [الترمذی: ۱ص ۴۳۵] ۳ [ترمذی: ۱ص ۱۳۵]
۴ [بخاری ۱ص ۶۱] ۵ [مسلم: ۱ص ۳۲۱]

(۴) آنکھیں بند کرنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب نماز کیلئے کھڑے ہو جاؤ تو آنکھوں کو بند نہ کرو۔[۱]

(۵) جمائی لینا

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''نماز میں جمائی آنا شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر جمائی آجائے تو حتی الامکان اس کو بند کرنے کی کوشش کرو۔[۲]

(۶) قبلہ کی طرف تھوکنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ کی جانب مسجد کی دیوار میں تھوک لگا دیکھ کر کھڑے ہوئے اور اپنے دست مبارک سے اس کو مٹانے لگے۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور اظہار ناراضگی کرتے ہوئے فرمایا: ''نماز پڑھنے کی حالت میں اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے ہوتا ہے لہٰذا نماز پڑھتے وقت قبلہ کی طرف ہرگز نہ تھوکو۔''[۳]

(۸) داهنی جانب تھوکنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، ترجمہ: ''نماز کی حالت میں اپنے سامنے ہرگز نہ تھوکو، نہ ہی دائیں طرف تھوکو لیکن بائیں طرف اپنے قدموں کے نیچے [اس زمانے میں مسجد کچی ہوا کرتی تھی نیچے کوئی چیز بچھائی نہیں جاتی تھی] اگر ایسا ممکن نہ ہو تو کپڑے کے حصے میں۔[۴]

(۹) نماز میں ادھر اُدھر دیکھنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ''میں نے نماز کے اندر ادھر ادھر دیکھنے کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو فرمایا ''هو اختلاس يختلسه الشيطان من العبد''[۵]

(۱۰) انگلیوں کی تشبیک کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص گھر سے وضو کر کے مسجد کی طرف چل پڑے وہ واپسی تک

---

۱ [معجم الطبرانی ۱۱/ص ۲۹] ۲ [ترمذی ۱/ص ۲۳۰] ۳ [مسند احمد: ۲/ص ۱۰۲]

۴ [مسند احمد ۴/۱۰۲] ۵ [بخاری ۱/ص ۱۸۱]

نماز کی حالت میں ہے۔ تو اس کو چاہئے کہ اس طرح نہ کرے آپ نے انگلیوں کی تشبیک کر کے فرمایا۔

(۱۱) انگلیاں چٹخانا

حضور ﷺ کا ارشاد ہے، ترجمہ "نماز کے اندر ہنسنے والا، ادھر ادھر التفات کرنے والا اور انگلیاں چٹخانے والا ایک ہی طرح کے ہیں [۱]

(۱۲) ہاتھ سے سلام کرنا

حضرت جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ہم جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھا کرتے تھے تو سلام پھیرتے وقت ہم السلام علیکم ورحمة اللّٰه کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے بھی اشارہ کرتے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ترجمہ "بدکے ہوئے گھوڑوں کی دموں کو ہلانے کی طرح ہاتھ کیوں ہلاتے ہو۔ بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ ہاتھ اپنی ران پر ہو اور اپنے دائیں بائیں والوں پر سلام کرو"

(۱۳) رکوع وسجود میں قرأت کرنا

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ریشمی لباس اور زعفران سے رنگا ہوا لباس پہننے، سونے کی انگوٹھی پہننے اور رکوع وسجود میں قرأت کرنے سے منع فرمایا۔

(۱۴) سجدہ کرنے کیلئے پھونکنا

حضرت ابو صالح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے ہاں گیا۔ ان کا ایک بھتیجا بھی وہاں آیا تھا۔ وہ دو رکعت نماز پڑھنے لگے جب سجدہ کرنے لگے تو زمین پر پھونک ماری تاکہ سجدے کی جگہ سے مٹی ہٹ جائے۔ انہیں دیکھ کر حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگی۔ بھتیجے! زمین پر نہ پھونکا کرو کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس سے منع کرتے ہوئے سنا ہے۔ ہمارے گھر میں ایک لڑکا رہتا تھا۔ یسار اس کا نام تھا۔ اس کو اس طرح پھونکتے دیکھ کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا "ترب وجھک للّٰہ" [۲] "اللہ کیلئے پیشانی خاک آلود کرو"

(۱۵) کپڑا لٹکا کر نماز پڑھنا

حضرت ابو ہریرة رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے کپڑا لٹکا کر منہ کو ڈھانپ کر

[۱] [معجم طبرانی ۲۰/۴۹] [۲] [مسند احمد: ج ۴ ص ۸۴]

نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔یعنی اس طرح نماز پڑھنا کہ چادر یا کپڑے کا درمیانی حصہ سر کے اوپر ہو اور اس کے اطراف آس پاس لٹک رہے ہوں۔اسی طرح چوغا یا عبا وغیرہ کندھے پر اس طرح ڈالنا بھی سدل ہے جب اس کی آستین بازوؤں میں نہ ڈالی ہوئی ہو۔

(۱۶) پائجامہ کو ٹخنوں سے نیچے لٹکانا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، ''من اسبل ازاره فی صلاته خیلاء فلیس من اللّٰه فی حلّ ولا حرام'' ''جو شخص نماز میں تکبر کے طور پر شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات پر عمل نہیں کر رہا'' دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ پائجامہ نیچے لٹکانے والے کی نماز نہیں قبول فرماتے ہیں۔[۱]

(۱۷) کندھوں کو ننگا کرنا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس طرح نماز نہ پڑھے کہ اس کے کندھے ننگے ہوں۔[۲]

(۱۸) سجدے میں جاتے وقت کپڑوں کو سمیٹنا

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔''أمرت ان اسجد علی سبعة اعظم ولا اکف ثوباً ولا شعرًا''[۳] ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں اور کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹوں۔

(۱۹) رکوع وسجود کو تمام نہ کرنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے، بدترین چور وہ ہے جو نماز میں چوری کرے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں کس طرح چوری ہوسکتی ہے؟ فرمایا: رکوع وسجود کو پورا نہ کرنا۔

(۲۰) سجدے میں ہاتھوں کو پھیلا کر رکھنا

عبدالرحمٰن بن شبل الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (سجدے میں) درندے کی طرح ہاتھ پھیلانے اور کوے کی طرح چونچ مارنے سے منع فرمایا: اسی طرح مسجد میں ایک جگہ نماز کیلئے مقرر کرنے سے بھی منع فرمایا۔[۴]

---

۱ [ابوداؤد: ۱ص۱۷۴] ۲ [ابوداؤد: ۱ص۱۷۲] ۳ [صحیح مسلم: ۱ص۳۵۴]

۴ [دارمی: ۱ص۳۰۳]

(۲۱) اقعاء کی کیفیت میں بیٹھنا

یعنی گھٹنوں کو کھڑا کر کے کولہوں پر بیٹھنا۔ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ "لاتقع بین السجدتین" دوسجدوں کے درمیان اقعاء کی صورت میں نہ بیٹھو۔

(۲۲) ایسی جگہ میں نماز پڑھنا جہاں کتا یا تصویر ہو

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ "لاتدخل الملائکة بَیْتًا فیه کلب اوصورة معظمه" فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا بڑی تصویر ہو۔ ایک مرتبہ زید بن خالدؓ بیمار ہوئے ہم ان کی عیادت کیلئے گئے تو ان کے گھر کے دروازے پر لٹکے ہوئے پردے پر تصویریں تھیں۔ میں نے عبداللہ خولانی سے کہا دیکھئے زید پہلے ہم کو تصویر کے متعلق حدیث نہیں سنایا کرتا تھا؟ تو عبداللہ نے کہا: کیا تم نہیں سنتے تھے کہ "الا رقما فی ثوب مگر کپڑے میں لگے نقش مراد نہیں" یعنی اس سے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے نقشے اور بیل بوٹے مراد ہیں، تو میں نے عرض کیا چھوٹی چھوٹی صورتوں کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ ایک سفر سے تشریف لائے۔ میں نے دروازے کے اوپر پردہ لٹکایا ہوا تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پروں والے گھوڑوں کی تصویریں تھیں۔ آپ ﷺ نے اس کو اتارنے کا حکم فرمایا۔ میں نے اس کو اتار دیا۔[۱]

(۲۳) نمازی کے آگے سے گزرنا

ابوجہمؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"لو یعلم المار بین المصلی ماذا علیه، لکان ان یقف اربعین خیراله من ان یمرّ بین یدیه"[۲]

ترجمہ: "نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو اگر معلوم ہو جائے کہ اس میں کتنا گناہ ہے تو چالیس (دن، یا چالیس مہینے یا چالیس سال) گزارنا بہتر ہے نمازی کے سامنے سے گزرنے سے"

سُترے کا حکم

امام کے سامنے سے ذرا ہٹ کر دائیں یا بائیں جانا سترہ قائم کرنا مستحب ہے۔ چاہے

---

۱ [مسلم: ج۳ ص۱۶۶۵] ۲ [مؤطا: ص۱۳۱]

کھلے میدان میں ہو یا آبادی میں۔ نمازی کیلئے اس کے قریب ہونا مستحب ہے۔ نمازی اور سترے کے درمیان تین گز کے فاصلے سے زیادہ فاصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ سترے کی لمبائی ایک گز یا تین تہائی گز ہے اور اس کی مقدار انگلی کی موٹائی کی بقدر ہو اگر سترے کیلئے لاٹھی وغیرہ نہ ملے، تو پتھروں کو جمع کر کے اس کی طرف رخ کرے۔ یا مٹی اپنے سامنے جمع کرے۔ یا سامان وغیرہ اپنے سامنے رکھے۔ اگر بالکل کچھ نہ ملے تو اپنے سامنے ایک لائن کھینچے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نماز پڑھتے وقت اپنے سامنے کسی چیز کو آڑ کے طور پر رکھو، اگر کوئی چیز نہ ملے تو لاٹھی گاڑ دے۔ اگر لاٹھی اس کے پاس نہ ہو تو اپنے سامنے خط کھینچے، اس کے بعد جو سامنے سے گزرے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: عیدین کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے نیزہ گاڑ دیا جاتا آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھاتے۔ حضرت ابوشعمہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ترجمہ "اگر تم میں سے کوئی سترے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے تو چاہئے کہ سترے کے قریب کھڑا ہو تا کہ شیطان اس کی نماز میں خلل نہ ڈال سکے۔[۱]

حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ستون یا درخت کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو درخت یا ستون کے بالکل سیدھ میں نہیں کھڑے ہوتے بلکہ اس کو اپنے دائیں یا بائیں آنکھ کی طرف رکھتے۔

نمازی کے سامنے سے گزرنے پر گزرنے والا گناہگار ہو گا۔ نمازی کیلئے کوئی گناہ نہیں ہے اگر وہ مناسب مقام پر کھڑا ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم بن سعد فرماتے ہیں۔ میرے والد نے اپنے والد سے روایت کیا ہے ایک مرتبہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک شخص میرے سامنے سے گزرنے لگا۔ میں نے اس کو روکا مگر وہ نہ مانا آگے سے گزر کر چلا گیا۔ میں نے اس کے متعلق حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو فرمانے لگے: "لا یضرّک یا ابن اخی" "اے بھتیجے تجھے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ یعنی تیری نماز میں کوئی کمی نہیں ہو گی۔ اسی طرح حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک میدان میں نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کوئی چیز نہیں تھی۔ اور لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سے گزر رہے تھے۔[۲]

ہمارے نزدیک مختار یہ ہے کہ گزرنے والے کو دفع نہیں کرنا چاہئے جبکہ شوافع میں سے حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گزرنے والے کو روکنا مستحب ہے۔ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر اجماع ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنے والے سے لڑنا اور اسلحے کے ساتھ لڑنا

---

۱ [مسند احمد ج ۲ ص ۱۲۸] ۲ [مسند احمد ج ۳ ص ۱۲۸]

ضروری نہیں ہے۔

امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے

امام کے سامنے سترہ ہو اور جماعت کھڑی ہو تو سامنے سے گزرنا جائز ہے۔ کیوں کہ امام کا سترہ سب کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقام عرفہ میں نماز پڑھا رہے تھے میں اور میرا بھائی فضل آئے اور صف کے سامنے سے گزرے، سواری سے اترے اور سواری کو چرنے کیلئے چھوڑ دیا اور ہم نماز میں شریک ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں کچھ بھی نہیں کہا۔

نماز پڑھنے والے کے سامنے لیٹنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے میں آپؐ کے سامنے لیٹی ہوتی۔ ایک روایت میں ہے جنازے کی طرح میں آپ کے سامنے پڑی ہوتی۔[۱]

نماز کو توڑنے والی چیزیں

(۱) بات کرنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ رہے ہوتے اور سلام کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے اندر سلام کا جواب دیتے۔ جب ہم نجاشی (شاہ حبشہ) کے پاس سے واپس آئے تو ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بحالت نماز سلام عرض کیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام کا جواب نہ دیا۔ تو ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم آپ کو نماز پڑھتے ہوئے سلام عرض کیا کرتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے مگر اس مرتبہ آپ نے جواب نہیں دیا؟ فرمایا: "ان فی الصلوۃ شغلاً" نماز مشغولیت کا نام ہے۔[۲]

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: پہلے ہم نماز میں آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے جب فرمان الٰہی "وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ" نازل ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے اندر کلام سے منع فرمایا اس کے بعد ہم اس سے باز آگئے۔[۳]

---

۱ [مسند احمد ۳ ص ۱۴۱] ۲ [مسلم: ۱ ص ۲۸۳] ۳ [مسلم ۱ ص ۲۸۱]

(۲) چھینکنے والے کو جواب دینا

حضرت معاویہ بن حکم السلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز میں شریک تھا۔ اتنے میں ایک شخص چھینکا۔ تو میں نے "یرحمک اللہ" کہہ دیا۔ لوگ مجھے گھورنے لگے۔ میں نے کہا! میری ماں مجھ پر روئے، تم مجھے کس طرح دیکھ رہے ہو؟ تو وہ اپنی رانوں پر ہاتھ مارنے لگے، تو میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ مجھے خاموش کرانا چاہتے ہیں۔ تب جا کر میں خاموش ہوا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے۔ میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قربان ہوں، ان جیسے تعلیم دینے والا نہ ان سے پہلے دیکھا نہ بعد میں: اللہ تعالیٰ کی قسم: مجھے ڈانٹا، نہ مارا نہ ہی برا بھلا کہا: صرف یہ فرمایا: نماز میں دنیاوی باتیں نہیں ہوتی۔ نماز صرف تسبیح، تکبیر اور قرآن کریم کی قرأت کا نام ہے۔

(۳) ہنسنا

حضرت حمید بن ہلال کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے تو لوگ کچھ تعجب کی چیز دیکھ کر ہنسے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت ابو موسیٰ نے کہا: تم میں سے جو لوگ ہنسے ہیں وہ اپنی نماز لوٹا لیں [۱]۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نماز کے اندر ہنسنے والے پر وضو کو لوٹانا واجب نہیں ہے [۲]۔

(۴) قہقہہ لگانا

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھا رہے تھے اتنے میں ایک نابینا شخص آیا۔ پھسل کر کنویں میں گر گیا۔ تو کچھ لوگ زور سے ہنسنے لگے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "من ضحک ان یعید الوضوء والصلوۃ" [۳]

ترجمہ: "ہنسنے والے اپنا وضو اور نماز لوٹا لیں۔"

(۵) نماز کے اندر کپڑوں میں تری دیکھنا

حضرت خالد بن لجلاج کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز پڑھا رہے تھے۔ کہ آپ نے قعدہ اولیٰ میں بیٹھ کر دیر لگا دی، پھر کھڑے ہو کر پیچھے ہٹنے لگے۔ مقتدیوں میں سے ایک

---

۱ [دار قطنی ا ص ۱۷۴] ۲ [دار قطنی ا ص ۱۷۱] ۳ [رواہ ابو العالیہ مرسلاً]

شخص کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور چلے گئے پھر جب عصر کیلئے تشریف لائے تو عصر کی نماز پڑھائی نماز کے بعد منبر کا ایک کونہ پکڑ کر کھڑے ہو گئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا، لوگو! میں نے نماز کیلئے وضو کرتے وقت اپنی بیوی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی۔ جب نماز کیلئے کھڑا ہوا تو اپنے کپڑوں کے اندر تری محسوس کی اور میں نے اپنے نفس کو دو چیزوں میں ایک چیز اختیار کرنے کو کہا یا یہ کروں تم سے شرم محسوس کر کے اللہ کے سامنے جری ہو جاؤں یا اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہوئے تمہارے سامنے جری ہو جاؤں تو میں نے فیصلہ کیا لوگوں کے سامنے شرمندگی بہتر ہے اللہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے۔ چنانچہ میں نکلا، وضو کو دھرایا، لہٰذا اگر کسی کے ساتھ مجھ جیسی حالت پیش آجائے تو میری طرح ہی عمل کرے۔[۱]

اس سے معلوم ہوا کہ کپڑوں میں تری پانے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور نماز میں نائب مقرر کرنا جائز ہے۔

وہ اشیا جن سے نماز نہیں ٹوٹتی

(۱) کسی بھی چیز کا نمازی کے سامنے سے گزرنا

حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم اپنے گاؤں میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیساتھ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحراء میں نماز پڑھائی۔ آپ کے سامنے کوئی سترہ نہیں تھا۔ ہمارا گدھا اور کتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آپس میں کھیلتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔[۲]

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "**لایقطع الصلاۃ شئی وادؤا وااما استطعتم فانما ھو شیطان**" کوئی چیز نماز کو نہیں توڑتی جس قدر ہو سکے اسے ہٹاؤ کیونکہ وہ شیطان ہے۔[۳]

(۲) نماز میں حدث لاحق ہونا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "**اذا احدث احدکم فی صلاتہ فلیأ خذ بأنفہ و لینصرف ولیتوضأ**" اگر تم میں سے کسی کو دوران نماز

---

۱ [بیہقی ج۳ ص۱۱۴] ۲ [سنن ابی داؤد ج۱ ص۱۹۱] ۳ [المستدرک ج۱ ص۱۸۴]

حدث لاحق ہو جائے تو اپنی ناک پکڑ لے اور جا کر وضو کر لے[۱]

(۳) نکسیر پھوٹنے سے بھی نماز نہیں ٹوٹتی

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر نماز میں ناک سے خون بہہ جائے یا قے آ جائے تو اس کو چاہئے کہ بات کئے بغیر جائے اور وضوء کر کے نماز کی بناء کرے۔ دوسری دلیل حضرت نافعؒ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناک سے جب خون نکلتا تو جا کر وضو کرتے کلام نہ کرتے اور جتنی رکعات پڑھی ہوتیں اس سے آگے رکعات پڑھ کر نماز مکمل کرتے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباس کے متعلق آتا ہے کہ جب ان کی ناک سے خون نکلتا تو جا کر خون کو دھو کر وضو کر کے باقی رکعات پڑھ کر نماز پوری کر لیتے۔

مسبوق چھوٹی ہوئی رکعات کس طرح ادا کرے

مسبوق امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو جائیگا۔ اعوذ باللہ، کہے گا۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم کہنے کے بعد سورۃ فاتحہ بمع سورت پڑھے گا۔ دلیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

﴿اذا اقیمت الصلوة فلیمش احدکم علی هینته، فلیصل ماادرک و لیقض ماسبق به﴾[۲]

''جب جماعت کھڑی ہو جائے تو وقار کے ساتھ آئے جو رکعات ملیں ان کو ادا کرے جو چھوٹ جائے اس کو قضاء کرے۔''

نماز کے اوقاتِ مکروہہ

(۱) فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے تک۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصر کے بعد غروب آفتاب سے قبل نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے قبل نماز سے بھی منع فرمایا ہے۔

(۲) عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب سے پہلے نماز پڑھنا بھی مکروہ ہے۔ دلیل حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمیت کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فجر کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے اور

---

[۱] [البیہقی ج۲ص ۲۵۶] [۲] [جامع الاحادیث ج۱ص ۴۰۱]

عصر کی نماز کے بعد غروب آفتاب سے قبل نماز پڑھنے سے روکا ہے۔[1]

(۳) طلوع وغروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ دلیل حضرت ابن عمر کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے "لا یتحر احدکم فیصل عند طلوع الشمس و عند غروبها" تم میں سے کوئی شخص طلوع وغروب شمس کے وقت نماز پڑھنے کا قصد نہ کرے۔

(۴) زوال کے وقت بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ دلیل: حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے تین اوقات میں نماز پڑھنے اور مردوں کو دفنانے سے منع فرمایا: طلوع آفتاب کے وقت جب تک خوب مرتفع نہ ہو۔ عین زوال کے وقت جب تک ڈھل نہ جائے اور غروب کے وقت جب تک مکمل غروب نہ ہو جائے۔[2]

(۵) فرض نماز کیلئے اقامت ہونے کے بعد بھی نوافل وغیرہ پڑھنا مکروہ ہے۔ فرمان نبوی ہے، "اذا أقیمت الصلاة فلاصلاة الاالمکتوبة" "جب جماعت کھڑی ہو جائے تو فرض کے علاوہ اور کوئی نماز نہیں ہے۔"

صلوۃ ممنوعہ

(۱) بغیر وضوء کے نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ ارشاد نبوی ہے۔ "لاتقبل صلوٰة من احدث حتی یتوضأ" کسی محدث کی نماز قبول نہیں الا یہ کہ وہ وضو کر لے۔ حضرموت سے آئے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ یارسول اللہ! حدث کیا ہے؟ فرمایا: ہوا خارج ہونا۔

(۲) جنابت کی حالت میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اقامت ہوگئی۔ صفیں سیدھی کر لی گئیں۔ حضور ﷺ تشریف لائے۔ جب جائے نماز میں کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ کو یاد آیا کہ آپ ﷺ جنابت کی حالت میں ہیں۔ ہم سے فرمایا: تم اپنی اپنی جگہوں پر رہو۔ پھر تشریف لے گئے۔ غسل فرما کر تشریف لائے آپ ﷺ کے سر مبارک سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ تکبیر کہی گئی اور نماز پڑھائی۔[3]

(۳) حیض کی حالت میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حج کے موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حائضہ ہوگئیں۔ طواف کے علاوہ دوسرے مناسک ادا فرماتیں اور نمازیں نہیں پڑھتی تھیں۔

---

[1] [مسلم ج۱ص۲۹۳] [2] [مسلم] [3] [بخاری ا ص ۴۲]

فرض نماز کو پانا

اذان کے بعد مسجد سے نماز ادا کئے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔ حضرت ابوالشعثاءؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم مسجد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ اذان ہوئی، تو ایک شخص مسجد سے باہر جانے لگے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو دیکھتے رہے حتیٰ کہ وہ مسجد سے باہر چلے گئے۔ تو حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا اس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کی ہے[1]

اور یہ بھی ذہن نشین رکھئے کہ نوافل اور سنن کو گھر میں ادا کرنا افضل ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چٹائیوں سے ایک چھوٹا سا کمرہ نما بنایا تھا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبادت کیا کرتے تھے۔ لوگ تلاش کر کے وہاں پہنچ گئے، وہاں جا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر نوافل ادا کرنے لگے۔ ایک دفعہ لوگ وہاں حاضر ہوئے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنے میں دیر کر دی اور گھر سے اور باہر نہ نکلے۔ تو وہ اونچے بولنے لگے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلانے کیلئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے تک گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصہ کی حالت میں باہر تشریف لائے اور لوگوں سے فرمایا: تمہارے اس طرح مسلسل عمل سے مجھے اندیشہ ہوا کہیں یہ تم پر فرض نہ کیا جائے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو، فرض نمازوں کے علاوہ گھر میں پڑھی گئی نماز زیادہ فضیلت کی حامل ہے۔

فوت شدہ نمازوں کو ادا کرنے کا حکم

قضاء نماز کو پہلی فرصت میں ادا کرنا چاہیئے۔ سفر میں فرصت ملے یا حضر میں، یاد آتے ہی اسکو ادا کرنا ضروری ہے۔ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (ایک سفر کے موقع پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں مخاطب کر کے فرمایا، تم آج رات چلتے رہو گے، صبح انشاء اللہ تعالیٰ پانی تک تمہاری رسائی ہوگی، چنانچہ لوگ چل پڑے اور سفر جاری رکھا۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر چلنے میں مصروف ہو گئے۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چلتا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلتے چلتے نیند کا غلبہ ہوا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اونگھ آئی قریب تھا کہ اپنی سواری سے گر جاتے۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جگائے بغیر سواری پر سیدھا کر کے بٹھا دیا، سواری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چلتی رہی۔ کافی دیر گزرنے کے بعد پھر نیند کا غلبہ زیادہ ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک طرف کو جھکنے لگے۔ تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سیدھا کر کے بیٹھا دیا۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جگایا نہیں پھر چلتے رہے۔ حتیٰ کہ

---

[1] [مسلم ا ص ۴۵۲]

رات کا آخری پہر ہوا۔ پھر آپ ﷺ سواری سے ایک طرف جھکنے لگے۔ جو پہلے سے زیادہ شدید تھا۔ حتیٰ کہ گرنے کے قریب ہو گئے۔ میں پھر آپ ﷺ کے پاس آ کر سیدھا کرنے لگا تو آپ ﷺ نے سر مبارک اٹھا کر فرمایا: یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا: ابوقتادہ ہوں، فرمایا، تم کب سے اس طرح میرے ساتھ چل رہے ہو! میں نے عرض کیا، میں رات سے برابر آپ کے ساتھ ساتھ ہوں۔ فرمایا، "حفظک اللہ بما حفظت بہ نبیہ" ترجمہ "جس طرح تم نے اللہ کے نبی کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائیں" پھر فرمایا، کیا تم خیال کر رہے ہو کہ ہم لوگوں سے اوجھل ہو گئے ہیں؟ پھر فرمایا، دیکھو، کوئی نظر آ رہا ہے؟ میں نے کہا: ایک سوار یہ جا رہا ہے پھر دوسرے ایک سوار کو میں نے دیکھ کر عرض کیا ایک اور بھی نظر آ رہا ہے حتیٰ کہ ہم سات افراد یک جا ہو گئے اور اکٹھے چلنے لگے۔ اتنے میں آپ ﷺ راستہ سے ایک طرف ہو کر ذرا آرام کرنے لگے اور ہم سے فرمایا، نماز کا خیال کرنا کہیں چھوٹنے نہ پائے۔ تو ہم وہاں بیٹھ کر ستانے لگے۔ ہم پر نیند کا غلبہ ہوا۔ دھوپ نکلنے پر آپ ﷺ سب سے پہلے بیدار ہوئے۔ ہم وہاں سے گھبراہٹ کے عالم میں اٹھے، آپ ﷺ نے فرمایا، اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو جاؤ، چنانچہ ہم اپنی سواریوں پر سوار ہو کر چل پڑے جب سورج بلند ہو گیا۔ تو آپ ﷺ سواری سے اترے۔ میرے پاس ایک برتن میں پانی تھا۔ آپ ﷺ نے اس کو طلب فرمایا۔ اس سے خفیف سا وضو کیا۔ تھوڑا سا پانی اس کے اندر بچا کر فرمایا۔ پانی کی حفاظت کرنا۔ ہو سکتا ہے آگے اس کی ضرورت پڑ جائے۔ پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی آپ ﷺ نے دو رکعت ادا فرمائیں۔ پھر دو رکعت عام دنوں کی طرح پڑھائی۔ اپنی سواری پر سوار ہوئے۔ ہم بھی اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو کر محو سفر ہو گئے۔ راہ چلتے ہوئے ہم میں سے بعض ساتھی آہستہ سے ایک دوسرے سے کہنے لگے، نماز قضا کرنے کا ہم کیا کفارہ ادا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہارے لئے نمونہ نہیں ہوں؟ پھر فرمایا "نیند کی وجہ سے نماز چھوٹنا کوتاہی نہیں ہے کوتاہی یہ ہے کہ اس نماز کو دوسری نماز کے وقت تک ادا کیا جائے۔ جس کی نماز بوجہ غلبہ نیند کے قضا ہو جائے تو بیدار ہوتے ہی اس کو ادا کرے۔ الحدیث [۱]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے:

﴿من نسی صلاۃ اونام عنها فکفارتها أن یصلیها اذا ذکرها﴾ [۲] جو شخص نماز ادا کرنا بھول گیا یا سو گیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ یاد

---

[۱] [مسلم ۱ ص ۲۳۹] [۲] [مسلم: ۱ ص ۲۳۱]

آنے پر نماز قضا کرلے۔

ایک اور روایت میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے۔

﴿اذا رقد احدکم عن الصلوٰة اوغفل عنها فلیصلها اذا ذکرها فان اللہ یقول، واقم الصلوٰة لذکری﴾الایة[1]

''اگر تم میں سے کوئی آدمی سو گیا یا نماز ادا کرنا بھول گیا تو یاد آنے پر قضا کرلے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ ''اور میرے ذکر کیلئے نماز قائم کرو۔''

فوت شدہ نماز کو وقتیہ سے پہلے ادا کرے الا یہ کہ وقتیہ کے فوت ہونے کا خطرہ ہو تو وقتیہ کو پہلے ادا کرکے فائتہ کو ادا کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا، **من نسی صلاة فلم یذکرها الاھومع الامام، فلیصل مع الامام، فاذا فرغ من صلاته فلیعد الصلاة التی نسی، ثم لیعد الصلاة التی صلی مع الامام**'' جو فوت شدہ نماز کو بھول جائے اور امام کے ساتھ (وقتیہ کو ادا کرتے ہوئے) یاد آئے تو امام کے ساتھ نماز کو پورا کرے، جب جماعت سے فارغ ہو جائے تو پہلے قضاء شدہ نماز کو ادا کرے پھر امام کے ساتھ ابھی پڑھی ہوئی نماز کو لوٹا دے۔

امام کے ساتھ ادا کردہ نماز کو لوٹانے کا حکم جب ہے جب وقت میں گنجائش ہو۔ لیکن اگر وقتیہ نماز کو ادا کرتے وقت قضا یاد آجائے۔ مگر وقت میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ دونوں نمازیں ادا ہو سکتی ہوں تو اس صورت میں وقتیہ ہی کو ادا کرے۔ پھر قضاء کو ادا کرے۔ اس صورت میں وقتیہ کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مفقود کے طلب میں موجود کو ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ وقتیہ کو بر وقت ادا کرنے کا حکم کتاب اللہ سے ثابت ہے اور فوت شدہ اور وقتیہ کے درمیان ترتیب کا وجوب خبر واحد سے ہے۔ چنانچہ وقت میں اگر گنجائش ہو تو اس پر عمل کیا جائیگا اگر وقت تنگ ہو تو کتاب اللہ پر عمل کرنا زیادہ مناسب ہے۔

اگر کئی نمازیں قضاء ہو جائیں تو ان کو بالترتیب ادا کرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ دشمن کے مقابلے میں تھے۔ جس کی وجہ سے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں قضاء ہوگئیں حتیٰ کہ آدھی رات گزر گئی تو رسول اللہ ﷺ اٹھے، پہلے ظہر، پھر عصر، اس کے بعد مغرب اور عشاء کی نماز یکے بعد دیگرے ادا فرماتے رہے۔[2]

---

[1] [طٰہٰ:۱۴] [2] [سنن النسائی:۲/ص۱۰۶]

بھولنے کی وجہ سے ترتیب ٹوٹ جاتی ہے۔ دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے، "**من نسی صلاۃ اونام عنها فكفارتها ان یصلیها اذا ذكرها**" "کوئی نماز بھولنے یا سونے کی وجہ سے چھوٹ جائے تو یاد آتے ہی فوراً قضاء کرنے سے اس کی تلافی ہو جائیگی"۔ لہٰذا فوت شدہ نماز کا وقت یاد آنے کا وقت ہے۔[1]

اسی طرح تنگی وقت کی وجہ سے بھی ترتیب ساقط ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ سابق میں آپ نے پڑھا ہے اور قضاء نمازوں کا زیادہ ہونا بھی ترتیب کو توڑ دیتا ہے۔ اور کثرت کی مقدار حضرات فقہاء نے چھ نمازوں سے زیادہ ہونا بتائی ہے۔ قضاء نمازوں کو ادا کر کے چھ سے کم رہ جانے سے ترتیب کا وجوب نہیں لوٹتا۔

قضا نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جائیگی اس کیلئے اذان بھی ہوگی اور اقامت بھی، دلیل اس کی حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم آپ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، رات کا وقت تھا، بعض حضرات نے آپ ﷺ سے رات کے آخری حصے میں قیام کرنے کی درخواست کی، تو آپؐ نے فرمایا: مجھے اندیشہ ہے کہ (نیند کی وجہ سے) نماز چھوٹ جائیگی" حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! میں بیدار رہوں گا۔ چنانچہ سارے حضرات لیٹ گئے اور محو خواب ہو گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے سامان پر ٹیک لگا کر طلوع فجر کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ان پر بھی نیند کا غلبہ ہوا۔ آنکھ لگ گئی۔ سورج طلوع ہونے کے بعد آپ ﷺ بیدار ہوئے۔ اور حضرت بلالؓ سے فرمایا، "**یابلال أین ماقلت**" "بلال تمہارا قول کہاں گیا؟ بلال نے کہا" مجھ پر نیند کا اس طرح شدید غلبہ ہوا جو اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہاری ارواح قبض فرمالی تھیں اور پھر اپنی منشاء کے مطابق لوٹا دیں۔

پھر فرمایا، بلال اٹھو اذان کہہ دو، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی، لوگوں نے وضو کیا، پھر آپ ﷺ نے نماز پڑھائی۔[1]

وتر چھوٹ جائے تو پانچوں نمازوں کی طرح اس کی قضا بھی لازمی ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**من نام عن الوتر اونسیه فلیصل اذا ذكر و اذا استیقظ**"[2]

بھول جانے یا سونے کی وجہ سے کسی کا وتر رہ جائے یاد آتے ہی اور بیدار ہوتے ہی اس کو ادا کرنا چاہئے۔ آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد گرامی ہے۔ "**من نام عن وتره فلیصل اذا**

---

[1] [سنن النسائی ج۲ ص ۱۰۶]　　[2] [ترمذی ج ا ص ۲۹]

أصبح"[۱] جو شخص وتر سے سو گیا تو صبح انہیں پڑھ لے۔

اگر فجر کی نماز قضا ہو جائے تو فجر کی سنتوں کا قضا پڑھنا واجب ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ التعریس میں فجر کی سنتوں کو ادا فرمایا۔

حضرت ابو مریمؒ کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے رات کے وقت بھی سفر جاری رہا، جب صبح ہونے کا وقت قریب آیا تو آپ ﷺ نے تھوڑی دیر قیام کرنے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ سواریوں سے اتر گئے اور سو گئے۔ طلوع آفتاب سے پہلے کوئی بھی بیدار نہ ہو سکا۔ اٹھ کر دیکھا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم فرمایا، انہوں نے اذان دی آپ ﷺ نے فجر کی دو رکعت سنتیں ادا فرمائیں پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اقامت کا حکم دیا اور فجر کی نماز پڑھائی۔[۲]

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اگر صرف سنت ہی چھوٹ ئی ہو تب بھی بعد میں اس کو ادا کرنا ضروری ہے کیوں کہ آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے۔ "من لم یصل رکعتی الفجر فلیصلھما بعدما تطلع الشمس"[۳] "جو فجر کی دو رکعت کو ادا نہ کر سکا ہو تو طلوع آفتاب کے بعد ادا کرے۔

اسی طرح ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعات سنت رہ جائیں تو نماز کے بعد ادا کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ ظہر کی سنتیں ہیں اور ظہر کا وقت ابھی باقی ہے۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، البتہ ظہر کے بعد کی دو رکعت سنت سے قبل ادا کرے کیوں کہ ان کو پہلے ادا کرنا مشروع ہوا ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں دو رکعتوں کے بعد ادا کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہ اپنے مقام سے ہٹ گئے جن کی وجہ سے دو رکعتوں کو ان کے وقت سے موخر نہیں کیا جائے گا۔

باب النوافل

سنن مؤکدہ اور مستحبات

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوتے سنا "ما من عبد مسلم یصلی للہ کل یوم اثنتی عشرۃ رکعۃ تطوعا غیر فریضۃ الابنی

---

۱ [ترمذی ا ص ۲۹] ۲ [نسائی ا ص ۲۹۷] ۳ [ترمذی ا ص ۲۶۴]

اللّٰہ له بیتا فی الجنّة"[1] "جو مسلمان روزانہ خالص اللہ کیلئے بارہ رکعات فرض سے زائد پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ یقیناً جنت میں اس کے لئے گھر بنائے گا۔ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات کو اس طرح بیان کرتی ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم ظہر سے پہلے چار رکعت گھر میں پڑھتے پھر مسجد جا کر ظہر کی نماز پڑھاتے۔ پھر گھر تشریف لاتے اور دو رکعت نماز ادا فرماتے اسی طرح دو رکعت مغرب کے بعد دو عشاء کے بعد اور دو رکعات فجر سے پہلے۔[2]

یہ سنن مؤکدہ ہیں ان کو ترک کرنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرما دیا ہے "لا تدعوا رکعتی الفجر و إن طردتکم الخیل"[3] فجر کی دو رکعتوں کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑنا، اگرچہ تمہیں گھوڑے بھی روند ڈالیں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو رکعت سنتوں کا زبردست اہتمام فرماتے تھے۔ البتہ ان میں طویل قرأت نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ "سورہ "قل یاایھا الکافرون" اور قل ھو اللّٰہ احد" وغیرہ پڑھتے۔

اسی طرح ظہر سے پہلے چار رکعت اور فجر سے پہلے دو رکعتوں کو کسی حال میں بھی نہ چھوڑتے۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے زوال کے بعد چار رکعت پڑھنے کا معمول بنایا تو میں نے عرض کیا، یہ رکعات جو آپ بلا ناغہ ادا فرماتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا: زوال کے وقت آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ بلا تاخیر ظہر کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ مجھے یہ پسند ہے کہ اس وقت میری نیکیاں اوپر کو چلی جائیں۔

ظہر کی نماز کے بعد دو رکعت کے ساتھ دو رکعات اور بھی ملا لینا مستحب ہے کیوں کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نقل فرماتی ہیں۔

"من صلی أربعا قبل الظھر، وأربعا بعد ھا حرّم اللّٰہ لحمه علی النار"[4] جو شخص ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعات اور بعد میں چار رکعات ادا کرے گا اللہ تعالیٰ جہنم پر اس کے گوشت کو حرام کر دیگا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے جب سے یہ بشارت سنی ہے اس وقت سے ان رکعات کو کبھی نہیں چھوڑا۔ عصر کی نماز سے پہلے چار رکعت پڑھنا بھی مستحب ہے۔ کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ "رحم اللّٰہ امرأ صلی قبل العصر اربعا"[5] اللہ تعالیٰ اس بندے کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرماتا ہے جو عصر سے قبل چار رکعت ادا کرتا ہے۔"

---

[1] [مسلم ا ص ۵۰۳] [2] [مسلم ا ص ۵۰۳] [3] [مسند احمد: ۲ ص ۲۲۱]

[4] [مسند احمد ۲ ص ۲۰۰] [5] [مسند احمد: ۲ ص ۲۰۰]

اور مغرب کے بعد نوافل کے متعلق حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے ترجمہ ''جو شخص مغرب کے بعد چھ رکعات ادا کرے گا اور درمیان میں کوئی فضول کام نہیں کریگا تو اس کو بارہ سال کی عبادت کا ثواب ملے گا۔[۱] آپ ﷺ کا ایک اور ارشاد گرامی ''من صلی بعد المغرب عشرین رکعة بنی اللّٰه له بیتا فی الجنّة'' [۲] جو شخص مغرب کے بعد بیس رکعات پڑھے گا اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائے گا۔

اسی طرح عشاء کی نماز کے بعد چار رکعت پڑھنا مستحب ہے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔ ترجمہ ''جو شخص عشاء کی نماز کے بعد چار رکعات اس طرح پڑھے کہ پہلی دو رکعتوں میں ''قل یا ایها الکافرون اور قل هو اللّٰه احد'' اور بعد کی رکعتوں میں ''حٰمٓ السجدہ اور تبارک الذی بیده الملک'' پڑھے۔ تو ان کا ثواب لیلۃ القدر کی چار رکعات کے ثواب کے برابر لکھا جائیگا۔[۳]

جمعہ کے بعد چار رکعات پڑھنا مسنون ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''اذا صلی احد کم الجمعة فلیصل بعدها اربعا'' [۴] تم میں سے جو شخص جمعہ پڑھے اس کو چاہئے کہ اس کے بعد چار رکعات پڑھ لے۔

اور جمعہ سے پہلے چار رکعات پڑھنا بھی مستحب ہے۔ دلیل اس کی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا معمول ہے۔ وہ چار رکعت جمعہ سے پہلے اور چار جمعہ کے بعد ادا فرماتے اور آپ ﷺ کے ارشاد ''دو اذانوں کے درمیان نماز ہے'' کے عموم کا بھی تقاضا ہے کہ چار رکعات پڑھ لی جائیں۔

نفل نماز قیام پر قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔ دلیل اس کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ حضور ﷺ بیٹھ کر بھی نماز پڑھ لیا کرتے تھے اور قرأت فرماتے جب تیس یا چالیس آیات کی مقدار کے مطابق پڑھنا باقی رہتا تو کھڑے ہو کر ان کو پڑھتے پھر رکوع فرماتے اور دوسری رکعات میں بھی اسی طرح کرتے۔[۵] البتہ بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہونے والے کے مقابلہ میں نصف اجر ملے گا۔

کیوں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''صلاة الرجل قاعد انصف الصلاة'' بیٹھ کر نماز ادا کرنا آدھی نماز ہے۔[۶] حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے آپ ﷺ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اے ابن عمر کیا ہوا؟ میں نے عرض

---

۱ [الترمذی ا ص ۲۷۲] ۲ [معجم الطبرانی ۱۱ ص ۳۴۶] ۳ [معجم الطبرانی ۱۱ ص ۳۴۶]
۴ [صحیح مسلم: ۲ ص ۶۰۰] ۵ [مسلم ا ص ۵۰۵] ۶ [مسلم: ا ص ۵۰۵]

کیا: مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ نے فرمایا، بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے اور آپ ﷺ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہاں میں نے ایسا کہا ہے۔ (لیکن مجھ کو اپنے اوپر قیاس نہ کرنا) میں تمہاری طرح نہیں ہوں۔

لیکن فجر کی سنت دوسری سنن سے ممتاز ہے۔ اس لئے اس میں احتیاط ہے کہ اس کو بیٹھ کر نہ پڑھا جائے اگر کوئی عذر نہ ہو۔

رات کے نوافل

رات کے وقت دو دو رکعت پڑھنا بھی ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر رات گزاری، آپ ﷺ نے وضو فرما کر نماز شروع کر دی تو میں بھی وضو کر کے آپ ﷺ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے میرا کان پکڑ کر دائیں طرف کھڑا کر دیا۔ آپ ﷺ نے دو رکعتیں ادا فرمائی پھر دو رکعتیں پھر دو رکعتیں پڑھی۔[۱] اور رات کو چار چار رکعات پڑھنا بھی ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں حضور ﷺ رمضان ہو یا غیر رمضان گیارہ رکعات ادا فرماتے پہلے چار رکعات ایسی ادا فرماتے کہ ان کے حسن اور طویل ترین ہونے کے متعلق نہ پوچھئے پھر اسی طرح چار رکعات ادا فرماتے پھر تین رکعات ادا فرماتے۔[۲]

چھ رکعات ایک سلام کے ساتھ پڑھنا بھی منقول ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے تہجد کے متعلق بیان کرتے ہوئے فرماتی ہیں: جب آپ ﷺ کا بدن بھاری ہو گیا تو چھ رکعات پڑھتے اور ساتویں رکعت ملا کر وتر پڑھتے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رات کے وقت چار چار رکعات پڑھنا افضل ہے جبکہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک دو دو رکعت پڑھنا افضل ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے، "صلوۃ الّیل مثنی مثنی" حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے اس کی تفصیل پوچھی گئی تو فرمایا: ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیرنا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی دو دو رکعت پڑھنا افضل ہے۔

رکعات کی کثرت سے طویل قیام کرنا افضل ہے۔ کیوں کہ فرمان الٰہی ہے۔ "قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِیْنَ"

دوسری وجہ افضلیت کی یہ ہے کہ طول قیام سے قرأت طویل ہوتی ہے اور قرأت قرآن تسبیح سے افضل ہے۔

---

۱ [مسند احمد: ج۴ ص۲۵۰] ۲ [مسلم: ج۴ ص۵۰۹]

تراویح

رمضان کی راتوں میں پڑھی جانے والی نماز کو تراویح کہا جاتا ہے۔ ان نمازوں کو تراویح اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہر چار رکعات کے بعد تھوڑی بیٹھ کر راحت حاصل کی جاتی ہے اور ترویحہ راحت پہنچانے کو کہا جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیام رمضان کے متعلق حکم دیئے بغیر ترغیب دیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: "**من قام رمضان ایمانا و احتسابا غفر له ماتقدم من ذنبه**" ترجمہ "جو شخص رمضان میں ایمان اور یقین کے ساتھ قیام اللیل کرے گا اس کے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے"

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے معاملہ اسی طرح ہی تھا۔ پھر حضرت ابو بکرؓ کے دور میں بھی اسی طرح رہا اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دور میں بھی اسی طرح تھا۔

تراویح کی نماز سنت مؤکدہ ہے۔ اسلئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک چند راتوں میں ادا کرنے کے بعد مواظبت چھوڑ دی اور فرمایا "میں اس لئے اس پر مواظبت نہیں کر رہا ہوں کہ کہیں یہ تم پر فرض نہ کر دی جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، ایک رات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد تشریف لے گئے۔ مسجد میں نماز ادا کی اور لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر آپ کی طرح نماز پڑھی۔ صبح ہوئی تو کچھ لوگوں کو اس کے متعلق پتہ چل گیا۔ دوسری رات پہلے سے زیادہ لوگ جمع ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد تشریف لے گئے اور نماز پڑھی۔ لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح نماز پڑھی۔ صبح ہوئی تو لوگوں میں اس کا تذکرہ ہوا۔ تو تیسری رات پہلے سے بھی زیادہ جمع ہو گئے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس تشریف لے گئے۔ نماز پڑھی۔ لوگوں نے بھی نمازیں پڑھیں۔ چوتھی رات ہوئی تو اتنے لوگ جمع ہو گئے کہ مسجد میں مزید گنجائش نہ رہی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر سے باہر تشریف نہ لائے۔ بعض لوگ نماز نماز کے الفاظ کہنے بھی لگے۔ پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر تشریف نہ لائے۔ جب صبح ہوئی تو فجر کی نماز کیلئے تشریف لائے فجر کی نماز پڑھانے کے بعد لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا، "رات کے وقت تمہارا مسجد میں جمع ہونا مجھے معلوم تھا مگر باہر اس لئے نہیں آیا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں رات کی نماز تم پر فرض کر دی جائے اور تم اس کو پورا نہ کر سکو۔"[1]

---

[1] [مسلم: ا ص ۵۲۴]

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میں نے تراویح اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جماعت کا حکم دینے کے متعلق حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا تو فرمایا: تراویح سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی طرف سے حکم نہیں دیا تھا اور نہ ہی وہ اس میں کوئی بدعت کرنے والے تھے۔ بلکہ انہوں نے لوگوں کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے تراویح جماعت کے ساتھ پڑھائی۔ اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی جماعت موجود تھی اور اس جماعت میں شریک تھی۔ ان میں جلیل القدر صحابہ کرام مثلاً حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عباس، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابی بن کعب وغیرہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین موجود تھے کسی نے بھی ان پر نکیر نہیں کی نہ صرف ان کو منع نہیں کیا بلکہ ان کی معاونت ومساعدت کی۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ سنت ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے۔ جب رمضان کے سات دن رہ گئے تو ہمیں لے کر رات کے وقت قیام فرمایا۔ دوسرے روز قیام نہیں فرمایا۔ تیسرے روز آدھی رات تک قیام فرمایا، ہم نے عرض کیا، یارسول اللہ رات کے باقی حصے میں ہمیں ساتھ لیکر نمازیں پڑھ لیتے؟ تو فرمایا: جو امام کے ساتھ قیام کرے اور لوٹ جائے تو پوری رات نماز پڑھنے کا ثواب اس کے اعمال نامے میں لکھ دیا جائیگا۔ پھر دو رات تک قیام نہیں فرمایا پھر جب تین روزے رہ گئے تو ایک رات ہمیں لیکر نماز پڑھی۔ اس رات آپ نے گھر والوں کو بلا کر جماعت میں شریک فرمایا اور نماز پڑھاتے رہے حتیٰ کہ سحری چھوٹنے کا ہمیں اندیشہ ہوگیا۔[1] حضرت عبدالرحمٰن بن عبد القاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسجد چلا گیا۔ مسجد میں دیکھا کہ لوگ متفرق طور پر نماز پڑھ رہے ہیں۔ کوئی علیحدہ پڑھ رہا۔ کچھ لوگ جماعت کی صورت میں پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: میری سمجھ میں یہ آرہا ہے کہ اگر میں ان سب کو ایک امام پر جمع کردوں تو بہت بہتر ہوگا۔ چنانچہ سب کو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے پڑھنے کا حکم دیا۔

دوسری رات پھر حضرت عمرؓ کے ساتھ مسجد جانا ہوا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب کو ایک امام کے پیچھے پڑھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: "نعم البدعة هذه" یہ اچھی ایجاد ہے[2] تراویح کی جماعت سنت کفایہ ہے۔ اگر اہل مسجد سب جماعت تراویح چھوڑ دیں تو سب گناہگار ہوں لیکن بعض لوگ اگر

---

[1] [ترمذی: ۲ص ۱۵۰] [2] [بخاری ا ص ۳۹۶]

تراویح گھر میں پڑھیں تو گناہگار نہیں ہوں گے۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے سنن میں ذکر فرمایا ہے کہ تراویح کی رکعات کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض کی رائے ہے یہ اکتالیس رکعات ہیں وتر کے ساتھ۔ یہ اہل مدینہ کا قول ہے۔ مدینہ میں ان کے ہاں اس پر عمل ہے۔ مگر اکثریت کی رائے یہ ہے یہ بیس رکعات ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس طرح مروی ہے۔ سفیان ثوریؒ، ابن مبارکؒ، امام شافعیؒ وغیرہم نے بھی اس قول کو اختیار فرمایا اور حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ہم نے انہیں شہر مکہ مکرمۃ میں اسی طرح عمل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت یزید بن رومان کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تیئس رکعات پڑھی جاتی تھی۔[۱] (یعنی بیس رکعت تراویح اور تین وتر) حضرت کعب بن یزیدؒ کہتے ہیں حضرت عمرؓ کے زمانے میں تراویح بیس رکعات پڑھی جاتی تھی۔

حضرت ابوالخصیبؒ کہتے ہیں: حضرت سوید بن غفلہؓ رمضان المبارک میں ہمیں بیس رکعات پانچ ترویحوں میں پڑھاتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ایک شخص کو تراویح پڑھانے کا حکم دیتے ہوئے بیس رکعات پڑھانے کا حکم فرمایا۔[۲]

حضرت عبدالرحمٰن السلمیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قراء کو بلایا۔ ان میں سے ایک کو نماز پڑھانے کا حکم دیتے ہوئے بیس رکعات پڑھانے کا حکم دیا اور وتر حضرت علیؓ خود پڑھایا کرتے تھے۔

تراویح جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل ہے یا انفرادی

حضرت عبداللہ بن مبارک، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ امام کے ساتھ پڑھنے کو افضل کہتے ہیں یہ حضرات استدلال کرتے ہیں حضرت ثعلبہ بن مالک القرظیؓ کی روایت سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رمضان المبارک میں ایک رات مسجد میں ایک کونے میں کچھ لوگوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کسی نے کہا: یا رسول اللہ! یہ لوگ قرآن نہیں پڑھ سکتے (یعنی انہیں حفظ یاد نہیں ہے) حضرت ابیؓ ان کو قرآن سنا رہا ہے۔ اور ان کے ساتھ نماز میں شریک ہیں۔ فرمایا: انہوں نے اچھا کیا یا فرمایا انہوں نے درست عمل کیا۔ اس عمل کو ناپسند نہیں فرمایا بلکہ تحسین فرمائی۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ قرآن پڑھنے والے کیلئے گھر میں تراویح پڑھنے کو افضل سمجھتے ہیں: استدلال کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے: "**قد عرفت الذی من**

---

[۱] [المؤطاء ا ص ۱۰۵] [۲] [بیہقی ۳ ص ۴۹۶]

صنيعكم فصلوا ايها الناس في بيوتكم، فان افضل صلاة المرء في بيته الا المكتوبة تمہارے عمل سے میں پہچان گیا۔ پس اے لوگو، تم اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو، کیونکہ فرض نماز کے علاوہ باقی نمازیں گھر میں پڑھنا افضل ہے۔''[1]

حضرت عبداللہ کے قول سے بھی استدلال کرتے ہیں، حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے کہا۔ میں رمضان میں (تراویح) امام کے پیچھے پڑھ لوں؟ ابن عمرؓ نے کہا: کیا تم قرآن نہیں پڑھ سکتے ہو؟ انہوں نے کہا، کیوں نہیں؟ پڑھ سکتا ہوں۔ ابن عمرؓ نے فرمایا، تو پھر تو گدھے کی طرح خاموش رہے گا؟ اپنے گھر میں نماز پڑھو۔[2] آج کل لوگوں کی اکثریت صحیح قرآن نہ پڑھ سکنے والوں کی ہے اور گھروں میں پڑھنے کی صورت میں سستی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جماعت کے ساتھ پڑھنا اولیٰ ہے۔ بشرطیکہ امام صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھتا ہو۔

تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد سے لیکر طلوع فجر تک ہے۔ عشاء کی نماز سے قبل جائز نہیں ہے۔ وتر پہلے پڑھ کر تراویح پڑھنا بھی جائز ہے۔ قیام پر قدرت ہوتے ہوئے بیٹھ کر پڑھنا مکروہ ہے۔ تراویح میں ایک مرتبہ قرآن کریم ختم کرنا سنت ہے۔ مقتدیوں کی سستی کی وجہ سے ختم قرآن کریم ترک نہیں کیا جائیگا۔ رمضان کے علاوہ ایام میں وتر جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا جائیگا۔ کیوں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے غیر رمضان میں وتر کو جماعت کیساتھ ادا نہیں فرمایا ہے اور رمضان المبارک میں اس کو جماعت کیساتھ ادا کرنا افضل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رمضان میں وتر جماعت کے ساتھ ادا فرماتے۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دعاء قنوت آہستہ پڑھنا افضل ہے اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام باآواز بلند دعاءِ قنوت پڑھے اور مقتدی آمین کہیں۔

کسوف وخسوف کی نماز

خسوف چاند گرہن اور کسوف سورج گرہن کو کہتے ہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں سورج گرہن ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھبرا کر اٹھے، مسجد تشریف لائے اور طویل ترین قیام، طویل ترین رکوع اور سجود کے ساتھ نماز پڑھی۔ پھر فرمایا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔ کسی کے مرنے جینے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تنبیہ فرماتا ہے۔ اگر ایسے واقعات دیکھو تو

---

[1] [بیہقی ۲ ص ۴۹۴] [2] [بیہقی ۲ ص ۴۹۴]

ذکر اللہ، دعا اور استغفار کی کثرت کرو۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال کے دن سورج گرہن ہوا۔ تو لوگوں نے کہا، ابراہیم رضی اللہ عنہ کی موت کی وجہ سے سورج گرہن ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ان الشمس والقمر آیتان من آیات اللّٰہ لاینکسفان لموت احد ولا لحیاته، فاذا رایتموهما فادعوا اللّٰہ وصلوا حتی ینجلی" [1] ترجمہ: چاند اور سورج اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہیں کسی کے مرنے جینے سے نہیں گہناتے ہوتے، اگر ان پر گرہن دیکھو تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور گرہن ختم ہونے تک نماز پڑھتے رہو۔"

صلاۃ کسوف سنت مؤکدہ ہے۔ عام نفل کی طرح دو رکعت ہیں۔ محمود بن لبید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انتقال کے دن سورج گرہن ہوا...... الخ۔ طویل حدیث بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کیلئے کھڑے ہو گئے۔ اس رکعت "آلو کتاب" پڑھ کر رکوع فرمایا، پھر قومہ پھر دو سجدے کئے۔ دوسری رکعت بھی اسی طرح پڑھائی۔ [2]

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: صلوۃ کسوف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عام نماز کی طرح رکوع وسجدے کئے۔ [3]

اسی طرح حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ طویل حدیث میں کسوف کے متعلق بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھائی۔ انتہائی طویل ترین قیام کیا۔ اس سے قبل اتنا طویل قیام کرتے ہوئے ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں دیکھا تھا۔ قرأت کی آواز ہم نے نہیں سنی۔ پھر طویل ترین رکوع کیا، پھر دوسری رکعت بھی اسی طرح لمبی پڑھائی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قعدہ میں بیٹھ گئے تو سورج صاف ہو گیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے، کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں سورج گرہن ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلدی جلدی مسجد تشریف لائے اور لوگ جمع ہو گئے۔ آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی۔ [4]

صلوۃ کسوف کی امامت جمعہ پڑھانے والا امام کرائے گا۔ اس میں جہر نہ خطبہ ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جہر اور خطبہ منقول نہیں ہے۔ طویل قرأت کریگا۔ روایت میں آتا ہے کہ آپ

---

[1] [بخاری ا ص ۳]
[2] [الفتح الربانی ۹ ص ۱۸۵]
[3] [الفتح الربانی: ۶/۱۸۷]
[4] [فتح الربانی ۶ ص ۱۹۲]

ﷺ نے پہلی رکعت میں سورۃ بقرہ پڑھنے کی بقدر اور رکعت ثانیہ میں سورۃ ال عمران پڑھنے کی بقدر قیام فرمایا۔

اگر جماعت کے ساتھ پڑھنے کی صورت نہ ہوسکے تو انفرادی طور پر دو یا چار رکعتیں پڑھنا چاہئے اور سورج کے صاف ہونے تک دعاء میں مشغول رہنا چاہئے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا "**فاذا رأيتم شيئا من ذلك فافزعوا الى ذكر الله و دعائه واستغفاره**" "اگر تم اس جیسے حادثات دیکھو تو ذکر اللہ، دعاء اور استغفار کی طرف دوڑو" ایک روایت میں "**فافزعوا الى الصلوة**" "نماز کی طرف بھاگو" بھی آتا ہے اور ایک روایت میں "**كبروا و صلوا و تصدقوا**" "اللہ کی بڑائی بیان کرو، نماز پڑھو، صدقہ دو! بھی وارد ہے"۔[1]

صلاۃ کسوف کے متعلق متعدد روایات مروی ہیں۔ ایک روایت میں ہے صلوۃ کسوف دو رکعت ہیں ہر رکعت میں دو رکوع دو سجدے ہیں۔ ایک روایت میں ہے ہر رکعت میں تین رکوع اور ایک روایت میں پانچ رکوع کا قول بھی ہے واللہ اعلم۔

چاند گرہن میں ہر ایک علیحدہ نماز پڑھ لے۔ کیوں کہ یہ رات کا وقت ہوتا ہے۔ لوگوں کا یک جا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ اسی طرح سخت ہوا، دشمن کے حملے کے وقت بھی انفرادی طور پر نماز پڑھی جائیگی۔

نماز استسقاء

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ اگر میرے بندے میری اطاعت کرتے تو رات کو باران رحمت برسا کر صبح سورج طلوع کرتا۔ (بجلی کی) کڑک کی آواز ان کو نہ سناتا۔[2]

یہ اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اطاعت گزاری اور نواہی سے بچنے کو پسند فرماتا ہے۔ اگر اللہ کے بندے ایسا کرتے تو اللہ تعالیٰ ان پر رات کو باران برساتا، اس لئے رات کے وقت بارش میں رحمت ہوتی ہے۔ مشقت نہیں ہوتی اور دن کے وقت بارش سے بہت سے امور معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چلنا پھرنا دشوار ہو جاتا ہے نیز بادل کی وجہ سے دھوپ نہیں نکلتی جس کی وجہ سے سورج کی روشنی سے انتفاع نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ فرماں برداروں سے مشکلات کو ہٹاتے ہیں حتیٰ کہ بجلی کی کڑک کی آواز تک ان کو نہیں سناتے۔ تاکہ ان کو تکلیف نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی انتہائی رحمت و مہربانی ہے

---

[1] [بخاری ۲۱۰] [2] [بخاری: ۲۱۰]

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اللہ کے غضب کو دعوت دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے قحط، خشک سالی اور دوسرے عذاب میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "مَایَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ وَکَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا" (الایۃ)[1]

"اگر تم شکر گزار بنو اور ایمان لے آؤ تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تعالیٰ قدردان علم والے ہیں۔

قحط اور خشک سالی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی علامت ہے۔ ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ گناہوں سے توبہ تائب ہونا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کی دعاء و درخواست کرنی چاہئے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے باران رحمت نازل فرما دے۔

استسقاء میں اصل یہ آیت کریمہ ہے "اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًا ۝ یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّ یُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ وَ یَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّ یَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًا"[2] "اپنے رب سے بخشش مانگو بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ آسمان سے تم پر (موسلادھار) مینہ برسائے گا اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کریگا اور تمہارے لئے باغ بنا دے گا اور تمہارے لئے نہریں بنا دے گا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے نزول باران کو استغفار کے ساتھ متعلق فرمایا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْآ اِلَیْہِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّ یَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ"[3] "اور اے قوم اپنے رب سے معافی مانگو پھر اس کی طرف رجوع کرو وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تمہاری قوت کو اور بڑھائے گا۔

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ استسقاء میں نماز باجماعت مسنون نہیں ہے۔ استسقاء دعاء اور استغفار کا نام ہے۔ دلیل مندرجہ بالا دونوں آیتیں ہیں اور آپؒ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ

حضرت انس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ ارشاد فرمار ہے تھے۔ منبر کے سامنے دروازے سے ایک شخص داخل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا، یارسول اللہ! مال مویشی ہلاک ہو گئے۔ راستے بند ہو گئے، اللہ تعالیٰ سے باران رحمت کی دعا کیجئے۔ تو

---

[1] [النساء: ۱۴۷] [2] [نوح: ۱۰۔۱۲] [3] [ہود: ۵۲]

رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے دربار میں دست دعا دراز فرمایا اور دعا مانگی: تین بار "اللھم اسقنا" "اے اللہ بارش برسا دیجئے"

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس وقت آسمان میں کہیں بھی بادل کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ آپؐ کی دعا کے بعد آسمان کے کنارے کمان کی طرح بادل نمودار ہوا۔ آسمان کے درمیان میں آکر پھیل گیا اور برسنے لگا۔ پورا ہفتہ گزر گیا ہم نے سورج نہیں دیکھا۔ پھر دوسرے جمعہ کو اسی طرح آپ ﷺ خطبہ بیان فرما رہے تھے کہ وہی شخص اسی دروازے سے داخل ہوا اور آپ ﷺ کے آگے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ یا رسول اللہ! ﷺ مال مویشی ہلاک اور راستے بند ہو گئے اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ بارش روک دے تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگی فرمایا: "اللھم حو الینا لا علینا" "اے اللہ ہمارے آس پاس برسا دے، ہم پر نہ برسا۔ اے اللہ! پہاڑوں، وادیوں اور درخت اگنے کی جگہوں پر برسا دے" حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اتنے میں بارش بند ہو گئی۔ نماز کے بعد ہم دھوپ میں چل کر اپنے گھروں کو گئے [1]

بخاری شریف کی ایک روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے بادل کو دیکھا دو ٹکڑے ہو کر دائیں بائیں برسنے لگا اور اہل مدینہ پر نہیں برسا۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام لوگوں کو لیکر دو رکعت نماز پڑھے گا۔ یہ دو رکعت ان کے نزدیک سنت ہے۔ اس میں جہراً قرأت کریگا۔ جیسا کہ عید کی نماز میں جہری قرأت ہوتی ہے۔ البتہ خطبے کے متعلق ان میں اختلاف ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ایک خطبے کے قائل ہیں اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ دو خطبوں کے۔ اصل خطبہ ان کے نزدیک استغفار ہے۔ نماز پڑھ کر دعاء کر کے خطبہ دیگا۔ خطبے سے فارغ ہو کر قلب رداء کرے۔ یعنی اپنی چادر الٹا کر کھڑا ہو کر دعا کرے اور مقتدی اپنی چادریں نہیں الٹائیں گے۔

حضرات صاحبینؒ کی دلیل حضرت عباد بن تمیمؒ کی روایت ہے کہ ان کے چچا، جو صحابی تھے، نے ان کو بتایا کہ حضور ﷺ لوگوں کے ساتھ استسقاء کیلئے باہر تشریف لے گئے، کھڑے ہو کر دعا فرمائی: پھر قبلہ رو ہو کر اپنی چادر الٹائی تو باران رحمت برسنے لگی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ استسقاء کیلئے باہر تشریف لے گئے، قبلہ رو ہو کر تحویل رداء کیا اور دو رکعت نماز پڑھائی اور قرأت ان میں باآواز بلند کی [2] چادر الٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ چادر اگر چوکور ہو تو اوپر کا حصہ نیچے کر دے اور نیچے کا اوپر کر دے اگر صدور ہو جیسے جبہ تو دایاں حصہ بایاں کر دے اور بایاں حصہ دائیں حصے کی طرف کر دے۔

---

1 [بخاری:۱۹۹] 2 [بخاری ۲۲۰]

نماز کیلئے جاتے وقت خشوع کے ساتھ ڈرتے ہوئے چلیں گے۔ کیوں کہ یہ طریقہ قبولیت کا ذریعہ ہے۔ تضرع وتذلل کا اظہار کریں گے۔ چلنے میں جلد بازی نہیں کریں گے۔ استسقاء میں کافروں کو نہیں آنے دیا جائیگا۔ کیوں کہ یہاں لوگ دعاء کیلئے نکلے ہوئے ہیں کفار کی کوئی دعا نہ صرف یہ کہ قبول نہیں ہوتی، بلکہ نزول لعنت کا اندیشہ ہوتا ہے۔

بارش کے قطرات کو اپنے ساتھ لگانا اور ملنا چاہئے۔ کیوں کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارش کے پانی سے اپنے کپڑوں کو گیلا کر دیا۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے ایسا کیوں کیا ہے؟ فرمایا: کیوں کہ یہ تازہ تازہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے، اس سے برکت حاصل کی جائیگی۔ بارش کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے اگرچہ مجازاً بادل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "ما انزل اللّٰہ من السماء من برکۃ الااصبح فریق من الناس بھا کافرین ینزل اللّٰہ الغیث فیقولون الکوکب کذاکذا.

"اللہ تعالیٰ آسمان سے جو برکت نازل فرماتے ہیں تو لوگوں میں سے ایک گروہ اس کی وجہ سے کفر کرنے والا ہو جاتا ہے کہ اللہ بارش نازل کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ فلاں فلاں ستاروں کی وجہ سے ہوئی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں بارش ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اصبح من الناس شاکر ومنھم کافر، قالوا: ھذہ رحمۃاللّٰہ وقال بعضھم : لقد صدق نوء کذ وکذا" پھر یہ آیات نازل ہوئیں۔ "فَلَا أُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ" سے "تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ"[1]

ترجمہ: "پھر میں تاروں کے ڈوبنے کی قسم کھاتا ہوں۔ اور بے شک اگر سمجھو تو یہ بڑی قسم ہے۔ بے شک یہ قرآن بڑی شان والا ہے۔ ایک پوشیدہ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ جسے بغیر پاکوں کے اور کوئی نہیں چھوتا۔ پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ سو کیا تم اس کلام کو سرسری بات سمجھتے ہو اور اپنا حصہ تم یہی لیتے ہو کہ اسے جھٹلاتے ہو؟"

[1] [واقعہ: ۷۵:۸۲]

باب سجدۃ السہو

جس آدمی کو اپنی نماز میں شک ہو

حضرت عطاء بن یسارؒ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت کعب الاحبارؒ سے سوال کیا اس آدمی کے بارے میں جس کو اپنی نماز میں شک ہو وہ نہیں جانتا کہ کتنی پڑھی کہ کیا چار پڑھی یا پانچ ان دونوں نے کہا وہ آدمی ایک رکعت اور پڑھ لے اور پھر بیٹھنے کی حالت میں دو سجدے کرے۔ اور حضرت ابراہیم نخعیؒ سے روایت ہے کہ اگر آدمی فرض نمازوں میں بھول گیا اس کو نہ معلوم ہو کہ چار پڑھی ہیں یا تین تو فرمایا کہ اگر یہ اس کی پہلی بھول ہے تو نماز کا اعادہ کرے اور اگر اکثر بھولتا رہتا ہے تو درستگی کیلئے تحری کرے اگر اس کا گمان ہو کہ اس نے نماز مکمل کر لی ہے تو سہو کے دو سجدے کر لے اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ اس نے تین رکعتیں پڑھی ہیں تو اس پر ایک رکعت کا اضافہ کرے پھر سہو کے دو سجدے کرے اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے اور فرمایا اسی پر ہم عمل کرتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کو نماز میں شک ہو اور معلوم نہ ہو کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار تو وہ تحری کرے اور ظن غالب کی طرف نظر کرے اگر اس کے ظن غالب میں تین ہیں تو کھڑا ہو جائے اور چوتھی کا اس پر اضافہ کرے پھر تشہد پڑھے اور سلام پھیرے اور سہو کے دو سجدے کرے اور اگر ان کا غالب گمان یہ ہے کہ اس نے چار رکعتیں پڑھی ہیں تو تشہد پڑھے پھر سلام پھیرے پھر سہو کے دو سجدے کرے۔ اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے اور فرمایا کہ ہم اس پر عمل کرتے ہیں مگر مستحب یہ ہے کہ اگر وہ پہلی مرتبہ اس میں مبتلا ہوا تو نماز دہرائے۔

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جس کو نماز میں شک ہو پس اس کو چاہئے کہ وہ دو سجدے کرے سلام پھیرنے کے بعد۔

حضرت علقمہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ سلام کے بعد سہو کے دو سجدے کرے۔ اور بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی سجدے سلام کے بعد کئے اور حضرت علقمہؒ نے حضرت عبداللہؓ سے روایت کرتے ہیں فرمایا نماز پڑھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پس کچھ زیادتی کی یا کچھ کمی کی جب سلام پھیرا تو ہم نے کہا یا رسول اللہ کیا نماز میں نئی چیز آگئی؟ فرمایا اگر نماز میں نئی چیز آتی تو میں

آپ لوگوں کو اس کی خبر دیتا لیکن میں تمہارے جیسا بشر ہوں بھولتا ہوں جیسے تم بھولتے ہو۔ پس تم میں سے کسی کو اگر نماز میں شک ہو تو درستگی کیلئے تحری کرے اور اس پر مکمل کرے اور سلام پھیرے اور چاہیئے کہ دو سجدے کرے۔

سلام پھیرنے کے بعد شک ہونا

حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب تو نماز میں سلام پھیرے اپنی نماز سے تو پھر تمہیں وضو کے متعلق شک ہو یا نماز یا قراءۃ کے متعلق تو اس کی طرف توجہ مت کرنا اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاثار میں نقل کیا ہے اور فرمایا کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

قعدہ اولیٰ کا ترک کرنا فرض نماز میں

عبدالرحمٰنؒ بن ہرمز سے روایت ہے کہ عبداللہ بن لحینۃ الازدیؒ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ظہر کی نماز پڑھائی اور پہلی دو رکعتوں میں کھڑے ہو گئے تین آدمی بیٹھے اور لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہو گئے یہاں تک کہ نماز مکمل ہو گئی اور لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلام پھیرنے کا انتظار کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبیر کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے اور دو سجدے کئے سلام سے پہلے پھر سلام پھیرا۔

دو رکعتوں کے اخیر میں سلام پھیرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعتوں کے بعد سلام پھیرا ذوالیدین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کیا نماز کم ہو گئی؟ یا آپ بھول گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا ذوالیدین سچ کہہ رہا ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوئے اور آخری دو رکعتیں پڑھیں پھر سلام پھیرا۔ پھر تکبیر پڑھی پھر سجدہ کیا اس جیسا سجدہ یا اس سے لمبا۔

سلام پھیرنا تین رکعتوں پر

حضرت معاویہ ابن حدلج رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھی سلام پھیرا نماز میں ایک رکعت باقی تھی۔ ایک آدمی نے اس کو سمجھ لیا اور کہا کہ آپ نماز میں ایک رکعت بھول گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس ہوئے مسجد میں داخل ہوئے اور بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا نماز کھڑی کروائی۔ پس لوگوں کیساتھ ایک رکعت پڑھ لی میں نے لوگوں کو اس کی خبر دی تو انہوں نے مجھ سے

کہا۔ کیا آپ اس آدمی کو پہچانتے ہیں میں نے کہا نہیں مگر ایک دفعہ اس کو اپنے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا یہ وہی آدمی ہے لوگوں نے کہا کہ یہ طلحہ بن عبید اللہؓ ہے۔

عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ عصر کی تین رکعتوں میں نبی کریمؐ نے سلام پھیرا پھر اپنی منزل پر تشریف لائے وہاں ایک آدمی بیٹھا تھا جس کا نام فرباق تھا اس نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یا رسول اللہ آپ نے نماز میں کمی کی ہے تو آپ ﷺ اپنی چادر اٹھائے غصے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ یہ سچ کہتا ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور وہی ایک رکعت پڑھی پھر سلام پھیرا پھر دو سجدے کئے پھر سلام پھیرا۔

جس نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھیں

حضرت علقمہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ بے شک نبی کریم ﷺ نے ظہر کی پانچ رکعتیں ادا فرمائیں۔ کسی نے پوچھا کیا نماز میں اضافہ ہو گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کیسے؟ اس نے کہا آپ نے پانچ پڑھیں۔ پس آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کئے۔

تین سجدے کرنا

ابراہیم سے روایت ہے ایک آدمی کے بارے میں انہوں نے کہا بھول کر تین سجدے کئے انہوں نے کہا اس کو کہ اس پر سجدہ سہو ہے۔ اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے اور کہا کہ اسی پر ہم عمل کرتے ہیں اور یہی امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

نظر ثانی کی ضرورت

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور جب امام کھڑا ہو جائے دو رکعتوں میں اگر اس کو یاد آئے کھڑے ہو کر مکمل کرنے سے پہلے تو اس کو چاہئے کہ بیٹھ جائے اور اگر کھڑے ہو کر مکمل کر لی تو پھر نہ بیٹھے اور سہو کے دو سجدے کرے۔ اور ان ہی سے روایت ہے فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کو دو رکعتوں میں شک ہو اور کھڑا ہو گیا تو وہ نہ بیٹھے اور سہو کے دو سجدے کرے اور مکمل کھڑا نہ ہوا ہو تو بیٹھ جائے اور اس کے ذمے سجدہ سہو بھی نہیں ہے۔

یقین پر بناء کرنا

حضرت سالمؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عمرؓ فرماتے تھے اگر تم میں سے کسی

کو نماز میں شک ہو تو وہ اس چیز کا ارادہ کرے جس کے متعلق اس کو گمان ہو کہ وہ اپنی نماز میں بھول گیا ہے تو وہ نماز پڑھ لے اور بیٹھنے کی صورت میں سجدہ سہو کرے۔

سجدہ سہو میں تکبیر

عبداللہ بن لحینہ الازدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر کی نماز میں کھڑے ہو گئے حالانکہ بیٹھنا چاہئے تھا نماز مکمل کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو سجدے کئے اور ہر سجدے میں تکبیر پڑھی بیٹھنے کی حالت میں سلام سے پہلے اور لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وہی دو سجدے کئے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھول کر بیٹھنے کی جگہ کئے۔

سجدہ سہو میں تشہد

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو نماز پڑھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سہو ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو سجدے کئے پھر تشہد پڑھا پھر سلام پھیرا۔

سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا

حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کیا زیادہ ہو گئی نماز؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''وہ کیسے'' انہوں نے کہا کہ پانچ رکعت پڑھی آپ نے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد دو سجدے کئے۔

مقتدیوں پر سہو نہیں ہے اور امام کی سہو مقتدیوں کی سہو ہے

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے والد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مقتدیوں پر سہو نہیں ہے اور اگر امام کو سہو ہو جائے تو امام پر اور مقتدیوں پر بھی واجب ہے اور جس کو امام کے پیچھے سہو ہو جائے اس پر کچھ نہیں ہے۔ امام ان کیلئے کافی ہے۔

ابراہیم سے روایت ہے فرمایا جب امام کو سہو ہو جائے اور وہ دو سجدے کرے تو تم بھی ان کے ساتھ سجدہ کرو اگر انہوں نے سجدہ نہیں کیا تو تمہارے اوپر کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے اور فرمایا ہم اسی پر عمل کرتے ہیں اور یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

سہو کے دو سجدے فرض اور نفل میں ایک جیسے ہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی جب

نماز کیلئے کھڑا ہوتا ہے تو شیطان اس کے پاس آتا ہے اور اس کو بھلا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کو معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی رکعتیں پڑھیں اور تمہارے لئے یہ واجب ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں دو سجدے کرو۔

خلاصہ

کسی کو معلوم نہ ہو کہ اس نے نماز میں کتنی رکعتیں پڑھ لی ہیں اور یہ اس کو پہلی مرتبہ ہوا س کو شک ہو گیا بالغ ہونے کے بعد تو نماز کو دھرالے اگر اس کو اکثر شک ہوتا رہتا ہے تو غالب گمان پر عمل کرلے اگر اس کا کوئی گمان ہے۔ اور درستگی نماز کیلئے تحری یعنی سوچ و بچار کرے اگر اس کو گمان بھی نہیں ہے تو یقین پر بنا کرے جب وہ بنا کرے نماز کے اختتام کے احتمال سے ہر اس جگہ پر قعدہ کرے جہاں پر احتمال ہے یہ خوف کرتے ہوئے کہ کہیں قعدہ اخیرہ فوت نہ ہو۔

اور سجدہ سہو نماز میں کمی اور زیادتی کو پورا کرنے کیلئے نماز کے بعد واجب ہے پھر تشہد پڑھے پھر سلام پھیرے اگر سلام سے پہلے بھی سجدہ کرے تو جائز ہے لیکن سلام کے بعد سجدہ کرنا بہتر ہے اور دائیں طرف ایک سلام پر اکتفا کرے ایک قول ضعیف یہ بھی ہے کہ دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد سجدہ کرنا بھی صحیح ہے پھر تکبیر کہے اور سجدہ کرے پھر تکبیر کہے اور اپنے سر کو اٹھائے پھر تکبیر کہے دوسرا سجدہ کرے پھر سر اٹھائے پھر تشہد پڑھے اور دعا کرے اور سلام پھیرے۔

سجدہ سہوا ایسے رکن کے ترک پر واجب ہوتا ہے جو شریعت میں واجب کی حیثیت سے ہو۔ جیسے قعدہ اولیٰ یا قرأت فاتحہ کو ترک کر دیا یا قنوت کو یا قنوت کی تکبیر کو ترک کر دیا یا کسی قعدہ میں تشہد پڑھنا ترک کرے یا عیدین کی تکبیریں ترک کرے یا خفی نمازوں میں امام جہر کرے یا خفی کرے جہاں جہر ہے اس قدر کہ جس سے نماز جائز ہے اور ان دونوں میں سجدہ سہو کے وجوب میں اختلاف ہے امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق سہو کے سجدے تین ہیں اور صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور ناطفی وجوب سہو کی طرف گیا ہے امام کی بھول مقتدی پر بھی سجدہ واجب کرتی ہے اگر امام سجدہ نہ کرے تو مقتدی بھی سجدہ نہ کرے اگر مقتدی کو سہو ہو گئی تو امام اور مقتدی دونوں پر سجدے لازم نہیں ہونگے اگر کوئی قعدہ اولیٰ بھول گیا پھر اس کو یاد آیا اس حال میں کہ وہ قعدہ کے زیادہ قریب تھا تو نہ لوٹے اور سجدہ سہو کرے۔

اگر کوئی قعدہ اخیرہ بھول جائے پانچویں رکعت کی طرف لوٹ گئے تو قعدہ کی طرف لوٹ جائے نہ ہی سجدہ کرے اور پانچویں رکعت کو ضائع کرے اگر پانچویں رکعت کو سجدہ کے ساتھ مقید کیا تو اس کا فرض باطل ہو جائے گا اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کی یہ نماز

نفل میں تبدیل ہو جائے گی اور اس کے اوپر لازم ہے وہ ایک رکعت چھٹی بھی اس کے ساتھ ملا دے بطور نفل اس لئے کہ نفل ایک رکعت نہیں ہوتی ایک رکعت اس کے ساتھ نہ ملائے تو اس پر کچھ بھی نہیں ہے اور سجدہ سہو بھی نہ کرے اگر وہ چوتھی رکعت کے بعد قدر تشہد بیٹھ گیا پھر پانچویں کی طرف اٹھ گیا اور سلام نہیں پھیرا اس لئے کہ وہ یہ گمان کرتا تھا یہ قعدہ اولیٰ ہے تو مستحب ہے کہ وہ لوٹ آئے قعدہ کی طرف اور اس کو چاہئے کہ بیٹھنے کی حالت میں بغیر اعادہ تشہد کے سلام پھیر لے اگر کھڑے کھڑے ہی سلام پھیرے تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی اور وہ سنت کا تارک ہوگا۔ اس لئے کہ بیٹھ کر سلام پھیرنا سنت ہے اگر اس نے پانچویں رکعت کو سجدے کے ساتھ مقید کر دیا تو مستحب یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک اور رکعت ملائے گا نفل کے ایک رکعت ہونے کی کراہت سے بچنے کیلئے اس کی نماز تو مکمل ہوگئی اور اس کی دو رکعت زائد نماز میں نفل شمار ہونگے اور سجدہ کرے گا سجدہ سہو۔ سلام کی اپنے جگہ سے تاخیر کی وجہ سے۔

باب سجدۃ التلاوۃ

قرآن مجید میں آیات سجدہ

(۱) سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّکَ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَ یُسَبِّحُوْنَہٗ وَ لَہٗ یَسْجُدُوْنَ" [1] جولوگ تیرے رب کے پاس ہیں اس کی بندگی سے بڑائی نہیں رکھتے اس کی پاک ذات کو یاد کرتے ہیں اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

(۲) سورۃ رعد میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ ظِلٰلُھُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ" [2] جو آسمان وزمین میں ہے اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے اور صبح وشام ان کے سائے بھی۔

(۳) سورہ نحل میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ لِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَ ھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ" [3] جو زمین اور آسمانوں میں ہیں جاندار اور فرشتے سب اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔

(۴) سورۃ اسراء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْھِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًاo وَ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًاo وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَ یَزِیْدُھُمْ خُشُوْعًاo" [4]
بے شک وہ لوگ جنہیں اس لئے پہلے علم دیا گیا ہے جب ان پر پڑھا جاتا ہے تو ٹھوڑیوں پر سجدے میں گرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک ہے بے شک ہمارے رب کا وعدہ ہو کر ہی رہے گا اور ٹھوڑیوں پر روتے ہوئے گرتے ہیں اور ان میں عاجزی زیادہ کر دیتا ہے۔

(۵) سورۃ مریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ بُکِیًّا" [5] جب ان پر اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو روتے ہوئے سجدہ میں گرتے ہیں۔

(۶) سورہ حج میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ

---

[1] [الاعراف: ۹] [2] [الرعد: ۱۳] [3] [النحل: ۱۴]

[4] [بنی اسرائیل: ۱۰۷ تا ۱۰۹] [5] [مریم: ۵۸]

كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ط وَ كَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ط وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ط اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ"[1] کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جوکوئی آسمانوں میں ہے اور جوکوئی زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چار پائے اور بہت سے آدمی اللہ ہی کیلئے سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے ہیں کہ جن پر عذاب مقرر ہو چکا ہے اور جسے اللہ ذلیل کرتا ہے۔ پھر اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

(۷) سورۃ فرقان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَ مَا الرَّحْمٰنُ ق اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا"[2] اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے ہم اسے سجدہ کرتے جس کیلئے تو کہہ دے اور اس سے انہیں اور زیادہ نفرت ہوتی ہے۔

(۸) سورۃ نمل اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اَلَّا يَسْجُدُوْ لِلّٰهِ الَّذِىْ يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ ٥ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ٥"[3] اللہ ہی کو کیوں نہ سجدہ کرے جو آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو سب کو جانتا ہے اللہ ہی ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔

(۹) سورۃ السجدۃ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْبِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ"[4] بس ہماری آیتوں پر وہ ایمان لاتے ہیں جب انہیں وہ یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں

(۱۰) اور سورۃ ص میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَ خَرَّ رَاكِعًا وَّ اَنَابَ ٥ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ط وَ اِنَّ لَهٗ عِنْدَ نَا لَزُلْفٰى وَ حُسْنَ مَاٰبٍ"[5] پھر اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر پڑا اور ہم نے اس کی غلطی معاف کر دی اور اس کیلئے ہمارے ہاں مرتبہ اور ٹھکانہ ہے۔

---

[1] [الحج: ۱۸] [2] [الفرقان: ۶۰] [3] [النمل: ۲۵-۲۶]

[4] [السجدہ: ۱۵] [5] [ص: ۲۵]

(۱۱) سورۃ حم السجدہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَ لَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِیْنَ عِنْدَ رَبِّكَ یُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَ هُمْ لَا یَسْئَمُوْنَ"[1] اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں سورج کو سجدہ نہ کرو اور نہ چاند کو اور اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے انہیں پیدا کیا ہے اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو پھر اگر وہ تکبر کریں تو وہ لوگ جو آپ کے رب کے پاس ہیں دن رات اس کی تسبیح کرتے ہیں اور تھکتے نہیں۔

(۱۲) سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا"[2] پس اللہ کے آگے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو۔

(۱۳) سورۃ انشقاق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ اِذَا قُرِئَ عَلَیْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا یَسْجُدُوْنَ"[3] اور جب ان پر قرآن پڑھا جائے تو وہ سجدہ نہیں کرتے۔

(۱۴) سورۃ العلق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "كَلَّا لَا تُطِعْهُ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ"[4] ہرگز ایسا نہیں چاہتے آپ اس کا کہنا نہ مانیئے اور سجدہ کیجئے اور قرب حاصل کیجئے۔

بے شک سجدوں کی بڑی فضیلت ہے جس کی طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رغبت دلائی۔ کثیر بن مرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ کثرت سے سجدہ کیا کرو بے شک کوئی بندہ اللہ کیلئے ایک سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بلند فرماتا ہے۔ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جب ابن آدم آیت سجدہ پڑھتا ہے اور سجدہ کرتا ہے تو شیطان روتے ہوئے بھاگتا ہے اور کہتا ہے "اے میری بربادی اس کو سجدے کا حکم دیا گیا اس نے سجدہ کیا اور اس کو جنت مل گئی اور مجھے سجدے کا حکم دیا گیا میں نے نافرمانی کی اور میرے لئے دوزخ ہے"

سجدہ تلاوت، آیت سجدہ تلاوت کرنے والے اور سننے والے پر واجب ہے۔ نماز میں بھی اور نماز سے باہر بھی علانیہ طور پر بھی اور سری طور پر بھی، حضرت نافعؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے سال آیت سجدہ کی تلاوت کی اور لوگوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساتھ سجدہ کیا۔ ان میں سے سوار بھی تھے اور زمین پر سجدہ کرنے والے بھی تھے۔ یہاں تک کہ سواروں نے اپنے ہاتھوں پر سجدے کئے اور حضرت نافعؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا

---

[1] [حم السجدۃ: ۳۷۔۳۸]
[2] [النجم: ۶۲]
[3] [الانشقاق: ۲۱]
[4] [العلق: ۱۹]

ہے کہا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن پڑھا اور بسا اوقات آیتِ سجدہ کی تلاوت فرماتے تھے تو ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سجدہ کرتے تھے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے سجدے رسول اللہ کے سجود کے ساتھ نماز سے باہر سنت عزیزہ ہے۔ طارق بن عبدالرحمنؒ سعید بن المسیبؒ سے روایت کرتے ہیں فرمایا کہ بے شک سجدہ سننے والے پر لازم ہے اور بخاری نے روایت کیا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سجدہ ان لوگوں پر ہے جن کو سنایا گیا۔ نافعؒ نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ سورتیں تلاوت فرماتے جہاں پر سجدے ہوتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ کرتے ہم بھی سجدہ کرتے یہاں تک کہ زمین پر پیشانی رکھنے کی جگہ نہ ملتی اور ابو مجلزؒ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کی نماز میں سجدہ کیا پھر کھڑے ہو گئے تو معلوم ہو گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی سورت کی تلاوت فرمائی جس میں سجدہ تھا۔

صٓ کا سجدہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''ص'' عزائم السجود میں سے نہیں ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''ص'' میں سجدہ کرتے دیکھا۔ حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منبر پر ''ص'' تلاوت فرمائی جب سجدے پر پہنچے تو نیچے اتر کر سجدہ کیا۔ لوگوں نے بھی آپؐ کے ساتھ سجدہ کیا اس کے بعد ایک اور دن میں اس کی تلاوت فرمائی جب آیت سجدہ پر پہنچے تو لوگ سجدہ کرنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ تو صرف ایک نبی کی توجہ ہے لیکن میں نے تمہیں سجدے کیلئے تیار ہوتے دیکھا ہے منبر سے نیچے اترے سجدہ کیا لوگ آپؐ کے ساتھ شامل سجدہ ہوئے۔[1]

اذا السماء انشقت کا سجدہ

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ''اذا السماء انشقت'' تلاوت فرمائی۔ اس میں سجدہ کیا میں نے کہا: ابو ہریرۃ؟ آپ اس پر کیوں سجدہ کر رہے ہیں؟ کہنے لگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اگر اس میں سجدہ کرتے نہ دیکھتا تو میں سجدہ نہ کرتا۔[2]

سجدہ تلاوت نماز کا حصہ ہے

اس کے لئے وہی شرائط ہیں جو نماز کیلئے ہیں چنانچہ اس کے لئے طہارت شرط ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نہ سجدہ کرے انسان مگر پاکی کی حالت میں اور سجدہ کرتے وقت قبلہ رو ہونا

---

۱ [بخاری ۲۱۲] ۲ [ابوداؤد ۲ص ۵۹]

ضروری ہے۔

سجدہ تلاوت دو تکبیروں کے درمیان بغیر سلام کے ادا ہوتا ہے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سجدہ تلاوت کے بعد سلام نہیں ہے، البتہ سجدہ میں جاتے وقت اور اٹھتے وقت تکبیر ہے۔

سجدہ تلاوت کیلئے کھڑا ہونا

حضرت ام سلمہ الازدی کہتی ہیں: میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا وہ قرآن پاک میں دیکھ کر تلاوت کر رہی تھیں جب آیت سجدہ تلاوت کرتیں تو کھڑی ہو جاتیں اور سجدہ کرتیں ہے[1]

سجدے میں کیا پڑھے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے گزشتہ رات خواب دیکھا، گویا میں ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہوں اور آیت سجدہ تلاوت کر کے سجدہ کر لیا۔ میں نے دیکھا درخت نے بھی میرے ساتھ سجدہ کر لیا اور سجدے میں اس کو یہ کہتے ہوئے سنا ''اے اللہ! اپنے ہاں میرے لئے اجر لکھ دیجئے، اس کو میرے لئے ذخیرہ بنا دیجئے، اس کی برکت سے میرا بوجھ ہٹا دیجئے، اس کو مجھ سے قبول فرما جس طرح آپ نے اپنے بندے داؤد کا سجدہ قبول فرمایا۔

ابن عباس کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے آیت سجدہ تلاوت فرمائی اور میں نے سنا آپؐ نے سجدے میں انہی الفاظ سے دعا فرمائی جن کو اس شخص نے درخت کے حوالے سے بیان کیا تھا[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رات کے وقت سجدہ تلاوت یوں فرمایا کرتے، **''سجدوجھی للذی خلقہ، وشق سمعہ وبصرہ بحولہ و قوتہ فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین**[3]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ایک رات آپؐ میرے ہاں تشریف فرما تھے میں نے آپؐ کو نہ پایا تو میں نے خیال کیا کہ اپنی کسی زوجہ کے پاس گئے ہوں گے۔ میں نے ہاتھ سے آس پاس ٹٹولنا بھی شروع کر دیا۔ تو میں نے دیکھا کہ آپؐ سجدے میں ہیں اور فرما رہے ہیں۔ **اللّٰھم اغفرلی**

---

[1] [سنن بیہقی ۲ص ۳۲۶] [2] [سنن بیہقی ۲ص ۳۲۶] [3] [سنن بیہقی ۲ص ۳۲]

ماسررت وما اعلنت" اے اللہ! مجھے معاف کر دیجئے جو میں نے چھپا کر عمل کیا اور جو سب کے سامنے کیا۔"

سابق میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اگر امام آیت سجدہ تلاوت کرے تو وہ بھی سجدہ کریگا اور مقتدی بھی۔ اگر ایسا شخص سنے جو نماز میں شریک نہ ہو اس پر سجدہ کرنا لازمی ہے اور کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے مگر امام کے ساتھ نہیں انفرادی طور پر پڑھ رہا ہے اور وہ اس کو سنے، تو نماز کے بعد سجدہ کرے۔ جو نماز میں آیت سجدہ تلاوت کرے اور نماز میں سجدہ نہ کرے تو بعد میں سجدہ کرنا لازمی نہیں ہے۔ ایک جگہ آیت سجدہ کو مکرر پڑھنے والے کیلئے ایک ہی سجدہ کافی ہے۔ سجدہ واجب ہونے کی صورت میں حرج ہوگا۔ جبکہ اس کے تکرار کی ضرورت پڑھنے پڑھانے والوں کو ہوتی ہے۔ اگر ہر بار پڑھنے پر سجدہ واجب ہو تو ان کے لئے حرج عظیم ہوگا۔ حضرت جبریل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سناتے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ہی سجدہ ادا فرماتے مگر شرط یہ ہے کہ ایک ہی آیت ہو اور ایک ہی مجلس ہو۔ اگر مختلف آیات سجدہ پڑھے۔ یا ایک آیت سجدہ کو مختلف مجلسوں میں پڑھے تو ایک سجدہ کافی نہیں ہوگا بلکہ ہر آیت اور ہر مجلس کیلئے علیحدہ سجدہ کرنا ضروری ہوگا۔

نماز کی قرأت کے آخر میں آیت سجدہ پڑھنا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر آیت سجدہ آخر سورۃ میں ہو چاہے اس پر رکوع کرے۔ چاہے سجدہ کرے۔[1] اور اگر سجدہ کرے تو اٹھ کر رکوع کر کے پھر نماز کیلئے سجدہ کریگا اور نماز کے رکوع یا سجود میں اس کی نیت کرنے سے بھی ادا ہوتا ہے۔

بیمار کی نماز کا حکم

مریض اگر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے اور رکوع وسجود کرے۔ اگر رکوع اور سجود کرنے پر قادر نہ ہو تو سر کے اشارے سے رکوع وسجدہ کرے۔ البتہ سجدے کے اشارے کو رکوع کے اشارے سے پست کرے۔ کیوں کہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیٹھ کر نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کھڑے ہو کر نماز پڑھنا افضل ہے۔ جو بیٹھ کر پڑھے گا اس کو نصف اجر ملے گا اور لیٹ کر پڑھے گا۔ اس کو بیٹھ کر پڑھی گئی نماز کے ثواب کا آدھا حصہ ملے گا۔ ایک روایت میں ہے وہ فرماتے ہیں: مجھے بواسیر کی بیماری تھی میں

---

[1] [بیہقی ج۲ص۳۲۳]

نے نماز کے متعلق آنحضرت ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیا کرو، اگر کھڑا نہیں ہوا جاتا تو بیٹھ کر پڑھو، اگر اس کی بھی گنجائش نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹ کر پڑھو۔[۱]

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جب ہم مدینہ آئے تو مدینہ کی گرمی کی وجہ سے ہم سخت وباء میں مبتلا ہو گئے، آپ ﷺ نے صحابہ کو دیکھا کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں تو ارشاد فرمایا: "صلاة القاعد مثل نصف صلاة القائم"[۲] اس طرح بیٹھنا اس کے لئے دشوار ہو تو جس طرح چاہے بیٹھے، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور ﷺ کو تربع کی حالت میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر دعا مانگتے دیکھا ہے۔

اگر رکوع اور سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو تو سر کے اشارے سے رکوع وسجدہ کریگا۔ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ ایک مرتبہ ایک بیمار کی عیادت کیلئے تشریف لے گئے، اس کو اپنے تکیے پر سجدہ کرتے دیکھا تو تکیہ اٹھوا دیا۔ پھر اس نے نماز پڑھنے کیلئے لکڑی لی تو رسول ﷺ نے اس کو اٹھا کر پھینک دیا اور فرمایا: "صل علی الارض ان استطعت، والا فاومی ایماءً واجعل سجودک اخفض من رکوعک" ترجمہ: "اگر گنجائش ہو تو زمین پر نماز پڑھنا ورنہ اشارے سے پڑھنا، سجدہ کے اشارے کو رکوع سے نیچے کر لینا۔

بیمار سجدہ کیلئے کسی چیز کو اپنے چہرے کی طرف نہیں اٹھائے گا۔ جیسا کہ اوپر حدیث سے آپ کو معلوم ہو گیا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی فرماتے ہیں۔ مریض اگر سجدہ کرنے پر قادر نہ ہو تو سر کے اشارے سے سجدہ کرے، سجدہ کرنے کیلئے کسی چیز کو اپنے چہرے کی طرف نہیں اٹھائے گا۔[۳]

اس سے واضح ہو گیا اگر کوئی شخص رکوع پر قادر ہو اور سجدہ سے عاجز ہو تو اشارے سے سجدہ کر سکتا ہے۔ اگر بیٹھ کر پڑھنے پر قادر نہ ہو تو دائیں پہلو پر لیٹ کر پڑھ سکتا ہے۔ کیوں کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے بیمار شخص اگر کھڑے ہونے کی طاقت رکھتا ہو تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ لے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھے اگر رکوع اور سجود پر قادر نہ ہو تو اشارہ سے رکوع وسجود کرے۔ سجدے کے اشارے کو رکوع کے اشارہ سے تھوڑا سا پست کرے۔ اگر بیٹھ کر پڑھنے کی سکت نہ ہو تو قبلہ رو ہو کر دائیں کروٹ پر لیٹ کر پڑھے۔ اگر دائیں پہلو کے بل لیٹ کر نہیں پڑھ سکتا تو چت لیٹ کر پڑھے اور پیر اس کے قبلہ کی جانب ہوں۔[۴]

---

۱ [صحیح بخاری ۲۱۹]
۲ [الموطا ص ۱۱۹]
۳ [بیہقی ۲ ص ۳۰۸]
۴ [بیہقی ۲ ص ۳۰۶]

تنبیہ

جن احادیث میں فرمایا گیا کہ قاعد کی نماز قائم کی نماز سے اجر کے لحاظ سے نصف ہے۔
وہ احادیث اس نفل پڑھنے والے کے متعلق ہیں جو کھڑا ہونے پر قدرت رکھنے کے باوجود بیٹھ کر پڑھتا ہو اور کھڑے ہونے پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر فرض نماز جائز ہی نہیں ہوگی اور مریض جو کھڑا نہیں ہو سکتا بیٹھ کر پڑھ لے اس کو پورا پورا اجر ملے گا۔ حدیث شریف میں حضور ﷺ کا فرمان منقول ہے انسان جب بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو حکم فرماتا ہے کہ میرے بندے کے یومیہ معمولات کو پورا پورا لکھ دو۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انسان بیماری کی وجہ سے نیک اعمال کو انجام نہیں دے سکتا جن کو وہ حالت صحت میں کیا کرتا تھا اس میں کمی نہ کی جائے لہٰذا جو مریض بیماری کی وجہ سے کھڑے ہو کر نماز فرض ادا نہیں کر سکتا بیٹھ کر نماز پڑھ لے یا اشارے سے پڑھ لے تو اس کو کھڑے ہو کر رکوع و سجود کرنے والے کی طرح ہی اجر و ثواب ملے گا۔

تہجد کا پابند شخص اگر سفر کی وجہ سے تہجد ادا نہ کر سکا تو اس کو تہجد پڑھنے کا ثواب ملے گا کیوں کہ حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے جو بندہ بیمار ہو جائے یا مسافر ہو جائے تو اس کو صحت و اقامت کے اعمال کے ثواب ملیں گے۔[1]

اور اگر سر کے اشارہ سے نماز پڑھنے پر قادر نہیں ہے تو نماز مؤخر ہو جاتی ہے۔ آنکھ بھنوؤں اور دل کے اشارے سے پڑھنا درست نہیں۔

اور اس عذر کی وجہ سے فوت شدہ نمازوں کی تعداد چھ سے متجاوز ہو جائیں تو ان کی قضاء بھی لازم نہیں ہوتی۔ کیوں کہ اس صورت میں حرج ہوگا اسی طرح بے ہوشی کی وجہ سے پانچ سے کم نمازیں قضاء ہو جائیں تو ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر چھ سے زیادہ ہو جائیں تو ان کی بھی قضاء نہیں ہے۔ قیام پر قادر ہو کر رکوع سجود پر قادر نہ ہو تو قیام لازم نہیں ہوگا۔ بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھنا اس کیلئے جائز ہوگا اگر تندرست شخص کچھ نماز قیام، رکوع اور سجود کے ساتھ ادا کرنے کے بعد عذر لاحق ہونے کی وجہ سے بیٹھ کر مکمل کر لے یا لیٹ کر ادا کرے تو جائز ہے۔

اگر بیمار شخص بیٹھ کر رکوع و سجود کے ساتھ ادا کرنے لگا، نماز کے درمیان کھڑا ہونے پر قادر ہوا تو بقیہ نماز کھڑا ہو کر ادا کرے۔ اگر نماز اشارے کے ساتھ پڑھنا شروع کی تھی پھر درمیان میں

---

[1] صحیح بخاری ج۱ص ۴۲۰

رکوع وسجدہ کرنے پر قادر ہوا تو نماز کو از سر نو لوٹائے گا۔ اس پر بنا نہیں کرے گا کیوں کہ اس صورت میں بناء القوی علی الضعیف لازم آئے گا۔

یوم جمعہ کی فضیلت

یوم جمعہ کی فضیلت کے متعلق حضور ﷺ کا ارشاد ہے، جمعہ سید الایام ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں تمام دنوں سے معظم ہے۔ یوم الفطر اور یوم الاضحیٰ سے بھی زیادہ معظم ومحترم ہے۔ اس کی پانچ خصوصیتیں ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے اس دن حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔

(۲) جمعہ ہی کے دن ان کو زمین پر اتارا۔

(۳) اسی دن آدم علیہ السلام کی وفات ہوئی۔

(۴) اس دن ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ اس میں انسان جو بھی دعا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو ضرور قبول فرماتے ہیں بشرطیکہ وہ حرام نہ ہو۔

(۵) جمعہ کے دن قیامت قائم ہوگی تمام ملائکہ مقربین، آسمان، زمین، ہوا، پہاڑ اور دریا سبھی جمعہ کے دن سے خوف زدہ ہیں [۱]۔

ایک روایت میں ارشاد نبوی ہے۔ جمعہ تمام دنوں سے بہترین دن ہے۔ اس دن آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اسی دن جنت میں داخل کئے گئے اور جمعہ کے دن جنت سے نکالے گئے اور قیامت جمعہ کے دن ہی قائم ہو جائیگی [۲]۔

حضرت اوس بن اوس الثقفی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تمہارے ایام میں جمعہ افضل ترین دن ہے۔ اس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا، اسی میں ان کا انتقال ہو گیا، اسی دن صور پھونکا جائیگا، جمعہ کے دن مجھ پر زیادہ درود بھیجا کرو کیوں کہ تمہارے درود میرے سامنے پیش کئے جاتے ہیں۔

صحابہؓ نے عرض کیا: ہمارے درود آپ کے سامنے کس طرح پیش کئے جائیں گے جب کہ آپ مٹی ہو چکے ہوں گے؟ تو فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کرام کے اجساد کو حرام فرمایا ہے [۳]۔

جمعہ کے دن کیلئے امت محمدیہ کی رہنمائی

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ ہم آخری زمانہ میں آنے والے ہیں لیکن قیامت کے

---

[۱] [الفتح الربانی ۶ ص ۳] [۲] [مسلم: ۲ ص ۵۸۵] [۳] [الفتح الربانی ۶ ص ۳]

روز سب پر سبقت لے جانے والے ہوں گے۔ اگرچہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر یہ دن ان پر مقرر کیا گیا ان کا اس بارے میں اختلاف ہو گیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں سمجھا دیا۔ اس میں لوگ ہمارے تابع ہیں یہود کل اور نصاری پرسوں۔

غسل جمعہ کا حکم

حضور ﷺ کا ارشاد ہے "من اتی الجمعة فلیغتسل"[۱] "جمعہ کی نماز کیلئے آنے والے کو چاہئے کہ غسل کرے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: "غسل جمعہ ہر بالغ پر واجب ہے۔"

ایک اور ارشاد مبارک ہے، "اغتسلوا یوم الجمعة ولو کأسًا بدینارٍ"[۲] ترجمہ: "جمعہ کیلئے غسل کیا کرو اگرچہ ایک گلاس پانی ایک دینار کے بدلے ملے"

حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا یہ قول نقل کرتے ہیں: "من توضأ یوم الجمعة فبها ونعمت ومن اغتسل فالغسل افضل"[۳]

حضرت حماد بن ابی سلیمان رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: میں نے ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے جمعہ کے دن غسل کے متعلق سچھنے لگانے کے بعد غسل اور عیدین کیلئے غسل کے متعلق پوچھا تو فرمایا: غسل کرنا اچھا ہے اگر نہ بھی کرے تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ تو میں نے عرض کیا کیا رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان نہیں ہے، "من راح الی الجمعة فلیغتسل" جو جمعہ کیلئے آئے اسے چاہئے کہ غسل کر کے آئے" فرمایا: ہاں آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے لیکن یہ امور واجبہ میں سے نہیں ہے۔ یعنی یہ امر وجوب کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ فرمان الٰہی "وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَایَعْتُمْ" کے امر کی طرح ہے لہٰذا اگر بیع کے وقت گواہ مقرر کر لیا تو بہتر ہے۔ اگر نہیں کیا تو کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح فرمان تعالیٰ "فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ"[۴] "جب جماعت ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ" تو جو نماز کے بعد منتشر ہو جائے درست ہے اور جو اپنی جگہ پر بیٹھ جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔[۵]

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ایک دفعہ ہم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے جمعہ کا وقت ہوا، انہوں نے پانی منگوا کر وضو کیا۔ کسی نے پوچھا آپ نے غسل نہیں کیا؟ تو فرمایا: آج زیادہ ٹھنڈ ہے۔[۶]

---

۱ [المستدرک: ۱/۸،۲۷۰] ۲ [بخاری: ۱۷۴] ۳ [جامع الرضوی اص ۵۱۸]

۴ [جمعہ: ۱۰] ۵ [الموطا: اص ۹۵] ۶ [الجامع الرضوی اص ۵۱۸]

غسل یوم الجمعہ کی فضیلت

حضرت ابوایوبؓ کہتے ہیں، میں نے جمعہ کے دن حضور ﷺ کوفرماتے ہوئے سنا جس شخص نے جمعہ کے دن غسل کیا، خوشبو لگائی اور اچھے کپڑے پہن کر مسجد میں آیا اور لوگوں کی گردنوں کو پھلانگ کر آگے نہ گیا اور خاموشی سے خطبہ سنا تو پچھلے جمعہ سے اس جمعہ تک کے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کا ایک اور ارشاد نقل فرماتے ہیں ترجمہ: ''جو شخص غسل کر کے جمعہ پڑھنے کیلئے مسجد میں آیا اپنے مقدر کے مطابق نماز پڑھی پھر امام کے خطبے کے اختتام تک خاموش سنتا رہا پھر امام کے ساتھ نماز پڑھی دوسرے اور اس جمعہ اور اس کے اوپر تین دن کے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔[2]

جمعہ کے دن خوشبو لگانا

ارشاد نبوی ہے ''غسل یوم الجمعه علی کل محتلم ومسواک ویمس من الطیب ماقدر علیه''[3] جمعہ کا غسل ہر بالغ پر ضروری ہے مسواک اور ملنے پر خوشبو بھی لگانا چاہئے۔

نماز جمعہ کیلئے عمامہ باندھنا

حضرت عمر بن حریثؓ کہتے ہیں: آپ ﷺ نے کالے رنگ کا عمامہ باندھ کر خطبہ دیا۔ ایک روایت میں ہے۔ گویا میں منبر پر رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں اور آپ ﷺ نے کالے رنگ کا عمامہ باندھا ہوا ہے اور اس کے شملے کو اپنے دونوں شانوں کے درمیان ڈالا ہوا ہے۔

جمعہ کے سفر کا حکم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے عبداللہ ابن رواحہؓ کو ایک سریہ کیلئے بھیجا۔ اتفاق سے وہ دن جمعہ کا تھا۔ ان کے ساتھی چلے گئے، وہ یہ سوچ کر کہ آج جمعہ کا دن ہے۔ جمعہ حضور ﷺ کے پیچھے پڑھ کر جاؤں گا پیچھے رہ گئے، چنانچہ جمعہ حضور ﷺ کے ساتھ پڑھا، حضورؐ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: اپنے ساتھیوں کے ساتھ کیوں نہیں گئے؟ کہا: میں نے چاہا کہ آپ کے ساتھ جمعہ پڑھ کر نکل جاؤں گا اور ساتھیوں کے ساتھ مل جاؤں گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم زمین کی

---

[1] [معجم الطبرانی: ۴/ص۱۶۱] [2] [مسلم ۲/۵۸۷] [3] [مسلم: ۲/۵۸۱]

ساری چیزوں کو بھی خرچ کر ڈالو گے ان کے صبح کے وقت چلنے کے ثواب کو نہیں پہنچ سکو گے۔[1]

جمعہ کے دن زوال سے پہلے سفر کی طرف روانہ ہونا مکروہ نہیں ہے۔ زوال کے بعد جمعہ کی نماز پڑھنے سے پہلے سفر پر جانا مکروہ تحریمی ہے۔

ترکِ جمعہ پر وعید

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص ہلکا سمجھ کر تین جمعے مسلسل ترک کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیگا۔[2]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو برسر منبر فرماتے ہوئے سنا "**لينتهين اقوام عن ودعهم الجمعات، او ليختمنّ اللّٰه على قلوبهم، ثم ليكوننّ من الغافلين**"[3] لوگ ترک جمعہ سے باز آجائیں ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر مہر ثبت فرمادیں گے پھر وہ غافل بن جائیں گے۔

ایک اور ارشاد ہے "**من ترک جمعة فی غیر عذر فلیتصدق بدینار، فان لم یجد فبنصف دینار!**"[4] جو شخص بلا عذر جمعہ کی نماز چھوڑے تو اس کو چاہئے کہ ایک دینار صدقہ دے۔ ایک دینار نہیں دے سکتا تو کم از کم نصف دینار صدقہ کرے۔

کن لوگوں پر جمعہ واجب نہیں

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: چار قسم کے افراد پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ (۱) عورت (۲) غلام (۳) مریض (۴) مسافر۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کتاب الآثار میں نقل فرمایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اس کو اختیار فرمایا: "اگر یہ لوگ جمعہ پڑھ لیں تو جائز ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ پڑھنا واجب ہے الا یہ کہ غلام، عورت، بچہ، اور مریض ہو۔[5]

جمعہ کیلئے اول وقت میں جانے کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: جو شخص غسل کر کے جمعہ کی طرف (اول وقت میں) جائے گویا اس نے اونٹ صدقہ کیا اگر دوسرے وقت میں جائے تو گائے، تیسرے وقت میں جائے، تو

---

۱ [مسلم: ۲ص ۹۹۰] ۲ [مسلم: ۲ص ۵۹۱] ۳ [الفتح الربانی ۶ص ۲۴]

۴ [الفتح الربانی ۶ص ۲۴] ۵ [الجامع الرضوی ۱ص ۵۲۴]

مینڈھا، چوتھے وقت میں جائے تو مرغی اور پانچویں وقت میں جائے تو انڈہ صدقہ کرنے کے برابر ثواب پالے گا۔ جب امام خطبہ کیلئے منبر پر بیٹھ جائے تو فرشتے خطبہ سننے کے لئے حاضر ہوتے ہیں [1] (یعنی لکھنا بند کر دیتے ہیں)

جمعہ کی شرائط

شہر کے علاوہ کسی اور جگہ جمعہ نہیں ہوتا۔ شہر جامع ہر اس جگہ کو کہا جاتا ہے جس میں حکومت کا کوئی نائب، فیصلہ کرنے والا قاضی ہو جو احکامات دیتا ہو۔ اور وہ مقام بھی مصر جامع کے تحت داخل ہے جہاں شہر کی اذان پہنچ جاتی ہو۔ یعنی شہر کے قریب قریب علاقے۔ گاؤں میں جمعہ جائز نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مسجد نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین میں قریہ جواثی نامی علاقے میں عبدالقیس کی مسجد میں ادا کیا گیا۔[2] جواثی بحرین کے قلع کا نام سے موسوم ہے۔ وہ شہر ہے صاحب مبسوط نے فرمایا: جواثی بحرین کے ایک شہر کا نام ہے، جہاں تک حدیث میں "قریۃ جواثی" کہا گیا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ قرآن کریم کی آیت "وَ قَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ" [3] میں مکہ اور طائف کو قریہ کہا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مکہ و مدینہ کے درمیان بستیوں میں جمعہ کے بارے میں پوچھا گیا، تو فرمایا: اگر ان پر کوئی حکومتی ذمہ دار مقرر ہو تو ان کو چاہئے جمعہ پڑھ لیں۔

حضرت عطاء نے کہا ہے اگر بہت ساری بستیاں ایک دوسری سے ملی ہوئی ہوں تو وہ مل کر جمعہ ادا کریں۔[4]

حضرت ولید بن مسلم کہتے ہیں: میں نے لیث بن سعد رضی اللہ عنہ سے جمعہ فی القری کے متعلق پوچھا: تو انہوں نے فرمایا: ہر وہ شہر یا گاؤں جہاں حکومتی ذمہ دار (امیر) موجود ہو تو اس کو جمعہ پڑھنے کا حکم دیا جائیگا کہ وہ ان کو لیکر جمعہ کی نماز پڑھ لے۔ چنانچہ مدائن ساحل شہر ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے وہاں جمعہ پڑھنا شروع ہوا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم اور دور عثمانی میں ان کے حکم سے وہاں جمعہ ہوتا رہا تھا۔ حضرات صحابہ کی کثیر تعداد وہاں موجود تھی۔[5]

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے عدی بن عدی الکندی کو لکھا: دیکھو ہر اس بستی پر امیر مقرر کرنا جس کے رہنے والے وہاں سے کہیں منتقل نہیں ہوتے ہوں۔ وہاں ہمیشہ کیلئے رہ رہے ہوں

---

[1] [المستدرک ا/ص ۲۸۸] [2] [صحیح بخاری: ۱۷۶] [3] [زخرف: ۳۱]

[4] [بیہقی: ۳/ص ۱۷۸] [5] [مصنف ابن ابی شیبہ]

اور اس کو یہ بھی حکم دینا کہ وہ ان کو لیکر جمعہ کی نماز پڑھے۔ لہٰذا کسی بستی میں امیر کے بغیر یا اس کے حکم کے بغیر جمعہ جائز نہیں کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جمعہ کی نماز، عید الضحیٰ، عید الفطر، ایک بڑے شہر کے علاوہ کسی اور جگہ میں نہیں ہوتی۔

جمعہ کا وقت

جمعہ کی صحت کی شرائط میں وقت بھی ہے۔

یہ اس کا وقت ظہر ہے۔ ظہر کے وقت کے بعد صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کی نماز زوال شمس کے بعد ادا فرماتے۔[۲]

حضرت انسؓ کی یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ اکثر اہل علم کا اجماع ہے کہ جمعہ کا وقت زوال شمس کے بعد ہے جو ظہر کی نماز کا وقت ہے۔

اگر جمعہ پڑھتے ہوئے وقت نکل جائے تو ظہر کی نماز کو قضاء کریں۔ جمعہ کو برقرار نہیں رکھا جائیگا۔

حضرت سلمہ بن اکوع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ہم جمعہ کی نماز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بعد از زوال ادا کرتے۔[۳]

خطیب کا خطبہ سے پہلے منبر پر بیٹھنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دینے کیلئے منبر پر چڑھتے تو خطبہ سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ جاتے۔ خطبہ جمعہ کی شرائط میں داخل ہے۔ چنانچہ نماز سے پہلے ایسے لوگوں کی موجودگی میں خطبہ دینا واجب ہے جن پر جمعہ واجب ہے اگرچہ اس وقت وہ لوگ نیند میں ہوں یا گونگے ہوں اگر بلا قصد جمعہ خطبہ دے یا جماعت کی حاضری کے بغیر دے، یا جمعہ کی نماز کے بعد دے، تو خطبہ جمعہ میں وہ شمار نہیں ہوگا۔ دو خطبے دینا سنت ہے کیوں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو خطبے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جب منبر پر چڑھتے تو خطبہ سے قبل تھوڑی دیر بیٹھ جاتے۔ پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے پھر بیٹھ جاتے پھر کھڑے ہو کر دوسرا خطبہ ارشاد فرماتے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو خطبے ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ جن میں قرآن پڑھتے اور لوگوں کو نصیحت فرماتے۔[۴]

---

۱ [مصنف ابن ابی شیبہ] ۲ [ترمذی: ۲ص ۷]

۳ [مسلم ۲ص ۵۸۸] ۴ [مسلم ۲ص ۵۸۸]

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر امام خطبہ میں صرف الحمد للہ، یالا الہ الا اللہ" کہہ لے، تب بھی جائز ہے۔ وہ آیت کریمہ "فاسعوا الی ذکر اللہ" سے استدلال کرتے ہیں اس میں مطلق ذکر کا حکم ہے۔ طویل یا قصیر کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ لہٰذا قلیل ذکر سے خطبہ کا وجوب ادا ہو جائیگا۔ دوسرا استدلال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عمل سے کرتے ہیں ایک مرتبہ انہوں نے منبر پر صرف "الحمد للہ" کہہ کر تھوڑی دیر ٹھہر کر نیچے اتر کر نماز پڑھائی۔ اور حضرات صاحبین رحمہما اللہ کہتے ہیں: خطبے کے صحیح ہونے کیلئے طویل ذکر ہونا چاہئے جیسے خطبہ کہا جائے اور اس کی کم از کم مقدار ان کے نزدیک التحیات کی بقدر ہے۔"

اگر خطبہ بیٹھ کر دیا، یا بغیر وضو کے خطبہ دیا یا دو خطبوں کے درمیان نہیں بیٹھا یا لوگوں کی طرف رخ نہیں کیا تو خطبہ ہو جائیگا۔ کیونکہ اصل مقصود حاصل ہو گیا۔ وہ ہے ذکر الٰہی اور وعظ۔ لیکن یہ عمل سنت کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہو گا۔ کیوں کہ مسنون طریقہ باوضو ہو کر، کھڑے ہونے کی حالت میں لوگوں کی طرف رخ کر کے خطبہ دینا ہے۔

لوگوں کی طرف رخ کر کے خطبہ دینا مستحب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف رخ کر کے خطبہ دیا کرتے تھے۔

خطبہ خاموش رہ کر سننا

حضرت عبداللہ بن سعید کہتے ہیں: میں نے حضرت سعید بن مصیب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: ایک شخص دوران خطبہ چھینکا، دوسرے نے چھینک کا جواب دیا: تو فرمانے لگے: اس سے کہدو آئندہ ایسا نہ کرے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو کتاب الآثار میں ذکر فرما کر لکھتے ہیں: ہم بھی اسی کے قائل ہیں کہ خطبہ نماز کی طرح ہے۔ اس میں نہ چھینک کا جواب دینا جائز ہے اور نہ سلام کا۔ یہی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ حضرت سعید بن مصیب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اس لئے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تم نے اپنے پاس والے کو امام کے خطبہ دیتے وقت "خاموش ہو جاؤ" بھی کہہ دیا تو تم نے لغو کام کیا۔[۲]

امام کا منبر پر بیٹھنا نفل نماز کو اور اس کا خطبہ شروع کرنا ہر کلام کو بند کرتا ہے۔ مگر صاحب ترتیب شخص کی کوئی نماز قضا ہو گئی ہو تو وہ دوران خطبہ اس کی قضاء کرنے لگے تو جائز ہے۔ اس لئے کہ ایسا نہ کرنے کی وجہ سے اس کی نماز جمعہ ہی نہیں ہوگی۔ خطبہ کے درمیان، امر بالمعروف، تسبیح، کھانا پینا، لکھنا، بولنا، چھینکنے والے کو جواب دینا، سلام کرنا و جواب دینا مکروہ ہے۔

---

[۱] [جمعہ:۹] [۲] [بخاری ۱۸۴]

حضور ﷺ کے نام مبارک آنے پر بآواز درود پڑھنا جائز نہیں ہے بلکہ دل دل میں آہستہ درود کہنا چاہئے۔اسی پر فتویٰ ہے۔اسی طرح لوگوں کیلئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا۔یا زور سے آمین کہنا، جائز نہیں ہے۔اگر ایسا کریں گے تو گناہگار ہوں گے۔یہی صحیح ہے اور فتویٰ بھی اسی پر ہے۔

جماعت میں حاضری

جمعہ کی نماز کے صحیح ہونے کیلئے جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی شرط ہے۔اس لئے کہ جمعہ مشتق ہی جماعت سے ہے۔حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جماعت کی مقدار امام کے علاوہ تین افراد ہیں جو اہل ہوں۔وہ فرماتے ہیں۔آیت کریمہ "فَاسْعَوْا" صیغہ جمع ہے اور جمع کا اقل عدد تین ہے۔اس لئے کم از کم تین افراد کا ہونا ضروری ہے اور تینوں ذکر کے اہل ہوں کیونکہ فرمایا گیا۔ "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ"

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے اچانک ایک قافلہ گندم لیکر نمودار ہوا تو لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور دوڑے۔حضور ﷺ کے ساتھ صرف بارہ افراد باقی رہ گئے۔تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔"وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَۃً اَوْ لَهْوَانِ انْفَضُّوْا اِلَیْهَا وَ تَرَکُوْکَ قَائِمًا"[1] "اور جب لوگ تجارت یا تماشا دیکھتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں۔

اور حضرات صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں: امام کے علاوہ دو آدمی بھی جماعت کے حکم میں ہیں ان سے بھی جمعہ منعقد ہوگا۔البتہ امام کے پہلی رکعت کے پہلے سجدے تک اس کے ساتھ ان کا برقرار رہنا ضروری ہے۔اگر امام کے سجدہ کرنے کے بعد یہ سارے بھاگ بھی جائیں تب بھی امام کی نماز جمعہ صحیح ہوگی۔جمعہ کی دو رکعتوں میں قرأت جہرا ہوگی۔یہی حضور ﷺ سے متواتر چلا آرہا ہے۔البتہ اس میں کوئی متعین سورۃ قرأت کرنا ضروری نہیں ہے۔

حضرت حمادؒ کہتے ہیں حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ جو اس وقت مسجد میں آگیا ہو جس وقت امام تشہد میں بیٹھا ہو۔تو وہ کیا کرے؟ تو فرمایا: تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑے ہو کر دو رکعت پڑھے گا۔اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں ذکر فرمایا ہے۔

حضرت ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں جو شخص امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شریک

---

[1] [جمعہ:۱۱]

ہو جائے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد دوسری رکعت کو اس کے ساتھ ملا کر نماز پوری کریگا۔

اگر امام کو تشہد میں پائے تو نماز میں شریک ہو کر دو رکعت پڑھ کر جمعہ کی نماز ادا کرے۔ یہ قول حضرت امام اعظمؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر دوسری رکعت کا اکثر حصہ امام کے ساتھ پایا تو جمعہ ہے ورنہ ظہر پڑھے۔ یعنی دوسری رکعت کے رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہو سکا تو ایک رکعت ملا کر جمعہ کو پورا کریگا۔ اگر امام کے دوسری رکعت کے رکوع سے اٹھنے کے بعد شریک ہوا تو چار پڑھے گا۔ مگر نیت دونوں میں بالاجماع جمعہ کی ہوگی۔ اسی کو کہا جائے گا کہ ''اس نے اپنی نیت کے خلاف نماز ادا کی''

مکبر مقرر کرنا

اگر امام کی آواز تمام لوگوں تک نہ پہنچ سکتی ہو تو امام کی تکبیرات آگے پہنچانے کیلئے مقتدیوں میں سے کسی کو مکبر مقرر کرنا جائز ہے۔ دلیل اس کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار ہوئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکبیر کو لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔[1]

مسافر، عورت، بیمار، غلام پر جمعہ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح اپاہج، نابینا، خائف اور دیہات والوں پر بھی واجب نہیں ہے۔ اگر یہ حضرات جمعہ کی نماز پڑھ لیں تو جائز ہے۔ اسی طرح مسافر اور مریض جمعہ کی امامت بھی کرا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان پر جمعہ کا واجب نہ ہونا ان پر حرج کو دور کرنے کیلئے بطور رخصت تھا اگر جمعہ میں حاضر ہو گئے تو ان پر فرض ہوگا۔

جو شخص جمعہ کے دن بلا عذر گھر میں ظہر کی نماز پڑھے تو اس نے ناجائز کام کا ارتکاب کیا۔ کیوں کہ اس نے ایک قطعی فرض کو ترک کر دیا۔ جواز اً تو نماز اس کی موقوف ہوگی۔ چنانچہ اگر جمعہ میں حاضر نہ ہونے کی گنجائش ہو اور جمعہ کی طرف چل پڑے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گھر سے نکلتے ہی اس کی نماز ظہر ختم ہو گئی اگر چہ وہ مسجد آ کر جمعہ کو نہ بھی پائے۔ اور حضرات صاحبین رحمہما اللہ کہتے ہیں۔ امام کے شریک ہونے کے بعد اس کے ظہر کی نماز (جو منفرداً گھر میں ادا کی تھی) باطل نہ ہو جائی گی۔ لیکن امام کے جمعہ پڑھانے کے بعد گھر سے چلا تو نماز ظہر باطل ہوگی۔ بالاتفاق۔

---

[1] [مسلم: ا ص ۳۰۹]

باب صلوٰۃ العید

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت اہل مدینہ کے ہاں دو دن خوشی منانے، کھیل کیلئے مقرر تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، زمانہ جاہلیت میں تمہارے دو دن کھیل کود کیلئے مقرر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دو دنوں کے بدلے ان سے بہتر دو دن تمہاری خوشی کیلئے مقرر فرمائے یعنی عید الضحیٰ اور عید الفطر کے دن۔[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: بقر عید کے دنوں میں ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میرے پاس تشریف لائے۔ اس وقت باندیاں دف بجا کر گا رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے چہرے مبارک پر کپڑا ڈال کر تشریف فرما تھے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے باندیوں کو ڈانٹ دیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چہرہ انور سے کپڑا اٹھا کر فرمایا: ابوبکر! ان کو رہنے دو یہ عید کے ایام ہیں۔[2]

بخاری کی ایک روایت کے مطابق وہ وقوفِ منیٰ کا دن تھا، ایک دوسری روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: عید الفطر یا عید الضحیٰ کے دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے پاس تشریف لائے اس وقت دو باندیاں یوم بعاث کا گانا گا رہی تھیں۔ حضرت تا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مزمار شیطان، یہ لفظ دو مرتبہ فرمایا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، چھوڑیئے ان کو ہر قوم کیلئے خوشی کا ایک دن ہوتا ہے۔ یہ ہماری عید ہے۔[3]

حضرت سید عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ایک مرتبہ حبشہ کے کچھ لوگ آئے جو عید کے دن مسجد میں کوئی جنگی کرتب دکھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بلایا۔ میں اپنا سر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانے پر رکھ کر ان کے کرتب کو دیکھتی رہی حتیٰ کہ میں خود واپس لوٹی۔ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہؓ فرمایا کرتی تھیں نوعمر بچیوں کی عمر کے مطابق ان کے ساتھ برتاؤ کرو۔

عیدین میں خوبصورت لباس پہننا

عیدین میں خوبصورت لباس زیب تن کرنا اور خوشبو لگانا سنت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ بازار میں کم خواب کا ایک جبہ فروخت ہو رہا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو خدمت نبوی میں پیش کیا اور کہا یا رسول اللہ! اس کو خرید کر عید کے ایام میں پہن لیا کیجئے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا: یہ لباس ان لوگوں کا ہے جن کا

---

[1] [بیہقی ج۳ص ۲۷۵] [2] [مسلم ج۲ص ۲۰۸] [3] [بخاری ۸۰۸]

(آخرت میں) کوئی حصہ نہیں ہے۔[۱] حضرت جعفر بن محمدؒ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر عید کے موقع پر دھاری دار یمنی چادر زیب تن فرمالیا کرتے تھے۔[۲]

ذی الحجہ کے شروع کے دس ایام میں عمل کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: سال کے کسی دن کا عمل، ذی الحجہ کے (پہلے) دس دنوں کے برابر نہیں ہوسکتا۔ آپ سے پوچھا گیا جہاد فی سبیل اللہ بھی؟ فرمایا جہاد بھی اس کے برابر نہیں ہوسکتا۔ ہاں وہ شخص جو اپنے جان و مال کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے نکلے اور واپس نہ آئے۔[۳] حضرت سعید بن جبیرؒ ذی الحجہ کے دس دنوں میں عبادت میں سخت مشقت برداشت کرتے۔

تکبیرات عید

عیدگاہ کو جاتے وقت راستے میں باآواز بلند تکبیر کہنا مسنون ہے۔ حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مسجد سے نکل کر عیدگاہ تک تکبیر کہا کرتے تھے۔[۴]

تکبیراتِ تشریقِ شہر میں رہنے والے مردوں پر فرض نمازوں کی جماعت کے بعد پڑھنا واجب ہیں۔ وجوب کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے، "وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ"[۵] یہاں ذکر سے مراد تکبیرات تشریق ہے شہریوں پر واجب ہونے کی دلیل حضرت علیؓ کا یہ قول ہے۔ "لاجمعة ولا تشريق ولا فطر ولااضحى الا فى مصر جامع او مدينة عظيمة" جمعہ تشریق عیدین نہیں ہیں مگر بڑے شہر میں۔ یہ امام صاحبؒ کے نزدیک ہے جبکہ حضرات صاحبینؒ کے نزدیک ہر فرض نماز پڑھنے والے پر تکبیرات تشریق کہنا واجب ہے کیوں کہ یہ فرض نماز کے بعد کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر فرض نماز کے بعد پڑھنا واجب ہونا چاہیے۔

تکبیر تشریق یہ ہیں: "اللّٰه اكبر اللّٰه اكبر، لا اله الا اللّٰه و اللّٰه أكبر، اللّٰه اكبر ولله الحمد"[۶]

امام صاحبؒ کے نزدیک یوم عرفہ (۹ ذی الحجہ) کی فجر کے بعد سے یوم نحر (۱۰ ذی الحجہ) کی عصر تک ہے۔ دلیل ان کی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا عمل ہے۔ ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یوم عرفہ کی فجر کے بعد سے یوم نحر کی عصر تک تکبیرات کہتے تھے۔

---

۱ [بخاری ۱۸۸] ۲ [بیہقی: ۳ص ۲۸] ۳ [سنن دارمی ۲ص ۲۵]
۴ [المستدرک: ۱/۲۹۱] ۵ [البقرۃ: ۲۰۳] ۶ [الجامع الرضوی: ۱ص ۵۶۸]

یوم نحر کی عصر کے بعد پڑھنا بند کرتے تھے۔ جب کہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک یوم عرفہ کی صبح سے لیکر ایام تشریق کے ختم تک ہے۔ ان کی دلیل عمر بن سعیدؒ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمارے ہاں تشریف لائے وہ یوم عرفہ کی فجر کی نماز کے بعد سے آخر ایام تشریق تک تکبیر کہا کرتے تھے۔[1]

عید کی نماز کیلئے غسل کرنا

عید کی نماز کیلئے غسل کرنا، مسواک کرنا مستحب ہے حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عید الفطر کیلئے غسل کر کے عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے۔[2]

عید کے دن کس وقت کھانا مستحب ہے

عید الفطر میں عید گاہ کی طرف نکلنے سے پہلے کھانا مستحب ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر کے دن کچھ کھجور تناول فرما کر ہی عید کے لئے تشریف لے جاتے اور عید الاضحیٰ میں عید کی نماز پڑھ کر قربانی کر کے کھانا مستحب ہے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر میں عید کیلئے جانے سے پہلے کچھ تناول فرماتے اور عید الضحیٰ میں عید کی نماز پڑھا کر قربانی کے گوشت سے تناول فرماتے۔

عید کیلئے آتے جاتے وقت راستہ تبدیل کرنا

عیدین کے لئے جاتے وقت ایک راستے سے اور عید گاہ سے آتے وقت دوسرے راستے سے آنا مستحب ہے تاکہ دونوں راستے اس کے لئے گواہی دیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید گاہ کی طرف پیدل تشریف لے جاتے اور اپنے ہاتھ میں برچھی پکڑتے اور عید پڑھاتے وقت اس کو اپنے سامنے سترہ کیلئے گاڑ دیتے۔[3] حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید کی نماز کیلئے آتے جاتے راستہ تبدیل فرماتے۔[4]

نماز عید کا وقت

عید کا وقت طلوع آفتاب کے بعد بقدر ایک نیزہ کے ہو جاتا ہے۔ یزید بن خمیر الرحبیؒ کہتے

---

۱ [المستدرک ا/ص ۲۹۸] ۲ [المؤطا ص ۱۴۶]
۳ [بیہقی: ۳/۲۸۱] ۴ [بخاری ۱۹۵]

ہیں کہ ایک مرتبہ صحابی رسول حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ لوگوں کے ساتھ عید کیلئے تشریف لے گئے، امام کے تاخیر سے آنے کو ناپسند فرمایا اور فرمایا: اس وقت ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھ کر فارغ ہو جاتے تھے، حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر اور عید الضحیٰ کی نماز کیلئے سورج کے مکمل طلوع ہونے کے بعد تشریف لے جاتے۔[1]

عید کی نماز کیلئے اذان واقامت نہیں

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عید کی نماز خطبے سے پہلے ہے، نماز کے بعد امام اپنی راحلہ پر کھڑے ہو کر خطبہ دے۔ عید کی نماز بغیر اذان واقامت کے ادا کی جائیگی۔ اس کو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں روایت کیا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک عید میں، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبے سے پہلے بلا اذان واقامت کے نماز پڑھائی۔[2]

قربانی کا وقت

قربانی کا وقت بعد نماز عید ہے۔ نماز سے پہلے ذبح کیا ہوا بس صرف گوشت ہے قربانی نہیں۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عید الاضحیٰ کے موقع پر نماز عید کے بعد خطبہ ارشاد فرمایا: جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور قربانی کی تو اس کی قربانی درست ہوگی۔ جو نماز سے پہلے جانور ذبح کرے وہ قربانی نہیں ہے۔ حضرت البراء کے ماموں ابو بردہ بن تیار نے کہا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نے اپنی بکری نماز عید سے پہلے ذبح کر ڈالی۔ میں نے سمجھا آج کا دن کھانے پینے کا دن ہے۔ تو میں نے چاہا ہمارے گھر میں پہلے ذبح ہونے والی میری ہی بکری ہو۔ یہ کہہ کر میں نے "بکری ذبح کر دی اور اس سے ناشتہ کر کے عید کے لئے آ گیا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آپ کی بکری محض بکری کا گوشت ہے، تو اس نے کہا: یا رسول اللہ! میرے پاس ایک سالہ بھیڑ کا بچہ ہے جو دو بکریوں سے بھی زیادہ میرے نزدیک پیارا ہے کیا وہ میرے لئے قربانی کیلئے جائز ہو جائیگا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں ہو جائے گا۔ لیکن آپ کے بعد کسی اور کیلئے جائز نہیں ہوگا۔[3]

---

۱ [بیہقی] ۲ [سنن دارمی ا ص ۲۷۵] ۳ [صحیح بخاری ۱۸۶]

عورتوں کا عید گاہ کی طرف نکلنا

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: عید کے دن ہمیں عید گاہ کی طرف نکلنے کا حکم ہوتا حتیٰ کہ پردہ نشین کنواری بچیوں کو ساتھ لے جاتیں اور حائضہ عورتیں بھی نکلتیں لوگوں کے پیچھے ان کے ساتھ تکبیر اور دعا میں بھی شریک ہوتیں۔ اور اس دن کی برکات کی امیدوار ہوتیں۔[1]

ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں پردہ نشین بچیوں کو عید گاہ کی طرف لے جانے کا امر فرماتے البتہ حائضہ عورتیں عید گاہ سے علیحدہ ایک جگہ بیٹھ جاتیں۔[2]

عید گاہ کی طرف بچوں کو ساتھ لے جانا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فضل بن عباس، عبداللہ بن عباس، عباس، علی، جعفر، حسن، حسین، اسامہ بن زید، زید بن حارثہ، ایمن ابن ام ایمن رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو ساتھ لیکر بلند آواز میں تکبیر و تحلیل کہتے ہوئے عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے۔ جاتے وقت خداد ین اور آتے وقت حذا تین کے راستے سے تشریف لاتے۔

بارش کی وجہ سے مسجد میں عید پڑھنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ عید کے دن بارش ہوگئی، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عید کی نماز مسجد میں پڑھائی۔[3]

عید گاہ میں عید کی نماز سے پہلے اور بعد میں نفل نہ پڑھنا مستحب ہے۔ کیوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر پڑھانے کیلئے تشریف لے گئے۔ عید کی نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں پڑھی۔ نہ عید سے پہلے نہ ہی بعد میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔[4]

نماز خطبے سے پہلے ہے

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عید الفطر کے موقع پر نماز پڑھا کر خطبہ ارشاد فرمایا خطبہ سے فارغ ہو کر عورتوں کی جماعت کے پاس تشریف لے گئے۔ ان کو وعظ و نصیحت سے نوازا۔[5]

---

۱ [بخاری ص۱۹۲] ۲ [سنن بیہقی ۳ص۲۷۹] ۳ [سنن داری ا ص ۳۰۱]

۴ [بخاری: ۱۹۵] ۵ [سنن ابوداؤد ا ص ۲۹۷]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما خطبے سے پہلے عید کی نماز پڑھاتے۔

رکعات کی تعداد اور طریقہ نماز

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عید الضحیٰ دو رکعت، عید الفطر دو رکعت، مسافر کی نماز دو رکعت اور جمعہ کی نماز دو رکعت ہے بفرمان نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام دو رکعت نماز پڑھائے گا۔

تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد، تین تکبیریں کہے گا، پھر سورۃ فاتحہ معہ سورۃ پڑھے گا۔ پھر تکبیر کہہ کر رکوع کریگا۔ دوسری رکعت میں، قرأت کے بعد تین تکبیریں کہے گا۔ چوتھی تکبیر رکوع کیلئے کہے گا اور یہ واجب ہے۔ تکبیرات زوائد کہتے ہوئے رفع یدین کریگا۔

دو تکبیروں کے درمیان تین تسبیحات کی بقدر وقفہ کرنا مستحب ہے۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کے ساتھی حضرت ابو عائشہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ سعید بن العاص نے ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ اور حذیفہ بن یمان سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیدین میں کس طرح تکبیر کہا کرتے تھے؟ تو ابو موسیٰ نے کہا: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنازہ کی تکبیرات کی طرح چار تکبیر کہا کرتے تھے۔ تو حضرت حذیفہ نے فرمایا۔ انہوں نے سچ بتایا۔

عبداللہ بن موسیٰ کہتے ہیں کہ حضرت سعید بن العاص نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ اور ابو مسعود کے پاس تکبیرات عیدین کے متعلق دریافت کرنے کیلئے مجھے بھیجا، تمام حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے دریافت کرنے کو کہا: تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قرأت سے پہلے چار تکبیریں کہو بمع تکبیر تحریمہ، پھر قرأت سے فارغ ہو کر تکبیر کہہ کر رکوع کرو، دوسری رکعت میں قرأت سے فارغ ہونے کے بعد چار تکبیریں کہو۔[1] (تین تکبیرات عید، ایک تکبیر رکوع)

عیدین میں جہراً قرأت کرنا مسنون ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، عیدین میں جہر کرنا سنت ہے اور عید کے لئے باہر میدان کی طرف نکلنا بھی سنت ہے۔[2]

اگر پہلے دن کی وجہ سے عید کی نماز ادا نہیں کی گئی تو دوسرے روز ادا کی جائیگی۔ روایت میں آتا ہے کچھ لوگ چاند دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو افطار کرنے کا حکم دیا، جب سورج کافی مرتفع ہو گیا تھا تو عید کی نماز اگلے دن پڑھنے کے لئے فرمایا: اور عید الاضحیٰ میں کسی وجہ سے پہلے اور دوسرے دن ادا نہیں کی گئی تو تیسرے دن بھی ادا کی جائے گی۔ چوتھے

---

[1] [سنن بیہقی] [2] [نسائی: ج۳ص ۱۸۱]

روز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

نماز کے بعد دو خطبے مسنون ہیں۔ نمازی کو اختیار ہے بیٹھ کر سن لے یا چلا جائے۔ کیوں کہ حضرت عبداللہ بن سائبؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے عید کی نماز پڑھانے کے بعد فرمایا: جو جانا چاہے جاسکتا ہے۔ جو ٹھہر کر خطبہ سننا چاہتا ہے وہ ایسا کرے۔[۱]

دو خطبوں کے درمیان تھوڑی دیر خاموش بیٹھے گا۔

مسافر کی نماز

حضرت خالد بن اسیرؓ کے خاندان کے ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! صلوۃ خوف اور مقیم کی نماز کا ذکر ہم قرآن میں پاتے ہیں۔ مگر صلوۃ مسافر کے متعلق قرآن میں کوئی ذکر نہیں؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرے بھتیجے! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو پیغمبر بنا کر ہماری طرف مبعوث فرمایا ہے ہم کچھ نہیں جانتے ہم وہ کچھ کریں گے جو آپ ؐ کو کرتے دیکھیں گے۔[۲]

حضرت یعلی بن امیہ کہتے ہیں کہ ہمیں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے عرض کیا قرآن کریم میں قصر نماز کے متعلق ارشاد ہے: "فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا" "تو تم پر کوئی گناہ نہیں نماز میں سے کچھ کم کردو اگر تمہیں یہ ڈر ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔

اب تو اس کا زمانہ ہے قصر کرنا کس طرح جائز ہوگا؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

تیری طرح مجھے اس پر تعجب تھا۔ میں نے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اوپر صدقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صدقے کو قبول کرو۔[۳] حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ شروع شروع میں مغرب کی نماز کے علاوہ باقی نمازیں دو دو رکعتیں تھیں پھر حالت اقامت میں ظہر، عصر اور عشاء کی چار رکعات پورا کرنے کا حکم فرمایا گیا اور سفر میں دو دو ہی برقرار رہیں۔[۴]

حضرت عمر بن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ سفر کی نماز دو رکعت، عید الضحیٰ کی نماز دو رکعت، عید الفطر کی نماز دو رکعت اور جماعت کی نماز دو رکعت مکمل بغیر قصر کے جیسا کہ آنحضرت ﷺ سے بھی مروی ہے۔

---

۱ [نسائی ۳ص ۱۸۵] ۲ [الموطا: ۱ص ۱۴۴]

۳ [صحیح مسلم: ۱ص ۴۷۸] ۴ [الفتح الربانی ۵ص ۹۲]

سفر میں قصر کرنا واجب ہے۔ یہ قول حضرت علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کا ہے تابعین میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حضرت قتادہؒ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام اسفار میں اس پر مواظبت کرنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہیں ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں کوئی چار رکعت والی نماز پوری پڑھی ہو۔

ان حضرات کی دوسری دلیل حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ نماز دو دو رکعت فرض ہوئی تھی۔ سفر کی نماز دو رکعت اپنی حالت پر برقرار رہی حضر (اقامت) اور عصر کی نماز میں اضافہ کر کے چار رکعت کر دی گئی۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے کہ مکہ مکرمہ آ کر دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر فرمایا اے اہل مکہ! اپنی نمازیں پوری کرلو، ہم لوگ مسافر ہیں۔[1]

تین دن کی مسافت طے کرنے کے ارادے سے اپنے شہر یا گاؤں کی آبادی سے نکلے گا تو مسافر شمار ہوگا۔ اس پر سفر کے احکامات جاری ہوں گے۔ مگر تین دن کی مقدار پا پیادہ چلنے کی مقدار ہے اور پہاڑی سفر کا اعتبار بھی پہاڑی چال کے مطابق ہوگا۔

اور سمندر کے اندر کے بھی بادبانی کشتیوں کے سفر میں ہوا کے معتدل ہونے کا اعتبار ہے۔ نہ زیادہ شدید ہو نہ ہی بالکل بند، تو معتدل ہوا میں کشتی تین دن میں جتنی مسافت طے کرتی ہے اس کو اصل شمار کیا جائیگا حضرت تمیم داریؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے سمندر میں سفر کے متعلق پوچھا۔ ان کا کام سمندری تجارت تھی۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز قصر کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ ”ھو الذی یسیر کم فی البرّ و البحر“[2] ”وہ ہی ہے جو تمہیں جنگل اور دریا میں سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے۔“ سفر پر نکلنے کے بعد اس پر سفر کے احکامات جاری ہوں گے تا آنکہ اپنے شہر میں داخل ہو جائے۔ یا کسی شہر یا بستی میں پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے، پندرہ دن سے کم کی نیت ہو تو وہ مسافر ہی رہے گا اگرچہ کثیر مدت کیوں نہ گزارے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں چار رکعات پڑھی ہیں اور مدینہ سے نکل کر مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر دو رکعت پڑھی۔[3] حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جب حج یا عمرہ کیلئے تشریف لے جاتے تو مقام ذوالحلیفہ پہنچ کر قصر شروع کرتے تھے۔[4]

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں لکھا ہے کہ مسافر اگر مکمل تین دن، جو اونٹ یا پیدل چل

---

[1] [المؤطا اص ۱۲۶] [2] [یونس:۲۲]

[3] [سنن دارمی: اص ۳۵۵] [4] [المؤطا اص ۱۲۴]

کر طے کیئے جاتے ہیں، کی نیت سے نکلے گا تو نمازوں کو قصر کریگا۔ تین دن سے کم کی مسافت کیلئے سفر کرنے والا نمازیں پوری پڑھے گا۔ یہی قول امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ دلیل اس کی حضرت شریح بن ہانیؒ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مسح کی مدت کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسافر کیلئے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کیلئے ایک دن ایک رات مقرر فرمایا ہے۔[۱] یہی تین دن کا سفر ہے جس سے احکام بدل جاتے ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کتاب الآثار میں فرماتے ہیں: ہم یہی کہتے ہیں کہ اگر تین دن کی مسافت سے کم نیت سے نکلا ہو تو نمازوں کو پورا پڑھے گا۔ تین دن یا اس سے زیادہ مسافت کیلئے نکلے جہاں جانے کیلئے نکلا ہے وہاں اس کی بیوی وغیرہ نہ ہو اور نہ ہی اس میں پندرہ دن رہنے کی نیت ہو تو قصر کریگا۔ اگر کسی جگہ پندرہ دن ٹھہرنے کا ارادہ کرے تو نمازیں پوری پڑھے۔ جب تک اس مقام میں رہے۔ جب اس جگہ سے واپس اپنے وطن کی طرف لوٹے تو قصر کرے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کسی جگہ پندرہ دن رہنے کا ارادہ کرتے تو نمازیں پوری پڑھتے۔[۲] حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسافر اگر پندرہ دن کسی جگہ ٹھہرنے کی نیت کرے تو قصر نہ کرے۔

لہٰذا اگر پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت نہ ہو تو قصر کرتا رہے اگرچہ سالہا سال اسی طرح گزر جائیں۔ دلیل اس کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں غزوہ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ حاضر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہاں دس دن سے زیادہ ٹھہرے۔ مگر نمازیں قصر کے ساتھ پڑھاتے تھے۔[۳]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ایک غزوہ کے سلسلے میں آذر بائیجان میں چھ مہینے رہے۔ مگر نمازیں دو دو رکعت پڑھاتے تھے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضرات صحابہ ''ام ہرمز'' میں نو مہینے رہے مگر نمازوں میں قصر کرتے رہے۔

سفر میں صورۃً جمع بین الصلاتین

حضرت اعرجؒ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تبوک کے سفر میں ظہر اور عصر کو اکٹھے ادا فرماتے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو موطا میں اور امام محمدؒ نے بھی اس کو روایت کرنے کے بعد فرمایا ہے ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ دو نمازوں کو اکٹھے پڑھنے کی صورت اس طرح ہوگی کہ پہلی نماز کو مؤخر کر کے آخر

---

[۱] [مسلم: ۱ص۲۳۲] [۲] [مصنف ابن ابی شیبہ ۲ص۴۵۵] [۳] [بیہقی ۳ص۱۵۲]

وقت میں ادا کیا جائے جبکہ دوسری نماز کو ابتدائی وقت میں۔اس طرح صورۃً تو یک پڑھی جائے گی۔ گئیں مگر حقیقت میں ہر ایک نماز اپنے وقت میں پڑھی گئی۔

حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے مؤذن نے آکر کہا: نماز کا وقت ہو گیا تو فرمایا: ٹھہر ٹھہر، جب شفق کے ختم ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تو مغرب کی نماز پڑھی، پھر تھوڑی دیر انتظار کیا شفق ختم ہو گیا تو عشاء کی نماز پڑھی، پھر فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی ضروری کام کیوجہ سے جلدی ہوتی تو اس طرح کرتے جیسے میں نے کیا۔[۱] بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب زوال شمس سے پہلے سفر پر تشریف لے جاتے تو ظہر کی نماز کو مؤخر کر کے عصر کے وقت سے کچھ پہلے پڑھتے۔ پھر عصر کی نماز ادا فرماتے۔ جب زوال کے بعد سفر پر جانا ہوتا تو ظہر کی نماز پڑھ کر سفر شروع فرماتے۔اسی طرح مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت اس طرح آئی ہے۔وہ فرماتے ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اگر سفر میں جلدی ہوتی تو ظہر کو اول وقت عصر تک مؤخر فرماتے اور پھر عصر کی نماز پڑھتے اور مغرب کو مؤخر کر کے عشاء کے اول وقت کے قریب پڑھتے اور عشاء شفق کے غائب ہونے کے بعد پڑھتے۔[۲]

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعات اکٹھے اور سات کو اکٹھے پڑھا ہے۔میں نے ابوالشعثاء سے کہا: میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کو موخر اور عصر کو پہلے وقت میں اور مغرب کو موخر اور عشاء کو پہلے وقت میں ادا فرمایا ہو گا تو ابولشعثاء نے کہا: میرا بھی یہی خیال ہے۔[۳]

حضرت قتلیبہؒ نے لیث بن سعدؒ سے روایت نقل کی ہے۔غزوہ تبوک کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر زوال سے پہلے کوچ کرتے تو ظہر کو موخر کر کے عصر کے ساتھ اکٹھے پڑھتے اور جب سورج کے زوال کے بعد سفر کیلئے روانہ ہوتے تو عصر میں تعجیل کر کے ظہر کے ساتھ اکٹھے ادا فرما کر سفر پر روانہ ہوتے۔اور جب مغرب کی نماز سے پہلے سفر جاری رہتا تو مغرب کو موخر اور عشاء کو معجّل کر کے اکٹھے ادا فرماتے اور اگر مغرب کے بعد سفر پر تشریف لے جاتے تو عشاء کو مقدم کر کے مغرب کے ساتھ ادا فرماتے۔[۴] اس روایت کو لیثؒ سے روایت کرنے والے صرف قتیبہ ہیں۔امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے متعلق فرمایا ہے۔قتیبہ کے علاوہ کسی نے اس کو لیث سے روایت نہیں کیا ہے۔مجھے معلوم نہیں ہے اور یہ حدیث **عن اللیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الطفیل عن معاذ** مروی

---

۱ [سنن ابوداؤد ۲ص ۶] ۲ [مسلم: اص ۲۴۱]

۳ [مسلم: اص ۲۹۱] ۴ [ترمذی ۳۳/۲] ا

ہے جوانتہائی غریب (یعنی غیر معروف) ہے۔

البتہ اس باب میں علماء میں معروف ابو الزبیر عن ابی الطفیل عن معاذ بن جبل قال جمع رسول الله ﷺ فی غزوة تبوک بین الظهر والعصر و بین المغرب والعشاء قال: فقلت ماحمله علی ذلک؟ قال فقال أرادان لایحرج امته[1]

ترجمہ: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے غزوہ تبوک کے موقع پر ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ادا فرمایا۔ ابوالطفیلؒ کہتے ہیں میں نے حضرت معاذؓ سے پوچھا۔ آپ نے ایسا کس لیے کیا: تو معاذ نے کہا۔ اس لیے کیا تا کہ آپؐ کی امت کو مشقت نہ ہو۔

(صاحب کتاب کہتے ہیں) میرے نزدیک احتیاط یہ ہے کہ اگر انسان سفر میں جمع بین الصلاتین پر مجبور ہو جائے تو جمع تاخیر کرے، جمع تقدیم سواء عرفہ کے نہیں کرے۔ اس لیے کہ غزوہ احزاب کے موقع پر جمع تاخیر ثابت ہے جبکہ جمع تقدیم سوائے یوم عرفہ میں آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے نماز کو مومنین پر موقت فرض فرمایا ہے۔ لہٰذا وقت کے بعد قضاء کرنا وقت سے پہلے اداء کرنے سے بہتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب.

حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ایک سفر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ جانا ہوا۔ ایک مقام پہ کسی نے کوئی خبر سنائی۔ اور یہ عصر کا وقت تھا۔ خبر سن کر بڑی تیزی کے ساتھ سفر کو جاری رکھا۔

قریش کے کچھ افراد بھی آپؐ کے ساتھ تھے۔ چلتے رہے چلتے رہے حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا۔ وہ چونکہ نماز کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا۔ نماز پڑھ لیجئے۔ انہوں نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ سفر کو جاری ہی رکھا۔ جب شفق کے غروب ہونے میں تھوڑا وقت رہ گیا تو سواری سے اترے مغرب کی نماز ادا کی پھر شفق کے غائب ہوتے ہی عشاء کیلئے اقامت ہوئی آپؓ نے عشاء کی نماز پڑھائی، پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے: حضور ﷺ کو جب زیادہ جلدی ہوتی تو آپؐ اس طرح کیا کرتے جو میں نے کیا۔[2]

یہ صورۃً جمع بین الصلاتین ہے۔ کیوں کہ مغرب کو اس کے آخر وقت میں شفق کے غائب ہونے سے پہلے پڑھا، اور عشاء کو شفق کے غائب ہونے کے بعد پہلے وقت میں ادا کیا۔

سفر میں نفل نماز پڑھنا

بعض فقہاء نے حفص بن عاصمؒ کی روایت سے استدلال کرتے ہوئے سفر میں نفل پڑھنے

---

۱ [مسلم: ا ص ۴۹۰] ۲ [دار قطنی ا ص ۳۹۳]

کا کہنا ہے۔ عاصمؒ کی روایت یہ ہے میں ایک بیماری میں مبتلا ہوا تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما میری عیادت کیلئے تشریف لائے۔ میں نے سفر میں نفل پڑھنے کے متعلق سوال کیا تو فرمایا۔ ایک مرتبہ میں ایک سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک تھا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس دوران نفل پڑھتے نہیں دیکھا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" [الاحزاب: ۲۱] ا؎ رسول اللہ کی ذات میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ لہٰذا جس نے سفر میں نفل نہ پڑھے اس نے رخصت کو قبول کیا۔

البتہ اکثر فقہاء نے سفر میں نفل پڑھنے کا قول فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک سفر میں نفل پڑھنا بہتر ہے اور نفل پڑھنے والا بڑے اجر وثواب کا حامل ہوگا۔

ان کا استدلال بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے قول سے ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سفر وحضر میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حضر میں ظہر کی نماز چار رکعت پڑھی ہے۔ اس کے بعد دو رکعات، اور سفر میں ظہر کی فرض نماز دو رکعت پڑھی۔ پھر اس کے دو رکعت نفل اور عصر کی نماز (سفر میں) دو رکعت پڑھی۔ عصر کے بعد کوئی نماز نہیں پڑھی اور مغرب کی نماز سفر وحضر میں تین رکعات پڑھی۔ اس میں کمی نہیں فرمائی۔ یہ دن کا وتر (طاق) ہے۔ اس کے بعد دو رکعات پڑھی ہیں۔ ۲؎

مقیم اگر مسافر امام کے پیچھے پڑھے تو نماز پوری کرے

حضرت عبداللہ بن صفوانؒ کہتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صفوانؒ کی عیادت کیلئے تشریف لائے۔ ہمیں نماز پڑھائی اور دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرا۔ ہم نے کھڑے ہو کر اپنی نماز پوری کر لی حضرت نافعؒ فرماتے ہیں: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ منیٰ میں اگر امام کے پیچھے پڑھتے تو چار رکعات ادا فرماتے اور اگر خود نماز پڑھتے تو دو رکعت پڑھاتے۔ ۳؎

مسافر، امام ہو یا انفرادی طور پر پڑھے تو دو رکعت پڑھے گا اور جب مقیم امام کے پیچھے کھڑا ہو جائے تو پوری چار رکعات پڑھے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے مکہ مکرمہ میں ظہر کی نماز پڑھائی۔ سلام پھیر کر فرمایا: یا اہل مکہ ہم مسافر ہیں۔ جو یہاں کے رہائشی ہیں وہ اپنی نماز پوری کر لیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر مقیم، مسافر امام کے پیچھے کھڑا ہو تو مسافر کے سلام پھیرتے ہی

ا؎ [مسلم: ۱/۴۸۰] ۲؎ [ترمذی: ۲/۲۲] ۳؎ [الموطا ص ۱۲۶]

مقیم کھڑا ہو کر اپنی نماز پوری کرے گا۔ یہی امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں۔ مسافر اگر مقیم کے پیچھے پڑھے تو پوری پڑھے گا اور یہی قول امام اعظمؒ کا ہے۔

حضرت ابو مجلزؒ نے کہا: میں نے حضرت ابن عمر سے کہا: اگر میں مقیم امام کے پیچھے دو رکعت میں پہنچ گیا تو کتنا پڑھوں؟ فرمایا مقیم کی نماز پڑھو، یعنی چار رکعتیں پوری پڑھ لو۔

پھر میں نے عرض کیا: مسافر مقیم کے پیچھے دو رکعات پڑھنے کے بعد شامل ہو جائے تو کیا اس کو صرف دو رکعات پڑھنا صحیح ہوگا؟ یا چار رکعات پوری پڑھ لے گا۔ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مسکرا کر فرمایا چار پوری پڑھے گا۔[۱]

کسی علاقے سے ہجرت کرنے والا شخص دوبارہ اس میں داخل ہو تو کس طرح نماز پڑھے

اگر کوئی شخص اپنے پیدائشی اور اصلی وطن سے ہجرت کر کے دوسرے علاقے کو اپنا وطن بنائے۔ پھر اپنے سابقہ وطن میں آئے تو مسافر کی نماز پڑھے گا۔ دلیل اس کی حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ایک مرتبہ ہم نے مدینہ منورہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مکہ مکرمہ کیلئے رخت سفر باندھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ آنے تک دو دو رکعتیں پڑھاتے رہے۔ ابو اسحاقؒ کہتے ہیں: میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ مکہ مکرمہ میں اقامت کی؟ فرمایا دس دن ہم وہاں رہے۔[۲]

وطن کے احکام

جو شخص کسی علاقے میں پیدا ہو تو وہ اس کا وطن ہے۔ جہاں شادی کرے وہ اس کا وطن ہے۔ جو کسی علاقے میں جا کر رہنے کا ارادہ کرے اور وہاں سے نہ جانے کا عزم کرے وہ اس کا وطن ہے۔

اگر کسی کے والدین کسی علاقے میں رہ رہے ہوں جو اس کا علاقہ نہیں ہے اور نہ وہاں اس کی بیوی موجود ہو تو اس کا وطن اصلی شمار نہیں ہوگا۔ الا یہ کہ اس میں ہمیشہ رہنے اس سے نہ جانے کا عزم کرے تو وہ اس کا وطن اصلی بنے گا۔ ایک شخص کیلئے ایک سے زیادہ وطن اصلی ہو سکتے ہیں۔ ایک شخص کا وطن اصلی بھی موجود ہو۔ وہ دوسری جگہ دوسری شادی کرے تو وہ بھی اس کا وطن اصلی ہوگا۔ وہاں جائیگا تو نمازیں پوری پڑھے گا۔ پہلے وطن میں بھی پوری پڑھے گا۔ البتہ ایک وطن سے دوسرے وطن کی طرف سفر کرتے ہوئے راستے میں قصر سے پڑھے گا۔ کسی علاقے میں پہنچ کر پندرہ دن یا اس

---

[۱] [صحیح البخاری ۱/۱۵۷] [۲] [بخاری: ۲۱۴]

سے زیادہ ایام ٹھہرنے کی نیت کرے گا تو چار رکعات والی نمازوں کو مکمل پڑھے گا۔ جب تک وہاں سے سفر کی نیت سے کوچ نہ کرے۔ پھر واپس اس میں آ کر دوبارہ پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کرے گا تو مقیم بنے گا ورنہ مسافر ہی رہے گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ چھ سال منیٰ میں نماز پڑھی ہے۔ تمام حضرات نے منیٰ میں مسافر کی نمازیں پڑھائیں۔ بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں شادی کرلی۔ جب بھی وہ مکہ مکرمہ تشریف لاتے تو ظہر عصر اور عشاء کی نمازوں کو چار چار مکمل پڑھتے جب منیٰ اور عرفات کی طرف نکلتے تو قصر کرتے اور جب حج سے فارغ ہو کر منی میں اقامت اختیار کرتے تو قصر نہیں کرتے۔ جب تک مکہ سے نہ نکلتے۔

حضرت عبدالرحمان بن ابی ذباب ؒ کہتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں چار رکعتیں پوری پڑھ لیں تو لوگوں نے اس کو ناپسند کیا تو فرمانے لگے۔ لوگو! میں جب سے مکہ آیا ہوں تو یہاں میں نے شادی کرلی ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے۔

''من تاهل فی بلد فلیصل صلاة المقیم'' [1]

حضرت علی ابن ربیعہ ؒ کہتے ہیں: ایک مرتبہ ہم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس علاقے (شام) کی طرف سفر کیا۔ تو وہ دو دو رکعتیں پڑھاتے رہے۔ حتیٰ کہ دوبارہ ہم کوفہ کی طرف لوٹے اور کوفہ ہمیں نظر آیا۔ اتنے میں نماز کا وقت ہوا۔ لوگوں نے کہا: امیر المومنین! یہ کوفہ نظر آ رہا ہے نماز پوری پڑھ لیں؟ فرمایا نہیں، جب تک اس میں داخل نہ ہوں۔[2]

بلا عذر جمع بین الصلاتین کرنا گناہ کبیرہ ہے

حضرت ابو قتادہ العدوی ؒ فرماتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہر ایک گورنر کے نام خط لکھا، تین چیزیں گناہ کبیرہ میں داخل ہیں۔ (۱) کسی عذر کے بغیر جمع بین الصلاتین کرنا۔ (۲) میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا (۳) نقب زنی کرنا۔

مسافر اقامت کی نیت سے مقیم بنے گا، اگر ایک شخص دو مختلف مقامات میں اقامت کی نیت کرے گا تو مقیم نہیں ہوگا۔ الا یہ کہ ایک مقام میں رات گزارنے کی نیت نہ کرے۔ اس لیے کہ رات گزارنے کا مقام مقام اقامت ہوتا ہے۔ فرض میں قصر یا مکمل کرنے کا اعتبار آخر وقت پر ہے چنانچہ ایک شخص اپنے وطن میں تھا۔ ظہر کی اذان ہوگئی۔ نماز اداء کرنے سے پہلے سفر پر روانہ ہوا۔ شہر کی

---

[1] [فتح الربانی] [2] [الفتح الربانی:۵/۱۱۵]

آبادی سے گزرنے کے بعد نماز پڑھنے لگا تو قصر کرے گا اور اگر مسافر اول وقت میں نماز ادا نہیں کر سکا۔ آخر وقت میں وطن پہنچ گیا یا کسی جگہ اقامت کی نیت کرلی تو پوری پڑھے گا۔ قصر نہیں کرے گا۔

گناہ کیلئے سفر کرنے والا بھی قصر کرے گا

قصر کی رخصت میں اطاعت، ضرورت یا کسی گناہ کیلئے سفر کرنے والے برابر ہیں۔ کیونکہ رخصت کے متعلق نصوص مطلق ہیں تمام کو شامل ہیں۔ چنانچہ آیات کریمہ "فَمَنْ كَانَ مِنكُمْ مَّرِيضًا اَوْعَلٰى سَفَرٍ" [بقرہ:۱۸۴] اور فرمان باری "فَتَيَمَّمُوْا" [النساء:] اور حضور ﷺ کا فرمان۔ یمسح المسافر ثلاثه ایام ولیالیھا" سبھی مطلق ہیں اس میں مطیع وغیر مطیع کی کوئی قید نہیں ہے اور ہم معصیت کو رخصت کا سبب قرار نہیں دے رہے ہیں۔ سبب وہ مشقت ہے جو سفر کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ نفس سفر تو ممنوع ومحذور نہیں ہے۔ البتہ معصیت ممنوع ہے جو اس کے ساتھ مجاور ہے لہٰذا افادہ رخصت میں سفر مباح ہوگا۔

دشمنوں کے ساتھ مزاحمت کے وقت نماز کا حکم

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لڑائی اگر اپنے انجام کو پہنچنے والی ہو اور فتح کی تیاری ہو اور نماز کا وقت ختم ہو رہا ہو مگر نماز پڑھنے پر قدرت نہ ہو رہی ہو تو ہر ایک علیحدہ علیحدہ اشارۃً نماز پڑھے گا۔ اگر اشارے کے ساتھ بھی پڑھنا ممکن نہ ہو تو قتال کے ختم ہونے تک نماز مؤخر کر دی جائے گی۔ دشمنوں کے حملے کا خطرہ نہ ہو تو دو رکعت پڑھیں گے۔ اگر دو پر قادر نہ ہو ایک رکعت دو سجدوں کے ساتھ پڑھیں گے اس پر بھی قادر نہ ہوں تو مؤخر ہوگی۔ حضرت مکحولؒ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تستر کے قلعے پر حملے کے موقع پر میں حاضر تھا جس پر طلوع فجر ہوتے ہی حملہ کیا گیا تھا۔

سخت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ فجر کی نماز پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے نماز کو طلوع آفتاب کے بعد تک موخر کر دیا۔ اور طلوع آفتاب کے بعد قلعہ کو فتح کر کے حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہم نے نماز فجر ادا کی۔ اور اس نماز کے وقت دنیا وما فیھا ملنے سے بھی زیادہ خوشی ہوئی تھی۔[1] حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یوم خندق کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر کفار کو برا بھلا کہتے ہوئے فرمایا کہ یارسول اللہ! سورج غروب ہونے

---

[1] [صحیح بخاری: ۱۸۷]

کے قریب ہو گیا مگر میں اب تک عصر کی نماز نہیں پڑھ سکا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وانا واللہ ماصلیتھا بعد'' میں نے بھی ابھی تک نہیں پڑھی۔ وہ اس کے بعد بطحاء کی طرف گئے غروب آفتاب کے بعد وضو کر کے نماز عصر پڑھی۔ پھر بعد میں مغرب پڑھی۔[1]

[1] [بخاری: ۱۸۷]

﴿باب الجنازہ﴾

مومن کے جان و مال اور اولاد پر کوئی افتاد، مصیبت وغیرہ نازل ہو تو صبر کرنا چاہیے تاکہ صابرین کے اجر عظیم کا مستحق ہو اور صابرین کے اجر کا کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ" [الزمر:۱۰] ترجمہ: "صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ بلا حساب دیا جائے گا۔" صبر کرنے والے کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ ترجمہ: مسلمان کو کوئی بھی تکلیف، پریشانی، تھکاوٹ، بیماری اور غم پہنچتا ہے تو اس کے بدلے اس کے گناہوں کو مٹایا جاتا ہے اور وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔[۱]

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ ام سائب کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا: ام سائب! تم کیوں کانپ رہی ہو؟ کہنے لگیں بخار نامراد کی وجہ سے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بخار کو برا بھلا مت کہو، بخار تو انسان کے گناہوں کو ایسا صاف کر دیتا ہے جیسا کہ آگ کی بھٹی لوہے کو صاف وشفاف کر دیتی ہے۔[۲]

انسان جب بخار کی تکلیف کو زبان پر حرف شکایت لائے بغیر ثواب ملنے کی نیت سے سہہ لیگا تو بخار اس کے گناہوں کا کفارہ بنے گا۔ مگر بخار و تکلیف پر جزع وفزع بے صبری، شکوہ شکایت کرے تو کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

بیماریاں گناہوں کو دھوڈالتی ہیں

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے بیماریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ترجمہ: مومن کو جب اللہ تعالیٰ بیماری میں مبتلا کر کے صحت بخشتا ہے تو یہ بیماری اس کے گناہوں کے لیے کفارہ بنتی ہے اور آئندہ کیلئے باعث موعظت ہوتی ہے۔ منافق جب بیمار ہو کر ٹھیک ہو جاتا ہے تو اس کی مثال اس اونٹ کی ہے جس کا مالک اس کو باندھ کر کھولدے، وہ نہیں جانتا کہ اس کو باندھا کیوں گیا تھا اور کھولا کس لیے گیا۔ اتنے میں آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! بیماری کیا ہوتی ہے، اللہ کی قسم میں کبھی بیمار ہوا ہی نہیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم یہاں سے اٹھو، تم ہم میں سے نہیں ہو۔[۳]

---

۱ [مسلم:۴/۱۹۹۳] ۲ [ابوداؤد ۳/۱۸۲] ۳ [ابوداؤد ۳/۱۸۲]

بیمار کے پورے پورے اعمال کا اجر

بیمار کیلئے بوجہ بیماری چھوٹے ہوئے اعمال کا ثواب زمانہ صحت میں کیے ہوئے اعمال کے برابر ملے گا۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ ”اگر ایک انسان زمانہ صحت میں نیک اعمال کرتا رہا ہو۔ بیماری کی وجہ سے اس کو نہ کر پا رہا ہو تو اس کو زمانہ صحت کے اعمال کے برابر ثواب ملتا رہے گا۔[1]

مریض اگر اپنے قریب المرگ ہونے کا گمان کرے تو اس کو چاہیے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند فرمائیں اور یہ یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس چیز سے کئی گنا بہتر ہے جس میں وہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، ”من احب لقاء اللّٰہ احب اللّٰہ لقاءہ جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کریگا تو اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات کو پسند فرمائیگا! من کرہ لقاء اللّٰہ کرہ اللّٰہ لقائہ جو اللہ سے ملنے کو پسند نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو پسند نہیں فرمائے گا۔“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا ازواج مطہرات میں سے کسی اور زوجہ نے کہا: یا رسول اللہ! ہم موت کو پسند نہیں کرتیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ جب بندۂ مومن مرنے لگتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور اکرام کی خوشخبری دی جاتی ہے اور جب کافر مرنے لگتا ہے تو عذاب وعقوبت کی خبر دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کو پیش آنے والا ہر منظر اس کے لیے مکروہ تر ہوتا جائے گا۔ اس کو اللہ کی ملاقات سے اور اللہ تعالیٰ کو اس سے اظہار ناپسندیدگی ہوگی۔[2]

مرنے والے کو قبلہ رو کرنا

جس پر موت کی کیفیت طاری ہو اس کو دائیں پہلو پر قبلہ رو لٹایا جائے گا۔ کیوں کہ حضرت براء بن عاذب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: جب تم اپنے بستر پر آنا چاہو تو وضو کرلو اور دائیں کروٹ لیٹ جاؤ اور یہ کلمات کہو۔ اللھم وجھی الیک، وفوضت امری الیک، والجات ظھری الیک، رغبۃ ورھبۃ الیک، لاملجا ولامنجا منک الا الیک آمنت بکتابک الذی انزلت ونبیک الذی ارسلت.

اگر اس رات تمہارا انتقال ہو جائے تو فطرت یعنی حالت اسلام میں مرو گے۔ ان کلمات کو تمام اذکار کے بعد کہہ لو۔[3]

---

[1] [ابو داؤد: ۱۸۲/۳] [2] [بخاری: ۱۳۲/۸] [3] [بخاری: ۳۳۶/۶]

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: میت کو قبلہ رو رکھا جائے گا۔ دلیل حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت البراء بن معرور کے بارے میں پوچھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا گیا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اپنے ایک تہائی مال کی آپ کیلئے وصیت کر گئے ہیں اور مرتے وقت یہ بھی وصیت کی کہ مرتے وقت مجھے قبلہ رو لٹا دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ فطرت اسلام پر ان کا انتقال ہوا اور تہائی ۳/۱ مال واپس ان کے بیٹے کو عطا فرما دیا۔ پھر ان کی قبر پر جا کر ان پر نماز پڑھی اور فرمایا: اے اللہ! ان کو معاف فرما، ان کے ساتھ رحم کا معاملہ فرما اور ان کو اپنی جنت میں داخل فرما اور تو نے ایسا کر دیا ہے۔[1]

مرنے والے کو کلمہء شہادت کی تلقین کرنا

مرنے والے کے پاس کلمہء شہادت پڑھنا چاہئے۔ کیوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: اپنے مرنے والوں کو لا الہ الا اللّٰہ کی تلقین کرو کیوں کہ مومن کی روح پانی کی طرح نکلتی ہے اور جبکہ کافر کی جان گدھے کی طرح زور سے نکلتی ہے۔[2]

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جس کی آخری بات ''لا الہ الا اللّٰہ'' ہو وہ جنت میں داخل ہوگا۔[3]

میت کے متعلق اچھی بات کرنا

جو میت کے پاس آئے اس کو چاہیے کہ میت کے متعلق خود بھی اچھی گفتگو کرے اور دوسروں کو اچھی باتیں کرنے کی تلقین کرے، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میت کے پاس جاؤ تو اس کے متعلق اچھی اچھی باتیں کیا کرو۔ کیوں کہ تمہاری باتوں پر فرشتے آمین کہتے ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: جب ابو سلمہؓ کا انتقال ہوا تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں کیا الفاظ کہہ دوں؟ فرمایا: تم کہو: اللھم اغفر لہ، و اعقبنا عقبی صالحۃ ''اے اللہ اس کو معاف فرما'' اور ہمیں اچھا بدلہ عطا فرما۔'' ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں اچھا بدلہ عطا فرما دیا۔[4]

میت کے پاس سب سے بہتر کلام ''اناللّٰہ وانا الیہ راجعون'' کہنا ہے۔ کیوں کہ

---

[1] [المستدرک ۱/۳۵۳] [2] [معجم طبرانی: ۱۰/۱۸۹]

[3] [دارمی ۳/۱۹۰] [4] [ابوداؤد ۳/۱۹۰]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہیں جب کوئی مصیبت پہنچ جائے تو کہو: ''اناللّٰہ واناالیہ راجعون. اللھم احتسبت مصیبتی فاجرنی فیھا وابدل لی بھا خیرا منھا''۔[1] اسی طرح میت کے پاس سورۃ یٰسین بھی پڑھنی چاہیے کیوں کہ ارشاد نبوی ہے۔ ''اقراء وایٰس علی موتاکم'' ترجمہ اپنے مردوں پر سورۃ یٰسین پڑھا کرو۔''

میت کو بوسہ دینا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی میت کو بوسہ دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔[2]

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا۔

میت کی آنکھیں بند کرنا

مردے کی ٹھوڑی کو باندھا جائے گا اور اس کی آنکھیں بند کی جائیں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسا کرنا ثابت ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کے انتقال پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کی آنکھیں کھلی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی آنکھیں بند کر دیں۔[3]

میت پر رونا

مرنے والے پر آنسو بہانے میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ وہ اس وقت بیہوشی کی کیفیت میں تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا انتقال ہوگیا؟ کہنے لگے! نہیں! یارسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رو پڑے، لوگ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ کر رو پڑے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ آنسو بہانے اور غمگین ہونے کی بنا پر عذاب نہیں دیتا۔ زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ لیکن اس کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرتا ہے یا رحمت کا معاملہ کرتا ہے۔

---

[1] [ابوداؤد ۳/۱۹۰] [2] [ابوداؤد ۳/۱۹۰] [3] [ترمذی ۲/۲۲۹]

میت پر نوحہ کرنا

نوحہ کرنا حرام ہے۔ کیونکہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کے اندر چار چیزیں جہالت کی ہیں جنہیں وہ نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ حسب ونسب پر فخر کرنا، حسب پر طعنہ دینا، ستاروں کے ذریعے پانی طلب کرنا اور نوحہ کرنا۔ اور فرمایا: نوحہ کناں مرنے سے پہلے اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرے تو قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ تارکول کا لباس پہنا ہوگا۔ نوحہ کرنے والوں سے آپ ﷺ نے اظہار برأت ظاہر فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے: لیس منا من حلق، ومن سلق ومن خرق.

حضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے والی عورتوں میں سے ایک عورت کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ نے جہاں ہم سے نیک اعمال کرنے کی بیعت لی وہاں ہم سے یہ بھی بیعت لی کہ ہم اس میں آپؐ کی نافرمانی نہیں کریں گی، چہرہ نہیں نوچیں گی، گریباں چاک نہیں کریں گی شعر نہیں کہا کریں گی۔

مردے پر رونے سے اس کو عذاب ہوگا یا نہیں؟ فرمان الٰہی ہے۔ "وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى" [بنی اسرائیل] اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ مردے کے رشتے داروں کے رونے کی وجہ سے اس کو عذاب نہیں ہونا چاہیے۔ جب کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا کہنا ہے زندوں کے رونے کی وجہ سے مردے کو عذاب دیا جائے گا۔

میت کو دفنانے میں جلدی کرنا

موت متحقق ہونے کے بعد دفن کرنے میں جلدی کرنا مستحب ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، تین چیزیں مؤخر نہ کی جائیں، نماز کو، وقت ہونے پر۔ جنازے کو حاضر ہونے کے بعد اور بے شوہر عورت کو برابر کا رشتہ ملنے پر۔[1]

اسی طرح روایت ہے کہ حضرت طلحہ بن البراء رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے۔ حضور ﷺ ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے انہیں دیکھ کر فرمایا: میرا خیال ہے طلحہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے متعلق اعلان کرو، اور دفنانے کے سلسلے میں جلدی کرو، اس لیے کہ مسلمان کی میت کو اس کے گھر والوں کے سامنے رکھنا مناسب نہیں ہے۔[2] مردے کو نہلانا فرض کفایہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت آدم

۱۔ [جامع الاحادیث ۳/۶۸۷] ۲۔ [سنن ابی داؤد ۳/۲۰۰]

علیہ السلام کے متعلق ایک حدیث بیان کرتے ہوئے آخر میں ان کا یہ قول نقل فرمایا کہ انہوں نے لوگوں سے کہا: میرے اور میرے رب کے رسولوں کے درمیان حائل مت ہو جاؤ، چنانچہ فرشتوں نے آپ کی روح قبض کر لی۔

بیری کے پتوں والے پانی سے ان کو غسل دیا، کفن دیا اور نماز جنازہ پڑھ کر دفنا دیا۔ پھر فرشتوں نے کہا: یہ تیرے بعد آنے والی تیری اولاد کا طریقہ ہے۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ فرشتوں نے ان کی جان قبض کرنے کے بعد ان کو نہلایا، خوشبو لگائی، کفن دیا، نماز پڑھائی، پھر قبر کھود کر دفن کر کے کہنے لگے، اے بنی آدم! مردے کے معاملے میں یہی تمہارا طریقہ ہے، اس طرح اپنے مردوں کے ساتھ معاملہ کرو۔[1]

میت کو نہلانا

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو میت کو نہلا کر اس کے عیوب کو پوشیدہ رکھے چالیس مرتبہ اس کو بخش دیا جائے گا۔ جو کسی مردے کو کفن دے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کو سندس واستبرق (کے عظیم لباس) پہنائے گا۔ جو شخص قبر کھو کر کسی مردے کو اس میں دفن کر دے تو ایک مسکین کو مکان دینے کا اجر تاقیام قیامت اس کو ملتا رہے گا۔[2]

ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ جو شخص کسی مردے کو غسل دے اور اس کے عیوب کو پوشیدہ رکھے اس کے چالیس گناہ کبیرہ معاف کر دیئے جائیں گے جو کسی مردے کو کفن دے تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں باریک ریشمی لباس پہنائیں گے، جو شخص قبر کھود کر مردے کو اس کے اندر دفن کر دے تو اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا کسی مسکین کو قیامت تک جگہ فراہم کرنے کا ثواب ہوتا ہے۔

غسل کیلئے اس کے کپڑے اتار دیئے جائیں گے تا کہ آسانی سے غسل دیا جا سکے، اور با آسانی پانی تمام بدن میں پہنچایا جا سکے، البتہ نہلاتے وقت اوپر کپڑے کے ذریعے پردہ کیا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم اپنی ران ظاہر مت کرو، نہ ہی کسی زندہ یا مردہ شخص کی ران کی طرف دیکھو، میت کو چارپائی پر رکھا جائے گا، تین مرتبہ دھونی دی جائے گی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اگر دھونی دو تو طاق عدد کے ساتھ ہو اور اس کی وجہ سے بدبو پھیلنے سے اس کو روکنے کیلئے غسل سے پہلے وضو کرایا جائے گا۔ اس لیے کہ غسل میں پہلے وضو کرنا سنت ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے اپنی بیٹی کو غسل دیتے وقت فرمایا تھا۔ پہلے دائیں

---

[1] [المستدرک ۱/۳۴۵] [2] [المستدرک ۱/۳۵۴]

طرف سے شروع کرو اور اعضاء وضو کو پہلے دھولو، البتہ کلی اور ناک میں پانی نہیں ڈالا جائے گا۔ کیوں کہ پانی کا باہر نکلنا دشوار ہوگا۔ غسل میں بیری کا پانی یا صابون استعمال کیا جائے گا۔ کیوں کہ اس سے صفائی خوب ہوتی ہے۔ اور مقصود صفائی ہی ہے۔ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا۔ ترجمہ: ''اس کو تین یا پانچ یا اس سے زیادہ مرتبہ بیری کے پانی سے دھولو۔'' آخر میں کافور اس میں رکھو۔[1]

گرم پانی نسبتاً گندگی دور کرنے کا زیادہ باعث ہے، بائیں پہلو پر لٹا کر دائیں پہلو کو پھر دائیں پہلو پر لٹا کر بائیں پہلو کو دھویا جائے گا۔ ابتداء داھنی طرف سے کی جائے گی۔ پھر اس کو بٹھا کر پیٹ پر ہاتھ پھیرا جائے گا تا کہ جو کچھ پیٹ میں موجود ہو وہ باہر نکل آئے تا کہ بعد میں کفن گندا نہ ہو جائے۔ میت کے سر یا داڑھی کے بالوں میں کنگھی نہیں کی جائے گی۔ ایک مرتبہ حضرت سیدہ عائشہؓ ایک مردہ عورت کے بالوں کو کنگھی کرتے دیکھ کر فرمانے لگی: تم مردے کے بالوں کو کنگھی کیوں کرتے ہو۔

اگر کچھ خارج ہو جائے تو صاف کیا جائے گا مگر دوبارہ نہلایا نہیں جائے گا۔ کیونکہ غسل ایک مرتبہ ہو چکا ہے۔ پھر کپڑے یا تولیہ کے ساتھ پانی کو خشک کیا جائے گا تا کہ کفن گیلا نہ ہو جائے۔ خوشبو لگائی جائے۔ سر اور ڈاڑھی پر حنوط لگایا جائے گا سجدے کے مقامات پر کافور رکھا جائے گا۔

کیونکہ خوشبو لگانا سنت ہے اور سجدے کے مقامات کی تخصیص ان کی شرافت وعظمت کی وجہ سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی کو نہلانے والیوں کو خوشبو لگانے کا حکم فرمایا۔ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مُحرِم کیلئے خوشبو کو منع فرمایا: حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس صحابی کو نہلانے والوں سے فرمایا جو کجاوہ لگنے سے انتقال کر گیا تھا کہ اس کو بیری کے پانی سے غسل دو، دو کپڑوں میں کفن دو، حنوط (خوشبو) مت لگاؤ، اس کے سر کو ڈھانپو مت کیونکہ قیامت کے دن یہ تلبیہ پڑھتا ہوا اٹھے گا۔[2]

کفن کا حکم

دھونی دیئے ہوئے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا جائے گا۔ قمیص، ازار، لفافہ۔ یہ مقدار کفن سنت کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روئی کے بنے ہوئے تین سحولی کپڑوں سے کفن دیا گیا۔[3]

---

۱ [صحیح بخاری ۲۴۷] ۲ [صحیح بخاری: ۲۴۹] ۳ [بخاری: ۲۴۸]

اور پہنانے کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے لفافے (سب سے اوپر والے کپڑے) کو بچھایا جائے گا۔ پھر اس کے اوپر ازار کو جو سر سے لے کر قدم تک ہوتا ہے۔ بائیں طرف سے پہلے کپڑے کو لپیٹ دیا جائے گا۔ پھر دائیں طرف سے اس کے اوپر لپیٹ دیا جائے گا۔ جیسا کہ زندگی میں اس طرح کیا جاتا ہے۔ پھر لفافے کو بھی اسی طرح لپیٹ دیا جائے گا۔ لفافہ بھی سر سے قدم تک ہوتا ہے۔ صرف لفافہ اور ازار پر اقتصار کرنا جائز ہے کیوں کہ حالت احرام میں مرنے والے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو کپڑوں میں کفن دینے کا حکم فرمایا۔ صرف ایک کپڑے پر اکتفا نہیں کیا جائے گا ہاں کپڑا نہ ہونے کی مجبوری ہو تو علیحدہ بات ہے کیوں کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو شہادت کے بعد صرف ایک کپڑے میں کفن دیا گیا تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیر شہید ہوئے اور وہ مجھ سے بہتر تھے، ان کو ان کی ایک چادر میں کفن دیا گیا۔ اگر سر کو ڈھانپ دیا جاتا تو پیر کھل جاتے اگر کپڑے کو پیروں پر ڈال دیا جاتا تو سر کھل جاتا۔[۱]

کفن کھلنے کا خطرہ ہو تو باندھنا چاہیے۔ عورت کا کفن بھی اس طرح ہے کہ قمیص، ازار اور لفافہ۔ البتہ ایک سے زائد کپڑا خمار، دوپٹہ اور ایک کپڑا جس کو اس کے سینے کے اوپر باندھ لیا جائے بڑھائے جائیں گے۔ کفن پہنانے کی ترتیب اس طرح ہوگی، سب سے پہلے قمیص پھر اس کے اوپر خمار پھر سینہ بند، پھر ازار پھر لفافہ پہنائے جائیں گے۔ جیسا کہ اپنی زندگی میں جس ترتیب سے پہنتی تھی۔ یہ عورت کا کفن سنت ہے۔ حضرت لیلیٰ بنت قانف الثقفی کہتی ہیں کہ حضرت ام کلثومؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وفات کے بعد غسل دینے والوں میں ایک میں بھی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے ازار پکڑایا پھر قمیص پھر خمار اس کے بعد لفافہ پکڑا دیا۔ اس کے بعد ایک اور کپڑا اوپر ڈال دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دروازے پر تشریف فرما تھے اور کفن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک میں تھے۔ ایک ایک کر کے کپڑے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں پکڑاتے جاتے۔[۲]

قریب البلوغ لڑکے کا حکم بالغ کی طرح ہے البتہ چھوٹے بچے کو دو کپڑوں، ازار و رداء میں کفن دیا جائے گا۔

زیادہ مہنگا کپڑا کفن میں استعمال کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا اور فرمایا ”زیادہ قیمت والا کپڑا کفن نہ دو، کیونکہ یہ جلدی اس سے چھین لیا جائے گا[۳] میت کو نہلانے کے بعد وضو کرنا مستحب ہے۔

---

۱ [بخاری: ۲۵۰] ۲ [ابوداؤد ۳/ ۲۰۰] ۳ [صحیح مسلم: ۴/ ۱۷۰۵]

میت کے ساتھ جانا اور نماز جنازہ پڑھنا

مسلمان کا ایک حق دوسرے مسلمان پر یہ بھی ہے کہ مرنے کے بعد اس کے جنازے کے ساتھ جائے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کیا کیا ہیں؟ فرمایا: جب اس سے ملاقات ہو سلام کرنا، دعوت کو قبول کرنا، اگر تجھ سے خیر خواہی کا طالب ہو تو اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا، چھینک کر الحمد للہ کہہ دے تو چھینک کا جواب دینا۔ بیمار ہونے پر عیادت کرنا، مرنے پر اس کے جنازے کے ساتھ جانا۔[۱] حضور ﷺ کا ارشاد ہے جو شخص ایمان اور ثواب کی نیت سے جنازے کا اتباع کرے اور نماز جنازہ پڑھ کر دفن کر کے لوٹے تو وہ دو قیراط اجر لے کر لوٹے گا۔ ایک قیراط ثواب احد پہاڑ کے ثواب کے برابر ہے۔ جو نماز پڑھ کر لوٹے اور دفن میں شریک نہ ہو تو اس کو ایک قیراط کا ثواب ملے گا۔[۲] ایک روایت میں ہے کہ احد پہاڑ سے بھی زیادہ وزنی ہوگا۔ ایک اور روایت میں ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ وہ (ایک قیراط) ترازو میں احد پہاڑ سے بھی زیادہ بھاری ہوگا۔

عورت جنازے کے ساتھ نہیں جائے گی، کیوں کہ حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جنازے کے پیچھے چلنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔

نماز جنازہ میت کیلئے سفارش ہے اور اللہ تعالیٰ مومنین کی سفارش کو قبول فرماتا ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ "**ما من میت یصلی علیه امة من المسلمین یبلغون مأة، کلهم یشفعون له، الاشفعوا فیه**" ترجمہ: کسی بھی میت پر مسلمانوں کو ایک جماعت جن کی تعداد سو کو پہنچی ہو نماز جنازہ پڑھیں اور معافی کی سفارش کریں تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو ضرور قبول فرماتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کے جنازے میں چالیس ایسے افراد شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو ضرور بالضرور قبول فرماتے ہیں۔[۳]

نماز جنازہ پڑھانے کا حق بادشاہ کو یا اس کے نائب کو ہے، پھر قاضی کو، اس کے بعد بستی کے امام کو، کیونکہ میت اپنی زندگی میں اس کی امامت پر راضی تھا۔ پھر اس کے قریبی ولی باپ بیٹے سے مقدم ہے۔

---

[۱] [ابوداؤد ۳/۲۰۰] [۲] [بخاری ۱۴] [۳] [مسلم: ۲/۶۵۵]

عورت کے جنازے میں امام وسط کے برابر جبکہ مرد کے جنازے میں سینے کے برابر کھڑا ہو جائے گا۔ کیونکہ حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے ایک عورت کے جنازے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درمیان کے محاذی کھڑے تھے۔ امام نمازیوں کی تین صفیں بنائے۔ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس مسلمان مردے کے جنازے میں تین صفیں ہوتو ان کی دعائیں ضرور قبول ہوں گی۔[۱]

نماز جنازہ میں چار تکبیرات ہیں۔ کیونکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحمہ نجاشی کے جنازے میں چار تکبیریں ارشاد فرمائیں۔[۲]

پہلی تکبیر کے ساتھ رفع یدین کرے گا۔ پھر ہاتھوں کو دائیں کو بائیں پر رکھ کر سینے پر رکھے گا۔ باقی تکبیرات میں رفع یدین نہیں کرے گا۔ کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جنازہ میں صرف تکبیر اولیٰ میں رفع یدین کرتے پھر نہیں کرتے تھے۔[۳] پہلی تکبیر کے بعد تحمید، دوسری تکبیر کے بعد درود، تیسری تکبیر کے بعد اپنے لیے، میت کیلئے اور تمام مومنین کیلئے دعا کرے گا۔ سعید المقبریؒ کے والد نے ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ نماز جنازہ کس طرح پڑھتے ہیں: فرمایا تیری عمر کی قسم: میں ضرور تجھے بتادوں گا۔

جب جنازہ سامنے رکھا جائے تو میں تکبیر کہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی تحمید اور درود شریف کے بعد کہتا ہوں۔ اے اللہ! یہ تیرا بندہ ہے۔ تیرے بندے کا بیٹا ہے۔ اور تیری باندی کا بیٹا ہے تیری وحدانیت کی گواہی دیا کرتا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتا تھا۔ آپ اس کے متعلق زیادہ جانتے ہیں اور اے اللہ! اگر یہ نیکوکار تھا تو اس میں اور بھی اضافہ فرما، اگر گناہگار تھا تو اس کے گناہوں سے درگزر کا معاملہ فرما۔ اے اللہ! اس کے اجر سے ہمیں محروم نہ فرما۔ اس کے بعد ہمیں فتنے میں مبتلا نہ فرما۔[۴]

نماز جنازہ میں قرأت ہے نہ تشہد۔ حضرت نافع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نماز جنازہ میں قرأت نہیں کیا کرتے تھے۔[۵]

اگر کوئی سورۃ بہ نیتِ دعا پڑھے تو پڑھ سکتا ہے مگر تلاوت کی نیت سے پڑھنا مکروہ ہے۔ پیدائش کے وقت بچہ آواز نکال کر مرا تو نام بھی رکھا جائے گا، غسل دیا جائے گا اور نماز پڑھی جائے گی،

---

۱ [ابوداؤد ۳/۲۰۲] ۲ [بخاری:۲۶۲] ۳ [دارقطنی:۲/۷۵]

۴ [بخاری:۲۶۱] ۵ [الموطا ص ۱۷۷]

ورنہ ایک کپڑے میں لپیٹ دیا جائے گا اور نماز بھی نہیں پڑھی جائے گی کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے، بچہ اگر آواز نہ نکالے تو اس کی نہ نماز جنازہ ہے نہ وہ کسی کی میراث کا وارث ہوگا نہ ہی مورث۔[1]
امام دائیں اور بائیں سلام پھیرے گا۔ حضرت اسود بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ کے تین طریقوں کو لوگوں نے ترک کر رکھا ہے۔ ایک ان میں سے نماز سے فارغ ہو کر سلام پھیرنے کی طرح جنازے کا سلام پھیرنا بھی ہے۔[2]

کسی وجہ سے میت پر نماز جنازہ نہ پڑھی گئی ہو اور دفنا دیا گیا ہو تو گمان غالب اگر اس کے گلنے سڑنے کا نہ ہو تو قبر پر نماز پڑھ لی جائے گی۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک کالے رنگ کا شخص جو مسجد میں آیا تھا، کا انتقال ہوا۔ آپ ﷺ کو اس کے مرنے کی اطلاع نہیں ہوئی۔ ایک دن اس کا تذکرہ ہوا تو حضور ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا کہ اس شخص کا کیا بنا؟ لوگوں نے کہا: یارسول اللہ! اس کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ فرمایا! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ تو لوگوں نے اس کے متعلق کچھ ایسی گفتگو کی جس سے اس کی تحقیر ہوری ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کی قبر مجھے دکھاؤ، آپ ﷺ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نماز جنازہ پڑھی۔[3]

غائبانہ نماز جنازہ نہیں ہوگی۔ جہاں تک نجاشی کے نماز جنازہ کا تعلق ہے تو حضور ﷺ اس کو دیکھ رہے تھے مقتدیوں کو نظر نہیں آیا۔ تو یہ حاضر کا جنازہ ہوا غائب کا نہیں۔ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی ہے کہ آپ ﷺ (نجاشی کے جنازے کیلئے) کھڑے ہوئے، ہم نے آپؐ کے پیچھے صف بندی کی، صحابہ کا خیال نہیں تھا مگر جنازہ آپ ﷺ کے سامنے حاضر تھا اس کو اوزاعی یحی بن ابی کثیر عن ابی قلابہ عن ابی المھلب عن عمران بن حصین کی سند کے ساتھ بیان کیا۔

حضرت ابوعوانہؒ نے یحی ابن کثیرؒ کی روایت نقل کی ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کے پیچھے صف بندی کی ہم نہیں دیکھ رہے تھے مگر جنازہ آپ ﷺ کے سامنے حاضر تھا۔ اس طرح کی نماز جنازہ صرف نجاشی کی ہوئی۔ انہی کے ساتھ خاص ہے۔ کیوں کہ حضور ﷺ نے نجاشی کے بعد کسی بھی میت کی غائبانہ نماز جنازہ نہیں پڑھائی، جہاں تک معاویہ المزنیؓ کی نماز جنازہ کا تعلق ہے اس کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ہم آپ ﷺ کے ساتھ تبوک کے مقام پر تھے۔ ایک دن سورج خوب آب وتاب اور روشن ہو کر طلوع ہوا۔ پہلے میں نے اس طرح کبھی اس کو نہیں دیکھا تھا۔ اس دن معاویہ بن معاویہ اللیثیؓ کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی

---
۱ [ترمذی: ۲۴۸] ۲ [بیہقی: ۴/۴۳] ۳ [بخاری: ۲۶۲]

نماز جنازہ میں ستر ہزار فرشتے بھیجے تھے۔ آپ ﷺ سے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا گیا تھا۔ تو فرمایا: وہ دن رات، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے بکثرت قل ھو اللہ احد پڑھا کرتے تھے اور حضور ﷺ سے فرمایا گیا۔ زمین آپ ﷺ کے لیے طی کر لی جائے تو آپ ﷺ ان کی نماز میں شریک ہوں گے تو آپ ﷺ نے فرمایا، ہاں تو ایسا کیا گیا، آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی پھر لوٹے۔[1]

نماز کیلئے رکھے ہوئے جنازوں کی ترتیب

اگر مختلف جنازے مرد وعورتوں کے حاضر ہوں تو مردوں کے جنازے امام کی طرف اور عورتوں کے قبلہ کی جانب رکھے جائیں گے، چنانچہ حارث بن نوفلؓ کے غلام عمار کا کہنا ہے۔ میں ام کلثومؓ اور ان کے بیٹے کے اکٹھے جنازے میں شریک ہوا۔ لڑکے کو امام کی جانب اور ام کلثومؓ کو طرف قبلہ رکھا گیا۔ میں نے اس کو عجیب سا سمجھا اور اس جنازے میں ابن عباس رضی اللہ عنہ، ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ، ابو قتادہ رضی اللہ عنہ اور ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ جیسی شخصیات بھی شریک تھیں۔ انہوں نے فرمایا: یہی طریقہ سنت ہے۔[2]

اوقات مکروہہ میں نماز جنازہ پڑھنے کی کراہت

طلوع آفتاب اور غروب آفتاب اور زوال کے وقت نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔
حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے ہمیں تین اوقات میں نماز پڑھنے اور مردوں کو دفنانے سے منع فرمایا ہے۔ طلوع آفتاب کے وقت جب تک خوب مرتفع نہ ہو، زوال کے وقت جب تک سورج ڈھل نہ جائے اور غروب کے وقت جب تک غروب نہ ہو۔[3]

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہاں مردوں کو دفنانے سے مراد، نماز جنازہ پڑھنا ہے۔

حد لگنے سے مرنے والے پر نماز جنازہ

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ قبیلہ بنو جہنیہ کی ایک عورت آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور وہ زنا سے حاملہ تھی۔ حضور ﷺ نے اس کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا: رجم کیا گیا اور اس پر نماز جنازہ پڑھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! آپ اس پر نماز جنازہ پڑھ رہے ہیں اس نے تو زنا کا ارتکاب کیا ہے؟

---

۱ [بیہقی ۴/۵۰]　　۲ [ابوداؤد ۳/۲۰۸]　　۳ [ابوداؤد ۳/۲۰۸]

تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس نے تو ایسی توبہ کر لی ہے کہ اس کو مدینہ کے ستر افراد پر تقسیم کر دیا جائے تو ان کے لیے بھی کافی ہوگی، کیا تم نے ایسی توبہ دیکھی ہے جو اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے قربان کر دے۔[1]

خودکشی کرنے والے پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائیگی

حضرت جابر بن سمرہؓ کہتے ہیں: حضور ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو لایا گیا جس نے نیزے سے خودکشی کر لی تھی۔ آپ ﷺ نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھائی۔[2]

قبر میں لحد بنانا افضل ہے

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے مرض وفات میں وصیت فرمائی، میری قبر کو لحد بناؤ اور کچی اینٹوں سے بناؤ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کو بنایا گیا تھا۔[3]

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللحد لنا والشق لغیرنا''[4] ترجمہ: ''لحد ہمارے لیے ہے اور شق ہمارے غیروں کیلئے۔''

میت کی ہڈی کا احترام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے میت کی ہڈی کو توڑنا ایسا ہے جیسا کہ زندہ ہونے کی حالت میں توڑنا۔[5]

میت کو قبر میں اتارنے کی کیفیت

مردے کو قبلے کی طرف سے قبر میں اتارا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما میت کو قبلے کی جانب سے قبر میں اتارا کرتے تھے۔[6] اس روایت کی سند میں ایک راوی عبداللہ بن خراشؒ ہیں: ابن حبان نے اس کی توثیق کی اور علماء کی ایک جماعت نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔

میت کو قبر میں رکھنے والا قبر کے اندر رکھتے ہوئے یہ کہے گا۔ ''بسم اللّٰہ وعلی ملة رسول اللّٰہ'' کیونکہ حضرت علیؓ نے البزارؒ سے کہا۔ جنازہ جب قبر تک پہنچ جائے اور لوگ بیٹھ جائیں

---

۱ [صحیح مسلم:۳/۱۳۲۴] ۲ [مسلم۲/۶۷۲] ۳ [مسلم:۲/۶۶۵]
۴ [ابوداؤد:۳/۲۱۳] ۵ [ابوداؤد:۳/۲۱۳] ۶ [معجم الطبرانی:۱۱/۶۸]

تو تم نہ بیٹھنا، بلکہ قبر کے کنارے پر کھڑے رہنا، جب اس کو قبر میں اتارا جائے تو اس وقت کہنا: ”بسم اللّٰہ وعلی ملۃ رسول اللّٰہ“ اے اللہ! آپ کا بندہ آپ کے پاس آیا ہے۔ آپ بہترین میزبان ہیں۔ دنیا کو پیچھے چھوڑ کر آیا ہے۔ اس کے آگے منتظر کو پیچھے چھوڑے ہوئے سے بہتر فرمادے۔ جب یہ الفاظ کہہ چکو تو گویا تم نے ”وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ“ ترجمہ: اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ نیکوکاروں کیلئے بہت بہتر ہے۔“[1]

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔ ”میت کو جب قبر کے اندر رکھ دیا جائے تو اس کو قبر میں اتارنے والوں کو چاہیے کہ لحد کے اندر رکھتے ہوئے کہہ دیں۔ ”بسم اللّٰہ وباللّٰہ وعلی ملۃ رسول اللّٰہ“ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ جب میت کو قبر کے اندر اتارتے تو فرماتے: ”بسم اللّٰہ وعلی سنۃ رسول اللّٰہ“[2]

میت کو دائیں کروٹ پر قبلہ رخ لٹایا جائے گا۔ حضرت عمر بن قتادہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: سنو اللہ تعالیٰ کے اولیاء وہ لوگ ہیں جو نمازوں کو قائم کرتے ہیں، رمضان کے روزے رکھتے ہیں۔ الحدیث۔ اس موقع پر یہ بھی فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمہارے زندوں اور مردوں کے لئے قبلہ بنادیا۔[3]

مٹی کے اندر دفن کرنا

انسان کو اس مٹی کے اندر دفن کردیا جائے گا جس سے اس کو پیدا کردیا گیا ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کا گذر قبر کے پاس رکھے گئے ایک جنازہ کے پاس سے ہوا۔ آپ ﷺ نے پوچھا۔ کس کی قبر ہے؟ لوگوں نے بتایا یا رسول اللہ! فلاں حبشی کی ہے۔ فرمایا: ”لا الہ الا اللّٰہ“ اپنی زمین اور آسمان کے لیے اس مٹی کو لایا گیا جس سے اس کی تخلیق کی تھی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے کی جان کو جس علاقے میں قبض کرنا چاہتا ہے اس میں اس کے لیے حاجت وضرورت پیدا کرتا ہے۔[4]

قبر کو کوہان نما بنایا جائے گا۔ حضرت ابوبکر بن عیاشؒ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر کو کوہان نما دیکھا ہے۔ قبر کو پختہ کرنا مکروہ ہے۔ حضور ﷺ نے قبر کو چونے وغیرہ سے پلستر کرنے سے منع فرمایا۔ اسی طرح قبر پر بیٹھنے اور اس پر عمارت بنانے سے منع فرمایا ہے۔

---

[1] [المستدرک ۱/۳۶۶] [2] [ابوداؤد: ۳/۲۱۴]

[3] [المستدرک: ۱/۵۹] [4] [المستدرک ۱/۳۶۷]

قبور کے پاس نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ "**لاتجلسوا علی القبور ولاتصلوا الیھا**"[1] "قبور پر مت بیٹھو، اوران کی طرف رخ کر کے نماز بھی نہ پڑھو۔"

کسی مسلمان کا کوئی کافر قرابت دار مر جائے تو گندا کپڑا دھونے کی طرح دھو کر ایک کپڑے میں لپیٹ کر زیر زمین چھپا دے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے والد ابوطالب کے متعلق حضور ﷺ کو بتا دیا کہ آپ کا بوڑھا گمراہ چچا انتقال کر گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جاؤ اپنے والد کو (زمین میں) چھپا آؤ۔ میرے پاس آنے تک ہرگز کوئی بات چیت نہ کرنا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں گیا اس کو زمین کے اندر چھپا آیا۔ تو آپ ﷺ نے مجھے غسل کرنے کا حکم دیا اور میرے لیے دعا کی۔[2]

چاہے اس کو اس کے ہم مذہب لوگوں کے حوالہ کرے، تا کہ وہ اس کو اپنے مردوں کی طرح دفنا دیں۔ کافر کو نہ غسل شرعی دیا جائے گا نہ اس پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ کفن بھی نہیں دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے قبرستان میں بھی دفن نہیں کیا جائے گا۔

دفن کر کے لوٹتے وقت استغفار

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ میت کو جب دفن کر کے فارغ ہوتے تو تھوڑی دیر کیلئے وہاں ٹھہر کر فرماتے: اپنے بھائی کیلئے دعائے مغفرت کرو، اس کے لیے تثبیت (فرشتوں کی آمد کے موقع پر ثابت قدم رہنا) مانگو، ابھی اس سے سوال جواب ہونے والا ہے۔[3]

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ جب میت کو دفن کر کے مٹی اس پر ڈال کر برابر کر لیتے تو قبر پر کھڑے ہو کر یہ دعا کرتے، اے اللہ! تیرے بندے کو تیری طرف لوٹا دیا گیا۔ اس کے ساتھ رحمت و نرمی کا معاملہ فرما۔ اے اللہ زمین کو اس کے پہلوؤں سے دور کر دیجئے۔ اس کی روح کیلئے آسمان کے دروازے کھول دیجئے۔ اس سے بہتر انداز سے قبول کیجئے۔ اے اللہ! یہ اگر نیکوکار ہے تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما۔ اگر گناہگار ہے تو درگذر کا معاملہ فرما۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ایک طویل حدیث بیان کر کے آخر میں فرمایا: تم جب مجھے دفن کر چکو، تو میری قبر پر خوب مٹی ڈال دو، اور پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر تک کھڑے رہو کہ اونٹ ذبح کر کے گوشت تقسیم کرنے کی مقدار تا کہ میں تم سے مانوس رہوں اور دیکھ لوں کہ میں اللہ تعالیٰ کے رسولوں (فرشتوں) کو کیا جواب دیتا ہوں۔[4]

۱۔ [صحیح مسلم: ۲/ ۶۶۷] ۲۔ [ابوداؤد ۳/ ۲۱۴]

۳۔ [ابوداؤد: ۳/ ۲۱۵] ۴۔ [مسلم ۱/ ۱۱۲]

قبر کے پاس قرآن پڑھنا

کتاب ''شعب الایمان'' میں قبر کے پاس قرآن پڑھنے، دفن کے بعد میت کو تلقین کرنے، مردے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے، تعزیت کیلئے مردے کے گھر بیٹھے رہنے اور مردے کے گھر والوں کیلئے کھانا تیار کرنے، قبور کی زیارت، ایصال ثواب، قبر کے امتحان اور عذاب قبر سے نجات کے اسباب وغیرہ سمیت مباحث کے متعلق بڑا فائدہ مند مباحثہ آیا ہے۔ اس میں دیکھ لیا جائے۔

عورتوں کیلئے زیارت قبور

عورتوں کیلئے قبور کی زیارت جائز ہے۔ کیونکہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے جو قبر کے پاس بیٹھ کر رو رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا: ''اتق اللہ و اصبری'' اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور صبر کرو تو عورت نے کہا۔ جا اپنا کام کر، میری مصیبت تجھ پر نہیں آئی۔ عورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں پہچانتی تھی۔ لوگوں نے کہا: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں تو وہ عورت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے پر آئی اور کہنے لگی، میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان نہ سکی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''انما الصبر عند الصدمة الاولی''[1]

عبداللہ بن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں: حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال مقام الحبشی میں ہوا وہاں سے ان کو مکہ مکرمہ لاکر دفن کر دیا گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب مکہ آئیں تو ان کی قبر پر جا کر یہ اشعار پڑھے۔

وکنا کندمانی جذیمة حقبة
من الدهر حتی قیل
لن یتصرعا فلما تفرقنا کانی ومالکا
لطول اجتماع لم نبت لیلة معا

پھر فرمانے لگیں: اللہ کی قسم! میں اگر تیرے مرنے کے مقام میں حاضر ہوتی تو وہاں دفن کرتی جہاں تیرا انتقال ہوا تھا۔ اگر میں وہاں حاضر ہوتی تو یہاں تیری زیارت کیلئے نہ آتی۔ البتہ عورتوں کا بکثرت اور بار بار قبور کی طرف جانا مکروہ ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول

---

1. [بخاری:۲/۹۵]

نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ نے بکثرت زیارتِ قبور کرنے والی عورت پر لعنت کی ہے۔ ترمذی نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ علماء کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ یہ حدیث عورتوں کو قبور کی زیارت کرنے کی اجازت دینے سے پہلے کی ہے۔ جب آپ ﷺ نے قبور کی زیارت کی اجازت دی تو اس اجازت کے ضمن میں مرد وعورت دونوں داخل ہیں۔

امام مسلمؒ نے آپ ﷺ کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ "**نهيتكم عن زيارة القبور فزروها**"[۱] میں نے تمہیں قبور کی زیارت سے منع کیا تھا۔ اب قبور کی زیارت کرو۔" بعض نے کہا کہ عورتوں کیلئے قبور کی زیارت اس لیے مکروہ ہے کہ ان میں صبر کا مادہ کم ہوتا ہے۔ وہاں جا کر جزع و فزع کریں گی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا، یارسول اللہ! میں قبرستان جا کر کیا کہوں؟ فرمایا: کہو **السلام على اهل الديار من المومنين والمسلمين ويرحم الله المستقدمين منا والمستاخرين وانا ان شاء الله بكم للاحقون**۔[۲] مسلمانوں کے اہل دیار پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سے پہلے آنے والوں اور بعد میں آنے والوں پر رحم کا معاملہ فرماوے۔ ہم بھی ان شاء اللہ تم ہی سے ملنے والے ہیں۔

حاکمؒ کی روایت ہے کہ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا قبرستان سے ہوتے ہوئے آ رہی تھیں۔ ابن ابی ملیکہؒ نے ان سے کہا: ام المومنین! آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں؟ فرمانے لگی: اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کی قبر کے پاس سے، ابن ابی ملیکہؒ کہتے ہیں میں نے عرض کیا۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے زیارت قبور سے منع نہیں فرمایا تھا؟ فرمایا: ہاں منع فرمایا تھا پھر زیارت کی اجازت بھی دی تھی۔[۳]

مردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "تم مردوں کو برا بھلا مت کہو، کیونکہ وہ جو کچھ آگے بھیج چکے ہیں ان تک پہنچ چکے ہیں۔[۴] ارشاد رسول اللہ ﷺ ہے: کسی مسلمان کو کافر کہہ کر گالی مت دو۔[۵]

---

۱ [مسلم:۲/۶۷۲] ۲ [مسلم:۲/۶۷۲] ۳ [المستدرک ۱/۳۸۶]

۴ [بخاری:۲۷۵] ۵ [بیہقی ۴/۷۵]

کسی مردے کو قطعی جنتی یا جہنمی نہیں کہنا چاہیے

حضرت ام علاءؓ کہتی ہیں کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ہمارے ہاں ٹھہرے تھے۔ بیمار ہوئے ہم ان کی تیمارداری کرتے رہے حتی کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ہم نے ان کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ تو میں نے عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا: اے ابوالسائب تجھ پر اللہ کی رحمت ہو میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا اکرام کیا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: کہ تمہیں کس طرح پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا؟ میں نے کہا: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے نہیں معلوم۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عثمان کا انتقال یقیناً ہو چکا ہے۔ میں ان کے متعلق خیر کی امید کرتا ہوں، اللہ کی قسم! میں رسول اللہ ہونے کے باوجود نہیں جانتا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے۔ ام علاء کہتی ہیں۔ اللہ کی قسم: اس کے بعد میں نے کسی کے بارے کبھی بھی صفائی نہیں دی۔ کہتی ہیں ایک مرتبہ میں نے خواب میں عثمانؓ کیلئے چشمہ بہتا دیکھا۔ خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آ کر خواب بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ ان کا عمل ہے۔[1]

شہید کا حکم

صاحب ''اللسان'' نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان قربان کرنے والوں کو شہید کہا جائے گا۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ شہداء سبز رنگ کے پرندوں کے پوٹوں میں جنت کے درختوں میں ہوں گے۔ شہید زندہ ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ ''لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ'' [ال عمران: ۱۶۹] ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں سے رزق دیئے جاتے ہیں۔ یہاں زندہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ شہداء کی ارواح زندہ کر کے جنت میں حاضر کی جائیں گی اور غیر شہداء کی ارواح کو قیامت میں زندہ کیا جائے گا۔

صاحب ''التعریفات'' نے کہا ہے کہ شہید ہر اس مسلمان، طاہر، بالغ، مظلوم مقتول کو کہا جائے گا جس کے قتل پر مال واجب نہ ہو صرف قصاص ہو۔ اس کے احکام میں اصل شہدائے احد ہیں۔ شہدائے احد کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ تمہارے بھائی احد کے شہداء جب شہید ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ارواح کو سبز رنگ کے پرندوں کے اندر کر دیا جو جنت کی نہروں

---

[1] [بخاری: ۵۳۸]

سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جنت کے پھلوں کے مزے اڑا رہے ہیں۔ عرش کے نیچے لگے سونے کی قندیلوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ جب اپنے مزیدار اور پاکیزہ خورد ونوش اور پرسکون آرام گاہوں کے مزے لوٹتے تو کہتے ہیں: کون جا کر ہمارے بھائیوں کو بتائے گا کہ ہم جنت میں زندہ ہیں، اور رزق دیئے جارہے ہیں تاکہ وہ بھی جہاد میں منہمک رہیں اور جہاد سے روگردانی نہ کریں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہاری طرف سے یہ پیغام ان تک پہنچاؤں گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" [ال عمران: ۱۶۹]۔[۱]

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شہدائے احد کی نماز جنازہ پڑھائی۔ ابو مالک الغفاری کہتے ہیں: شہداء احد نو نو کر کے لائے جاتے۔ دسویں حضرت حمزہؓ ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جنازہ پڑھاتے جاتے۔ پھر یہ نو اٹھائے جاتے۔ دوسرے نو شہداء کو لایا جاتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھاتے اور حضرت حمزہؓ کا جنازہ اپنی جگہ پر برقرار رکھا جاتا۔ اس طرح کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام کی نماز جنازہ پڑھائی۔

شہید کو نہلایا نہیں جائے گا۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ احد کے دن آپؐ نے فرمایا۔ آپ میں سے حمزہ کی جائے قتل کو کسی نے دیکھا ہے؟ ایک شخص نے کہا: میں نے دیکھا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ چلو مجھے دکھاؤ۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں پہنچ کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ تو دیکھا کہ ان کا پیٹ چاک کر دیا گیا ہے اور ان کے اعضاء کاٹے گئے ہیں۔

تو اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! ان کے اعضاء کاٹ دیئے گئے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں فرمایا۔ پھر شہداء کے درمیان میں کھڑے ہو کر فرمایا: میں ان پر گواہ ہوں۔ ان کے خونوں کے ساتھ ان کو دفنا دو، اس لیے کہ قیامت کے دن ہر زخم سے خون بہہ رہا ہوگا۔ رنگ اس کا خون کا ہوگا مگر خوشبو مشک کی طرح ہوگی دفنانے میں اس کو مقدم کرو، جس کو زیادہ قرآن یاد ہو۔[۲]

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: شہید، عاقل، بالغ اور طاہر ہو تو اس کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ اگر بچہ شہید ہو جائے، یا بحالت جنابت آدمی، یا عورت بحالت حیض یا نفاس شہید ہو جائے۔ تو غسل دیئے جائیں گے حیض و نفاس کا حکم ان کے نزدیک ایک ہی ہے بچے کو کیوں نہلایا جائے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ابن آدم کے مردوں میں اصل نہلانا ہے بالغ شہید کو اس لیے غسل نہیں

---

۱ [ابوداؤد: ۳/۲۵] ۲ [بیہقی: ۴/۱۱]

دیا جاتا ہے کہ شہادت گناہوں کو دھو ڈالتی ہے، اور اس کا اثر باقی رہے گا جب کہ بچے کے اندر یہ معدوم ہے تو اپنے اصل پر ہی رہے گا۔ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک شہید بچے کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ وہ اس کو بالغ پر قیاس کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جنبی کو غسل نہیں دیا جائے گا۔ اس لیے کہ موت کی وجہ سے غسل جنابت ساقط ہو گیا۔ حائضہ اور نفساء کا حکم بھی ان کے نزدیک جُنب کی طرح ہے۔

جنبی شہید کو غسل دینے کے متعلق امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل قصہ احد میں عبداللہ بن الزبیر کی روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شداد بن اوس جن کو شعوب حنظلۃ بن ابی عامرؓ بھی کہا جاتا ہے۔ احد میں شہید ہوئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا: تمہارے ساتھی کو فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ سے ان کے متعلق دریافت کرلو۔ ان کی بیوی نے کہا۔ وہ جنب تھے، اعلان سنتے ہی اسی حالت میں نکلے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اسی لیے فرشتے ان کو نہلا رہے تھے۔[1] جو میدان جنگ میں مردہ حالت میں ملے اور بدن پر زخم وغیرہ نہ ہو۔ تو اس کو نہلایا جائے گا۔ کیوں کہ اس کی شہادت میں شبہ ہو گیا۔

شہید کو اس کے پہنے ہوئے کپڑوں کے ساتھ ہی دفنایا جائے گا یہی اس کے لیے کفن ہوگا البتہ اگر زیادہ کپڑے پہنے ہوئے ہو تو کمی کی جائے گی۔ اگر کم ہو تو اضافہ کیا جائے گا۔ تا کہ کفن سنت کے مطابق ہو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک شخص کے سینے یا حلق میں تیر پیوست ہو گیا۔ اور اسے اس کے کپڑوں کے ساتھ کفن دیا گیا۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت حمزہؓ کو ایک چادر میں کفن دیا گیا۔ جب اس کو سر کی طرف کھینچتے تو پاؤں باہر نکلتے اور پاؤں کی طرف کرتے تو سر کھل جاتا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ چادر سر کی طرف کر دی جائے اور پاؤں پر اذخر کے پتے ڈال دیئے جائیں۔[2]

مرتث کو غسل دیا جائے گا، مرتث اسے کہیں گے جو میدان جنگ سے زخمی حالت میں اٹھایا جانے کے بعد مر جائے۔ میدان جنگ میں مردہ حالت میں پایا جانے والا مرتث نہیں ہوگا۔ میدان جنگ میں زخمی ہو کر کھائے، یا پیئے یا دواء استعمال کرے یا اور کوئی دنیاوی کام کرے۔ مثلاً کوئی چیز بیچے یا خریدے یا نماز پڑھے، یا جنگ کے میدان سے اٹھایا جائے۔

کچھ کام کیے بغیر ہوش کے ساتھ ایک دن سے زیاد گزار دے تو مرتث ہے۔ غسل دیا جائے گا کیونکہ اس نے زندگی کے کچھ فوائد پائے جس سے ظلم کا اثر کچھ کم ہو گیا۔

---

[1] [المستدرک ۲/۱۲۰] [2] [المستدرک ۲/۱۲۰]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زخمی ہونے کے بعد کافی کلام فرمایا: کچھ کھایا، دودھ نوش فرمایا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھی شہید کردیا گیا تھا ان کو کپڑوں کے ساتھ دفن کردیا گیا۔ غسل نہیں دیا گیا۔ کیونکہ ان کو مظلومانہ انداز سے قتل کردیا گیا تھا۔

قصاص یا حد لگنے کی وجہ سے قتل ہوجائے تو غسل بھی دیا جائے گا۔ نماز بھی پڑھی جائے گی۔ باغیوں یا ڈاکوؤں پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ کیوں کہ یہ زمین میں فساد پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔

''ذٰلِکَ لَھُمۡ خِزۡیٌ فِی الدُّنۡیَا'' [المائدہ:۳۳] نماز جنازہ چونکہ دربار الٰہی میں میت کی معافی کی سفارش ہے۔ یہ لوگ لائق سفارش ہرگز نہیں۔

﴿باب المساجد﴾

مسجد کی فضیلت

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "احب البلاد الی اللہ مساجدھا وابغض البلاد الی اللہ اسواقھا" تمام شہروں میں اللہ تعالیٰ کو محبوب ترین جگہیں مساجد ہیں۔ اور مبغوض ترین جگہیں بازار ہیں۔

مسجد بنانے کی فضیلت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جو اللہ کی رضا مندی کی خاطر مسجد بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ جنت میں اسی طرح اس کے لیے گھر بنائے گا۔ ارشاد خداوندی ہے۔ "اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ وَ لَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ". [توبہ:۱۸]

توسیع مسجد

حضرت زید بن اسلمؒ کہتے ہیں: مدینہ کی مسجد کے ساتھ حضرت عباس بن عبدالمطلب کا مکان تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔ یہ مکان میرے ہاتھ فروخت کرو۔ حضرت عمرؓ کا اس کو مسجد میں شامل کر کے توسیع کرنا چاہ رہے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مکان بیچنے سے انکار کر دیا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ مجھے ہبہ کر دو۔ اس پر بھی راضی نہ ہوئے تو فرمایا: آپ خود اس کو مسجد میں شامل کر کے توسیع کر لو۔ اس کو بھی اختیار نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا ان میں سے ایک تو ضرور کرنا پڑے گا۔ تو پھر ہمارے درمیان ایک حکم مقرر کر لو، تو حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حکم کے طور پر درمیان میں ڈال دیا۔ ان کے سامنے دونوں کا مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ تم ان کو راضی کیے بغیر گھر سے بے دخل نہیں کر سکتے ہو۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم یہ بتاؤ کہ تم نے یہ فیصلہ قرآن کی روشنی میں کیا ہے یا سنت رسول کے مطابق کیا ہے؟ حضرت ابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ کس طرح؟ تو حضرت ابی رضی اللہ عنہ

نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جب بیت المقدس تعمیر فرمانے لگے۔ تو جب دیوار تکمل کر کے چلے جاتے تو صبح ہوتے ہی وہ گر جاتی۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی۔ تم ایک آدمی کے حق میں تعمیر نہیں کر سکو گے جب تک اس کو راضی نہ کرلو۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا مطالبہ ترک کر دیا۔ بعد میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے خود اس کو مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع فرمائی۔

دنیا میں سب سے پہلے بنائی گئی مسجد

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمین پر سب سے پہلے کونسی مسجد بنائی گئی ہے؟ فرمایا: مسجد حرام، میں نے عرض کیا۔ اس کے بعد کونسی؟ فرمایا۔ مسجد اقصیٰ، میں نے عرض کیا: ان کے درمیان کتنی مدت ہے۔ فرمایا: چالیس سال جہاں تمہیں نماز ملے وہی پڑھ لو۔ مسجد ہے۔[1]

مسجد حرام کی سب سے پہلے تعمیر حضرات ابراہیم علیہ السلام اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کی۔

مسجد نبوی کی بناء

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مسجد نبوی کی دیواریں کچی اینٹوں اور چھت کھجور کی ٹہنیوں اور ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس میں کوئی توسیع نہیں کی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس میں توسیع فرمائی۔ اور اس کی دیواریں عہد نبوی کی طرح کچی اینٹوں، چھت کھجور کی ٹہنیوں سے ہی بنوائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں مزید اضافہ فرمایا۔ اس کی دیواریں منقش پتھروں اور ستون بھی خوبصورت پتھروں سے بنائے اور چھت ساج کی تھی۔[2]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی میں ایک دروازہ عورتوں کے لئے مخصوص فرمایا تھا اور فرمایا تھا کہ اس دروازے سے ہرگز کوئی مرد داخل نہ ہو۔'' حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہ کو کبھی بھی اس دروازے سے داخل ہوتے دیکھا نہ نکلتے ہوئے۔[3]

مسجد نبوی کا منبر

مدینہ منورہ میں ایک عورت تھی۔ اس کا ایک رومی غلام تھا اور بڑھئی کا کام کرتا تھا اور کاریگر

---

[1] [مسلم:۱/۳۷۰] [2] [صحیح بخاری:۹۵] [3] [ابوداؤد طیالسی]

تھا۔ حضور ﷺ نے اس عورت کے پاس پیغام بھیجا کہ اپنے غلام سے کہہ دو کہ میرے لئے منبر بنائے جس پر میں بیٹھ جاؤں۔ ایک روایت میں ہے اس عورت نے خود ہی آنحضرت ﷺ سے کہا تھا۔ یارسول اللہ! میں آپ کے بیٹھنے کیلئے کوئی چیز نہ بنوادوں؟ کیونکہ میرا غلام لکڑیوں کا کاریگر ہے۔[1]

بیت نبوی اور منبر کی درمیانی جگہ کی فضیلت

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ "**مابین بیتی ومنبری روضة من ریاض الجنة**"[2] میرے گھر اور منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

مسجد قبا اور اس میں نماز کی فضیلت

عبداللہ بن دینارؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر ہفتے کے دن مسجد قباء تشریف لے جاتے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ہر ہفتے کے دن یہاں تشریف لاتے دیکھا ہے۔[3]

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ جو شخص مسجد قباء میں آکر نماز پڑھے، اس کو عمرہ کرنے کے برابر ثواب ملے گا۔[4] امام نوویؒ کہتے ہیں یہ حدیث مسجد نبوی کے مسجد تقوی ہونے پر نص ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک مسجد تقویٰ کا مصداق مسجد قباء ہے۔ کیونکہ کئی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد تقوی سے مراد مسجد قباء ہے۔ بہرحال میرے نزدیک مسجد تقوی مسجد نبوی اور مسجد قباء دونوں ہیں۔

مساجد کیلئے رخت سفر باندھنا

حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔ **لاتشد الرحال الا الی ثلاث مساجد: مسجد الحرام، مسجدی هذا و مسجد الاقصی**"[5] تین مساجد مسجد حرام، میری اس مسجد اور مسجد اقصی کے علاوہ کسی اور مسجد کیلئے سفر نہیں کیا جائے گا۔ شیخ السبکی رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ روئے زمین پر ایسی کوئی جگہ نہیں جس کی ذاتی فضیلت ہو جس کو حاصل کرنے کیلئے اس کی طرف رخت سفر باندھا جاسکے، سوائے مذکورہ تین مقامات کے ان تین مقامات کے علاوہ کسی جگہ کی طرف اس کی ذاتی فضیلت کی بنا پر خصوصی سفر نہ کیا جائے۔ ہاں جہاد کی غرض یا حصول علم کیلئے یا اور کسی غرض کیلئے سفر کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ ایک عورت نے بیمار ہو

---

[1] [بخاری:۹۶] [2] [نسائی ۲/۲۵] [3] [مسلم:۲/۱۰۱۶]
[4] [نسائی:۲/۳۷] [5] [نسائی:۲/۳۷]

کر یہ نذر مانی کہ اگر میں اس بیماری سے شفایاب ہوئی تو بیت المقدس کی طرف نکلوں گی اور وہاں جا کر نماز پڑھوں گی، چنانچہ تندرست ہوگئی اور بیت المقدس کی طرف سفر کرنے کی تیاری کر لی اور جاتے وقت ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے ملنے اور سلام عرض کرنے کیلئے حاضر ہوئی اور اپنا ارادہ ان کے سامنے بیان کر دیا۔ تو حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ بیٹھ جاؤ، اور جو کچھ سفر کے لیے تیار کیا ہے اس کو یہیں استعمال کرو اور مسجد نبویؐ میں جا کر نماز پڑھو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ ''صلاة فيه افضل من الف صلوة فيما سواه الامسجد الكعبة'' میری مسجد میں ایک نماز دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ایک ہزار گنا زیادہ ہے سوائے مسجد حرام کے۔

یعنی کعبہ میں نماز پڑھنا میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ مذہب ائمہ ثلاثہؒ، ابن وہبؒ، امام مالکؒ اور علماء کی ایک بڑی جماعت کا ہے۔

مسجد حرام اور مسجد نبوی میں نماز کی فضیلت

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ دوسری مساجد کے مقابلے میں میری اس مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب ایک ہزار نمازوں سے بڑھ کر ہے سوائے مسجد حرام کے۔[1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **صلوٰة فى مسجدى هذا افضل من الف صلوة فيما سواه الا المسجد الحرام و صلوٰة فى المسجد الحرام افضل من مائة الف صلوة فيما سواه.''**[2]

''میری اس مسجد میں نماز ادا کرنا دوسری مساجد کی نسبت ہزار نمازوں سے افضل ہے، سوائے مسجد حرام کے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں نماز پڑھنے سے ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص میری مسجد میں بلا ناغہ مسلسل چالیس نمازیں ادا کرے گا اس کو جہنم سے برأت کا ٹکٹ ملے گا اور عذاب سے نجات ہوگی۔ نفاق سے برأت ہوگی۔[3]

مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھنے کی فضیلت

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: مسجد حرام میں نماز پڑھنا ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، میری مسجد میں نماز پڑھنا ایک ہزار اور بیت المقدس میں نماز پڑھنا

---

[1] [نسائی: ۲/۳۵] [2] [الفتح الربانی: ۲۲/۲۴۶] [3] [الفتح الربانی ۲۳/۲۷۲]

پانچ سو نمازوں کے برابر ہے۔[۱]

مسجد کی طرف چلنے کی فضیلت

جو شخص وضو کر کے مسجد جا کر نماز کی رعایت کرے گا۔ تو اس کے اعمال لکھنے والے فرشتے مسجد کی طرف چلنے والے کے ہر ہر قدم پر دس نیکیاں لکھیں گے۔ مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرنے والا نماز پڑھنے والے کی طرح ہے۔ گھر سے نکلتے ہی وہ نماز میں مشغول شمار ہوگا۔ حتیٰ کہ دوبارہ گھر لوٹے۔[۲]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر تم کسی شخص کے اندر مسجد جانے کی عادت دیکھو تو اس کے مومن ہونے کی گواہی دو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ'' [۳][توبہ:۱۸] مسجدوں کو آباد وہ لوگ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔

مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کا سنت طریقہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں اندر اور باہر نکلنے کے وقت بائیں پاؤں کو باہر رکھنا سنت ہے۔[۴]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اگر تم مسجد میں داخل ہو جاؤ تو کہو اللھم افتح لی ابواب رحمتک اور نکلو تو ''اللھم انی اسئلک من فضلک'' کہا کرو۔[۵]

مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے نماز پڑھنا

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے: جو تم میں سے مسجد میں داخل ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔[۶] لیکن بیٹھنے سے پہلے نہ پڑھ سکے۔ تو مسجد سے نکلنے سے پہلے پڑھ کر نکلے۔ پہلے پڑھنا بہر حال بہتر ہے۔

مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت

حضرت سائب بن یزید کہتے ہیں: میں مسجد میں کھڑا تھا کہ کسی نے مجھے سنگریزے سے مارا، مڑ کر دیکھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ مجھ سے فرمایا: اٹھیے ان دو شخصوں کے پاس چلتے ہیں مجھے لے کر مسجد کے اندر دو افراد کے پاس گئے۔ ان سے پوچھا۔ تم کہاں کے ہو؟ وہ کہنے لگے۔ ہم طائف

---

۱ [الترغیب والترہیب:۲/۲۱۶] ۲ [المستدرک ا/۲۱۱] ۳ [المستدرک ۲۱۲]
۴ [المستدرک ۲۱۸] ۵ [نسائی:۲/۳۵] ۶ [ترمذی:ا/۱۹۸]

سے آئے ہیں۔ فرمایا اگر تم مقامی ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا، تم مسجد رسول اللہ ﷺ میں بلند آواز سے باتیں کر رہے ہو۔[1]

حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے دادا کے حوالے سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں شعر گوئی سے منع فرمایا ہے۔ بیع وشراء اور جمعہ کے دن اور حلقہ بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔[2] یہاں شعر گوئی سے مراد اشعارِ مذمومہ ہیں۔ ورنہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مسجد میں انشاد شعر کی اجازت دی تھی اور انہیں فرمایا تھا۔ ''اجب عنی'' میری طرف سے کفار کو جواب دیا کرو، پھر ان کیلئے دعاء دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ ''اللھم ایدہ بروح القدس'' اے اللہ! جبریل کے ذریعے اس کی مدد فرما۔[3]

مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرنا بھی منع ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک شخص نے مسجد نبوی میں آکر اپنی گمشدہ چیز کا اعلان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لا وجدت'' تمہیں نہ ملے۔[4]

مواضع عذاب میں نماز پڑھنے کی ممانعت

قوم ثمود کی بستی کے بارے میں جس پر عذاب آیا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس معذّب قوم کے دیار میں مت داخل ہو جاؤ۔ اگر جانا ہوا تو روتے ہوئے گزر جاؤ، اگر رو کر نہیں جا سکتے ہو تو داخل ہی مت ہو۔ کہیں ان کا عذاب تم پر نہ آئے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی اہل کتاب سے فرمایا تھا: ہم تمہارے عبادت خانوں میں تصویروں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ عیسائیوں کے ان عبادت خانوں کے اندر نماز پڑھتے جہاں تصویر نہ ہوتی۔ اہل کتاب کے متعلق آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں: اگر ان کا کوئی نیک بندہ انتقال کر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس کی تصویر بنا کر اس میں رکھ دیتے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شریر ترین مخلوق ہیں۔[5]

مسجد میں ریح خارج کرنے کی ممانعت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فرشتے اس انسان کیلئے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اپنے مصلی میں بیٹھا رہے اور حدث لاحق نہ کرے۔ اور کہتے ہیں۔ اللھم اغفر لہ اللھم ارحمہ[6]

---

[1] [بخاری:۱۰۰] [2] [ترمذی:۲۰۲] [3] [نسائی:۲/۴۸]

[4] [بخاری:۹۳] [5] ٥ [بخاری:۹۳] [6] [ابوداؤد/۱۳۰]

مسجد میں تھوکنے کی ممانعت

حضور ﷺ بسا اوقات کھجور کی ٹیڑی آپؐ کے دست مبارک میں ہوتی، مسجد میں تشریف لانے کے بعد قبلہ کی جانب تھوک لگا دیکھ کر اس کو مٹا دیا اور لوگوں کی طرف غضب ناک حالت میں متوجہ ہو کر فرمایا۔ ''تم میں سے کوئی شخص اس پر خوش ہوگا کہ اس کے چہرے پر تھوک دیا جائے۔ تم جب قبلہ رخ ہوتے ہو تو تم اپنے رب کے سامنے ہوتے ہو اور فرشتہ تمہاری دائیں جانب ہیں لہٰذا دائیں طرف اور نہ قبلہ کی طرف تھوکے، اگر تھوکنا ہو تو بائیں طرف یا اپنے قدموں کے نیچے۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو اس طرح کرے۔[۱] یعنی کپڑے کے اندر تھوک کر اس کو لپیٹ دے۔

مسجد میں سونے کا حکم

مسافر کیلئے مجبوری کی حالت میں مسجد میں سونا جائز ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ قبیلہ ''بنو عکل'' کی ایک جماعت آئی اور صفہ میں ٹھہرے۔[۲] یعنی مسجد کی وہ جگہ جہاں اصحاب صفہ ٹھہرا کرتے تھے۔

لہسن یا پیاز کھا کر یا کسی قسم کی بدبو کسی کے بدن سے آ رہی ہو اس کے لیے مسجد میں آنا مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے مسجد کے نمازیوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا۔ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے: جو شخص لہسن یا پیاز کھالے تو وہ ہماری مساجد کے قریب نہ آئے۔ اس لیے کہ جس سے انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔ فرشتوں کو بھی اس سے تکلیف ہوتی ہے۔[۳]

حضرت معدان بن ابی طلحہؒ کہتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگو! تم دو درختوں سے کھاتے ہو، میں ان کو خبث سمجھ رہا ہوں، یعنی لہسن اور پیاز، میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ جس سے ان کی بو محسوس فرماتے اس کو بقیع سے نکال دینے کا حکم فرماتے جو تم میں سے ان کو کھانا چاہے تو اس کو چاہیے کہ پکا کر ان کی بو ختم کر دے۔[۴]

حائضہ اور جنبی بھی مسجد کے اندر داخل نہ ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اپنے گھروں کے دروازوں کا رخ بدل دو، صحابہؓ نے رخصت کی امید میں تبدیل نہیں کیے حتی کہ آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: ان گھروں کے دروازے مسجد سے دوسری طرف کر دو اس لیے کہ

---

۱ [ابوداؤد: ۱/۱۳۰] ۲ [نسائی ۲/۴۲]

۳ [نسائی: ۲/۴۲] ۴ [نسائی: ۲/۴۲]

میں کسی حائضہ اور جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونے کو نہیں حلال کرتا۔[۱]

اسی طرح آپ ﷺ نے اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ سکتے ہو مگر اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھو۔[۲]

اس کے علاوہ سات مقامات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ کوڑا خانہ میں، قصاب خانہ میں، قبرستان میں، راستے کے بیچ میں، حمام کے اندر، اونٹوں کے باڑے میں، کعبہ کی چھت پر۔[۳]

---

[۲] [ترمذی: ۱/ ۲۱۷] [۳] [ترمذی: ۱......۲۱۸]

﴿کتاب الزکوٰۃ﴾

زکوٰۃ کی لغوی واصطلاحی تعریف

زکوٰۃ کا لغوی معنی زیادتی ہے۔ جب مال زیادہ ہو جائے تو اہل عرب کہتے ہیں "زکی المال" اور طہارت و پاکی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اہل عرب کہتے ہیں فلاں زکی العرض، اس نے اپنی عزت کو پاک رکھا۔ اور اصطلاح شرع میں مخصوص مال میں سے مخصوص حصے کا کسی مخصوص شخص کو مالک بنانا اللہ کیلئے حصہ مخصوص یعنی اموال تجارت میں سے مال کا چالیسواں حصہ، زمین کی پیداوار میں سے دسواں حصہ، بکریوں گائیوں اور اونٹوں میں مقرر شدہ حصہ جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ مال مخصوص سے مراد نصاب کے مطابق مال اور شخص مخصوص سے مراد، فقیر، مسکین اور دوسرے مصارف زکوٰۃ۔ اللہ کیلئے ہونے کی نیت تو تمام عبادات کے صحیح ہونے کی شرط ہے۔

زکوٰۃ کی فرضیت

زکوٰۃ نماز کے بعد افضل ترین عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بتیس مقامات پر صلوٰۃ کے ساتھ مقارن بیان فرمایا ہے۔ ۲ ہجری میں روزے سے قبل اس کی فرضیت آئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: "وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ" [البقرہ:۲۷۷] دوسری جگہ ارشاد ہے۔ "خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا" [توبہ:۱۰۳] اور حدیث شریف سے بھی اس کی فرضیت ثابت ہے۔ چنانچہ "بنی الاسلام علی خمس" والی حدیث اور عبدالقیس کے وفد کو آمرکم باربع وانھکم عن اربع والی حدیث سے اس کی فرضیت ثابت ہے اور اس کی فرضیت پر امت کا اجماع ہے۔

مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط

پہلی شرط: نماء "بڑھوتری" اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) حقیقی تجارت کی صورت میں۔ جانوروں کے توالد وتناسل کی صورت میں۔ (۲) تقدیری: مال خود اس کے ہاتھ میں ہو یا اس کے وکیل کے پاس ہو۔ اس میں بھی زیادہ ہونے کی گنجائش ہوتی ہے۔

خرچ کرنے کیلئے جمع شدہ مال پر زکوٰۃ نہیں۔اسی طرح ان مکانات پر زکوٰۃ نہیں ہے جو تجارت کیلئے نہ ہوں۔اسی طرح کتابیں جو تجارت کیلئے نہ ہوں ان پر بھی زکوٰۃ نہیں۔کیوں کہ یہ تمام چیزیں نامی (بڑھنے والی) نہیں ہیں۔

دوسری شرط

کامل نصاب ہونا ہے۔نصاب وہ متعین مقدار ہے جو شریعت نے سونے چاندی میں مقرر فرمائی ہے یا چوپایوں، بکریوں، گائیوں اور اونٹوں میں ایک مقدار مقرر ہے۔

تیسری شرط

حولان حول (نصاب کے مکمل ہونے کے بعد مکمل ایک سال (قمری) گزرنا) سال گزرنے کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ سال مختلف موسموں پر مشتمل ہوتا ہے کہ جس سے مال کا بڑھنا ممکن ہوتا ہے۔حضور ﷺ کا ارشاد ہے۔"ولا زکوٰۃ فی مال امرء حتی یحول علیه الحول"[1] ترجمہ:"انسان کے مال پر سال گزرنے سے پہلے کوئی زکوٰۃ نہیں ہے۔"

چوتھی شرط

ایسے مال پر کوئی زکوٰۃ نہیں جس کا کوئی مالک نہ ہو جیسے لقطہ (راستے سے ملی ہوئی چیز) اسی طرح ایسے مال پر بھی زکوٰۃ نہیں جس پر قرض حاوی ہو۔کیوں کہ یہ ناقص مِلک ہے۔اس لیے قرض خواہ اس سے بغیر اس کی رضا و خوشی کے لے سکتا ہے۔جبکہ زکوٰۃ نعمتِ کاملہ کے شکرانے کے طور پر واجب ہے۔

پانچویں شرط

ضرورت اصلی سے فارغ ہونا۔لہٰذا جو ضرورت اصلیہ میں مستعمل ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ مثلاً رہنے کا مکان، پہننے کے کپڑے، سواریاں، گھر کے ساز و سامان، کاریگری کے سامان، صاحب علم کیلئے مطالعے کے لئے کتابیں۔

اسی طرح اس مال پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے جس کو سال بھر کی ضرورت اصلیہ کیلئے روکے رکھا ہے۔چنانچہ سال گزر جائے اگر کچھ باقی بچا ہو تو اس بچے ہوئے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ اگلے سال کے لیے خرچ کی نیت ہی کیوں نہ ہو۔کیونکہ یہ ضرورت اصلیہ میں خرچ نہیں ہوا۔

---

[1] [دار قطنی:۲/۹۰]

گمشدہ مال دو سال کے بعد ملے تو اسی پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے مال ضمار میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ مال ضمار اس مال کو کہا جاتا ہے جس کے گم ہو جانے کے بعد ملنے کی امید نہ ہو۔ اسی طرح اس مال پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے جو کسی شخص کے پاس کئی سال سے ہو اور وہ اس کا انکار کر رہا ہو۔ چنانچہ اس کے ملنے پر سابقہ سالوں کی زکوٰۃ دینا واجب نہیں ہوگا۔ اسی طرح کسی نے مال غصب کر لیا اور مالک کے پاس کوئی بینہ اور ثبوت نہ ہو کہ عدالت میں پیش کر سکے۔ تو ایسے مال کے ملنے پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ یعنی گزشتہ سال کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں۔

اسی طرح اس مال پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جو کسی غیر معروف کے پاس امانت رکھوا کر اس کی پہچان نہ کر سکتا ہو اور سالہا سال گذر جائیں۔ یعنی بعد میں وہ شخص خود لائے یا کسی طرح یاد آ جائے اور مال ملے تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ دینا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح دریا کے اندر گرے ہوئے مال، یا کسی جگہ دفن کر کے جگہ بھول جائے اور بعد میں مال مل جائے تو گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں۔ اسی طرح اگر مقروض بھاگ جائے اور قرض خواہ اس کے پیچھے جائے اور تلاش کرنے کی نہ خود طاقت رکھتا ہو نہ وکیل کی گنجائش ہو تو اس مال کے ملنے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کنگال شخص پر قرض ہو جس کو باقاعدہ عدالت مفلس قرار دے یا ایسے شخص پر قرض ہو جو اس کا منکر ہو مگر قرض خواہ کے پاس بینہ موجود ہو تب بھی امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اگر مال کے غصب ہونے پر مغصوب عنہ کے پاس کوئی گواہ موجود ہو تو مال ملنے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

اگر مال مدفون گھر میں یا کسی قریبی جگہ پر دفن کیا ہو۔ کئی سالوں کے بعد مل جائے تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔ یا امانت کسی جان پہچان والے شخص کے پاس رکھ کر سالہا سال بھول جائے اور پھر وہ ملے اس کی بھی زکوٰۃ دینا ضروری ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جب لوگوں کے اموال ان کو واپس کیے تو ان سے کہا گیا۔ ان اموال پر گزرے سالوں کی زکوٰۃ تو آپ لے سکتے ہیں؟ فرمایا نہیں یہ مال، مال ضمار ہے۔ عبادات کے وجوب اور اسقاط میں عقل وقیاس کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ یہ امور توقیفیہ ہیں۔ دوسری بات یہ کہ یہ اموال، اموال نامی (بڑھنے والے) نہیں ہیں اس لیے کہ نمو (بڑھنا) اس کو حرکت میں لانے سے ہوگا جس سے یہ عاجز تھے۔

اگر کوئی شخص سامان تجارت کی غرض سے خریدے۔ پھر گھریلو استعمال کرنے کی نیت کر لے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ عمل کے ساتھ نیت (ترک تجارت کی) متصل ہوگئی۔ گھر میں استعمال کرنے کی نیت کرنے کے بعد پھر نیت میں تبدیلی کر کے ان سے دوبارہ تجارت کی

نیت کی۔ تو تب بھی تک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جب تک ان کو فروخت نہ کرلے اور فروخت کرنے کے بعد ان کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اس لیے کہ عمل کے ساتھ نیت متصل نہیں ہوئی کیونکہ اس نے اس میں تجارت شروع نہیں کی۔ اس لیے نیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مسافر صرف اقامت کی نیت کرنے سے مقیم ہوتا ہے جبکہ مقیم محض نیت کرنے سے مسافر نہیں بنے گا جب تک کہ عملاً سفر شروع نہ کردے۔

کوئی چیز خریدی اور خریدتے وقت تجارت کی نیت کی، تو وہ مال تجارت ہے کیوں کہ عمل کے ساتھ نیت متصل ہوئی۔ بخلاف وراثت میں ملا ہوا مال کہ اگر مال ملتے ہی تجارت کی نیت کرلے تو مال تجارت کے احکام اس پر لاگو نہیں ہوں گے۔ کیونکہ اس کے ساتھ اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ لہٰذا میراث میں ملے ہوئے مال پر زکوٰۃ نہیں ہوگی اگر اس کے پاس سوائے اس مال کے اور کوئی مال بقدر نصاب نہ ہو۔ الا یہ کہ اس پر تصرف کرلے۔ (گذشتہ مسئلہ کی طرح)

درمیان سال میں نصاب کے ہم جنس مال ملے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ چنانچہ، سونا، چاندی، دراہم ودنانیر اور سامان تجارت ایک جنس شمار ہوتے ہیں۔ بعض کو بعض کے ساتھ ضم کرکے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ جانوروں میں بکری، گائے، اونٹ جدا جدا جنس ہیں لہٰذا بکریوں کو گائیوں کے ساتھ ملا کر مجموعہ پر زکوٰۃ ادا کی جائے ایسا نہیں ہے۔ ہبہ، وراثت یا وصیت کی وجہ سے ملے ہوئے مال پر سال کے مکمل ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی یعنی موجودہ نصاب کے ساتھ ضم کرکے نصاب پر سال مکمل ہو جائے۔ زکوٰۃ کی قیمت زکوٰۃ کی مد میں فقراء کو دینا بھی جائز ہے۔ اسی طرح صدقہ فطر میں قیمت ادا کرنا جائز ہے۔ اسی طرح نذر میں بھی قیمت دینا جائز ہے۔

عشری اور خراجی زمین کی پیداوار اور پھلوں پر وجوب زکوٰۃ کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے۔ "خذمن اموالھم صدقة" "ان کے اموال سے صدقہ وصول کرو۔" عشری زمین وہ ہے جس کے مالک مسلمان ہیں یا کافر تھے۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھیں یا کسی علاقہ کو فتح کرکے مجاہدین کے مابین تقسیم کردیا گیا ہو۔

اور خراجی زمین وہ ہے جس کو اہل اسلام فتح کرکے ان کے مالکوں کو اس پر برقرار رکھیں۔ البتہ مکہ مکرمہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو بزور بازو فتح فرمایا تھا اور اہل مکہ کو ان کی زمینوں پر برقرار رکھا تھا مگر ان پر خراج مقرر نہیں فرمایا تھا۔

بہرحال زکوٰۃ میں قیمت دینے کے جواز کی دلیل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا عمل ہے کہ انہوں نے اہل یمن کو فرمایا تھا۔ جو گندم اور مکئی کی زکوٰۃ میں کپڑے ادا کردیئے یہ تمہارے لیے بھی

باعث آسانی ہے۔اسی طرح حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کو بھی اس کا اختیار دیا گیا تھا۔

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو امر فرمایا تھا۔کسی پر بنت مخاض واجب ہو اور اس کے پاس بنت مخاض موجود نہ ہو اور بنت لبون موجود ہو تو زکوٰۃ وصول کرنے والا اس کو قبول کرلے اور زکوٰۃ ادا کرنے والا اس کو بیس درہم ادا کرے گا۔

زکوٰۃ کی قیمت دینے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہونے کے وقت کی قیمت کا اعتبار ہوگا، اور حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادا کے دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا اور چوپایوں میں تمام کے نزدیک ادا کے دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔اور اس شہر کی قیمت کا اعتبار ہے جس میں وہ مال موجود ہے۔اگر مال کسی صحراء یا بیاباں میں موجود ہو تو اس کے قریب ترین شہر میں اس کی جو قیمت ہوگی اس کا اعتبار ہوگا۔

نصاب کے مالک ہونے کے بعد سال کے مکمل ہونے سے پہلے اگر زکوٰۃ ادا کردے تو ادا ہو جائے گی۔دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا دو سالوں کی زکوٰۃ پیشگی دینا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبول فرمانا ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ نصاب کے مالک ہونے کے بعد نفس وجوب ہوتا ہے۔لہٰذا سبب پایا گیا۔سبب کے بعد ادا کرنا درست ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارک میں اور ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ادوار میں اغنیاء سے زکوٰۃ لی جاتی۔کیوں کہ اموال ظاہرہ اموال باطنہ پر زکوٰۃ وصول کرنے کا حق حکومت وقت کو ہے اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" ''ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کریں۔

پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو انہوں نے زکوٰۃ وصول کرنے والے حکومتی کارندوں کا اصحاب اموال پر ظلم کرنے اور ان کے اچھے اموال پر ہاتھ ڈالنے کا خطرہ محسوس کیا تو انہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی خود مال والوں کے ذمہ لگادی۔گویا ہر ایک اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرنے میں حکومت کا وکیل اور نمائندہ ہے خود اپنی دیانت کے مطابق حکومت کو زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے۔ ہاں جس کے بارے میں یہ علم ہو کہ وہ نہیں ادا کر رہا ہے اس سے مطالبہ کرکے زکوٰۃ وصول کی جاتی۔ لیکن اگر حکومت وقت زکوٰۃ کے وصول کے اسلامی اصول سے ہٹ کر زبردستی صاحب اموال کی رضا مندی کے بغیر وصول کرے اور مصارف زکوٰۃ میں خرچ نہ کرے تو زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوگی۔کیوں کہ وصولی بھی طریقہ اسلامی کے خلاف اور خرچ بھی غیر مصرف میں ہوا۔کیونکہ زکوٰۃ کے مصرف فقراء ہیں اور ان پر یہ خرچ نہیں ہوا۔

البتہ شمس الائمہ امام السرخسی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں اگر اصحاب الاموال ان حکمرانوں کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت کرلیں گے تو ادائیگی ہو جائے گی۔ اس لیے کہ حکام کے پاس جو مال موجود ہے وہ عوام الناس کا مال ہے اور عوام الناس کو ان کے حقوق پہنچانا ان پر واجب ہے۔ جو زیادہ ہیں گویا یہ عوام کے مقروض ہیں۔ انکے ہاتھوں میں موجود مال ان کی اپنی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ فقراء ہیں اور لوگوں کے مال کھانے کی وجہ سے یہ مقروض ہیں۔ لہٰذا فقیر و مقروض کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

اگر کسی شخص کے واجب الاداء دیے بغیر مر گیا تو اس کے ورثاء پر اس کے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے۔ ہاں اگر مرتے وقت ادائیگی زکوٰۃ کی وصیت کی ہو تو ایک تہائی ۳/۱ حصہ اس کے مال متروک میں سے زکوٰۃ کے طور پر ادا کرنا ضروری ہے میت کے مال سے پر زکوٰۃ اس لیے واجب نہیں ہے کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور عبادات مکلّف پر واجب ہوتی ہے جبکہ میت اب مکلّف نہیں رہی۔ ہاں اگر وارث اپنے طور پر اس کے مال سے اس کی زکوٰۃ ادا کردیتے تو ادا ہو جائے گی اور یہ اس کی مہربانی ہوگی۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "فدين الله أحق بالقضاء"[1]

یعنی اللہ کا قرض (زکوٰۃ) ادائیگی کا زیادہ حقدار ہے۔

اگر کوئی شخص اپنا سارا مال صدقہ کردے اور زکوٰۃ کی نیت نہ کرے تو اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔ اس لیے کہ زکوٰۃ کا مال اسی مال کا ہی تو جز تھا تو گویا متعین تھا۔ لہٰذا اس کے تعین کی ضرورت نہیں ہے۔

ادائیگی کے وقت نیت ہونا ضروری ہے۔

زکوٰۃ فقیر کے حوالے کرتے وقت زکوٰۃ کی نیت کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ عبادات کی ادائیگی کیلئے نیت کا ہونا ضروری اور واجب ہے۔ البتہ نیت کا محل دل ہے۔ اور دل میں زکوٰۃ کی نیت ہونی چاہیے۔ زبان سے چاہے جو بھی نام دے۔ مثلاً ہدیہ کہہ کردے ہبہ کے عنوان سے تعبیر کرے۔ یا اور کوئی کلمہ استعمال کرے۔ جائز ہے۔ زکوٰۃ فقیر کو دیتے وقت نیت نہ کی اور فقیر نے اس کو وصول کر کے اس پر تصرف کیا اور مال ختم ہوا تو بعد میں نیت کرلی۔ تو یہ صحیح نہیں ہے۔ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ہاں مال اگر فقیر کے پاس موجود ہو، ختم نہ ہوا ہو، اور صاحب مال زکوٰۃ کی نیت کرے تو یہ صحیح ہے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

---

[1] [صحیح مسلم: ۸۰۴/۲]

اگر زکوٰۃ مال سے جدا کرتے وقت نیت کر لی، مگر فقیر کو دیتے وقت کوئی نیت نہ تھی تب بھی جائز ہے زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ پہلی نیت کافی ہے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ اگر زیادہ ہو تو یک مشت ایک کو نہیں دی جاتی۔ بلکہ مختلف لوگوں کو مختلف اوقات میں دی جاتی ہے۔ ہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ محض مال جدا کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی جب تک اس کو اس کے مستحق تک نہ پہنچایا جائے۔ لہٰذا مال سے جدائی کے بعد مستحق کے حوالے کرنے سے پہلے یہ ہلاک ہو جائے تو دوبارہ ادا کرنا واجب ہے۔

کسی شخص نے کسی شخص کو زکوٰۃ تقسیم کرنے کا وکیل بنایا اور زکوٰۃ کو اس کے حوالہ کرتے وقت زکوٰۃ کی نیت کر لی اور وکیل نے اس کو فقراء کے درمیان تقسیم کرتے وقت کوئی نیت نہ کی تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس میں شرط موکل کی نیت ہے اسی طرح وکیل کو مال دے کر کہا کہ یہ نفلی صدقہ ہے یا کہا یہ میری قسم کا یا روزے کا کفارہ ہے فقراء میں تقسیم کر لو۔ مال کے تقسیم ہونے سے قبل نیت تبدیل کر دی اور اس میں زکوٰۃ کی نیت کر لی تو یہ بھی صحیح ہے، زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ وکیل کے حوالہ کر دی۔ اس نے فقراء میں تقسیم سے پہلے دوسروں کی زکوٰۃ کے ساتھ خلط کر دی پھر زکوٰۃ کے یہ تمام اموال چوری ہو گئے۔ تو وکیل ان سب کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا۔ ہاں اگر موکل کی طرف سے دوسروں کے اموال زکوٰۃ کو ساتھ ملانے کی اجازت صراحۃً ہو یا دلالۃً ہو تو اس صورت میں وکیل ذمہ دار نہیں ہوگا۔ لیکن موکلین پر دوبارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔ فقراء اگر کسی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کیلئے وکیل مقرر کر دیں۔ اغنیاء فقراء کیلئے اس شخص کو زکوٰۃ دیدیں اور وہ قبضہ کر لے۔ تو فقراء اس کے مالک ہو جائیں گے۔ یہ بعض فقراء کے اموال کو بعض کے ساتھ ملانے والا ہو گیا اور زکوٰۃ دینے والے کی طرف سے زکوٰۃ ادا ہو گئی اور اگر اب یہ مال وکیل کے ہاتھ سے ہلاک ہو جائے تو وہ اس کا ضامن نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ مال اس کے ہاتھ میں امانت ہے۔

اگر صاحب نصاب شخص نے اپنی زکوٰۃ ایک شخص کو دے کر کہا کہ یہ کسی فقیر کو یا کسی مسکین کو دے دے تو وہ شخص اس مال کو اپنے بالغ نادار بیٹے کو دیدے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر وہ شخص فقیر ہو اور اپنے چھوٹے بیٹے کو دیدے۔ تب بھی صحیح ہے۔ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اگر وہ غنی ہو اور اپنے نابالغ بچے کو دیدے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ کیوں کہ نابالغ بچہ باپ کے غنی ہونے کی صورت میں غنی اور فقیر ہونے کی صورت میں فقیر شمار ہوگا۔ اگر زکوٰۃ ادا کرنے والا فقیر کا نام لے کر متعین کر کے کہہ دے۔ تو اس کے لیے کسی اور کو دینا جائز نہیں ہوگا۔

وکیل اپنے موکل کی زکوٰۃ اپنی تنگدست بیوی کو دے سکتا ہے۔ مگر خود نہیں لے سکتا۔ اگرچہ

فقیر وتنگدست ہو ہاں اگر موکل یہ کہہ دے کہ جہاں چا ہو دے دو، تو خود لینا اس کیلئے جائز ہو جائے گا۔

اگر وکیل نے اپنے مال سے اس ارادے سے موکل کی زکوٰۃ ادا کی کہ میں اس کو اپنے موکل سے لے لوں گا۔ تو یہ بھی صحیح ہے۔ زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کسی زکوٰۃ دہندہ نے کسی شخص سے کہا کہ میری طرف سے ایک ہزار روپیہ فلاں کو دیدو اور اپنے دل میں زکوٰۃ کی نیت کر لی تو یہ بھی صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفس مال زکوٰۃ سے دینا کوئی ضروری نہیں ہے۔ اسی وجہ سے وہ کسی کو کہہ دے اور وہ اس کی طرف سے دیدے پھر وہ اس کو زکوٰۃ کی رقم ادا کر دے تو درست ہے۔

زکوٰۃ دینے والے کیلئے شرائط

پہلی شرط:

وجوب زکوٰۃ کیلئے زکوٰۃ دینے والے کے اندر چند شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اسلام ہے۔ یہ تمام عبادات کے وجوب اور صحیح ہونے کیلئے شرط ہے۔ اسلام کے بغیر کوئی بھی عبادت صحیح نہیں ہوگی۔ ارشاد خداوندی ہے۔ "**وقدمنا الی ماعملوا من عمل فجعلنه هباء منثورا**" [الفرقان: ۲۳] ترجمہ: اور جو عمل انہوں نے کیے تھے۔ ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔ پھر انہیں اڑتی ہوئی خاک کر دیں گے۔

دوسری شرط:

عاقل بالغ ہونا ہے۔ لہٰذا بچے پر بلوغ سے قبل واجب نہیں اور مجنون پر جب تک اسے افاقہ نہ ہو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ (کیوں کہ فرمان نبوی ﷺ ہے۔ "**رفع القلم عن الثلاثة، عن المجنون المغلوب علی عقله حتی یبرء، وعن النائم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم**"[1] ترجمہ: "تین افراد مرفوع القلم ہیں۔ مجنون جب تک ٹھیک نہ ہو، سونے والا جب تک بیدار نہ ہو اور بچہ جب تک بالغ نہ ہو۔

تیسری شرط

مال نامی (بڑھنے والے مال) کے نصاب (شریعت کی متعین کردہ مقدار) کا مالک ہو، کیوں کہ شریعت نے غنی پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ اور غنی ہونے کی کم از کم مقدار نصاب کا مالک ہونا

---

[1] [جامع الاحادیث: ۲۳۲/۴]

ہے۔ چنانچہ اگر نصاب کا مالک نہیں ہے تو وہ غنی نہیں ہے بلکہ فقیر ہے۔ وہ خود زکوٰۃ کا مستحق ہے۔

چوتھی شرط

مقروض نہ ہو اس لیے کہ جو مال نصاب اس کے پاس ہے۔ وہ قرض میں دینے کی ضرورت کی وجہ سے ضرورت اصلیہ میں داخل ہے۔ کیوں کہ قرض خواہ کسی بھی وقت اپنے قرض کی وصولی کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اور نہ دینے کی صورت میں اہانت بھی کرسکتا ہے۔ تو گویا جو مال اس کے پاس ہے وہ قرض خواہ کے ضرر سے بچنے کیلئے ہے۔ لہٰذا یہ ضرورت اصلیہ میں داخل ہوگیا۔

قرض کی قسمیں:

قرض کی دو قسمیں ہیں ایک بندوں کا قرض، تلف کردہ چیز کا ضمان، بیوی کا مہر، عورت کیلئے بدل خلع، اور نفقہ وغیرہ یہ تمام دیون، اس کے پاس موجود نصاب کے برابر یا اس سے زیادہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ یہ دیون زمین اور درخت سے حاصل شدہ پیداوار کی زکوٰۃ سے مانع نہیں ہیں۔ دوسری قسم وہ دین ہے جو شریعت کی وجہ سے اس پر واجب ہے۔ گویا اس کا بھی مطالب موجود ہے۔ حکمران یا فقیر، یہ بھی اپنی مقدار کی بقدر وجوب زکوٰۃ میں رکاوٹ ہیں وہ اس طرح کہ ایک آدمی سونے کے نصاب کا مالک ہے۔ سال گزرنے پر اس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی۔ حتیٰ کہ دوسرا سال بھی گزر گیا۔ اب دوسرے سال کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے سال کی زکوٰۃ کو اس سے منہا کرنے کے بعد نصاب کی مقدار میں کمی آجائے گی۔ نصاب کامل نہیں رہے گا۔ جب کہ زکوٰۃ کے وجوب کیلئے نصاب کا کامل ہونا ضروری ہے۔

ایک آدمی نصاب کا مالک ہے۔ درمیان سال میں ایسا مقروض ہوگیا کہ قرض اس کے سارے نصاب کو حاوی ہوگیا۔ پھر سال مکمل ہونے سے پہلے قرض سے بری ہوگیا۔ تو اس صورت میں حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔ کیونکہ انہوں نے اس کو درمیان سال نصاب میں کمی ہونے اور سال کے اختتام میں پورے ہونے پر قیاس کیا۔ یعنی اس صورت میں زکوٰۃ سب کے نزدیک واجب ہوتی ہے۔ اسی طرح اس صورت میں بھی زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔ یہ اختلاف اس صورت میں تھا کہ وہ دین نصاب کو محیط ہو۔ اگر درمیان سال میں مسلط ہونے والا قرض نصاب سے کم ہو تو دونوں کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوجائے گی۔

باہر چرنے والے چوپایوں پر زکوٰۃ

اگر جانور بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ سال کے اکثر حصے میں باہر چر کر اپنے پیٹ بھرتے ہوں اور یہ دودھ حاصل کرنے، نسل نکالنے اور گھی وغیرہ حاصل کرنے کی غرض سے پالے گئے ہوں تو نصاب کے مطابق ہونے پر ان پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اگر سواری یا بار برداری کیلئے رکھے گئے ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اسی طرح اگر نصف سال یا اس سے زیادہ اوقات مالک ان کو اپنی طرف سے کھلاتا ہو تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور یہ سائمہ (باہر چرنے والے) نہیں کہلائیں گے۔

سائمہ جانور جن پر زکوٰۃ واجب ہے یہ ہیں۔ اونٹ، گائے بھینس، بھیڑ بکری وغیرہ۔

اونٹوں کی زکوٰۃ

سائمہ اونٹ پانچ سے کم ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیوں کہ فرمان رسول ﷺ ہے۔ ترجمہ ''جس کے پاس صرف چار اونٹ موجود ہوں اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے ہاں اگر ان کا مالک ادا کرنا چاہے تو اس کو اختیار ہے اور جب پانچ ہو جائیں تو ان میں ایک بکری دینا واجب ہے۔[1] پانچ کی یہ تعداد نر، مادہ اور چھوٹوں کو بھی شامل ہے۔ بشرطیکہ پانچ سارے چھوٹے نہ ہوں۔ چھوٹے بڑوں کے تابع ہیں۔ اسی طرح پانچ کا یہ عدد اندھوں اور لنگڑوں کو بھی شامل ہے۔ البتہ یہ کہ بطور زکوٰۃ کے اندھا اور لنگڑا جانور وصول نہیں کیا جائے گا۔ پانچ اونٹوں پر دی جانے والی بکری کی عمر کم از کم ایک سال پوری ہو کر دوسرے سال میں قدم رکھا ہوا ہو۔ چھ مہینے کی بکری نہیں وصول کی جائے گی۔

البتہ بھیڑ کا چھ مہینے والا بچہ زکوٰۃ میں تو نہیں دیا جا سکتا مگر قربانی اس کی جائز ہے۔

سوال: زکوٰۃ میں اصول یہ ہے کہ جس جنس کا نصاب ہے زکوٰۃ بھی اسی جنس سے ادا کی جائے گی تو اونٹوں کی زکوٰۃ میں بکری کیوں واجب کی گی؟

جواب: اونٹ جب پانچ کے عدد کو پہنچ جاتے ہیں تو یہ مال کثیر ہے۔ لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے۔ لیکن اگر ان میں سے ایک اونٹ واجب کر دیا جائے تو یہ بہت زیادہ ہے لہٰذا بکری واجب کر دی گئی اور بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ اس زمانے میں بکری کی قیمت پانچ درہم ہوا کرتی تھی اور درمیانہ اونٹ کی قیمت چالیس درہم تھی۔ اس حساب سے پانچ اونٹوں کی اوسط قیمت دوسو درہم ہوئی اور پانچ اونٹوں پر ایک بکری واجب کرنا ایسا ہوا جیسے دوسو درہم پر پانچ درہم یعنی چالیسواں حصہ

[1] [صحیح بخاری: ۲۳۹/۲]

لہٰذا پانچ اونٹوں میں ایک بکری واجب ہوتی ہے۔

کسی شخص کے پاس پانچ اونٹ موجود ہوں، درمیان سال یا سال کی تکمیل سے چند روز قبل دوسری جنس گایوں یا بکریوں کے عوض فروخت کردے یا نقد رقم کے بدل بیچ دے تو اس سال زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی، بلکہ از سر نو مال پر پورا سال گزرے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بشرطیکہ اس کے پاس اس جنس کا نصاب پہلے سے موجود نہ ہو۔ لہٰذا اگر نصاب موجود ہو تو جنس کے ساتھ ملا کر سب کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اگر اس نے زکوٰۃ سے بچنے کیلئے اس قسم کی تبدیلی کی ہے تو یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔

بہر حال پانچ سائمہ اونٹوں میں ایک بکری، دس میں دو بکریاں، پندرہ میں تین اور بیس میں چار بکریاں واجب ہیں۔ کیوں کہ حدیث شریف میں وارد ہے۔ ''چوبیس اور اس سے کم تعداد میں فی پانچ اونٹ ایک بکری ہی واجب ہے۔''

جب پچیس ہو جائیں تو ایک بنت مخاض (ایک سال مکمل کر کے دوسرے سال میں قدم رکھنے والا نر یا مادہ اونٹ کا بچہ) واجب ہو جائے گا۔ اگر اس کے پاس بنت مخاض موجود نہ ہو تو اس کی قیمت ادا کرے گا۔ بنت مخاض (مادہ) کے بجائے ابن مخاض (نر) نہیں دے سکتا۔ البتہ گایوں اور بکریوں کی زکوٰۃ میں نر یا مادہ کوئی بھی دے سکتا ہے۔ پچیس سے لے کر پینتیس تک ایک بنت مخاض ادا کرتا رہے گا اور جب چھتیس ہو جائیں تو ان میں ایک بنت لبون (دو سال مکمل ہو کر تیسرے سال میں قدم رکھا ہو) واجب ہو جائے گی پینتالیس تک۔ چھیالیس سے لیکر ساٹھ تک اونٹوں میں ایک حقہ (تین سال مکمل کر کے چوتھے سال میں چل رہا ہو اور سواری اور بار برداری کے لائق ہو گیا ہو) واجب ہے جب اکسٹھ ہو جائیں تو ایک جذعہ (چار سال مکمل کر کے پانچویں سال میں چل رہا ہو) واجب ہو جائیگا پچھتر تک۔ چھہتر سے نوے تک دو بنت لبون، اکیانوے سے ایک سو بیس تک دو حقے اور ایک سو بیس سے بڑھ جائیں تو ہر چالیس میں دو بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ کا اضافہ ہوتا رہے گا۔

گایوں کی زکوٰۃ

تیس سے کم گایوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ جب تیس ہو جائیں تو ان میں ایک تبیع یا تبیعہ (سال مکمل ہونے کے بعد دوسرے سال میں چلنے والا بچھڑا) واجب ہوگا اور چالیس میں ایک مسنہ یا مسن (دو سال پورے ہونے کے بعد تیسرا سال شروع ہو) اداء کرنا فرض ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اسی طرح زکوٰۃ وصول کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے طویل حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا: کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا تھا کہ میں ہر چالیس گایوں میں ایک مسنہ اور ہر تیس میں ایک تبیعہ وصول کراؤں۔[1]

اگر چالیس سے اکتالیس ہو جائیں تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اکتالیس سے ساٹھ تک بقدر حساب زکوٰۃ واجب کی جائے گی۔ چنانچہ اگر چالیس پر ایک گائے کا اضافہ ہو جائے۔ تو اس میں ایک مسنہ واجب ہوگا اور ایک زائد میں مسنہ کی قیمت کا چالیسواں حصہ واجب ہوگا اور دو زائد ہو جائیں تو ایک مسنہ کے ساتھ ایک مسنہ کے دو چالیسویں، اور تین بڑھ جائیں تو تین چالیسویں واجب ہوں گے۔ دلیل اس کی یہ ہے۔ تیس اور چالیس کے درمیان عفو یعنی زکوٰۃ واجب نہ ہونا خلاف قیاس نص سے ثابت ہے اور چالیس سے ساٹھ تک کے عفو میں کوئی نص نہیں ہے، لہٰذا چالیس سے زائد کے اندر عفو یعنی زکوٰۃ واجب نہ ہونا رائے اور قیاس سے ثابت نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ مال وجوب زکوٰۃ کا سبب ہے اور رائے سے نصاب مقرر کرنا جائز نہیں ہے، اور اسی طرح رائے سے مال کو واجب سے خالی کرنا اس کے سبب کے تحقق کے بغیر جائز نہیں ہے۔

ساٹھ میں دو تبیعے، جب ستر ہو جائیں تو ایک مسنہ ایک تبیع / یا تبیعہ، اسی (۸۰) میں دو مسنے واجب ہوں گے۔ اسی طرح ہر دس کے بعد تبیعہ سے مسنہ اور مسنہ سے تبیعہ میں تبدیل ہو کر اضافہ ہوتا رہے گا۔

اسی پر اجماع بھی ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے۔

گائے اور بھینس کا حکم زکوٰۃ، قربانی اور سود کے اعتبار سے ایک جیسا ہے، لہٰذا گائے کے گوشت کو بھینس کے گوشت کے بدلے کمی بیشی کے ساتھ بیچنا سود ہوگا۔ لیکن یمین (قسم) کے اعتبار سے گائے اور بھینس میں عرف کے اعتبار سے فرق ہوگا۔ چنانچہ اگر کسی نے قسم کھائی کہ وہ گائے کا گوشت نہیں کھائے گا۔ بھینس کا گوشت کھا لیا تو حانث نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ہمارے عرف میں یہ علیحدہ علیحدہ گوشت شمار ہوتے ہیں۔ اگر کسی علاقے میں عرفاً ایک شمار ہوں تو حانث ہو جائے گا۔

بکریوں کی زکوٰۃ

چالیس سے کم بکریوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ تمام کی عمر کم از کم ایک سال ہو، اگر ساری بکریوں کی عمر ایک سال ہے۔ تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ان پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اگر ساری بکریاں ایک سال سے کم کی ہوں تو کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اگر ایک آدمی

---

[1] [مسند احمد]

چالیس بکریاں خریدے جن میں کچھ ایک سال کی اور کچھ ایک سال سے کم عمر کی ہیں تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جب تک سب کی عمریں ایک سال کی نہ ہو جائیں۔

جب چالیس ہو جائیں تو ان میں ایک بکری واجب ہے۔ بشرطیکہ سائمہ (سال کے اکثر حصے باہر چرنے والی ہوں چالیس سے ایک سو بیس تک یہی ایک بکری واجب ہے اور جب ایک سو بیس سے بڑھ جائیں تو دو سو تک دو بکریاں واجب ہیں۔ دو سو ایک سے لے کر تین سو تک تین بکریاں اور جب تین سو سے بڑھ جائیں تو ہر سو پر ایک بکری واجب ہوتی چلی جائے گی۔[1]

پھر سنت یہ ہے کہ نصاب اگر بھیڑوں کا ہو تو بھیڑ، بکریوں کا ہو تو بکری، اور اگر دونوں کا مجموعہ ہو تو جو زیادہ ہو اس سے میں سے وصول کیا جائے گا۔ اگر دونوں برابر ہوں تو کسی بھی نوع سے ادا کرے۔ سنت ادا ہو جائے گی۔ وجوب زکوٰۃ، جواز قربانی اور سود ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے یکساں ہیں۔ البتہ قسم کے اعتبار سے مختلف شمار ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے بکری کا گوشت نہ کھانے کی قسم کھا رکھی ہو اور بھیڑ کا گوشت کھالے تو حانث نہیں ہوگا اگر باہر چرنے والے نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

اونٹ کے بچوں، بچھڑوں اور بکری کے بچوں میں زکوٰۃ

اونٹ کے بچوں میں زکوٰۃ نہیں ہے اگر چہ زیادہ ہوں اور ان کے ساتھ بڑا نہ ہو۔ اسی طرح گائے کے ایک سال سے کم بچوں میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور بکری کے بچوں میں بھی زکوٰۃ نہیں۔ ہاں اگر ان کے ساتھ ایک بھی بڑا موجود ہو تو سب کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ یہ قول حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والا ہمارے پاس آیا، میں نے بیٹھ کر ان کی باتیں سنیں، وہ فرمارہے تھے۔ میرا عہد ہے کہ میں دودھ پیتا بچہ وصول نہیں کروں گا۔ یعنی چھوٹے جانور (عمر کے لحاظ سے) نصاب میں شمار نہیں ہوں گے۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: بکری کے بچے چالیس ہو جائیں تو ان میں سے ایک بچہ زکوٰۃ میں دینا واجب ہے اور جب ایک سو اکیس ہو جائیں تو دو اور دو سو ایک ہوں تو تین اور چار سو میں چار بچے واجب ہیں۔ پھر ہر سو میں ایک بچہ واجب ہوتا چلا جائے گا۔ اسی طرح گائے کے بچے جب تیس ہو جائیں تو ان میں سے ایک بچھڑا واجب ہوگا۔ ساٹھ تک یہی ایک۔ ساٹھ میں دو نوے تک۔ اور نوے میں تین اور ایک سو بیس میں چار بچھڑے واجب ہوں گے۔

اونٹ کے بچوں میں ان کے نزدیک پچیس تک کچھ واجب نہیں۔ جب پچیس ہو جائیں تو

---

[1] [صحیح بخاری ۳۹/۲]

ان میں ایک واجب ہو جائے گا۔ پچیس تا چھہتر، چھہتر میں انہیں میں سے دو بچے چھہتر سے ایک سو پینتالیس تک دو اور ایک سو پینتالیس میں تین بکریاں، واجب ہوں گی۔

مال کے ہلاک ہونے اور ہلاک کرنے کے متعلق مسائل

امام ابوحنیفہ اور امام یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک نصاب میں زکوٰۃ واجب ہے عفو میں نہیں۔ یعنی اونٹوں میں پانچ میں ایک بکری، اور دس میں دو بکریاں، چھ سے ۹ تک کا عفو، پانچ اور دس نصاب ہے اور حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ نصاب اور عفو دونوں کے ساتھ متعلق ہے اور ان کے درمیان اختلاف کا ثمرہ ظاہر ہوگا جب عفو ہلاک ہو جائے اور نصاب باقی رہے۔ مثلاً نو اونٹ تھے جن میں چار ہلاک ہو گئے۔ پانچ رہ گئے۔ تو حضرات شیخین رحمہما اللہ کے نزدیک ایک بکری کا وجوب باقی رہے گا اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ و امام زفر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ ہلاک شدہ کی بقدر زکوٰۃ میں کمی ہوگی، چنانچہ ان کے نزدیک بکری کی قیمت کا ۵/۹ حصہ واجب ہوگا۔ ۴/۹ معاف ہوگا۔

وجوب زکوٰۃ کے بعد اگر مال ہلاک ہو جائے تو وجوب ساقط ہو جائے گا۔ اگر صاحب مال خود ہلاک کر دے تو ضامن ہوگا۔ جیسا کہ امانت میں ہے۔ ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان نہیں ہے۔ ہلاک کرنے کی صورت میں ضمان ہے۔

سونے چاندی کی زکوٰۃ

سونے چاندی سے بنے ہوئے زیورات، برتن اور کسی سانچے میں ڈھلے ہوئے اور بے ڈھلے ہوئے۔ نصاب کو پہنچ جائیں۔ چاہے ان میں تجارت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو زکوٰۃ واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "والذین یکنزون الذهب وَالْفِضَّةَ ولاینفقونها فی سبیل الله فبشرهم بعذاب الیم" [التوبہ: ۳۴] اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

اللہ تعالیٰ نے وجوب زکوٰۃ کو سونے چاندی کے ساتھ متعلق فرمایا: یہاں آیت میں "یکنزون" (ذخیرہ اندوزی کرنے) سے مراد مال سے زکوٰۃ نہ نکالنا ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سونے کے زیورات پہنا کرتی تھی جب یہ آیت اتری تو میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کنز میں داخل ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگر وہ مقدار نصاب کو پہنچے اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرو تو یہ کنز میں داخل ہے۔ اگر زکوٰۃ ادا کرتے رہو تو کنز نہیں ہے۔[1] اس حدیث کی

---

[1] [سنن ابوداود ۲/ ۲۵]

روشنی میں آیت کی تفسیر یوں ہوگی۔ الذین لایؤدون الزکوٰۃ الذھب والفضہ فبشرھم بعذاب الیم "یعنی جولوگ سونے چاندی کی زکوٰۃ ادانہیں کرتے ان کوسخت دردناک عذاب کی خبرسنادیں۔

حضرت عبداللہ بن شداد بن الھادؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا ایک مرتبہ حضور ﷺ گھر تشریف لائے میرے ہاتھ میں چاندی کی انگوٹھیاں دیکھ کر فرمایا کہ عائشہ! یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: یہ میں آپ کیلئے زینت اختیار کیے ہوئے ہوں۔ فرمایا کیا تم اس کی زکوٰۃ بھی دیتی ہو؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا:ھوحسبک من النار "یہ تیسرے لیے آگ ہونے کیلئے کافی ہے۔ حضور ﷺ نے وعید شدید کوترک اداء زکوٰۃ کے ساتھ فرمایا۔ یہی اس کے وجوب کی دلیل ہے۔ نصاب کی تکمیل کے اعتبار سے سونا چاندی ایک شمار ہوں گے۔ یعنی کسی کے پاس کچھ سونا ہے اور کچھ چاندی ہوان کوملانے سے نصاب مکمل ہوتا ہے۔ توان کوملا کرزکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ بخلاف سائمہ جانوروں کے کہ وہ مختلف جنس ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ملحق نہیں ہوں گے۔ یعنی کسی کے پاس کچھ گائیں ہیں اور کچھ اونٹ ان کوملانے سے ان کی قیمت نصاب کوپہنچتی ہے تونہیں ملایا جائے گا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: سونے چاندی کو قیمت کے لحاظ سے ملایا جائے گا اور حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اجزاء کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ ضم کیا جائے گا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ مثلاً ایک آدمی کے پاس ساڑھے تینتالیس گرام سونا ہے۔ (جونصف نصاب ہے) اوراس کے پاس کچھ چاندی کے برتن ہیں جن کاوزن دوسونوے گرام سے کم ہے۔ مگران کی قیمت سونے کے نصاب کے آدھے کے برابر ہے۔ توحضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پرزکوٰۃ واجب ہوگی اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک نہیں ہوگی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک اعتبار وزن کا ہے جوکم ہے لہٰذا نصاب مکمل نہیں جب کہ منصوص علیہ یہی ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل یہ ہے ان کوایک دوسرے کے ساتھ ضم کران کی مجانست کی وجہ سے ہے۔ اور مجانست قیمت سے ہے۔ جب قیمت کسی ایک کے نصاب کے برابر ہوگئی توسبب پایا گیا۔ حضور ﷺ کے فرمان کے بموجب جوانہوں نے حضرت عمرو بن حذم کوفرمایا تھا: سونے کی قیمت اگردوسودرہم کے برابر ہوجائے توہر چالیس درہم میں ایک درہم واجب ہے۔

بعض احادیث اورآثار میں سونے کے نصاب کی تحدید بیس دیناراور بعض میں بیس مثقال آئی ہے۔ طبرانی میں ایک طویل حدیث کے ضمن میں یہ ذکر ہے کہ چاندی میں ہر پانچ اواق میں پانچ

درہم، واجب ہیں اور اس مقدار سے بڑھ جائے۔ تو ہر چالیس درہم میں ایک درہم واجب ہے۔ پانچ اواق سے کم چاندی پر زکوٰۃ نہیں ہے۔[1] اس حدیث میں یہ بھی ہے۔ ''بیس دینار سے کم ہو تو کچھ نہیں۔ اگر بیس دینار ہو جائیں تو اس میں نصف دینار واجب ہے۔ اور اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو زیادتی کے حساب سے واجب ہوگا۔ صاحب لسان العرب نے کہا ہے کہ لوگ بیس مثقال پر ایک دینار کا اطلاق کرتے ہیں۔ اور مثقال ۷/۳۔ درہم کا وزن ہے۔

آج کل سونے کا نصاب ۸۷ گرام یا پچاسی گرام ہے اور چاندی کا نصاب دوسو درہم جو پانچ سو اسی گرام یا پانچ سو پچانوے گرام کے برابر ہے۔

سونے چاندی کے مخلوط نصاب میں اکثریت کا اعتبار ہے۔ چنانچہ چاندی اگر زیادہ ہے تو چاندی کے اعتبار سے، سونا اگر زیادہ ہے تو سونے کے اعتبار سے حساب لگایا جائے گا۔ سونے چاندی کے ساتھ کھوٹ اگر زیادہ ہے تو زکوٰۃ نہیں ہے الا یہ کہ کھوٹ کے ساتھ لگا سونا یا چاندی نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے تو اس پر زکوٰۃ ہے۔ یا اس میں تجارت کی نیت کرے اور اگر کھوٹ پر سونا غالب ہو تو سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔ سونے یا چاندی کے ساتھ کھوٹ بالکل مساوی ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ مگر مختار یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کیونکہ احتیاط اسی میں ہے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور حنابلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک کھوٹ میں بالکل زکوٰۃ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کے ساتھ لگایا ہوا خالص سونا یا خالص چاندی نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے۔

سونے کا نصاب بیس مثقال ہے جو ۸۷ گرام کے برابر ہے اور چاندی کا نصاب ہے دوسو درہم ہے جو وزن کے لحاظ سے ۵۸۰ گرام کے برابر ہے۔ یاقوت، موتی، جواہر میں زکوٰۃ نہیں ہے اگرچہ زیورات کی صورت میں ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں اگر تجارت کیلئے ہوں تو ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دلیل اس کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے۔ ''لیس فی الجوھر زکوٰۃ'' اسی طرح سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ (قیمتی) پتھر میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ الا یہ کہ تجارت کیلئے ہو۔[2]

دریا سے حاصل کردہ عنبر پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔ دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: لیس فی العنبر زکوٰۃ انما ھو شی وسرہ البحر ''عنبر میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے یہ محض ایک چیز ہے جس کو دریا نے باہر پھینک دیا ہے۔

کاغذی نوٹ کی زکوٰۃ کا حکم

آج کل رائج کاغذی نوٹ کے ساتھ قیمت کے طور پر ایسا کاروبار کر رہے ہیں جیسا کہ

---

۱ [معجم طبرانی: ۳۱۲/۲۵] ۲۔ [سنن بیہقی: ۴ص ۱۴۶]

سونے چاندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ان پر وہ احکام جاری ہوں گے جو سونے چاندی پر جاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اتنے نوٹوں کا مالک ہو جو ستاسی گرام سونے کی قیمت کے برابر ہوں۔ چاہے جس ملک کی کرنسی ہو اور وہ اس کی حوائج اصلیہ سے زائد ہو۔ مدیون نہ ہو اور سال اس پر گزر جائے۔ تو اس میں سے اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ اسی طرح جو شخص اتنے نوٹوں کا مالک ہو جائے جن کی قیمت پانچ سو اسی گرام چاندی کے برابر ہو اور وہ اس کی ضروریات اصلی سے زائد ہو۔ ملک تام ہو اور سال گزر جائے تو اس مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ البتہ سوال یہ ہے کہ نوٹوں کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت سونے کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا یا چاندی کے نصاب کا۔ چونکہ ان کی قیمت میں کافی تفاوت ہوتا ہے۔ مثلاً سونے کے نصاب کا اعتبار کیا جائے تو نصاب بنتا ہے۔ چاندی کے اعتبار سے نہیں بنتا تو ادائیگی زکوٰۃ کیلئے کس نصاب کا اعتبار ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جو بھی فقرا کے لئے زیادہ سودمند ہو اس کے اعتبار سے حساب لگایا جائے۔ چنانچہ اگر سونے کے وزن کے اعتبار سے قیمت لگاتے ہیں تو نصاب بنتا ہے۔ اور چاندی سے نہیں بنتا۔ تو سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا یا چاندی کے اعتبار سے نصاب کو پہنچتا ہے مگر سونے کے اعتبار سے نہیں پہنچتا تو حساب چاندی کے اعتبار سے لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

البناء نے الفتح الربانی میں زکوٰۃ الاوراق المالیہ کے عنوان کے تحت اس پر بحث کرتے ہوئے یہ ذکر فرمایا ہے: ''کہ کاغذی نوٹ حکومت پر واجب قرضوں کی رسیدیں ہیں۔ ان نوٹوں کی قیمت کے برابر سونا چاندی حکومت کے پاس امانت ہے اور حکومت ان امانتوں کی ضامن ہے۔ گویہ امانتوں کی یہ رسیدیں درحقیقت حکومت کے ذمے دیون کی رسیدیں ہیں۔ وقت طلب ان دیون کو حکومت سے حاصل کرسکتا ہے۔ چنانچہ ہر کرنسی پر لکھا ہوتا ہے ''حامل ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا'' اگر نوٹ پانچ کا تو پانچ۔ اگر دس کا ہو تو دس، سو کا ہو تو سو اور ہزار کا ہو تو ہزار لکھا جاتا ہے۔

چنانچہ اگر کوئی نوٹ لے کر اس حکومت کے پاس جائے۔ جس کا یہ نوٹ ہے جس نے اس کو جاری کیا ہے تو وہ اس کے مطابق سونا ادا کرنے کی پابند ہے ادا کر دیتی ہے تو ثابت ہوا کہ یہ نوٹ دیون کی رسیدات ہیں۔ ان کے ساتھ آپس میں معاملات کرنا حوالے کے اصولوں پر ہوگا۔ بغیر صیغہ کے اشتراط کے تعاطی (ایجاب وقبول ذکر کیے بغیر) کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اور حوالہ بیع کی طرح ہے۔ چنانچہ جو لوگ بیع تعاطی کے جواز کے قائل ہیں وہ حوالہ کے بھی قائل ہیں چنانچہ حنفیہ، شافعیہ مالکیہ اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے۔ یہ حضرات بیع تعاطی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ بیع تعاطی یہ ہے کہ مثلاً ایک چیز کی قیمت متعین ہے اور معروف ہے۔ مشتری خاموشی سے رقم بائع کو پکڑا کر اس کو اٹھائے۔ اس

میں قولاً ایجاب وقبول نہیں ہوتا۔ لہٰذا نوٹ حکومت کے ذمہ دیون کی رسید ہے جب چاہے اس کے ذریعے سے اپنا دین حکومت سے وصول کرسکتا ہے تو یہ ایک قوی دین ہوا۔ اس میں حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں بھی زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔ اور دین کی زکوٰۃ قبضے سے پہلے ادا کرنا جائز ہے۔ خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ کرنسی نوٹوں کی زکوٰۃ کا حکم بالکل سونے چاندی کی زکوٰۃ کے حکم کی طرح ہے۔ اس لیے کہ لوگ ان کے ساتھ کاروبار کرتے ہیں جیسا کہ سونا چاندی کے ذریعے کاروبار کیا جاتا ہے۔

سامان تجارت کی زکوٰۃ کا حکم

اموال تجارت میں زکوٰۃ فرض ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ "اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَاکَسَبْتُمْ" "اپنی پاک کمائی میں سے خرچ کرو۔" [البقرہ: ۲۶۷] "طَیِّبٰتِ مَاکَسَبْتُمْ" سے مراد بقول مجاہد رحمۃ اللہ علیہ تجارت ہے۔ اسی طرح حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں اس مال میں سے زکوٰۃ دینے کا امر فرمایا کرتے جن کو تجارت کے لیے مقرر کرتے۔ اسی طرح حضرت حماس رضی اللہ عنہ کی روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ ایک مرتبہ میں امیر المومنین حضرت عمرؓ کے پاس سے گزرا۔ میری گردن پر چمڑے کی ایک پوٹلی تھی۔ حضرت عمر نے فرمایا: حماس! اس کی زکوٰۃ نہیں دو گے؟ میں نے عرض کیا: میرے پاس ان چمڑوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ فرمایا: یہ مال ہے نیچے رکھو۔ میں نے پوٹلی کو ان کے سامنے رکھ دیا۔ حساب لگا کر انہوں نے اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ میں نے عرض کیا یہ چمڑا ہے، فرمایا اس کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کرو۔[1]

اس سے ثابت ہوا کہ مال تجارت میں زکوٰۃ واجب ہے خواہ جس نوع کا بھی مال ہو۔ اگر ان کی قیمت سونے یا چاندی کے نصاب کو پہنچ جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے بموجب جو آپ نے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ "اگر سونے کی قیمت دوسو درہم کو پہنچ جائے تو ہر چالیس درہم پر ایک درہم واجب ہے۔"[2]

البتہ مال تجارت کی قیمت اس اعتبار سے لگائے جس میں فقراء کو فائدہ ہو۔ اگر مال سال کے شروع اور آخر میں نصاب کے مطابق رہا اور درمیان سال میں اس کے اندر کمی ہوتی رہی تب بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ ساقط نہیں ہوگی۔

کسی کے پاس سامان تجارت بھی موجود ہے اور کچھ نقد رقم بھی، یا سونے چاندی میں سے کچھ موجود ہے۔ تو سب کو ملا کر زکوٰۃ ادا کرے گا۔ اس لیے کہ سب تجارت کیلئے ہے۔ سامان تجارت

---

[1] [سنن بیہقی: ۴/۱۴۷] [2] [المستدرک ا/ص ۳۹۵]

بالفعل اور نقدی وسونا چاندی بالقول۔ اگر کسی کے پاس سامان تجارت ہے مگر اس کی قیمت نصاب سے کم ہے لیکن اس کے پاس تھوڑا سا سونا یا چاندی موجود ہے یا کچھ نقد کرنسی موجود ہے تو سامان تجارت ان میں سے کسی ایک کے ساتھ یا تمام کے ساتھ ملانے کی صورت میں نصاب کو پہنچ جاتا ہے تو امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نقدین (سونا چاندی) کو نہیں ملایا جائے گا۔ اسی طرح کرنسی نوٹ کو نہیں ملایا جائے گا۔

اگر کسی کے پاس غلہ موجود ہے بغرض تجارت۔ اس کی قیمت ساڑھے تینتالیس گرام سونے کے برابر ہے اور ساڑھے تینتالیس گرام سونا بھی اس کے پاس موجود ہے۔ تو اس صورت میں امام صاحبؒ کے نزدیک غلے کی قیمت اور سونے کو ملا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک اس صورت میں اس پر زکوٰۃ نہیں۔

لیکن اگر سامان تجارت کیلئے نہ ہوں تو ان میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ "لیس فی العروض زکاۃ الاماکان للتجارۃ" عام سامان میں زکوٰۃ نہیں ہے الا یہ کہ وہ تجارت کیلئے ہوں۔

قرض کی زکوٰۃ

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم دونوں فرماتے ہیں۔ من أسلف مالا فعلیہ زکاتہ فی کل عام، اذا کان فی ثقۃ[1]

کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے غائب شخص کے مال کے متعلق دریافت کیا۔ تو فرمایا: جس طرح حاضر کے مال سے زکوٰۃ دی جاتی ہے اسی طرح غائب کے مال سے بھی زکوٰۃ ادا کرتے رہو تو سائل نے کہا: تب تو اس کا مال زکوٰۃ ادا کرتے کرتے ختم ہو جائے گا؟ تو فرمایا: انسان کے دین کے ہلاک ہونے کے مقابلے میں مال ہلاک ہونا اچھا ہے۔[2]

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرض کی تین قسمیں ہیں: (۱) قوی (۲) متوسط، (۳) کمزور جبکہ حضرات صاحبین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قرض کی کوئی قسمیں نہیں ہیں حکم کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ سب کی زکوٰۃ واجب ہے۔ قرض کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اپنے قبضے میں جو مال ہے اس کی زکوٰۃ ادا کرو۔ اور جس قرض کا ملنا یقینی ہو اس کا حکم بھی اپنے قبضے میں موجود مال کی طرح ہے اور وہ قرض جس

---

۱ [سنن البیہقی ۱۴۹/۴] ۲ [سنن البیہقی: ۱۴۹/۴]

کا ملنا موہوم ہو تو اس کو قبضہ میں لینے کے بعد زکوٰۃ دی جائے گی۔[1]

اگر قرض کا ایک خمس ۵/۱ حصہ وصول ہو گیا تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہو جائے گی اور حولان حول کی ابتداء اصل مال کے ملکیت کے وقت سے ہے۔ قبض کے وقت یا وقت بیع سے نہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص سامان تجارت کے مالک ہونے کے چھ مہینے بعد اس کو فروخت کرے اور ایک سال چھ مہینے بعد اس کی قیمت وصول کرے تو اس طرح اس مال پر دو سال مکمل ہوئے، قبضے کے وقت بلا خلاف سابقہ دونوں سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ دین کی زکوٰۃ قبضہ کرنے کے بعد ادا کرے گا۔

ایک شخص کا کسی کے اوپر قرض ہے کئی سال گذر ہو گئے مقروض نے ادا نہیں کیا۔ قبضہ سے پہلے قرض دینے والے کا انتقال ہو گیا تو اس پر مرتے وقت قرض پر قبضے کی صورت میں زکوٰۃ نکالنے کی وصیت کرنا لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی زندگی میں ادا کرنا واجب نہ تھا۔ اسی طرح اس کا وارث اگر اس قرض کو وصول کر لے تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ اس مال کا مالک اپنے مورث کے انتقال کے بعد ہوا، لہٰذا اس پر حولان حول کی ابتداء مالک بننے کے بعد سے شروع ہو جائے گی۔ اگر قرض خواہ غریب مقروض کو سال مکمل ہونے کے بعد (یعنی زکوٰۃ واجب ہونے کے بعد) معاف کر دے تو اس پر اس مال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ مقروض کے ساتھ غریب کی قید اس لیے لگائی کہ وہ مصرف زکوٰۃ ہے۔ اور مالدار مقروض مصرف زکوٰۃ نہیں ہے۔ تو اس کو دینا استہلاک کی طرح ہے۔ اگر کسی عورت نے شوہر سے اپنا مکمل مہر قبل الدخول وصول کر لیا۔ اس پر سال گزر گیا۔ سال گزرنے کے بعد قبل الدخول ہی طلاق دی۔ تو عورت کو نصف مہر واپس کرنا پڑے گا۔ اور اس پر نصف مہر کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

زمینی پیداوار کی زکوٰۃ

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مطلقاً زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے۔ پیداوار کم ہو یا زیادہ، بغیر تدبیر اختیار کیے ایک سال تک باقی رہنے والی ہو یا باقی رہنے والی نہ ہو، زمین کو نہر وغیرہ کے جاری پانی سے سیراب کیا ہو یا بارش کے پانی سے سیراب کیا ہو، بہر صورت عشر واجب ہو جائے گا۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ استدلال کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ [البقرہ:۲۶۷] ترجمہ: اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے ستھری چیزیں خرچ کرو اور اس چیز میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے

۱۔ [بیہقی ۴ص ۱]

لیے زمین سے پیدا کی۔

دوسری روایت ”وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ[الانعام:۱۴۱]“ اور جس دن اسے کاٹو اس کا حق ادا کرو۔ حضرت ابن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: یہاں ”حقہ“ سے مراد عشر یا نصف عشر ہے ۱۔ اور حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

”فيما سقت السماء والعيون او كان عشريا العشر، وماسقي بالنضح نصف العشر“

جس زمین کو آسمان یا چشموں کا پانی سیراب کرے یا وہ عُشر ہو تو اس میں عشر ہے جس کو رہٹ کے ذریعے پانی دیا جائے اس میں بیسواں حصہ ہے۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا استدلال حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی ہے: ”رسول اللہ ﷺ نے مجھے یمن مبعوث فرمایا اور مجھے حکم دیا کہ اس زمین سے عشر وصول کروں، جو بارش کے پانی یا بلا خرچ کے پانی سے سیراب ہو رہی ہو اور اس زمین سے بیسواں حصہ وصول کروں۔ جو رہٹ وغیرہ کے ذریعے سے سیراب کی جا رہی ہو ۲۔

امام رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی ہے۔ اور زمین بارش کے پانی سے سیراب ہو رہی ہو تو اس کی پیداوار میں دسواں حصہ اور جو زمین ڈول وغیرہ سے سینچی جا رہی ہو تو بیسواں حصہ اداء کرنا ضروری ہے۔ مطلق پیداوار سے عشر کا وجوب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پیداوار سے عشر نکالنے سے پہلے انتقال کر گیا تو اس کے ترکے سے عشر نکال لیا جائے گا۔ اسی طرح مقروض شخص کی پیداوار سے بھی عشر یا نصف عشر جو بھی واجب ہو نکال لیا جائے گا۔ بچے کی زمین مجنون اور وقف کی زمین سے بھی عشر نکالنا واجب ہے۔ عشر کے بجائے اس کی قیمت بھی دینا جائز ہے۔ حضرات صاحبینؒ (امام ابو یوسف اور امام محمد) کہتے ہیں۔ ایسی پیدوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہو گا جو بغیر کسی تدبیر وستور کرنے کے سال تک خراب ہوئے بغیر باقی رہے جیسا کہ گندم، جو، کھجور، کشمش وغیرہ اور پانچ وسق کو پہنچ جائیں چنانچہ سبزیوں میں کوئی عشر نہیں اور یہی قول امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ ان حضرات کی دلیل حضور ﷺ کا یہ فرمان ہے۔ **”ليس فيما اقل من خمسة اوسق صدقة“** ”پانچ وسق سے کم (پیداوار) میں زکوٰۃ نہیں ہے“۔ ساٹھ صاع کا ایک وسق ہوتا ہے۔ اور صاع علی اختلاف القولین تین ہزار سولہ گرام یا تین ہزار چورانوے گرام کے وزن کے برابر ہوتا ہے۔

ان حضرات کا دوسرا استدلال اس حدیث سے ہے۔ **ليس على الرجل المسلم**

---

۱ [صحیح بخاری ۱۴۸/۲] ۲ [سنن بیہقی ج ۱۳۱/۴]

زکوٰۃ فی کرمہ ولافی زرعہ، اذاکان أقل من خمسة أوسق"[1] "مسلمان کی پیداوار اگر پانچ وسق سے کم ہو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے۔"

یہ حضرات حضور ﷺ کے اس ارشاد گرامی سے بھی استدلال کرتے ہیں۔

"لیس فی الخضروات شیئی." "سبزیوں میں کچھ بھی واجب نہیں۔

خلاصہ یہ کہ امام صاحب اور صاحبین کے درمیان دو جگہ اختلاف ہے۔(۱) نصاب کی شرط میں (۲) پیداوار کے باقی رہنے کی شرط میں۔

چنانچہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک یہ دونوں شرطیں جبکہ امام صاحب کے نزدیک کوئی شرط نہیں ہے۔عشر کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

صاحب تحفۃ الفقہاء نے کہا ہیکہ صحیح وہ ہے جو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔تمام حضرات نے امام صاحب کی دلیل کو ترجیح دی ہے۔

حضرات صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک پانچ وسق شرط ہے اور جو چیز تولی نہیں جاتی ہے مثلاً زعفران، روئی اور ان جیسی چیزوں میں قیمت کا اعتبار کیا جاتا۔اگر ان کی قیمت اس چیز کے برابر ہو جائے۔وسق میں تولی جاتی ہے۔کیوں کہ ان اشیاء میں جو وسق کے ذریعے نہیں ناپے جاسکے ہوں۔مقدار کرنا ممکن نہیں ہے لہٰذا سامان تجارت کی طرح ان کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔لہٰذا زعفران یا اس جیسی دوسری اشیاء کی قیمت نوسو پانچ کلوگرام کے برابر ہو جائے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک غیر وسقی چیزوں میں اعلیٰ درجے کا معیار معتبر ہے۔یعنی جس معیار سے اندازہ کیا جاتا ہے اس میں جو سب سے اعلیٰ معیار ہے اگر وہ پانچ کی تعداد کو پہنچ جائے تو اس میں عشر واجب ہو جائے گا۔ورنہ نہیں چنانچہ وہ اعلیٰ معیار جس سے گندم کا اندازہ لگایا جاتا ہے یا کھجور اور غلوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ وسق ہے اور روئی کا اعلیٰ معیار جس سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔حمل (گٹھڑی) ہے اور زعفران کے تولنے کا اعلیٰ معیار من (دوسوسات درہم کا وزن) ہے۔لہٰذا گندم اور کھجور میں پانچ وسق نصاب ہوگا جیسا کہ منصوص بھی ہے اسی پر قیاس کرتے ہوئے روئی کا نصاب پانچ احمال اور زعفران کا نصاب پانچ من ہے۔ایک من کا وزن دوسوساٹھ درہم کے وزن کے برابر ہوتا ہے جو سات سو ستر گرام وزن کے برابر ہوتا ہے اور حمل تین سو من کے برابر ہوتا ہے۔اس حساب سے روئی کا نصاب ایک ہزار ایک سو کتیس کلوگرام ہوگا۔

شہد میں حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عشر واجب ہے کم ہو یا زیادہ، استدلال

---

[1] [بیہقی ۱۳۱/۴]

حضرت عمرو بن شعیب کے دادا کی روایت سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ بنی متعان کے ایک شخص ہلال اپنے شہد کا عشر لے کر خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔ ایک وادی کی حفاظت کی درخواست کی جس کو سلبہ کہا جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے اس وادی کی حفاظت کا حکم دیا جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو حضرت سفیان بن وہب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس وادی کی حفاظت کے متعلق خط لکھا: تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: اگر وہ شہد کے اس حصے کو جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ادا کرتا تھا تمہیں بھی ادا کرے تو تم اس کے سلبہ (وادی) کی حفاظت کرو۔[1]

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا استدلال حضرت بن ابی ذباب کی روایت سے ہے وہ فرماتے ہیں: میں نے خدمت نبوی میں آ کر اسلام قبول کیا۔ پھر میں نے عرض کیا: یارسول اللہ: میری قوم جو مسلمان ہوئی کے اموال میں کوئی حصہ مقرر کیجئے: آپ ﷺ نے مقرر فرمایا اور مجھے وصول کرنے کا حکم دیا۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے عامل مقرر کیا اور حضرت عمرؓ نے بھی مجھے اس کام پر مامور فرمایا۔ چنانچہ میں نے اپنی قوم سے شہد کی زکوٰۃ ادا کرنے کو کہا۔ قوم والوں نے کہا: ہم کتنی مقدار ادا کریں؟ میں نے کہا: دسواں حصہ، چنانچہ میں نے دسواں وصول کر کے حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت مسلمانوں کے صدقات کی مد میں جمع فرمائی۔

شہد میں وجوب زکوٰۃ کے قائلین میں حضرت امام اوزاعی، امام الزھری، ربیعہ، ابن شہاب اور یحییٰ بن سعید رحمہم اللہ ہیں۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شہد کی مقدار جب تک پانچ فُرق کو نہ پہنچے تو کوئی زکوٰۃ نہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے: شہد میں وجوب زکوٰۃ کا نصاب پانچ افراق ہے اور یک فرق چھتیس رطل ہوتا ہے۔ اور ایک رطل کا وزن ایک سو تیس درہم کے برابر ہوتا ہے جو تین سو ستتر گرام کے برابر ہے۔ اس احساب سے ایک ''فرق'' کا وزن تیرہ کلو گرام اور پانچ سو بہتر گرام ہوگا اور اس صورت میں شہد کا نصاب چھیاسٹھ کلو گرام اور آٹھ سو ساٹھ گرام ہوگا۔

شہد اگر عشری زمین سے نکالا گیا ہو تو اس میں عشر۔ اگر خراج والی سے میں نکالا گیا ہو تو اس میں عشر ہے نہ خراج۔ جیسا کہ خراجی زمین میں عشر نہیں۔ جس زمین کی پیداوار میں عشر واجب ہے اس میں کام کرنے والوں کی مزدوری، بیج کی قیمت اور کھال کے عوض کی قیمت حساب میں شامل نہیں ہوگی۔

---

[1] [بیہقی: ج۴ص۱۲۴]

رکاز (معدنیات اور دفن کردہ خزانے) میں زکوٰۃ

رکاز کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی زمین میں ودیعت کردہ معدنیات اور اہل جاہلیت کے دفینے پر ہوتا ہے۔ مسلمان یا مسلم ملک کے کافر باشندے کو کوئی معدنیات سونا، چاندی، لوہے پیتل یا سیسہ وغیرہ عشری یا خراجی زمین سے ملے تو اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہے۔ بارشاد نبوی ”وفی الرکاز الخمس“ رکاز میں پانچواں ۱/۵ حصہ بیت المال کا ہے۔ ایک قول کے مطابق اس میں حولان حول شرط نہیں ہے۔ کیونکہ سال کی شرط نما (بڑھوتری) کیلئے ہے جب کہ یہ نما ہی نما ہے۔ دوسری وجہ سال کے شرط نہ ہونے کی یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پہلے یہ چیزیں غیر مسلموں کے تصرف میں تھیں۔ ان پر ہمارا تسلط ہوا تو یہ ایک طرح سے مال غنیمت ہوئے اور مال غنیمت میں خمس ۱/۵ حصہ واجب ہے۔ اور ان کو پانے والا غانم (غنیمت پانے والے) کی طرح ہے۔ اور غانمین کو ۴/۵ حصہ ملتا ہے اگر کوئی شخص اپنے گھر میں معدنیات پائے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس میں کچھ بھی نہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنے گھر کے جمیع اجزاء کا مالک ہے۔ لہٰذا معدن بھی گھر کی زمین کا ایک جزو ہے لیکن اگر اپنی زمین میں پائے تو اس میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے دو روایتیں مروی ہیں۔ ایک روایت میں وجوب کا قول کیا اور دوسری میں عدمِ وجوب خمس کا اور حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک گھر میں ملے یا زمین میں بہر صورت خمس واجب ہے۔ کیونکہ حدیث میں مطلق خمس کا ذکر ہے۔

اگر کوئی دفینہ (دبا ہوا خزانہ) پائے۔ اور اس میں مسلمانوں کی ملکیت ہونے کی کوئی علامت بھی پائے تو یہ لقطہ (راستے سے اٹھائی ہوئی چیز) کے حکم میں ہوگی۔

کیونکہ علامت سے معلوم ہوا کہ اس کو مسلمانوں نے دبایا ہوا ہوگا۔ تو یہ غنیمت شمار نہیں ہوگا۔ اور اگر اس میں غیر مسلموں کی کوئی نشانی کوئی علامت پائے تو یہ کفار کے مال ہونے کی علامت ہے جو غنیمت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس لیے اس میں خمس (1/5) بیت المال کا اور باقی چار حصے پانے والے کو ملیں گے۔ اگر عام سرکاری زمین میں پائے تو یہی حکم ہے کہ چار حصے پانے والے کے اور ایک حصے بیت المال کا اور اگر کسی کی ملکیت زمین میں پائے تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ۴/۵ حصہ پانے والے کو اور خمس بیت المال کا ہے اور حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ اس شخص کا ہے جسے یہ علاقہ فتح ہونے کے بعد امیر جیش نے اس کے نام الاٹ کیا تھا۔ اس لیے کہ سب سے پہلے اس کا ہاتھ اس پر پہنچا۔ لہٰذا اس زمین کے ظاہر اور جو کچھ اس کے باطن میں ہے سب کا مالک ہوگیا۔

اگر یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کس کا دبایا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا یا کافروں کا تو وہ کافروں کا دبا ہوا تصور کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کافروں کے علاقے میں رہنے لگا اور ان کے مکانات میں سے کسی مکان میں رہنے لگا اور اس مکان میں دفینہ پایا۔ تو یہ ان لوگوں کا شمار ہوگا۔ اس کے لیے اس پر قبضہ کرنا جائز نہیں کیونکہ یہ غدر ہے اور اگر ان کے صحراء میں پائے تو یہ اس کی ملکیت ہوگی۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک موتی اور عنبر میں خمس نہیں ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان دونوں میں بلکہ سمندر سے حاصل کردہ تمام زیورات میں خمس واجب ہے۔

مصارف زکوٰۃ کا بیان

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ'' [التوبة: ٦٠]

''صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا اور محتاجوں کا اور جو کارکن ان صدقات پر متعین ہیں اور جن کی دلجوئی کرنا (منظور) ہے، اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں اور قرض داروں کے قرضہ میں اور جہاد میں اور مسافروں میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے فرمانِ ذی شان ''لِلْفُقَرَآءِ میں ''لام'' جہت استحقاق کو بیان کرنے کے لیے ہے، شرکت اور تقسیم کے لیے نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کے جتنے اصناف ذکر کیے ہیں ان میں سے ہر صنف (نوع) کو پوری زکوٰۃ دینا بھی جائز ہے اور ہر صنف میں سے ایک فرد کو دینا بھی جائز ہے کیونکہ ہر صنف ایسی ہے کہ اس کو شمار کرنا ممکن نہیں ہے، جس کو شمار کرنا ممکن ہو اس کی طرف کسی چیز کی اضافت تملیک کے لیے نہیں بلکہ بیان جہت کے لیے ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ جنس کو شامل ہوگی اور وہ ایک ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ وہ دریائے فرات کا پانی نہیں پیئے گا۔ پھر اس سے ایک گھونٹ پانی پی لے تو حانث ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ سارا پانی پینے پر قدرت نہیں رکھتا۔ پس معلوم ہوا کہ مذکورہ اصنافِ ثمانیہ زکوٰۃ کے لیے ایسے ہیں جیسے نماز کے لیے کعبۃ اللہ، اور ہر صنف کعبۃ اللہ کے جزو کی مانند ہے کہ کعبہ کے کسی جزو (حصہ) کا استقبال (قبلہ رخ ہونا) بھی کافی ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان، ''اِنَّمَا'' مذکورہ اصناف کے اثبات اور غیر مذکورہ کی نفی کے لیے ہے، یعنی ''اِنَّمَا'' کا کلمہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ہے کہ جنس صدقات، اصناف

معدودہ میں منحصر ہے، اور ان ہی کے ساتھ خاص ہے۔ گویا کہ یوں فرمایا کہ یہ صدقات صرف ان کے لئے ہیں دوسروں کے لیے نہیں ہیں۔ آخری چار اصناف میں کلمہ "لام" کی بجائے "فِیْ" کا کلمہ استعمال کیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ وہ مذکورہ اصناف کی بہ نسبت استحقاقِ صدقہ کے حق میں زیادہ مؤکد ہیں کیونکہ کلمہ "فِیْ" ظرفیت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ان آٹھ اصناف زکوٰۃ میں سے "مؤلفۃ القلوب" کی صنف ختم ہو چکی ہے، اس کی تین انواع ہیں، ایک نوع وہ تھی جس کو نبی کریم ﷺ دل جوئی کے لیے زکوٰۃ دیتے تھے تا کہ وہ مسلمان ہو جائیں اور ان کے مسلمان ہونے سے ان کی قوم بھی مسلمان ہو جائے۔ دوسری نوع وہ تھی جو مسلمان تھی، لیکن وہ کمزور (الاعتقاد سمجھے جانے والے) مسلمان تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کو اس لیے دیتے تھے تا کہ وہ اسلام میں پختہ ہو جائیں اور انکی تیسری نوع وہ تھی جن کے شر سے بچنے کے لئے زکوٰۃ دی جاتی تھی۔ مثلاً عباس بن مرداس السلمی، عینیہ بن حصن الفزاری، صفوان بن امیہ القرشی، اقرع بن حابس التمیمی اور ابوسفیان بن حرب الاموی وغیرھم۔

آنحضرت ﷺ ان کو اس لیے نہیں دیتے تھے کہ آپ ﷺ ان سے ڈرتے تھے، کیونکہ انبیاء کرام علیہم الصلوات، اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں، آپ ﷺ ان کو صرف اس اندیشہ سے کہ کہیں ان کو اللہ تعالیٰ آتش دوزخ میں نہ ڈال دے، مال زکوٰۃ میں سے دیتے تھے۔

سوال: وہ تو کفار تھے، ان کو زکوٰۃ دینا کیسے جائز تھا؟

جواب: جہاد، امیر غریب تمام مسلمانوں پر فرض ہے، اس زمانے میں غریبوں کے مال میں سے کسی کو دینا ان کے حق میں جہاد کے قائم مقام تھا۔ پس گویا آپ ﷺ نے یہی ان کو دے دیا پھر وفاتِ رسول ﷺ کے بعد یہ حصہ ساقط ہو گیا، وصال نبوی ﷺ کے بعد مؤلفۃ القلوب حضرات، ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور مطالبہ کیا کہ ان کے لیے حسب دستور اس کو تحریر کیا جائے، انہوں نے تحریر کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گواہ بنایا، چنانچہ وہ اس تحریر کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے تا کہ اس تحریری معاہدے کے مطابق اپنا حصہ وصول کریں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو پھاڑ دیا اور فرمایا: ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے، اب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت بخش دی ہے اور ہمیں تم سے مستغنی کر دیا ہے، پس اگر تم اسلام پر قائم رہتے ہو تو ٹھیک، ورنہ ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی" (یہ سن کر) وہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس واپس گئے اور ان سے کہنے لگے: آپ خلیفہء وقت ہیں یا وہ؟ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ ہے، اگر وہ چاہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل کو برقرار رکھا اور دیگر صحابہؓ نے اس پر ان کی موافقت کی،

پس صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا۔

لیکن محض حکم کی علت کا ختم ہو جانا اصل حکم کی نفی پر دلیل نہیں بن سکتا، کیونکہ کوئی حکم اپنی بقاء میں علت کی بقاء کا محتاج نہیں ہوتا، جیسے اضطباع اور رمل کا حکم ہے۔ لہٰذا کسی ایسی دلیل کا ہونا ضروری ہے جس سے معلوم ہو کہ مذکورہ حکم بقاءِ علت کے ساتھ مقید تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس آیت کریمہ کا ذکر کیا تھا وہ اجماع کا مدار بن سکتی ہے، وہ آیت یہ ہے۔ ''وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکھف: ۹۲) '' اور آپ فرما دیجئے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے (آ گیا) ہے، پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے'' یا مؤلفۃ القلوب کو مال زکوٰۃ نہ دینے کا حکم آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان سے منسوخ ہوگا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا ''زکوٰۃ کا مال، مالداروں سے لے کر ان ہی کے ناداروں میں لوٹا دو'' پس یہ حدیث اجماع کے لیے مدار ہوگی، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ ہی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مذکورہ حدیث کی وجہ سے نسخ ثابت ہوگا جس کو اہل اجماع نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا۔ پس صحابہ رضی اللہ عنہم کی نسبت سے قطعی ہوگا اور کتاب اللہ سے اس کا نسخ درست ہوگا، اجماع فی نفسہ ناسخ نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ صحیح امر کے خلاف ہے، کیونکہ نسخ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی ہوسکتا ہے۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات میں حجت نہیں ہے کیونکہ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رجوع کرنا فرض ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کے بغیر کسی اجماع کی کوئی حیثیت نہیں۔ پس یہ نسخ حدیث سے ہے نہ کہ اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم سے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے جس کو اصحاب ستہ نے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تم ایک ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہے، ان کو اس بات کی طرف دعوت دینا کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور میں اللہ کا رسول ہوں، پس اگر اس میں وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لی جائے گی اور ان ہی کے فقیروں پر لوٹائی جائے گی۔''

اس حدیث میں ''فقرائهم'' کی ضمیر مسلمانوں کی طرف لوٹتی ہے، لہٰذا مؤلفۃ القلوب خواہ کافر ہوں یا مال دار، ان کو زکوٰۃ نہیں دی جائے گی اور جو ان میں سے مسلمان ہوں اور فقیر ہوں تو فقیر ہونے کی وجہ سے ان کو زکوٰۃ دی جائے گی نہ کہ مؤلفۃ القلوب ہونے کی وجہ سے۔ معلوم ہوا کہ مؤلفۃ القلوب کی تمام انواع بالعموم منسوخ ہیں جو مال دار اور نادار سب کو شامل ہے خواہ وہ کفار ہوں یا مسلمان۔

زکوٰۃ کا پہلا اور دوسرا مصرف فقیر اور مسکین ہے۔

فقیر وہ ہے جس کے پاس بڑھنے والے نصاب سے کم کوئی ادنیٰ چیز ہو اور مسکین وہ ہے کہ جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے۔ بعض نے اس کے برعکس کہا ہے اور ہر قول کی وجہ موجود ہے پھر مسئلہ یہ ہے کہ فقیر اور مسکین دو مختلف اصناف ومصارف ہیں یا دونوں ایک ہی صنف اور مصرف ہے؟ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دو مختلف اصناف ہیں اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک دونوں ایک ہی صنف (نوع ومصرف) ہیں اس اختلاف کا ثمرہ، اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کے تہائی حصہ میں وصیت کرے کہ یہ فلاں کو اور فقراء ومساکین کو دے دینا تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق وہ تہائی حصہ ان سب کے درمیان اثلاثاً تقسیم ہوگا اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق اس کے دو نصف ہوں گے ایک نصف فلاں کے لیے اور ایک نصف فقراء اور مساکین کے لیے ہوگا۔

زکوٰۃ کا تیسرا مصرف عامل ہے یعنی زکوٰۃ پر مقرر کردہ عامل (محصل) کو اس کے کام کے مطابق خرچ دیا جائے گا جو اس کے اور اس کے معاونین (عملہ) کے لیے کافی ہو۔ امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے، اس لئے کہ اس نے اپنے آپ کو اسی کام پر لگا دیا ہے پس اس کو اتنے خرچ کی ضرورت ہے جو اس کے لیے کافی ہو اور اس کا یہ استحقاق بطورِ کفایت کے ہے لیکن اگر اس قدر کو کافی ہونے کے لیے زکوٰۃ کا سارا مال صرف ہو جاتا ہو تو نصف سے زیادہ نہ دے، اس لیے کہ نصف ہونا عین انصاف کے مطابق ہے۔ باوجودیکہ غنی کو زکوٰۃ لینا حرام ہے لیکن عامل ہونے کی صورت میں یہ لینا غنی کے لیے حلال ہے۔ پس عامل اگرچہ غنی ہو اس کے لیے زکوٰۃ وصدقات میں سے خرچ لینا جائز ہے۔ اگر عامل ہاشمی ہو تو قرابت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے اس کو میل کچیل کے شبہ سے بچانے کے لیے اس مال میں سے لینا جائز نہیں ہے۔ غیر ہاشمی کے لیے جائز ہے، خواہ وہ غنی ہو، کیونکہ غنی بزرگی کا حقدار ہونے میں ہاشمی کے مرتبے کو نہیں پہنچتا تو اس کے حق میں شبہ معتبر نہ ہوا۔

اگر عامل ہاشمی کو صدقات وصول کرنے کے لیے مقرر کیا جائے اور اس کو اس میں سے روزینہ دیں تو اس کو لینا نہیں چاہیے اور اگر وہ یہ کام کرے اور روزینہ دوسری مد سے دیا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں اس سے معلوم ہوا کہ اس کو اس کام پر مقرر کرنا درست ہے اور اس کو صدقات میں سے اجرت لینا مکروہ ہے حرام نہیں ہے۔

اگر یہ مال عامل کے ہاتھ میں ہلاک ہو جائے تو مال والوں کے ذمے سے فرض ادا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس کا ہاتھ بمنزلہ امام کے ہاتھ کے ہے اور وہ فقراء کی طرف سے ان کا نائب ہے، یعنی اگر عامل کے پاس مال ہلاک ہو جائے یا ضائع ہو جائے تو اس کا حق ساقط ہو جائے گا اور زکوٰۃ

دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی یعنی اس کی مزدوری باطل ہوگئی اور اس کو بیت المال سے کچھ نہ دیا جائے گا۔

زکوٰۃ کا چوتھا مصرف ''رقاب'' یعنی مکاتب غلام ہیں اور ان کو آزاد کرانے میں ان کی مدد کی جائے، آج کل یہ مصرف موجود نہیں ہے اس لیے زکوٰۃ دیگر مصارف میں صرف کی جائے گی۔

زکوٰۃ کا پانچواں مصرف ''غارم'' یعنی مدیون (قرض دار) ہے، یہ وہ شخص ہے جس پر قرض لازم ہو اور اپنے قرض سے زائد کسی نصاب کا مالک نہ ہو۔ آیت صدقہ تو مطلق مدیون کو زکوٰۃ دینے کا تقاضا کر رہی ہے لیکن آنحضورﷺ کا یہ فرمان ''لا تحل الصدقة لغني''[1]

یعنی غنی کے لیے زکوٰۃ لینا حلال نہیں ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا شخص جو اپنے قرض سے زائد کسی نصاب کا مالک ہو اس کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

غارم وہ ہے جس کے ذمے کسی کا قرض ہو اور اس کے پاس ادا کرنے کے لیے کچھ نہ ہو اور وہ شخص جس کا لوگوں کے اوپر قرضہ ہے اور وہ اس کو وصول کرنے پر قادر نہیں ہے اور اسکے پاس اور کچھ بقدر نصاب نہیں ہے۔ تو وہ غریم (قرض خواہ) فقیر ہے، اس کو بھی زکوٰۃ لینا جائز ہے۔

چھٹا مصرف ''فی سبیل اللہ'' یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فی سبیل اللہ سے مراد وہ مجاہدین ہیں جو فقیری کی وجہ سے لشکر اسلام کے غازیوں سے جدا ہیں۔

یعنی جو نفقہ یا سواری وغیرہ کے نہ ہونے کے باعث اپنے فقر کی وجہ سے لشکر اسلام کے ساتھ ملنے سے عاجز رہ گئے ہوں، ان کو زکوٰۃ لینا حلال ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو فقیری کی وجہ سے حاجیوں کے قافلے سے جدا ہو گئے ہوں، یعنی جو لوگ کسی وجہ سے قافلے میں نہیں مل سکتے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنا اونٹ اللہ کے راستے میں دیا تو آنحضورﷺ نے اس کو حکم دیا کہ کسی حاجی کو اس پر سوار کر دے''

مال دار غازیوں میں زکوٰۃ کا مال صرف نہ کیا جائے، کیونکہ اس کا مصرف فقراء ہیں بعض کہتے ہیں کہ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد طالب علم ہیں۔ کتاب ''الشرنبلالیۃ'' میں اس کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور جو حضرات ''فی سبیل اللہ'' کی تفسیر طالب علم سے کرنے کو بعید کہتے ہیں ان کے اس قول کو بعید قرار دیا ہے، کیونکہ طالب علم کا مقصد احکام کا استفادہ ہوتا ہے، کیا کوئی طالب علم اس شخص کے رتبے کو پا سکتا ہے جس نے صحبت نبویﷺ سے فیض حاصل کیا ہو اور بارگاہِ نبوت سے وابستہ رہا ہو۔ جیسا

---

[1] [سنن ابی داؤد ۲/ ۱۱۸]

کہ اصحاب صفہ تھے معلوم ہوا کہ اس کی تفسیر طالب علم سے کرنا بہت عمدہ ہے۔ ''البدائع'' میں فی سبیل اللہ'' کی تفسیر کل تقربات وخیرات سے کی ہے، پس اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت اور نیکی کے راستے میں کوشش کرے بشرطیکہ وہ محتاج ہو، (اور یہ اختلاف آیت کی تفسیری مراد میں ہے، حکم میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ اختلاف لفظی ہے) اور طالب علم کے بارے میں کہا ہے (اور اس قول کو الواقعات کی طرف منسوب کیا ہے) کہ اس کے لیے زکوٰۃ لینا جائز ہے، خواہ وہ غنی ہو جب کہ وہ اپنے آپ کو علم کے افادہ واستفادہ کے لیے فارغ کرلے، کیونکہ وہ کسب سے عاجز ہے اور اس کی حاجت بھی اس چیز کی داعی ہے جس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تردید کی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات غنی میں اطلاقِ حرمت کے خلاف ہے اور کسی نے اس پر اعتماد نہیں کیا۔

ساتواں مصرف ''ابن السبیل'' یعنی مسافر ہے۔ یعنی وہ مسافر جو دور ہونے کی وجہ سے اپنے مال سے جدا ہیں، ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں، کیونکہ سبیل کا معنی راستہ ہے اور راستہ اس کو لازم ہوگیا ہے۔ اس لیے اس نام سے موسوم ہوگیا۔ اور مسافر اگرچہ اپنے وطن میں مالدار ہو لیکن سفر میں اس کے ساتھ مال نہیں ہے، یا اپنے وطن میں اس طرح ہو کہ اس کا قرضہ لوگوں کے ذمے ہو اور وہ اس کے لینے پر قادر نہ ہو تو اس وقت وہ فقیر ہے اور اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، اگرچہ اس کے گھر والے مال میں اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اپنے وطن پہنچ کر اس کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا ایسے فقیر مسافر کو زکوٰۃ کے مال میں سے اپنی حاجت کے بقدر لینا جائز ہے اور حاجت سے زیادہ لینا حلال نہیں ہے۔ کیونکہ وہ سردست فقیر ہے، اگرچہ وہ ظاہراً غنی ہے مسافروں کو زکوٰۃ قبول کرنے کی بجائے قرض لینا اولیٰ ہے، لیکن یہ ان کے لیے لازمی نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے ادا سے عاجز ہونے کا امکان ہے۔ اور اس کو اپنے مال پر قادر ہونے کے بعد اس بچے ہوئے مال کا صدقہ کردینا واجب نہیں ہے۔ جس شخص کا میعادی قرض لوگوں کے اوپر ہو اور اس کو اپنے خرچ کی ضرورت ہو تو اس کو مالِ زکوٰۃ میں سے اس قدر لینا جائز ہے جو میعاد کے پورا ہونے تک اس کے خرچ کو کافی ہو اور اگر قرض کی میعاد مقرر نہ ہو تو اگر قرض دار محتاج ہے تو اصح قول کے مطابق اس کو زکوٰۃ لینا جائز ہے۔ کیونکہ وہ مسافر کے حکم میں ہے اور اگر قرض دار مال دار ہو اور قرض کا اقرار کرتا ہو تو اس کو زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے اور اسی طرح اگر وہ قرض دار انکار کرتا ہو اور اس کے پاس قرض کے گواہ عادل ہوں تب بھی یہی حکم ہے (کہ زکوٰۃ لینا جائز نہیں ہے)

پس اوپر جن سات مصارفِ زکوٰۃ کا بیان ہوا یہ سب زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے مصرف ہیں

اور مالک کو اختیار ہے کہ ان میں سے ہر قسم کے آدمی کو تھوڑا تھوڑا دے یا ایک ہی قسم کے آدمیوں کو سب زکوٰۃ دے اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ ایک ہی شخص کو دے دے۔ اگرچہ دوسری اقسام کے لوگ بھی موجود ہوں، کیونکہ زکوٰۃ اللہ کا حق ہے اور وہی اس کو لینے والا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ'' [التوبہ:۱۰۴] ''اور وہ صدقات کو لیتا ہے'' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ''جب کوئی شخص حلال پاکیزہ مال میں سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ حلال و پاکیزہ مال کو ہی قبول کرتا ہے تو رحمٰن اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے لیتا ہے۔ الحدیث حسن صحیح[۱]

آیتِ صدقہ میں فقراء کی طرف بحرف لام اضافت کرنا اس بات کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ یہ سب زکوٰۃ کے مصارف ہیں اور فقر و حاجت کی علت سے۔ یہ مصارف قرار پائے ہیں اور اس سے مقصد فقیر کو مالدار کرنا اور محتاج کی حاجت و ضرورت کو پورا کرنا ہے۔

جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا تھا، اس وقت ان سے فرمایا۔ ''تم ایسی قوم کے پاس جا رہے ہو جو اہل کتاب ہے۔'' [الحدیث] اس میں یہ بھی ہے کہ جب وہ یہ کام کرلیں تو ان کو خبر دینا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے اموال سے لی جائے گی اور ان ہی کے فقراء پر لوٹائی جائے گی۔''[۲] معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا مقصد دفع حاجت ہے اور مذکورہ مصارف میں سے اغنیاء کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔

جن لوگوں کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے

(۱) غیر مسلم کو زکوٰۃ نہ دی جائے، کیونکہ فرمان نبوی ﷺ ہے کہ ''پھر یہ زکوٰۃ ان کے فقراء پر لوٹائی جائے گی (یعنی فقرائھم میں ضمیر مسلمانوں کی طرف لوٹتی ہے اس لئے زکوٰۃ کافر کو نہ دینی چاہیے۔) زکوٰۃ کے علاوہ اور صدقات میں سے ان کو دینا جائز ہے، خواہ وہ واجب ہوں یا نفلی، لیکن مسلمانوں کے فقراء کو دینا افضل ہے۔ صدقۃ فطر نذر کفارہ میں اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا اس میں اختلاف ہے اور انہوں نے فرمایا کہ زکوٰۃ پر اعتبار (قیاس) کرتے ہوئے تمام واجب صدقات کا ان کو دینا جائز نہیں ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے۔

(۲) مال دار کو جو نصاب کا مالک ہو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ زکوٰۃ کسی مالدار کے لیے حلال نہیں ہے۔''[۳] مالدار کی نابالغ اولاد کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے باپ کے غنی ہونے کی وجہ سے غنی شمار ہوگی، حتیٰ کہ اس کا نفقہ ان کے باپ پر

---

۱ [سنن الترمذی ۲/۸۵] ۲ [سنن البیہقی ۴/۱۰۱] ۳ [سنن ابی داود ۲/۱۱۸]

ہی واجب ہوتا ہے۔ بخلاف بالغ اولاد کے وہ اپنے باپ کے غنی ہونے کی وجہ سے غنی قرار نہیں دی جائے گی۔ یہاں تک کہ ان کا نفقہ انہی پر واجب ہے، ان کے باپ پر نہیں ہے۔ مالدار کا باپ فقیر (محتاج) ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔ غنی کی بیوی اگر فقیر ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

اگر کسی کا مہر اس کے خاوند کے ذمے دین ہو جو نصاب کی مقدار ہے اور وہ خاوند مالدار ہے تو اس کو زکوٰۃ دینا امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ (اور احتیاطاً اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے)۔

غنی کے مراتب

(۱) جس کے لیے سوال کرنا حرام ہے لیکن زکوٰۃ لینا حلال ہے، وہ ایسا غنی ہے جو ایک دن کی خوراک اور ستر عورت کا مالک ہو۔ (۲) جس کے لیے سوال کرنا اور زکوٰۃ لینا دونوں حرام ہے اور اس پر صدقہ فطر اور قربانی کرنا واجب ہے، وہ ایسا غنی ہے جو اتنے مال کا مالک ہو جس کی قیمت نصاب کو پہنچتی ہو اور حوائج اصلیہ سے زائد ہو جیسے گھر کا سامان، کپڑے، زمین اور سواری وغیرہ۔ (۳) جس کے لیے سوال کرنا اور زکوٰۃ لینا دونوں حرام ہیں اور اس پر صدقہ فطر اور قربانی کرنا واجب ہے اور زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، وہ ایسا غنی ہے جو ایسے نصاب کا مالک ہو جو بڑھنے والا ہو اور مکمل ہو۔

اپنی اصل یعنی ماں یا باپ اور ان سے اوپر کے لوگ دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ کو اور اپنے فروع یعنی بیٹا، بیٹی اور ان سے نیچے کے لوگ پوتا، پوتی، نواسا، نواسی وغیرہ کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس سے اس زکوٰۃ دینے والے کی منفعت ہر لحاظ سے منقطع نہیں ہوئی بلکہ ایک لحاظ سے اس کی منفعت باقی ہے۔[۱] اور اس لیے کہ جانبین سے دونوں کے درمیان جزئیت ثابت ہے، حتیٰ کہ حقوق عامہ میں ایک کا دوسرے کے حق میں گواہی دینا جائز نہیں ہے اور مال چرانے سے قطع ید نہیں ہوگا۔ پس زکوٰۃ کی تملیک علی وجہ الکمال متحقق نہیں ہوئی۔ نیز اس لیے کہ وہ نفقات کے مستحق ہیں اور صلہ رحمی کے اعتبار سے ایک دوسرے کی غمخواری واجب ہوتی ہے، پس دوسرے اعتبار سے وہ زکوٰۃ کے مستحق نہیں ہوں گے۔ یہی حکم ہے عشر اور دیگر واجبات کا کہ ان کو دینا جائز نہیں ہے جیسا کہ ان کی چھوٹی (نابالغ) اولاد کو دینا جائز نہیں ہے۔

خاوند کا اپنی بیوی کو اور بیوی کا اپنے خاوند کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ عادت کے بموجب وہ منافع میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں، نیز اس لیے کہ خاوند کے ذمے عورت کے لیے جو نفقہ وکسوہ وغیرہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ غنی شمار ہوتی ہے اور اس لیے بھی کہ وہ

---

۱ [البحر الرائق وغیرہ]

دونوں ولادت میں اصل ہیں، لہٰذا جیسے اس اصل کے فروع کو زکوٰۃ دینا ممنوع ہے۔اسی طرح اصل کو دینا بھی ممنوع ہوگا اور دونوں کے درمیان میراث بھی تقسیم ہوتی ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک عورت اپنے خاوند کو زکوٰۃ نہ دے، کیونکہ وہ دونوں منافع میں شریک ہوتے ہیں، نیز اس لیے کہ خاوند اپنی مالدار بیوی کے مال کی وجہ سے غنی شمار ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى''[الضحیٰ:۸] یعنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال واسباب کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غنی کردیا اور صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک عورت اپنے خاوند کو زکوٰۃ دے سکتی ہے، کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی بیوی سے فرمایا تھا جبکہ اس نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو صدقہ دینے کے متعلق دریافت کیا تھا کہ اے عورت! ''تیرے لیے دو اجر ہیں، ایک صدقہ دینے کا اجر اور دوسرا صلہ رحمی کرنے کا اجر۔''[1]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ حکم صدقہء نفلی کے متعلق ہے۔(جیسا کہ ہدایہ میں بھی مذکور ہے)۔امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول راجح ہے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی بیوی کی مالداری اپنے کام کاج کی وجہ سے تھی۔

اپنے غلام ومکاتب ومدبر، اپنی اِم ولد اور اپنے معتق البعض کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے۔اور معتق البعض کا حکم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے۔کیونکہ ان صورتوں میں تملیک جو زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرط ہے، مفقود ہے۔اس لیے کہ غلام کی کمائی اس کے آقا کے لیے ہوتی ہے اور اپنے مکاتب غلام کی کمائی میں بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے، اور مکاتب غلام ہی رہتا ہے جب تک کہ اس پر ایک درہم بھی باقی ہو، پس ادائیگیٔ زکوٰۃ ثابت نہ ہوئی، اور مکاتب غلام ہی ہوتا ہے اور مکاتب وہ غلام ہے جس کو آقا کہہ دے کہ ایک ہزار (مثلاً) مجھے ادا کردے تو تو آزاد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد مبارک ''وَفِي الرِّقَابِ''[البقرۃ:۱۷۷] کا یہی مفہوم ومطلب ہے۔

زکوٰۃ کا مال بنی ہاشم کو دینا جائز نہیں ہے اور بنی ہاشم سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وحضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور حضرت حارث بن عبدالمطلب کی اولاد ہے اور ان کے علاوہ جو دیگر بنی ہاشم ہیں ان کو زکوٰۃ کا مال دینا جائز ہے جیسے ابولہب کی اولاد ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔''یہ صدقات، حقیقت میں لوگوں کے میل کچیل ہیں اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حلال نہیں ہیں۔''[صحیح مسلم ۲/۷۵۴] اور آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مراد وہی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔

---

[1] [صحیح مسلم ۲/۶۹۵]

(۷) اور بنی ہاشم کے غلاموں کو بھی زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔
"ان الصدقة لاتحل لنا، وان موالي القوم من أنفسهم"[۱] یعنی بے شک ہمارے لیے صدقہ حلال نہیں ہے اور کسی قوم کا آزاد کیا ہوا غلام ان ہی میں سے ہوتا ہے۔ نیز بنی ہاشم وغیرہ کے لیے زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کا حرام ہونا اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اور ان کی اولاد کو دوسروں پر شرف وفضیلت دی ہے، کیونکہ انہوں نے اپنے زمانہ جاہلیت وزمانہ اسلام میں حضور انور ﷺ کی نصرت کی ہے اور ابولہب، حضور علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے میں حد درجہ حریص تھا۔ پس اس کی اولاد اس شرف واعزاز کی بالکل مستحق نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے عوض خمس الخمس (پانچویں حصہ کا پانچواں حصہ) دلایا، جیسا کہ فرمایا: "مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى .... الآیۃ [الحشر:۷]

کیا ہاشمی ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتا ہے؟ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز نہیں ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جائز ہے۔ یہ منع کا حکم صدقات واجبہ میں ہے لیکن صدقات نافلہ اور اوقاف کی آمدنی بنی ہاشم کو دینا جائز ہے جبکہ وقف کرنے والے نے بنی ہاشم کا نام لیا ہو ورنہ جائز نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جس صورت میں نام نہیں لیا تو ہر لحاظ سے صدقہ ہوا، پس ہاشمیوں کو جائز نہ ہوا اور جب ان کا نام لے لیا تو تبرع اور صلہ ہوا صدقہ نہ ہوا۔ اسی طرح کان اور دفینے کے مال کا خمس (۱/۵) ان کو دینا جائز ہے، لیکن نذر وعشر وکفارات وجزائے صید اور صدقۂ فطر ان کو دینا جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ تمام واجب صدقات ہیں۔[۲]

زکوٰۃ کے مال سے مسجد بنانا، پل بنانا، راستے بنانا، نہریں کھودنا، حج وجہاد کے لیے دینا اور وہ سب صورتیں جن میں اس کو مالک نہیں بنایا جاتا جائز نہیں ہیں اور اس مال سے میت کو کفن دینا بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ میت میں تملیک کی صحت نہیں پائی جاتی اور زکوٰۃ کے مال سے میت کا قرض ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے، زکوٰۃ میں ضروری ہے کہ فقیر ہی اس کو قبضہ کرے یا اس کا ولی یا وکیل قبضہ کرے، جب کہ اگر یتیم چھوٹے بچوں کو زکوٰۃ دینے کا ارادہ ہو تو ان کی ماں کو دے دے۔ زکوٰۃ کے مال سے فقیر آدمی کا قرض ادا کیا جا سکتا ہے اور قابض اس فقیر کی طرف سے وکیل ہوگا۔ زکوٰۃ کے جتنے مصارف بیان ہوئے ان سب میں فقر شرط ہے۔ صرف عامل، مکاتب غلام اور ابن السبیل اس شرط سے خارج ہیں۔

فقیر وہ ہے جو ایسے نصاب کا مالک نہ ہو جو بڑھنے والا ہو، پس ایسے فقیر کو زکوٰۃ دینا جائز

---

۱ [سنن الترمذی ۲/۸۴]   ۲ [کذا عن ابی یوسف رحمۃ اللہ علیہ]

ہے، خواہ وہ تندرست اور کمانے والا ہو، البتہ جو شخص زندگی کا سہارا رکھتا ہو اس کو نہ لینا ہی بہتر ہے۔

زکوٰۃ کے متفرق مسائل

اگر ایک ہی فقیر کو نصاب بھر مال دے دیا یا اس سے زیادہ تو جائز ہے لیکن مکروہ ہے۔ اگر فقیر پر قرض ہو کہ اگر اس کے قرض کو ادا کرتا ہے تو نصاب سے کم بچتا ہے تو مکروہ بھی نہیں ہے یا اس کے بال بچے ہوں کہ اگر ان بچوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر ایک کو نصاب سے کم ملتا ہے تو مکروہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ غنی نہیں ہوتے۔

جو شخص نصاب سے کم مال کا مالک ہو اگرچہ تندرست اور پیشہ ور ہو تو اس کو زکوٰۃ دینا جائز ہے، کیونکہ وہ مفلس ہے۔

اگر تحری کر کے ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جس کو وہ اپنے غالب گمان میں زکوٰۃ کا مصرف جانتا ہے، پھر اس کے خلاف ظاہر ہوا، مثلاً فقیر گمان کیا تھا لیکن وہ غنی ظاہر ہوا یا ہاشمی یا غیر مسلم ظاہر ہوا یا اندھیرے میں زکوٰۃ دی تھی پھر معلوم ہوا کہ وہ اس کا باپ یا بیٹا تھا تو ان سب صورتوں میں اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور وہ اس کو دوبارہ نہیں دے گا، اس لیے کہ جو اس پر واجب تھا وہ اس نے ادا کر دیا، اور اس پر واجب یہ تھا کہ وہ اپنی کوشش اور غالب گمان میں جس کو فقیر خیال کرتا ہے اس کو زکوٰۃ کا مال دیدے کیونکہ وہ حقیقت پر واقف نہیں ہوسکتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ میں دوسرے کا مال ہوتا ہے یا اس پر اس کا قرض ہوتا ہے، پس جب اسے اپنی کوشش صرف کرنے کے بعد دیدے تو جائز ہے، جیسا کہ اجتہاد اور کوشش کرنے کے بعد قبلہ کی سمت میں غلطی ظاہر ہو جائے تو نماز کا اعادہ نہیں ہوتا۔ نیز ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ "اے یزید! تیرے لیے وہ ہے جس کی تو نے نیت کی اور اے معن! تیرے لیے وہ ہے جو تو نے لے لیا۔"[1] واقعہ یہ ہوا تھا کہ ان کے والد یزید نے چند دینار صدقہ کی نیت سے نکالے اور مسجد میں بیٹھے ایک آدمی کے پاس رکھ دیئے۔ معن رضی اللہ عنہ آئے اور ان دنانیر کو لے لیا، یزید نے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے تجھے دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا، معن رضی اللہ عنہ اس معاملے کو بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذکورہ فیصلہ فرمایا۔ الحدیث امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اس پر زکوٰۃ کا اعادہ واجب ہے۔

لیکن جب کسی کو فقیر گمان کر کے زکوٰۃ دی پھر معلوم ہوا کہ وہ اس کا غلام یا مدبر یا ام ولد یا مکاتب تھا تو زکوٰۃ جائز نہ ہوگی اور وہ بالا جماع دوبارہ ادا کرے گا، کیونکہ تملیک معدوم ہے۔ اگر ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جو اس کی خدمت کرتا ہے اور اس کی ضروریات کو پورا کرتا ہے یا ایسے مفلس کو دی

---

1. [صحیح البخاری ۲/۱۳۲]

جواس کے پاس تنخواہ پر کام کرتا ہے یا اس شخص کو دی جس کو اس نے کوئی ہدیہ وتحفہ دیا ہے تو زکوٰۃ جائز ہوگی۔لیکن اگر وہ اس کو معاوضہ میں دیتا ہے تو جائز نہیں ہوگی۔اگر زکوٰۃ کا مال ایسے بچے کو دیا جو عقل و سمجھ رکھتا ہے اور پھر اس نے خود ہی قبضہ کرلیا تو جائز ہوگی۔اگر کسی دیوانے کو زکوٰۃ دی پس اس کے ولی نے یا اس شخص نے جو اس کی کفالت کرتا ہے اس کیلئے قبضہ کرلیا تو جائز ہوگی اور لقیط (وہ بچہ جو پڑا ہو ملے) کی طرف سے اس کا ملتقط (جس کو وہ بچہ پڑا ہوا ملے اور اس نے اس کو اٹھایا ہو) قبضہ کرتا ہے۔

زکوٰۃ کی منتقلی کا مسئلہ

ایک شہر سے دوسرے شہر زکوٰۃ کا مال منتقل کرنا مکروہ ہے، ہر قوم کا صدقہ ان ہی میں تقسیم ہوگا، کیونکہ اس میں حق جوار کی رعایت ہے، لہٰذا مجاورت جتنی قریب کی ہوگی اس کی رعایت اتنی ہی واجب ہوگی، لیکن اگر دوسرے شہر میں منتقل کردی تو ادا ہوجائے گی۔اگرچہ یہ عمل مکروہ ہے۔اس لیے کہ زکوٰۃ کا مصرف از روئے نص مطلق فقراء ہیں اور رقوم زکوٰۃ کی دوسرے شہر میں منتقلی اس صورت میں مکروہ ہے جب سال پورا ہونے کے بعد ادا کرے اگر سال پورا ہونے سے پہلے دے تو پھر دوسرے شہر میں منتقل کرنا مکروہ نہیں ہے۔اسی طرح اگر دوسرے شہر میں فقراء اس کے رشتہ دار ہوں تو زکوٰۃ ان کی طرف منتقل کرنا (بھیجنا) بلا کراہت جائز ہے بلکہ افضل ہے، کیونکہ اس میں فرض بھی ساقط ہوتا ہے اور صلہ رحمی بھی ہوتی ہے، یا پھر وہاں کے فقراء اس کے اہل شہر سے زیادہ محتاج ہوں تو پھر بھی وہاں بھیجنے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ حدیث معاذ رضی اللہ عنہ ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن کا صدقہ مدینہ منورہ منتقل کرتے تھے، اس لیے کہ مدینہ منورہ کے فقراء زیادہ محتاج اور ضرورت مند تھے اور اگر دوسروں کی طرف زکوٰۃ منتقل کردے تو جائز ہے، کیونکہ نصوص مطلق ہیں۔

زکوٰۃ کے افضل مصارف

زکوٰۃ، صدقہ فطر اور نذر میں افضل یہ ہے کہ اول اپنے مفلس بھائیوں اور بہنوں کو دے، پھر ان کی مفلس اولاد کو، پھر مفلس چچاؤں اور پھوپھیوں کو، پھر ان کی مفلس اولاد کو، پھر مفلس ماموں اور خالاؤں کو، پھر ان کی مفلس اولاد کو پھر ذوی الارحام کو پھر پڑوسیوں کو، پھر اپنے محلہ والوں کو، پھر اپنے شہر یا گاؤں والوں کو دے۔

زکوٰۃ کا مال کسی دوسرے شہر میں منتقل نہ کرے، لیکن جب دوسرے شہر والے اس کے شہر والوں یا قرابت داروں سے زیادہ محتاج ہوں تو پھر منتقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

باب صدقۃ الفطر

صدقہ ءفطر واجب ہونے کی شرائط

(۱) آزاد ہونا (۲) مسلمان ہونا (۳) صاحب نصاب ہونا اور نصاب اس کی اور اس کے اہل وعیال کی اصل حاجتوں سے زائد ہو۔

صدقہ ءفطر کے وجوب پر دلیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں پر اس کو فرض کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اَدّوا صاعاً من تمر او صاعاً من قمح بين إثنين، أو صاعاً من شعير عن كل واحدٍ صغير و كبير" [۱] یعنی ایک صاع کھجور میں سے یا ایک صاع گندم میں سے ادا کرو جو دو کے درمیان ہوگا یا ایک صاع جو میں سے ہر چھوٹے اور بڑے کی طرف سے ادا کرو۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کی زکوٰۃ الفطر لوگوں پر فرض کی ہے جو کھجور میں سے ایک صاع یا جو میں سے ایک صاع ہے اور ہر آزاد غلام اور مسلمان مرد وعورت پر لازم ہے۔" [۲] اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں یہ ہے کہ لوگوں نے گندم میں سے اس کو نصف صاع کے برابر قرار دیا ہے۔ [۳]

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ "ہم رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ہر چھوٹے بڑے آزاد اور غلام کی طرف سے ایک صاع غلہ یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع کشمش میں سے زکوٰۃ الفطر ادا کیا کرتے تھے۔ ہم برابر اسی طرح نکالتے رہے، یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بن ابی سفیان حج یا عمرے کے ارادے سے آئے تو برسر منبر لوگوں سے خطاب کیا، اپنے خطاب میں یہ بھی کہا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ شام کی گندم کے دو مد، کھجور کے ایک صاع کے برابر ہیں، پھر لوگ اس پر عمل کرنے لگے۔" [۴]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ لوگ عہد رسالت میں ایک صاع جو یا کھجور یا کشمش یا حجاز کی جو صدقہ فطر نکالا کرتے تھے آپ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں گندم کی کثرت ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک صاع جو یا کھجور وغیرہ کے بدلے نصف صاع گندم مقرر فرمادی۔" [۵]

---

[۱] [جامع الاحادیث ۱/۱۷۸] [۲] [صحیح مسلم ۲/۶۷۷] [۳] ایضاً

[۴] [صحیح مسلم ۲/۶۷۸] [۵] [سنن ابی داود ۲/۱۱۲]

ثعلبہ بن عبداللہ بن ابی صعیرؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''ایک صاع گندم میں سے ہر دو پر واجب ہیں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا آزاد ہو یا غلام، مذکر ہو یا مونث، مالدار کو تو اللہ تعالیٰ پاک کر دیں گے اور نادار کو اس سے زیادہ لوٹائیں گے جو اس کو عطا کیا ہے۔''[1]

صدقہ ءفطر آزاد مسلمان پر واجب ہے جب کہ وہ مقدار نصاب مال کا مالک ہو جو اس کے مکان، سامان، کپڑوں اور سواری سے زائد ہو۔ صدقہ ءفطر کا وجوب تو احادیث مذکورہ سے ثابت ہے۔ ان احادیث سے وجوب ثابت ہوتا ہے، کیونکہ دلیل قطعی نہیں پائی جاتی اور آزادی کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے تاکہ تملیک کا معنی متحقق ہو اور مسلمان ہونے کی قید اس لیے لگائی تاکہ یہ عمل قربت اور عبادت بنے اور نصاب کے مالک ہونے کی قید اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے لگائی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''صدقہ واجب نہیں ہوتا مگر جب تونگری پائی جائے۔''[2] اور اس تونگری کا اندازہ نصاب کے ساتھ لگایا گیا ہے کیونکہ شرع میں مال داری کا اندازہ اسی سے لگایا گیا ہے جو کہ مذکورہ چیزوں سے زائد ہو۔ یعنی حاجت اصلیہ سے۔ اور اس صدقہ ءفطر میں نصاب کا نامی ہونا شرط نہیں ہے اور صدقہ کی حرمت، قربانی اور فطرانے کا وجوب اسی (نصاب) سے متعلق ہے۔

صدقہ ءفطر کس کی طرف سے ادا کرنا واجب ہے

صدقہ ءفطر اپنی طرف سے نکالے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی نکالے، کیونکہ اس کا نفقہ اس پر واجب ہے اور اس کو اس کی کامل ولایت حاصل ہے اور وجوب صدقہ ءفطر کا سبب خود اس کا نفس (ذات) ہے اور جس کی مؤنت و ولایت اس کے ذمہ ہے اور وہ اس پر مطلق کامل ولایت رکھتا ہے وہ بھی اس کے ساتھ ملحق و تابع ہے اور اسی کے معنی میں ہے۔ جیسے اس کے چھوٹے (نابالغ) بچے، کیونکہ اس کو ان پر کامل ولایت حاصل ہوہے یہ اس وقت ہے کہ جب ان بچوں کے پاس مال نہ ہو (یعنی محتاج ہوں) لیکن اگر ان کے پاس مال ہو تو امام بوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کے مال میں سے صدقہ فطر واجب ہوگا۔

صدقہ فطر کس کی طرف سے دینا واجب نہیں ہے

بیوی کی طرف سے صدقہ ءفطر دینا خاوند پر واجب نہیں ہے، اس لیے کہ اس کی مؤنت و

---

[1] [سنن ابی داؤد ۲/۱۱۴] [2] [صحیح البخاری ۴/۶]

ولایت ناقص ہے کہ سوائے حقوق زوجیت کے اور کسی طرح کی ولایت نہیں ہے۔ اپنے والدین کی طرف سے بھی ادا کرنا واجب نہیں ہے اور نہ ہی اپنی بالغ اولاد کی طرف سے دینا واجب ہے۔ اگرچہ وہ سب اس کے خرچ پر اس کے ہمراہ رہتے ہوں، کیونکہ ولایت (جو اس کے وجوب کا سبب ہے) معدوم ہے۔ اگر ان کی طرف سے یا اپنی بیوی کی طرف سے ان کی اجازت وحکم کے بغیر ادا کردے تو جائز ہے کیونکہ عام طور پر اجازت موجود ہوتی ہے۔

صدقہ فطر کی جنس و مقدار واجب

صدقہ ٔفطر گندم یا آٹے یا گیہوں، دلیا یا کشمش میں سے نصف صاع یا کھجور اور جو میں سے ایک صاع ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے اور "الجامع الصغیر" کی یہی روایت ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کشمش جو کے بمنزلہ ہے اور یہی ایک روایت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان تمام چیزوں میں سے ایک صاع واجب ہے جیسا کہ حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کی سابقہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کے مطابق نصف صاع گندم میں اعتبار وزن کا ہے۔ آٹا، گندم سے بہتر ہے اور نقدی آٹے سے بہتر ہے جیسا کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے، کیونکہ فقیر کی حاجت رفع کرنے میں قیمت زیادہ معاون ہے اور اس سے اس کی حاجت جلد پوری ہوتی ہے، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کا مختار قول یہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ گندم دینا افضل ہے کیونکہ یہ اختلاف سے بعید تر ہے، جبکہ قیمت دینے اور آٹا دینے میں امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صاع، آٹھ رطل عراقی کا ہوتا ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک پانچ رطل اور تہائی رطل کا ہوتا ہے۔ اور یہی ائمہ ثلاثہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عراقی اور مدنی صاع میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے کہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اندازہ مدینہ کے رطل کے ساتھ کیا اور اس کا وزن عراق کے رطل کے وزن سے زیادہ تھا کہ پہلا تیس استار کا اور دوسرا بیس استار کا ہوا ہے، جب عراقی آٹھ رطل کا تقابل مدنی پانچ اور تہائی کے ساتھ کرو تو دونوں کو برابر پاؤ گے، یہی قول اشبہ ہے، اس لیے کہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف ذکر نہیں کیا، اگر ان کا اختلاف ہوتا تو آپؒ ضرور اس کا ذکر کرتے، کیونکہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ ان

کے مذہب کو زیادہ جاننے والے تھے۔

اور صاع شرعی لحاظ سے ایک ہزار چالیس درہم کا ہوتا ہے، اور شرعی درہم کا وزن دو گرام اور دس میں سے نو اجزاء ہے، پس صاع کا وزن تین کلوگرام اور ہزار گرام میں سے سولہ اجزاء ہوتا ہے (یعنی تین کلوگرام اور 187.50 گرام) اور نصف صاع کا وزن ڈیڑھ کلوگرام اور ہزار گرام میں سے آٹھ اجزاء ہوتا ہے۔ (یعنی ایک کلوگرام اور ۶۳۵ گرام یا ڈیڑھ کلوگرام اور ۱۲۵ گرام اور احتیاطاً پونے دو کلوگرام۔

صدقہ ءفطر کے وجوب کا وقت

صدقہ ءفطر، عیدالفطر کے روز صبح صادق طلوع ہونے کے بعد واجب ہوتا ہے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رمضان کے آخری روزے کے غروب آفتاب کے ساتھ واجب ہوتا ہے، پس جو شخص عیدالفطر کی رات مسلمان ہوا یا پیدا ہوا، اس پر صدقہ ءفطر ہمارے نزدیک واجب ہوگا، اور امام شافعیؒ کے نزدیک واجب نہ ہوگا، اور اگر طلوع فجر کے بعد مسلمان ہوا یا پیدا ہوا تو اس کا صدقہ ءفطر واجب نہیں ہوگا۔

لوگوں کے لئے مستحب یہ ہے کہ عیدالفطر کے روز طلوع فجر کے بعد عیدگاہ جانے سے پہلے صدقہ ءفطر ادا کریں تاکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و فعل کی پیروی ہو جائے۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عیدگاہ جانے سے پہلے ہی صدقہ ءفطر نکالا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے تھے کہ غرباء کو اس روز در بدر پھرنے سے بے نیاز اور غنی کرو۔''

صدقہ فطر پہلے ادا کرنے کا فائدہ یہ بھی ہے کہ فقیر ومحتاج آدمی نمازِ عید سے غافل نہیں ہوگا۔ اگر صدقہ عید فطر کے دن سے پہلے دے دیا تو یہ بھی جائز ہے، اس لیے کہ اس نے وجوب کا سبب پائے جانے کے بعد ادا کیا ہے۔ یعنی رأس ہونا موجود ہے جس کا نفقہ اس کے ذمے ہے اور اس کی ولایت اس کو حاصل ہے اور یومِ فطر کا ہونا اس کے وجوب کی شرط ہے اور وجوب کا سبب پائے جانے کے بعد پیشگی ادا کر دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ میں ہے۔ اور پیشگی ادا کرنے کا یہ حکم مطلقاً ہے۔ خواہ اس رمضان المبارک میں دیا جائے یا اس سے پہلے دیا جائے ہر وقت جائز ہے۔ اس میں مدت کی مقدار کی کچھ تفصیل نہیں ہے۔ یہی صحیح ومختار ہے، بعض فقہاء کہتے ہیں کہ اگر نصف رمضان میں ادا کرے تو جائز ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اگر اخیر عشرہ میں ادا کرے تو جائز ہے ورنہ نہیں۔

صدقہ ءفطر کی ادائیگی میں تاخیر کا مسئلہ

اگر یومِ فطر سے تاخیر کردی یعنی عید الفطر کا دن گذر گیا اور صدقہ ءفطر ادا نہ کیا تو وہ ساقط نہیں ہوگا اور اس کا دینا اس پر واجب رہے گا۔ اس لیے کہ یہ مالی عبادت ہے جو واجب ہونے کے بعد ادائیگی کے بغیر ساقط نہیں ہوتی جیسا کہ زکوٰۃ، اگرچہ کتنی ہی تاخیر ہو جائے اس کا ادا کرنا واجب رہتا ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ذمے سے ہے نہ کہ مال سے، اور مال وجوب کے لیے شرط ہے، پس واجب ہونے کے بعد اس کا ہلاک وضائع ہونا اس کو ساقط نہیں کرتا جیسا کہ حج۔ زکوٰۃ کا مسئلہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ اس کا تعلق مال سے ہے۔

کتاب الصوم

صوم کے معنی اور اس کی فرضیت

لغت میں صوم کے معنی ہیں "رکنا" اور شریعت کی اصطلاح میں صوم کہتے ہیں، کھانے پینے اور جماع سے صبح صادق سے لے کر غروب شمس تک نیت کے ساتھ رکے رہنا، عورت کے لئے حیض اور نفاس سے پاک ہونا بھی شرط ہے۔

رمضان المبارک کے روزے ہر مسلمان عاقل بالغ پر فرض ہیں۔ بہ طورِ ادا و قضا کے۔ روزے کی فرضیت کتاب اللہ سے ثابت ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: "**فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**" [البقرة:]

اور اللہ کا ارشاد ہے "**كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ**" [البقرہ:]

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **بني الاسلام علىٰ خمس شهادة ، ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوٰة وايتآء الزكوٰة وحج البيت وصوم رمضان.** اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے **لا اله الا الله محمد رسول الله** کی گواہی دینا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔[1] نیز نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ **الشهر هكذا وهكذا (ثم عقد ابهامه فی الثالثة) فصوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته فان اغمی عليكم فاقدروا له ثلاثين.**

مہینہ اتنا ہے اور اتنا ہے (پھر آپ نے اپنے انگوٹھے مبارک سے تیس کا نشان بنا کر دکھایا) چاند کو دیکھ کر روزے رکھو اور اسی کو دیکھ کر روزے رکھنے بند کرو۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس دن مکمل کرو۔[2]

ادائے صوم کی فرضیت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔ "**فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ**. [البقرة:]

اور اگر ادا چھوٹ جائے تو بعد میں قضائے صوم کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ**. [البقرة:]

---

[1] [مسلم ۱/۴۵] [2] (مسلم ۲/۷۵۹)

یعنی رمضان المبارک میں جتنے روزے چھوٹیں، تو باقی دنوں میں اتنے ہی روزوں کی قضا کرے۔ یہاں بچے اور مجنوں مخاطب نہیں ہیں۔ اور غیر مسلم تو ویسے ہی عبادت کے اہل نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: رفع القلم عن ثلاثة عن المجنون المغلوب علیٰ عقله حتی یبرء وعن النآئم حتی یستیقظ وعن الصبی حتی یحتلم: تین قسم کے افراد سے کسی قسم کی بازپرس نہ ہوگی۔ پاگل سے جس کی عقل پر جنون غالب آ گیا ہو جب تک کہ تندرست نہ ہو جائے، سونے والے سے جب تک کہ بیدار نہ ہو جائے، اور بچے سے جب تک کہ بالغ نہ ہو جائے۔

کفارے کے روزے رمضان کے روزوں کی طرح فرض علمی نہیں ہیں بلکہ یہ فرض عملی ہیں جن کا انکار کرنے والا کافر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کفارے کے روزوں کی فرضیت پر اجماع منعقد نہیں۔ اور رمضان کا روزہ دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ پس سورۂ مجادلہ میں مذکور کفارۂ ظہار کے روزے سورہ نساء میں مذکور قتل خطا کے روزے سورۂ بقرہ میں مذکورہ یمین کے روزے اور سورۂ مائدہ میں مذکورہ جزاء الصید اور فدیة الاذیٰ کے روزے اور نذر کے روزے واجب ہیں اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلْيُوفُوا نُذُوْرَهُمْ. [الحج:]

اور آپ ﷺ نے فرمایا: فأوف بما نذرت به لله: جو تم اللہ کے لئے نذر مانو اسے پورا کرو۔[1]

اگر کسی نے روزہ رکھنے کی قسم کھائی تو بھی روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی نے نفلی روزہ رکھا اور غروب شمس سے پہلے افطار کر لیا تو اس روزے کی قضا بھی واجب ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم میں اپنے عمل کو باطل کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَ لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ [محمد:]

اور جب حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنا روزہ غروب شمس سے پہلے افطار کر لیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: لا علیكما صو ما مكانه یوماً آخر. کچھ حرج نہیں کسی اور دن روزہ رکھ لینا۔[2] مذکورہ بالا کے علاوہ جتنے روزے ہیں وہ نفلی ہیں۔ جیسے نویں دسویں محرم کا روزہ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: هٰذا یوم عاشورة ولم یكتب الله علیكم صیامهٗ وانا صائم فمن احب منكم ان یصوم فَلْيَصُمْ ومن احب ان یفطر فلیفطر یہ دسویں محرم کا دن ہے، اور اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کا روزہ فرض نہیں کیا لیکن میں روزے سے ہوں پس تم میں سے جو چاہے روزہ رکھ لے اور جو چاہے افطار کر لے۔[3]

[1] [ابوداؤد ۳/۲۳۸] [2] [ابوداؤد ۳/۳۳۰] [3] [مسلم ۲/۷۹۵]

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **فاذا کان العام المقبل ان شاء اللہ صمنا الیوم لتاسع.** جب آئندہ سال شروع ہوگا تو ہم ان شاء اللہ نویں محرم کا روزہ رکھیں گے۔[۱] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **یکفی سنۃ الماضیۃ**۔ کہ یہ روزہ گزشتہ سال کے گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہے[۲] اور ہر مہینے تین روزے رکھنا بھی نفلی روزوں میں شامل ہیں۔ افضل یہ ہے کہ یہ روزے چاند کی تیرھویں، چودھویں، اور پندرھویں کو رکھے جائیں۔ حضرت ملحان القیسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں حکم فرمایا کہ ہم ''ایام بیض'' تیرھویں، چودھویں، اور پندرھویں تاریخ کے روزے رکھیں اور فرمایا۔ **ھن کھیئۃ الدھر**: یہ ایسا ہے کہ گویا کہ ساری زندگی مسلسل روزے رکھے ہوں۔[۳]

ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن نہ رکھنا بھی نفلی روزوں میں شامل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: **وصم من الشھر ثلاثۃ ایام وذلک مثل صیام الدھر**: ہر مہینے تین روزے رکھا کرو، یہ تمام عمر روزے رکھنے کے برابر ہے۔[۴] اور فرمایا: **صم یوما و افطر یوماً وذلک صیام داؤد علیہ السلام وھو اعدل الصیام**: ایک دن روزہ رکھا کرو اور ایک دن افطار کیا کرو! یہ حضرت داؤد علیہ السلام کا طریقہ ہے، اور یہ روزوں میں بہترین طریقہ ہے۔[۵] اور حجاج حضرات کے علاوہ ''یوم العرفہ'' نویں ذوالحجہ کا روزہ رکھنا بھی نفلی روزوں میں داخل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا **یکفر السنۃ الماضیۃ و الباقیۃ** یہ روزہ گذشتہ اور آئندہ سال کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔[۶] اور سوموار کے دن کا روزہ بھی نفلی روزوں میں داخل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **ذاک یوم ولدت فیہ یوم بعثت او انزل علی فیہ**: اس دن میری ولادت ہوئی۔ اس دن مجھے معبوث کیا گیا، یا اسی دن مجھ پر وحی نازل ہوئی۔

اور جمعرات کے دن کا روزہ بھی نفلی روزوں میں داخل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: **ان اعمال العباد تعرض یوم الاثنین و الخمیس.** بلاشبہ بندوں کے اعمال سوموار اور جمعرات کو پیش کیے جاتے ہیں۔[۷]

اور پندرھویں شعبان کا روزہ بھی نفل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا کہ تم نے اس ماہ کی پندرھویں تاریخ کا روزہ رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تو تم رمضان گذرنے کے بعد اس کے بدلے دو روزے رکھ لینا۔

---

۱ [مسلم ۲/۷۹۸] ۲ [ابوداؤد: ۲/۳۲۵] ۳ [ابوداؤد ۲/۳۲۸]
۴ [مسلم ۲/۸۱۲] ۵ [ابوداؤد ۲/۳۲۸] ۶ [ابوداؤد ۲/۳۲۸]
۷ [ابوداؤد ۲/۳۲۵]

ماہِ شوال کے چھ روزے بھی نفلی روزوں میں داخل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من صام رمضان واتبعه ستامن شوال كان كصيام الدهر.** جس نے رمضان کے روزے رکھے اور پھر شوال کے چھ روزے رکھے تو اس نے تمام عمر کے روزے رکھے۔[۱]

محرم الحرام کے روزے رکھنا بھی نفلی روزوں میں داخل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **افضل الصيام بعد رمضان شهرالله المحرم.** رمضان کے بعد سب سے افضل روزے ماہ محرم کے ہیں[۲] ذوالحجہ کے دس روزے بھی نفلی روزوں میں داخل ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشادفرمایا: **مامن ايام العمل الصالح فيها احب الى الله من هذا الايام.** اللہ تعالیٰ کو (ذی الحجہ کے دس) دنوں میں تمام نیک اعمال میں سب سے زیادہ روزہ پسند ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب ارشاد فرمایا: **والجهاد في سبيل الله الا رجل خرج بنفسه وماله فلم يرجع من ذلك بشيئ.** جہاد فی سبیل اللہ بھی نہیں مگر وہ شخص جو اپنی جان اور مال لے کر نکلے اور دونوں (اللہ کے رستے میں) لٹا دے۔[۳]

ماہِ رجب اور شعبان کے روزے بھی نفلی روزوں میں داخل ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے غلام حضرت عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت اسماء نے مجھے حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں بھیجا اور فرمایا کہ مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ تین اشیاء کو حرام قرار دیتے ہیں......اور تمام رجب کے روزوں کو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا رجب کے روزوں کے بارے میں اس سے کیا پوچھتے ہو جو ہمیشہ روزے رکھتا ہے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا جواب اس بات کا انکار تھا جو حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما کو پہنچی تھی کہ آپ رجب کے روزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ تمام رجب بلکہ سارا سال روزے رکھتے تھے۔ عیدین اور ایامِ تشریق کے علاوہ۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ سلف کا مذہب ہے۔[۴]

شافعیہ کے نزدیک عیدین اور ایام تشریق کے علاوہ تمام سال روزے رکھنے میں کوئی کراہت نہیں، بلکہ یہ مستحب ہے۔ بشرطیکہ کوئی ضرر لاحق نہ ہو اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اگر کوئی ضرر لاحق ہو یا حق تلفی ہو تو پھر تمام سال روزے رکھنا مکروہ ہے۔ شوافع کا استدلال حضرت حمزہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت ہے جس میں انہوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میں ہمیشہ روزے رکھتا ہوں کیا میں سفر میں

---

۱ [مسلم/۲/۸۲۲] ۲ [مسلم:۲/۸۱۸]

۳ [ابوداؤد/۲/۳۲۵] ۴ [شرح نووی علی صحیح مسلم ۸/۳۸]

بھی روزے رکھ سکتا ہوں! آپ ﷺ نے فرمایا: **ان شئت فصم** "اگر چاہو تو رکھ لو"۔[1]

اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے ہمیشہ روزے رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حدیثِ مبارکہ: **لا صام من صام الابد** (کہ جس نے ہمیشہ روزے رکھے یا اس نے کوئی روزہ نہیں رکھا)۔ کے ضمن میں فرماتی ہیں کہ یہ اس کے بارے میں ہے جو عیدین اور ایام تشریق کے بھی روزے رکھے، اور اس کے بارے میں ہے جسے کوئی ضرر لاحق ہو یا وہ حق تلفی کا مرتکب ہو۔

شعبان کے روزے بھی نفلی روزوں میں داخل ہیں۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے آپ ﷺ کو شعبان سے زیادہ کسی اور مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے تمام شعبان روزے رکھے۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ کسی دن روزہ چھوٹ جاتا۔[3]

جن ایام میں روزہ رکھنا حرام ہے

عید الفطر، عید الاضحیٰ اور ایام تشریق یعنی ذی الحجہ کی گیارہ، بارہ اور تیرہ تاریخ کو روزہ رکھنا حرام ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے عیدین کے دن روزہ رکھنے سے منع فرمایا، اور ایام تشریق میں منادی بھیجا جس نے ندا لگائی کہ۔ **انہ لایدخل الجنۃ الا مؤمن وایام منیٰ ایام اکل وشرب** : "جنت میں صرف مومن داخل ہوگا اور منیٰ (تشریق) کے دن کھانے، پینے کے دن ہیں"۔[4]

جن ایام میں روزہ رکھنا مکروہ ہے

اکیلے جمعۃ المبارک کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لایصم احدکم یوم الجمعۃ الاان یصوم قبلہ اویصوم بعدہ.** تم میں سے کوئی (صرف) جمعہ کا روزہ نہ رکھے، بلکہ اس کے ساتھ جمعرات یا ہفتہ کا روزہ بھی رکھے[5] اسی طرح رمضان سے پہلے ایک یا دو دن روزہ رکھنا بھی مکروہ ہے۔ مگر اس کے لئے یہ مکروہ نہیں جو ہمیشہ روزے رکھتا ہو۔

آپ ﷺ نے فرمایا: **لاتقدمو ارمضان بصوم یوم ولایومین الا رجل کان**

---

1. [مسلم ۲/۷۸۹] 2. [نووی ۸/۴۰] 3. [مسلم ۲/۸۱۱]
4. [مسلم ۲/۸۰۰] 5. ایضاً

یصوم صوماً فلیصمہ. "رمضان سے پہلے ایک اور دن یا دو دن روزے نہ رکھو، مگر وہ شخص رکھ لے جو (ان دنوں) پہلے بھی روزے رکھتا ہو۔"

روزے کی نیت

روزے کیلئے نیت کرنا شرط ہے اس لئے کہ روزہ بھی دیگر عبادات کی طرح ایک عبادت ہے۔لہٰذا نیت کے بغیر صحیح نہیں۔آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انما الاعمال بالنیات "تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے"[1] روزے کیلئے دل میں نیت کر لینا ہی کافی ہے۔زبان سے کہنا ضروری نہیں۔لیکن! رمضان کے پورے مہینے کے روزوں کی نیت ایک ساتھ کر لینا درست نہیں اس لئے کہ ہر دن کا روزہ ایک مستقل الگ عبادت ہے۔اس لئے روزانہ نیت کرنا ضروری ہے۔کیونکہ غروبِ آفتاب کے بعد روزے دار روزے سے نکل جاتا ہے۔اور صبح صادق سے قبل پھر دوبارہ روزہ رکھتا ہے اس لئے نیت بھی دوبارہ کرے گا۔آپ ﷺ نے فرمایا: اذا اقبل اللیل وأدبر النھار وغابت الشمس فقد افطر الصائم. جب رات آجائے، دن چلا جائے سورج چھپ جائے تو روزہ دار روزہ افطار کر لے۔[2]

فرضی، نفلی اور نذر معین کے روزوں کی نیت کا وقت

فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ طلوعِ فجر ثانی (صادق) روزے کی نیت کا پہلا وقت ہے اور یہی افضل ہے، لیکن یہ وقت مشتبہ ہے جسے اکثر لوگ نہیں جانتے اور نیت صوم کو طلوع فجر اول (کاذب) پر موقوف کرنا بھی صحیح نہیں۔اس لئے کہ وہ بھی غفلت اور نیند کا وقت ہے اور متہجد کے لئے بھی رات کے آخری حصے میں سونا مستحب ہے۔لہٰذا روزے کی نیت غروبِ آفتاب کے بعد سے کسی بھی وقت کر لینا جائز ہے۔لیکن اگلے دن زوالِ شمس سے پہلے پہلے نیت کر لینا ضروری ہے تاکہ دن کا اکثر حصہ نیت کے ساتھ گذرے، جب دن کا اکثر حصہ روزے کی نیت کے ساتھ گذر جائے گا تو گویا سارا دن بھی نیت کے ساتھ گذرا۔لیکن اگر کسی نے زوال کے بعد نیت کی تو یہ جائز نہیں اس لئے کہ اس صورت میں دن کا اکثر حصہ بغیر نیت کے گذرے گا۔اور اکثر کے لئے کل کا حکم مسلم ہے۔اور فجر کے بعد روزے کی نیت کا جواز اس لئے بھی ہے کہ بعض بچے رات کے آخری حصے میں بالغ ہو جاتے ہیں اور بعض عورتیں حیض ونفاس سے پاک ہو جاتی ہیں اور بعض لوگ اس وقت سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور صبح (صادق) کے بعد بیدار ہوتے ہیں تو ان کی آسانی کے لئے فجر کے بعد بھی

[1] [بخاری شریف ۱/۳] [2] [مسلم ۲/۲۷۲]

روزے کی نیت کو جائز قرار دیا۔

حضرت ربیعہ بن معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاشورہ کی صبح مدینہ منورہ کے قریب انصار کی بستیوں میں پیغام بھیجا کہ: من کان اصبح صائماً فلیتم صومه ومن کان اصبح مفطراً فلیصة بقیة یومه: ''جو صبح کرے روزے کی حالت میں تو اسے چاہیے کہ اپنا روزہ مکمل کرے اور جو صبح کرے افطار کی حالت میں تو وہ بھی باقی دن روزہ داروں کی طرح گذارے''۔ راویہ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد ہم عاشورہ کا روزہ رکھتی تھیں اور اپنے چھوٹے بچوں کو بھی رکھواتی تھیں ہم مسجد میں جایا کرتی تھیں پس ہم اپنے بچوں کے لئے روئی کی گڑیا بنایا کرتی تھیں۔ جب کوئی ان میں سے بھوک کی وجہ سے روتا تو ہم اسے افطار کے وقت تک وہ گڑیا دے دیتیں۔[1] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ اسلم کے لوگوں سے فرمایا، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے عاشورہ کے روزے کے بارے میں پوچھا: فاتموا بقیة یومکم واقضوه اپنا بقیہ دن روزہ داروں کی طرح گذارو اور پھر روزے کی قضا کرو۔[2]

احادیث میں عاشورہ کے روزے کو بڑے اہتمام کے ساتھ بیان کرنا اس کی فرضیت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور دن میں نیت کرنے کا حکم عام ہے رمضان میں اور غیر رمضان میں۔ پس حدیث شریف سے ظاہر ہے کہ دن میں نیت کرنے سے بھی روزہ جائز ہے۔ صوم یومِ عاشورہ والی حدیث کے منسوخ ہو جانے سے یہ ضروری نہیں ہے کہ دن کی نیت سے روزے کا جواز بھی منسوخ ہو چکا ہو۔ اور ترمذی شریف کی حدیث ''من لم یجمع الصیام قبل الفجر فلا صیام له''[3] افضلیت کی نفی پر محمول ہے نہ کہ نفسِ صوم کی نفی پر۔

ضحوۂ کبریٰ نصف النہار کو کہتے ہیں جو طلوعِ صبح صادق سے غروب شمس کا درمیانی حصہ ہے۔ اور رمضان میں روزے کی مطلق نیت کرنے، یا نفلی روزے کی نیت کرنے یا کسی اور واجبی روزے کی نیت کرنے سے رمضان کا روزہ ہی ادا ہوگا، کیونکہ رمضان کا مہینہ فرض روزے کیلئے متعین ہے، اور اس پر امت کا اجماع ہے کہ رمضان میں فرض روزے کے علاوہ کوئی روزہ نہیں رکھا جا سکتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صومِ شک کے بارے میں پوچھا گیا تو دونوں نے یہی فرمایا کہ ''ہمارے نزدیک شعبان کا روزہ رکھنا رمضان کا روزہ چھوڑنے سے بہتر ہے۔''[4] اور ان دونوں کا روزہ نفل کی نیت سے تھا اس لئے کہ فرض کی نیت سے (صوم یوم شک) جائز نہیں۔

---

[1] [مسلم ۲/۷۹۸] [2] [ابو داؤد ۲/۳۲۷]
[3] [ترمذی: ۳/۱۱۷] [4] [بیہقی ۴/۲۱۱]

اور نفلی روزے کی نیت بھی دن میں کرنا جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس تشریف لاتے اور پوچھتے کہ کیا تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟ میں عرض کرتی نہیں تو فرماتے میں روزے سے ہوں [1] اور نذر کا ایسا روزہ جس کا وقت متعین ہو۔ مثلاً یوں کہا کہ میں اللہ کے لئے آئندہ جمعرات کا روزہ رکھوں گا۔ اور جمعرات کو بھول گیا، پھر طلوع فجر کے بعد یاد آیا تو اب بھی روزے کی نیت کرنے سے روزہ ادا ہو جائے گا۔

رمضان کے قضا روزے، کفارے کے روزے، نذر مطلق کے روزے، اور ان نفلی روزوں کی قضا کے روزے جو توڑ دیے تھے۔ ان تمام روزوں کیلئے رات کی ہی نیت ناگریز ہے۔ اس لئے کہ یہ وقت ہر قسم کے روزوں کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ (وقت) رمضان کی طرح فرض روزوں کیلئے متعین نہیں۔ مطلقاً نفلی روزے اور نذر معین کے روزے کی نیت بھی رات ہی کی معتبر ہوگی۔

مریض اور مسافر کا روزہ

جب مریض کیلئے رمضان کا روزہ نقصان دہ نہ ہو، اور نہ اس کے مرض میں اضافے کا سبب ہو، اور وہ کسی اور واجب روزے کی نیت کرلے تو رمضان کا روزہ ہی ادا ہوگا۔ اور اگر روزہ اس کے مرض میں اضافے کا باعث ہو تو جس روزے کی اس نے نیت کی ہے وہی واقع ہوگا اور اسی طرح مسافر نے رمضان میں کسی اور روزے کی نیت کرلی تو جس کی نیت کی ہے وہی ادا ہوگا۔

روزے کا وقت

روزے کا وقت فجرِ ثانی کے طلوع ہونے کے بعد سے سورج کے غروب ہونے تک ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ" [البقرة:]

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے تکیے کے نیچے ایک سفید اور ایک کالا دو ڈورے رکھتا ہوں تا کہ میں رات اور دن میں امتیاز کر سکوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تیرا تکیہ بڑا لمبا چوڑا ہے، خیط ابیض سے دن کی سفیدی اور خیط اسود سے رات کی سیاہی مراد ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فجر دو ہیں پہلی یعنی فجر کاذب کھانے کو حرام اور نماز کو حلال نہیں کرتی اور دوسری یعنی صادق کھانے پینے کو حرام

---

[1] [ابوداؤد/۲/۳۲۹]

اور نماز کو حلال کر دیتی ہے۔

رمضان کا چاند دیکھنے کی کوشش کرنا

انتیس (۲۹) شعبان کو غروبِ آفتاب کے بعد رمضان کا چاند تلاش کرنا واجب علی الکفایہ ہے۔ نبی کریم ﷺ اور سلف صالحین کا یہی معمول تھا کہ وہ انتیس کو چاند دیکھنے کی کوشش کرتے اگر چاند نظر آجاتا تو روزہ رکھ لیتے ورنہ شعبان کے تیس دن مکمل کرتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **صوموا لرئویتہ وأفطروا لرؤیتہ فان اغمی علیکم فاکملوا عدۃ شعبان ثلاثین.** چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر افطار کرو''۔ اگر تمہیں چاند نظر نہ آئے تو پھر شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ اس لئے کہ جو مہینہ چل رہا تھا وہ کسی دلیل کے بغیر ختم نہیں ہوگا اور وہ دلیل یا تو چاند کا نظر آجانا ہے، یا مدتِ شعبان کا پورا ہو جانا ہے۔ ہر مہینے کا یہی حکم ہوگا۔

رویت ہلال میں خبرِ واحد کا اعتبار

جب آسمان پر کوئی ایسی علت ہو جو چاند دیکھنے میں مانع ہو جیسے بادل یا گرد وغبار وغیرہ تو ایک عادل شخص کی شہادت قبول کی جائے گی خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک بدو (دیہاتی) آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے رمضان کا چاند دیکھا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟ اس نے کہا جی ہاں میں گواہی دیتا ہوں۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) اللہ کے سچے رسول ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا اے بلال لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ کل روزہ رکھیں۔ اور خبر واحد کی قبولیت میں عدل کی شرط لگائی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ دیانت کی خبروں میں سے ہے اور عادل وہ ہے جو کبیرہ گناہوں سے کنارہ کش ہو اور صغیرہ پر مصر نہ ہو۔ جس کو چاند نظر آگیا اس پر اس کی گواہی دینا فرض ہے جبکہ کسی اور نے چاند نہ دیکھا ہو حتی کہ یہ گواہی پردہ نشین عورت پر بھی فرض ہے اگرچہ اس کا شوہر بھی اس کو اجازت نہ دے۔

خبر واحد سے رمضان کے چاند کے ثبوت کے بعد اگر لوگ تیس روزے پورے کرلیں اور شوال کا چاند نظر نہ آئے تو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگ تیس دن مکمل ہونے کے بعد عید کرلیں کیونکہ ایک آدمی کی شہادت سے رمضان ثابت ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ابتداءً افطار ثابت نہیں ہوتا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مسلمان پر یہ تہمت نہیں لگاتا کہ اس نے مسلمانوں سے ایک دن

پہلے روزہ رکھوایا ہے۔ اور امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک احتیاط پر عمل کرتے ہوئے عید نہ کریں۔

اگر قاضی چاند دیکھنے والے کی گواہی رد کردے تو وہ روزہ رکھے گا کیونکہ اس نے خود چاند دیکھا ہے اگر اس نے افطار کرلیا تو اس پر قضا واجب ہوگی۔ تاہم شبہ کی وجہ سے کفارہ لازم نہیں ہوگا۔ یہ شخص مہینے کے آخری دن بھی احتیاطاً روزہ رکھے گا اور لوگوں کے ساتھ افطار کرے گا۔ تاہم اگر وہ اپنے یقین پر عمل کرتے ہوئے افطار کرلے (یعنی روزہ نہ رکھے) تو اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **صومکم یوم تصومون واضحاکم یوم تضو حون.** "تمہارا روزہ اسی دن ہوگا جس دن تم روزہ رکھو گے اور تمہاری قربانی اسی دن ہوگی جس دن تم قربانی کروگے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ موقوفاً بھی ثابت ہیں کہ تمہارا افطار اسی دن ہے جس دن تم افطار کرو اور تمہاری قربانی اسی دن ہے جس دن تم قربانی کرو۔

اگر آسمان میں کوئی علت نہ ہو تو حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت حسنؒ کی روایت یہ ہے کہ دو آدمیوں کی شہادت کافی ہے۔ جس طرح تمام حقوق میں دو آدمیوں کی شہادت قابل قبول ہے۔ اگر کوئی شخص شہر سے باہر آکر چاند دیکھنے کی گواہی دے تو اس کی گواہی قبول کی جائے گی اسی طرح اگر کوئی شخص بلند جگہ مینار وغیرہ پر ہونے کی وجہ سے چاند دیکھنے کی گواہی دے تو اس کی شہادت بھی معتبر ہے۔ اس لئے کہ مطالع کے صاف اور آلودہ ہونے اور جگہ کے پست اور بلند ہونے کے اعتبار سے چاند دیکھنے میں فرق آجاتا ہے۔ اور اس وجہ سے بھی کہ اعرابی کی حدیث میں یہی مذکور ہے۔

جب چاند کسی ایک قطر میں نظر آجائے تو تمام لوگوں کیلئے روزہ رکھنا لازم ہے اور عام طور پر مطالع کا اختلاف قابل اعتبار نہیں۔ ظاہر الروایہ میں حضرت امامؒ صاحب سے یہی منقول ہے اور کہا گیا ہے کہ جب دو قطروں کے درمیان اس قدر قرب ہو کہ مطالع (طلوع ہونے کی جگہیں) متحد ہوں تو اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ اور اتنا بعد ہو کہ مطالع مختلف ہو جائیں تو ایک مطلع والوں پر دوسرے مطلع والوں کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔ اگر ایک قطر والوں نے چاند دیکھ کر تیس روزے رکھے اور دوسرے قطر والوں نے چاند دیکھ کر انتیس روزے رکھے، تو انتیس والوں پر ایک دن کی قضا ہے، جبکہ دونوں قطروں کے مابین اتنا قرب ہو کہ مطالع متحد ہوں۔ اور اگر دونوں قطر ایک دوسرے سے اس قدر بعید ہوں کہ مطالع مختلف ہوں تو ایک قطر والوں کے لئے دوسرے قطر والوں کا اتباع ضروری نہیں، قطروں کے قریب ہونے کی مثال جیسے عراق اور شام، اور دور کی مثال جیسے کویت اور مغرب۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ لوگوں کا روزہ اسی

دن ہوگا جس دن وہ روزہ رکھیں گے اور ان کا افطار اسی دن ہوگا جس دن وہ افطار کریں گے۔

شوال کا چاند دیکھنا

انتیس رمضان کو شوال کا چاند دیکھنے کی کوشش کرنا واجب علی الکفایہ ہے۔ جس شخص نے اکیلے شوال کا چاند دیکھا تو وہ عبادت میں احتیاط کرتے ہوئے افطار نہ کرے کیونکہ حدیث میں مذکور ہے کہ تمہارا افطار اسی دن ہے جس دن تم افطار کرو گے۔ اور اگر اس نے افطار کرلیا تو شبہ کی وجہ سے روزے کی قضا کرے گا اور اپنے یقین کی بنا پر عمل کرنے کی وجہ سے اس پر کوئی کفارہ نہیں۔

اگر آسمان پر کوئی علت ہو تو دو آدمیوں کی گواہی قبول کی جائے گی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی اس لئے کہ شہادت کے ساتھ آدمی کا حق متعلق ہے۔ اور اگر آسمان میں کوئی علت نہ ہو تو امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ دو آدمیوں کی شہادت قبول کی جائے گی۔ جیسا کہ تمام حقوق میں دو آدمیوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔

ذوالحجہ کے چاند کا حکم بھی شوال کے چاند کی طرح ہے جیسا کہ حضرت ربعی بن حراشؒ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی صحابی نے فرمایا کہ رمضان کے آخری دن لوگوں میں اختلاف ہوگیا، دو دیہاتی آئے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے گواہی دی کہ اللہ کی قسم کل شام ہم نے چاند دیکھا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ افطار کرلیں اور کل عیدگاہ کی طرف جائیں[1]

یوم الشک کا روزہ

یوم شک کے روزے میں علماء کا اختلاف ہے کہ اس دن رزہ رکھنا افضل ہے یا افطار کرنا! علماء فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے شعبان میں روزے رکھے یا وہ مسلسل روزے رکھتا تھا تو اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ ''**لایقدم احدکم رمضان بصوم یوم اویومین الاان یکون رجل کان یصوم صومه فلیصم ذلک الیوم**'' ''تم میں سے کوئی شخص ایک دن یا دو دن پہلے رمضان کا روزہ نہ رکھے سوائے اس شخص کے جو مسلسل روزے رکھتا ہو وہ اس دن بھی روزہ رکھ سکتا ہے۔''[2]

اگر کوئی شخص ایسا نہ ہو تو محمد بن مسلمہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے حدیث کے سبب افطار افضل ہے، اور حضرت نصیر بن یحییٰؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ثابت ہے۔ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے

---

[1] [ابوداؤد ۲/۳۰۱] [2] [بخاری ۳/۳۴]

مروی ہے اور یہی مختار مذہب ہے کہ متقی اور خواص روزہ رکھیں اور عوام الناس کو یہی کہا جائے کہ وہ ضحوۂ کبریٰ سے پہلے تک انتظار کریں ہوسکتا ہے کہ چاند کا تحقق ہو جائے، اور اس کے بعد روزہ ہوتا ہی نہیں۔ متقی آدمی تو نفل کی نیت کر کے کراہت سے بچ سکتا ہے جبکہ عام لوگ ایسا نہیں کر سکتے۔

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور قضاء وکفارہ لازم ہوتا ہے

جس شخص نے دانستہ جماع کیا یا اس کے ساتھ جماع کیا گیا ہو دونوں راستوں (قبل اور دبر) میں سے کسی ایک راستے میں اور اس نے رمضان کا روزہ رکھا ہوا تھا تو اس پر قضاء بھی ہے اور کفارہ بھی۔ اسی پر اجماع ہے۔

جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنی بیوی کے ساتھ رمضان میں جماع کیا اور اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے فرمایا کیا تیرے پاس غلام ہے اس نے عرض کیا نہیں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تو دو مہینے کے روزے رکھ سکتا ہے؟ اس نے کہا نہیں! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلاؤ۔[1]

اور جماع کے تحقق کے لئے انزال شرط نہیں ہے اور دبر میں وطی کرنے سے بھی کفارہ واجب ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے بھی شہوت بدرجۂ کمال پوری ہو جاتی ہے۔ عورت اگر اپنی رضا مندی سے جماع کرائے تو اس پر قضا اور کفارہ ہر دو واجب ہیں اس لئے کہ یہ مرحلہ دونوں کی رضا سے تکمیل کو پہنچا ہے سو اس عورت پر وہی ہے جو مرد پر واجب ہے جیسا کہ غسل اور حد اور اگر جبراً جماع کیا گیا ہو تو عورت پر کفارہ لازم نہیں جیسے نسیان میں کفارہ نہیں۔ اگر عورت نے اپنے شوہر کو جماع پر مجبور کیا اور اس نے جماع کر لیا تو دونوں پر کفارہ واجب ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ زبردستی کی وجہ سے مرد پر کفارہ لازم نہیں اگر عورت کو معلوم تھا کہ فجر طلوع ہو چکی ہے اور اس نے اس بات کو اپنے شوہر سے چھپایا اور اس نے جماع کر لیا تو کفارہ محض عورت پر ہوگا۔ جس شخص نے جان بوجھ کر رمضان کے روزے کے دوران غذا یا دوا استعمال کی تو اس پر بھی قضاء وکفارہ ہر دو لازم ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو جس نے رمضان کا روزہ توڑ دیا تھا، حکم فرمایا وہ غلام آزاد کرے یا ساٹھ روزے رکھے یا اتنے مساکین کو کھانا کھلائے۔[2]
اور جماع کرنے والے اور روزہ توڑنے والے پر کفارے کے ساتھ ساتھ قضا بھی واجب ہے۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "من افطر یوماً من رمضان

---

[1] [مسلم ۲/۷۸۲] [2] [مسلم ۲/۷۸۲]

من غیر عذر ولا مرض من لم یقضه صیام الدهر وان صامه" جو شخص بلا کسی عذر شرعی اور مرض کے رمضان کا ایک روزہ بھی توڑ دے، اور غیر رمضان میں تمام عمر روزے رکھے تو بھی اس رمضانی روزے کا بدل نہیں ہو سکتے۔[1] اس حدیث کی تشریح میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت سعید ابن مسیّب رضی اللہ عنہ، امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ امام ابن جبیر رحمۃ اللہ علیہ امام ابراہیم، امام قتادہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام حماد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اس روزے کے بدلے ایک دن روزہ بھی رکھے۔

اگر وہ عورت جس پر کفارہ واجب تھا، حائضہ ہو جائے، یا وہ آدمی جس پر کفارہ لازم ہوا تھا اس قدر بیمار پڑ جائے کہ اس کے لئے روزہ توڑنا مباح ہو جائے تو ان سے کفارہ ساقط ہو جائے گا، اس لئے کہ ظاہر ہو گیا کہ جو روزہ انہوں نے توڑا وہ ان پر ضروری نہیں تھا اور کفارہ تو ضروری روزے کو توڑنے سے واجب ہوتا ہے۔ نیز کفارہ حق تعالیٰ کی حق تلفی کرنے سے واجب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا حق مرض اور حیض کی وجہ سے ساقط ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اس مرض اور حیض میں اس مرد وعورت کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اور اگر ایسے مرد وعورت سفر شروع کر دیں تو سفر کی وجہ سے کفارہ ساقط نہیں ہو گا۔ کیونکہ یہ انسان کا اختیاری فعل ہے اسی طرح اگر جبراً سفر پر بھیج دیا گیا تو بھی کفارہ ساقط نہ ہو گا۔

جن چیزوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے صرف قضا لازم ہوتی ہے

اگر کوئی شخص قبل اور دبر کے علاوہ یا کسی جانور سے وطی کرے اور انزال ہو جائے تو اس کا روزہ فاسد ہے اور قضا لازم ہے کیونکہ اس کی شہوت پوری ہو چکی ہے تاہم اس پر کفارہ واجب نہیں کیونکہ اس کی شہوت بدرجہ کمال پوری نہیں ہوئی۔ اگر آدمی نے بوسہ لیا اور اسے انزال ہو گیا یا ہاتھ لگایا اور انزال ہو گیا تو بھی روزہ فاسد ہو گیا۔ تاہم اس پر بھی کفارہ نہیں کیونکہ یہ (بھی) کامل طریقے سے اپنی شہوت پوری نہیں کر سکا۔ اگر کسی نے حقنہ کرایا یا پاخانے کے راستے سے دوا ڈالی، یا ناک کے ذریعے چڑھالی یا کان میں دوا ڈالی نہ کہ پانی۔ تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا اور اس پر قضا لازم ہے کیونکہ مفسد صوم چیز ان تمام صورتوں میں داخل تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر کفارہ لازم نہیں ہے۔ کیونکہ پیٹ کی شہوت ان تمام صورتوں میں مکمل پوری نہیں ہوئی اور روزہ توڑنے والی چیز وہ ہے جس سے بدن کو تقویت ملتی ہو خواہ غذا ہو یا دوا۔ اگر کسی آدمی نے کسی ایسے زخم پر دوا لگائی جس سے وہ غذا دماغ یا پیٹ تک پہنچ گئی تو اس کا روزہ بھی فاسد ہو گیا۔ کیونکہ روزہ توڑنے والی چیز امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک داخل تک پہنچ چکی ہے جبکہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں روزہ فاسد نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک منفذِ اصلی سے پہنچنا شرط ہے نیز اس لئے

---

[1] [بخاری ۲/۳۹]

بھی کہ چونکہ منفذ تنگ ہے لہٰذا ممکن ہے کہ وہ دواء سے بند ہو گیا ہو اور دواء داخل تک نہ پہنچی ہو۔ پٹھوں میں لگنے والے انجکشن کو بھی وہ اسی پر قیاس کرتے ہوئے مفسد صوم نہیں قرار دیتے۔ رگوں میں لگنے والا انجکشن امام صاحبؒ کے نزدیک روزے کو توڑ دے گا۔ کیونکہ دواء یقیناً داخل میں پہنچ چکی ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ احتیاط اس میں ہے کہ افطار کے وقت انجکشن لگوانے تک تاخیر کی جائے۔ تاکہ اختلاف کی رعایت ہو سکے۔ ایسی صورت میں اگر روزہ ٹوٹنے کا حکم لگائیں تو اس پر صرف قضاء ہے۔ کیونکہ اس کی شہوت بدرجۂ کمال پوری نہیں ہو سکی۔

اگر آدمی نے کوئی ایسی چیز نگلی جس سے جسم کو فائدہ نہ ہوتا ہو جیسے کنکری اور موتی تو بھی اس کا روزہ فاسد ہو گیا کیونکہ یہ صورتاً افطار ہے۔ تاہم اس پر بھی کفارہ نہیں ہے۔ کیونکہ معناً افطار نہیں ہے۔

اگر کسی نے جان بوجھ کر منہ بھر کر قے کی تو روزہ قضاء کریگا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **من ذرعه القی فلیس علیه قضاء ومن استلقئ فلیق** "جس شخص پر قے کا غلبہ ہو جائے تو اس پر قضا نہیں۔ اور جس نے جان بوجھ کر قے کی تو وہ قضا کرے۔"[1] اور قے سے مراد منہ بھر کر قے ہونا ہے اس لئے کہ جو اس سے کم ہو وہ لعاب (تھوک) کے تابع ہے۔

اگر کسی آدمی نے یہ سمجھ کر سحری کھائی کہ ابھی رات باقی ہے، یا یہ سمجھ کر افطار کر لیا کہ رات ہو چکی ہے، پھر بعد میں اسے اصل وقت کا علم ہوا تو رکن صوم کے فوت ہونے کی وجہ سے اس کا روزہ فاسد ہو گیا، روزے کا رکن کھانے پینے اور جماع سے رکے رہنا ہے تاہم عذر کی وجہ سے اس پر کفارہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ جبکہ کفارہ تو عمداً ایسا کرنے والے پر ہوتا ہے لیکن وہ باقی دن کھانے پینے اور جماع سے رکا رہے۔ تاکہ جس قدر ممکن ہو رمضان کا حق ادا ہو سکے اور تہمت سے خلاصی پا سکے۔ اور اس دن کی قضاء اس کے ذمے لازم ہوگی۔

اگر کسی نے روزہ دار عورت سے سوتے ہوئے جماع کیا تو اس عاقلہ کے ساتھ جمع کیا جس نے رات کو روزے کی نیت کی تھی پھر اس عاقلہ پر دن میں جنون طاری ہو گیا اور اسی حالتِ جنون میں اس کے ساتھ جماع کیا گیا پھر اسی دن اسے افاقہ ہو گیا تو اس کا روزہ فاسد ہو گیا۔ کیونکہ مفطر پایا گیا لیکن اس پر بوجہ عدم تعمد کے کفارہ نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص مشت زنی کرے اور اس سے منی خارج ہو جائے تو اس کا روزہ فاسد ہو جاتا

---

[1] [مستدرک ۱/۴۲۷]

ہے کیونکہ یہ معنیً جماع ہے۔ لیکن اس پر کفارہ نہیں کیونکہ یہ صورتاً جماع نہیں ہے۔

اگر کسی نے دانتوں کے درمیان باقی ماندہ کھانا نگل لیا جو چنے کے برابر تھا تو اس کا روزہ ٹوٹ گیا اور اس پر قضاء ہے۔ کیونکہ عام طور سے اتنا کھانا دانتوں میں باقی نہیں رہتا۔ اور اس سے احتراز بھی ممکن ہے لیکن اس پر کفارہ نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنے منہ میں کوئی چیز داخل نہیں کی۔

جن چیزوں سے روزہ فاسد نہیں ہوتا

اگر روزہ دار بھول کر کھا پی لے یا جماع کر لے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "**اذانسی فاکل وشرب فلیتم صومه فانما اطعمه الله وسقاه**" اگر روزے دار نے سہواً کھا پی لیا تو اس کو چاہئے کہ اپنا روزہ مکمل کرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے کھلایا ہے اور اسے پلایا ہے [1] یا حالت نیند میں احتلام ہو گیا جیسا کہ حضرت ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "**ثلاث لا یفطرون الصائم الحجامة والقئی والاحتلام**" "تین چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا، پچھنے لگوانے سے، قے سے اور احتلام سے" [2] اس لئے کہ اس میں انسان کا عمل دخل نہیں ہے لہٰذا نا سی سے بڑھ کر اس کے ساتھ رعایت ہونی چاہیے۔ یا عورت پر نظر ڈالی جس سے انزال ہو گیا یا کسی کے بارے میں سوچا اور انزال ہو گیا تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ دیکھ کر انزال ہونا مباشرت نہ ہونے کی وجہ سے احتلام کی طرح ہے۔

رمضان کے مہینے میں دن کو خوشبو لگائی تو روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ کیونکہ خوشبو غسل کی طرح ظاہری بدن پر استعمال کی جاتی ہے۔ آنکھ میں سرمہ لگانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں سرمہ لگالوں؟ میں روزہ دار ہوں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لگالو! [3]

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل علم میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ روزہ دار کے لئے سرمے کا استعمال جائز ہے یا نہیں امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ، امام ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مکروہ قرار دیا ہے جبکہ بعض حضرات نے روزہ دار کے لئے اس کی اجازت دی ہے اس کے جواز کے قائل حضرت انس رضی اللہ عنہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ، امام حسن رحمۃ اللہ علیہ، اور امام ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ یہ حضرات روزہ دار کے لئے سرمہ لگانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔

اگر روزہ دار نے کسی ایسی عورت کا بوسہ لیا جس کا بوسہ حلال ہے اور اسے انزال نہ ہو تو اس

---

[1] [بخاری ۳/۳۸] [2] [ترمذی ۲/۱۱۱] [3] [ترمذی ۲/۱۱۵]

کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روزہ کی حالت میں میرا بوسہ لیا کرتے تھے اور تم میں سے کون اپنی خواہشات پر قابو پا سکتا ہے جیسا کہ آپ کو اپنی خواہشات پر قابو تھا۔[1]

(روزہ دار کے لئے) اگرچہ غیبت حرام ہے لیکن اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیونکہ یہ صورتاً اور معنیً کسی طرح بھی مفطر نہیں ہے۔ اگر اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد "**من لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة فی ان یدع طعامه وشرابه**" وہ شخص جس نے جھوٹی بات کو نہ چھوڑا تو اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔[2] کے پیش نظر یہ سوچ کر کہ اس کا روزہ ٹوٹ چکا ہے عمداً کھالیا تو اس پر قضاء اور کفارہ دونوں لازم ہیں خواہ اسے اس حدیث کا علم ہو یا نہ! کیونکہ اس پر اجماع ہے کہ غیبت سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر روزہ دار پر قے کا غلبہ ہو جائے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا، جیسا کہ پہلے حدیث گذر چکی ہے۔

اگر مرد، نہ کہ عورت، اپنے اگلے راستے میں دوا ڈال لے تو طرفین رحمہما اللہ کے نزدیک اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ آلہ تناسل اور پیٹ کے درمیان منفذ ہے۔ اسی لئے پیٹ سے پیشاب نکل کر آلہ تناسل ہی کے راستے باہر آتا ہے۔ اور صحیح قول یہی ہے کہ ان دونوں کے درمیان منفذ نہیں ہے۔ بلکہ پیشاب مثانے میں ٹپکتا ہے پھر مثانے سے نکلتا ہے اور جو چیز ٹپک کر نکلتی ہے وہ ٹپک کر نہیں ٹوٹتی، اور یہ اختلاف تب ہے جب پیشاب مثانے تک پہنچ جائے اور اگر پیشاب نالی میں ٹھہر جائے تو بالا جماع روزہ فاسد نہیں ہوگا۔

اگر روزہ دار کے حلق میں گرد وغبار یا مکھی داخل ہو جائے تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا اس لئے کہ اس سے احتراز ممکن نہیں ہے۔

اگر روزہ دار کو جنابت لاحق ہوگئی تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا اس لئے کہ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر کے وقت اگر جنبی ہو جاتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسل کرتے تھے اور روزہ رکھتے تھے۔[3] نیز اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مباشرت کو ساری رات مباح قرار دیا ہے۔ "فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ" [البقرة] اس لئے یقیناً صبح کے وقت ہی غسل ہو سکے گا۔

اگر دانتوں کے درمیان کھانا نگل لیا جو چنے سے کم تھا تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ چنے سے کم، لعاب کے تابع ہوتا ہے اور اس سے احتراز ممکن نہیں ہے۔ بخلاف (چنے سے)

---

1. [مسلم/۲/۷۷۷] 2. (ترمذی/۲/۱۰۵) 3. [مسلم/۲/۷۸۰]

زیادہ کہ اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

مکروہاتِ صوم

اگر روزہ دار کوئی چیز چکھ لے لیکن نگلے نہ تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا کیونکہ مفطر جوف تک نہیں پہنچی۔ تاہم یہ مکروہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں مفسد صوم کی طرف میلان ہے۔

گوند چبانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اگر وہ (گوند) تھوک کے ساتھ معدے تک نہ پہنچتی ہو۔ تاہم یہ بھی مکروہ ہے۔ کیونکہ بظاہر یہ چیز کا کھانا ہے۔ اس گوند سے مراد وہ گوند ہے جو درختوں سے حاصل ہوتی ہے۔ چیونگم سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

جو چیزیں روزہ میں مکروہ نہیں

دوپہر یا شام کے وقت تر مسواک کا استعمال روزہ دار کے لئے مکروہ نہیں ہے۔ حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روزے کی حالت میں اتنی بار مسواک کرتے ہوئے دیکھا کہ میں شمار نہیں کر سکتا۔[1]

روزہ دار کے لئے لعاب نگلنا جائز ہے روزہ دار کے لئے ہر قسم کی مسواک جائز ہے خواہ خشک ہو یا تر اگرچہ پانی کے ساتھ ترکی ہوئی ہو۔

جن حالات میں روزہ توڑنا جائز ہے

جو شخص رمضان میں مریض ہو جائے اور اسے تجربے سے یا ماہر ڈاکٹر کے کہنے سے یہ معلوم ہو جائے کہ اگر اس نے روزہ رکھا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا یا شفایابی میں تاخیر ہو جائے گی تو وہ روزہ چھوڑ دے اور قضا کر لے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مرض کی زیادتی یا افاقے میں تاخیر اسے ہلاکت تک پہنچا دے۔ سو اسے چاہیے کہ اس سے احتراز کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرُ" [البقرہ]

اور وہ مسافر جس کو روزے کے ساتھ ضرر و تکلیف نہ ہو تو اس کے لئے روزہ رکھنا افضل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَ اِنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" [البقرۃ] اور اگر وہ روزہ نہ رکھے اور بعد ازاں قضا کر لے تو یہ بھی جائز ہے اس لئے کہ سفر مشقت سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اس لئے بھی کہ سفر بذات خود ایک عذر ہے بخلاف مرض کے۔ کیونکہ بعض اوقات وہ بہت خفیف ہوتا ہے اسی لئے

---

[1] [بخاری ۳/۳۸]

اس میں حرج کی قید لگائی گئی ہے۔اگر رمضان میں سفر کرے تو جائز ہے لیکن اگر فجر طلوع ہونے کے بعد سفر کیا تو اس دن کا روزہ توڑ نہیں سکتا۔اس لئے کہ جب اس پر روزہ فرض ہوا تو یہ مقیم تھا۔اسی لئے اس کو اختیار سے باطل نہیں کر سکتا۔اگر اس نے حالت اقامت میں روزہ توڑ دیا تو اس پر قضا بھی ہے اور کفارہ بھی۔بخلاف مریض کے کیونکہ اس سے کفارہ ساقط ہو جاتا ہے۔اس لئے کہ جو عذر واقع ہوا ہے وہ صاحب حق کی طرف سے ہے۔

اگر مریض حالت مرض میں یا مسافر حالت سفر میں فوت ہو جائے تو ان دونوں پر ان کی وراثت میں سے فدیہ وغیرہ کی صورت میں قضا لازم نہیں ہے۔کیونکہ انہیں ایام اخر کا زمانہ نہیں ملا۔ اگر مریض فوت ہونے سے پہلے تندرست ہو جائے۔(یعنی مرض سے افاقے کے بعد موت آجائے) یا مسافر مقیم ہو جائے تو دونوں پر قضاء لازم ہے۔مریض پر بقدر صحت اور مسافر پر بقدر اقامت اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر اطعام مساکین کی وصیت واجب ہے اور اس کے ثلث مال میں سے ایک روزے کے بدلے میں اس وصیت پر عمل کیا جائے گا۔ایک مسکین کو آدھا صاع گندم یا ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو دیئے جائیں گے۔اس لئے کہ وہ اپنی آخری عمر میں ادا (اور قضاء) کرنے سے عاجز آگیا تھا۔لہٰذا شیخ فانی (انتہائی ضعیف) کی طرح ہو گیا۔پھر احناف کے نزدیک وصیت کرنا ضروری ہے۔حتیٰ کہ اگر وہ وصیت کئے بغیر چل بسا تو اس کے ورثاء پر فدیہ ادا کرنا لازم نہیں ہے۔اور اگر انہوں نے اس کی طرف سے بغیر وصیت کئے ہی ادا کر دیا تو جائز ہے۔زکوٰۃ کا بھی یہی حکم ہے۔

ایک صاع کا وزن تین کلوگرام اور سولہ گرام (3016G) ہوتا ہے اور نصف صاع ڈیڑھ کلوگرام اور آٹھ گرام (1508G) ہوتا ہے۔

حاملہ کو اور دودھ پلانے والی عورت کو جب اپنے بچوں کا یا اپنی جان کا خوف ہو تو یہ دونوں مریض پر قیاس کرتے ہوئے افطار کر لیں اور قضاء کریں۔کیونکہ یہ افطار عذر کی وجہ سے ہے اور دونوں کے درمیان دو قدر مشترک، حرج اور نقصان کو دفع کرنا، ہیں۔پس دونوں کے لئے قضاء لازمی ہے۔وہ شیخ فانی جو عدم قوت کے سبب روزے پر قادر نہ ہو، تو وہ رمضان کے روزے نہ رکھے۔اور ہر روز مسکین کو کھانا کھلائے۔کیونکہ وہ روزے رکھنے سے عاجز ہے اور قضاء کی امید بھی نہیں ہے۔لہٰذا اب میت کی طرح اس پر یہی حکم لگایا جائے گا کہ وہ روزے کا فدیہ ادا کرے یہی حکم شیخہ فانیہ کا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ" [البقرۃ]

ہاں اگر شیخ فانی روزے پر قادر ہو جائے تو اس کا فدیے والا حکم باطل ہو جاتا ہے اس لئے

کہ فدیے کا حکم تب ہوتا، جب عجز برقرار رہتا۔ اگر روزے دار عورت رمضان میں حیض یا نفاس میں مبتلا ہو جائے تو افطار کر لے اور قضاء کرے اور اس صورت میں اس کے لئے روزہ داروں کی مشابہت صحیح نہیں ہے اس لئے کہ اس کیلئے روزہ حرام ہے اور حرام کیساتھ مشابہت بھی حرام ہے۔

اگر حیض ونفاس والی عورتیں رمضان میں دن کے دوران پاک ہو جائیں یا مسافر مقیم ہو جائے یا مریض شفایاب ہو جائے یا مجنون کو افاقہ ہو جائے تو انہیں باقی دن احترامِ رمضان میں روزہ توڑنے والی چیزوں سے رکا رہنا واجب ہے۔

اگر انہوں نے اس دن روزہ رکھ لیا تو ابتدائے دن میں عدمِ اہلیت یا عدم تکلیف (مکلّف نہ ہوتے) کی بنا پر روزہ جائز نہیں ہوگا۔ البتہ اگر مسافر نصف نہار (زوال) سے پہلے مقیم ہو جائے اور روزے کی نیت کر لے تو جائز ہے اس لئے کہ وہ ابتدائے دن میں اس کا اہل تھا۔

رمضان المبارک میں اگر بچہ بالغ ہو جائے یا کافر اسلام لے آئے، تو یہ دونوں احترامِ رمضان میں روزہ داروں کی طرح باقی دن کھانے پینے سے رکے رہیں گے اور اس کے بعد سے یہ دونوں روزہ رکھیں گے۔ کیونکہ سبب صوم اور اہلیت صوم متحقق ہو چکی ہے اور جس دن میں وہ روزے کے اہل ہوئے اس دن کی یا اس سے پہلے دنوں کی عدمِ خطاب اور عدم اہلیت کے سبب قضاء نہیں کریں گے۔

مجنوں اور بے ہوش کے احکام

جو شخص پورا مہینہ مجنوں رہے تو اس پر قضا نہیں ہے، اس لئے کہ اس نے مہینے کو حالت صحت میں نہیں پایا اور یہی روزے کا سبب ہے۔ چنانچہ یہ شخص اس سبب کی وجہ سے شریعت کی طرف سے مخاطب نہیں ہے۔ حدیث شریف میں مذکور ہے۔ "**رفعت الاقلام عن ثلاثه عن الصغير حتى يعقل عن النائم حتىٰ يستيقظ وعن المجنون حتى يفيق**" "تین اشخاص سے قلم اٹھا لیا گیا ہے بچے سے یہاں تک کہ وہ عاقل ہو جائے، سونے والے سے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو جائے، مجنوں سے یہاں تک کہ اس کو افاقہ ہو جائے" [1]

جو شخص پورا مہینہ بے ہوش رہا وہ قضاء کرے گا۔ اس لئے کہ یہ ایسا مرض ہے جو قوی کو ضعیف کر دیتا ہے اور عقل کو زائل نہیں کرتا۔ پس سبب نے اس سے اعراض نہیں کیا اور وہ اس مرض کے باوجود شریعت کا مکلّف ہے۔ لہٰذا وہ مریض کی طرح قضاء کرے گا۔

---

[1] [جامع الاحادیث ۴/۲۳۴]

اگر رمضان میں اس پر غشی طاری ہوئی تو اس دن کی قضاء نہیں کرے گا جس دن روزہ رکھ کر اس پر غشی طاری ہوئی ہے۔ کیونکہ اس دن کے روزے کی اس کی نیت تھی۔ تاہم بعد کے روزوں کی قضاء کرے گا۔ کیونکہ ان دنوں کے روزوں کی نیت نہیں پائی گئی۔

اگر مجنوں رمضان کے کچھ دنوں میں تندرست ہو جائے تو جو روزے اس کے فوت ہو چکے ہیں ان کی قضاء کرے گا۔ اس لئے کہ وجوبِ صوم کا سبب یعنی ماہ رمضان پایا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" [البقرہ:] سے بھی مراد یہی ہے کہ مہینے کے بعض دنوں میں موجود تھا، کیونکہ اگر اس سے مراد کل رمضان لیا جائے تو اس آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ رمضان کے بعد روزے رکھے۔ جو کہ خلافِ اجماع ہے۔

نفلی روزے شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں

جس شخص نے نفلی روزہ یا نفلی نماز شروع کی اور پھر فاسد ہو گئی تو ان دونوں کو وجوباً قضاء کرے گا۔ اس لئے کہ مؤدی نے ثواب کے لئے یہ عمل کیا۔ لہٰذا اس عمل کی باطل ہونے سے حفاظت کرنا ضروری ہے اور جب حفاظت واجب ہے تو قضا بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ" [محمد:] پھر احناف کے نزدیک بلا عذر افطار کرنا مباح نہیں ہے۔ ان دو روایتوں کی وجہ سے جو ہم نے بیان کی ہیں۔ تاہم عذر کے سبب افطار کرنا مباح ہے۔ ضیافت بھی عذر ہے۔ اس لئے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو کھانے کی دعوت دی۔ جب یہ تمام حضرات کھانے کے لئے آئے تو ایک صحابی ایک طرف ہو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا میرا روزہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تیرے بھائی نے تیرے لئے تکلف کیا اور کھانا بنایا تم کہہ رہے ہو کہ میرا روزہ ہے۔ اب کھاؤ! پھر ایک روزہ رکھ لینا![1]

رمضان کی قضاء

رمضان کے روزے قضاء کرنے کے لئے مسلسل روزے رکھنا ضروری نہیں، کیونکہ حق تعالیٰ کے فرمان "فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرُ" [البقرۃ] میں تتابع شرط نہیں اور اس فرض کی ادائیگی میں جلدی کرنا افضل ہے۔ اگر دوسرا رمضان آ جائے تو اس رمضان کے روزے رکھے کیونکہ یہ وقت اسی رمضان کے روزے رکھنے کا ہے۔ پھر اس کے بعد پہلے قضاء شدہ روزوں کی قضاء کرے اس لئے کہ

[1] [دارِ قطنی ۲/۱۷۸]

قضاء کا وقت تو پورا سال ہے سوائے ایام تشریق کے۔ اس پر قضا کے علاوہ مزید کوئی چیز واجب نہیں ہے، کیونکہ نصوص سے مزید کسی چیز کا پتا نہیں چلتا۔

ایامِ خمسہ (ممنوعہ) میں روزے کی نذر

جس شخص نے عید کے دن یا ایامِ تشریق کے دنوں میں روزے کی منت مان لی۔ تو اس پر لازم ہے کہ وہ ان دنوں میں روزہ نہ رکھے بعد میں رکھ لے کیونکہ اس نے ثواب کے لئے نذر مانی ہے پس یہ لازم ہو جائے گی جیسا کہ مکروہ اوقات میں نماز پڑھنے کی نذر ماننا۔ اور یہ نذر ماننا گناہ نہیں ہے۔ ہاں ان دنوں میں روزہ رکھنا گناہ ہے۔ پس نذر تو صحیح ہے لیکن ان دنوں میں روزے کی ممانعت کی وجہ سے ان دنوں میں روزے نہ رکھے بعد ازاں قضاء کرے۔ اگر اس نے روزہ رکھا تو جائز ہے۔

باب الاعتکاف

اعتکاف لغۃً قیام کرنا اور رکے رہنا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "سَوَآءَ نِ الْعٰكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ" [الحج:] اور شرعاً اعتکاف کہتے ہیں کہ روزے کے ساتھ مخصوص جگہ یعنی مسجد میں بہ نیت اعتکاف قیام کرنا۔ اعتکاف کی تین قسمیں ہیں (۱) واجب، یعنی اعتکاف کی نذر ماننا (۲) سنت یعنی رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف (۳) مستحب: رمضان کے آخری دس دنوں کے علاوہ جس وقت چاہے کیونکہ رمضان کے آخری دنوں میں جب بھی مسجد میں داخل ہو کر اعتکاف کی نیت کرے گا تو جب تک وہ مسجد میں رہے اس کا اعتکاف مسنون شمار ہوگا اور رمضان کے آخری دس دنوں کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اس لئے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے اس پر مواظبت اختیار فرمائی ہے۔ حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ ﷺ رمضان کے آخری دس دنوں میں اعتکاف کرتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ رحلت فرما گئے۔ پھر اس کے بعد ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن نے اعتکاف کیا۔[1]

اگر اخلاص کے ساتھ کیا جائے تو یہ اعلیٰ ترین عمل ہے۔ حضرت عطاء ابن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ معتکف کی مثال اس شخص کی سی ہے جس کو کسی عظیم آدمی کے ہاں کوئی حاجت درپیش ہو۔ اور وہ اس کے دروازے پر بیٹھ جائے اور کہے کہ میں اس وقت تک نہیں ہٹوں گا۔ جب تک کہ آپ میری حاجت نہ پوری کردیں۔ اسی طرح معتکف اللہ تعالیٰ کے گھر میں بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اس وقت تک نہیں ہٹوں گا جب تک کہ آپ میری مغفرت نہ کریں۔ امام زھری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تعجب ہے ان لوگوں پر جو اعتکاف چھوڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کوئی کام کبھی کرتے تھے اور کبھی چھوڑ بھی دیتے تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے اعتکاف وفات تک کبھی نہیں چھوڑا۔

معتکف جس مسجد میں اعتکاف کا ارادہ رکھتا ہے اکیس کی رات کو اس میں داخل ہو جائے اور عید الفطر کا چاند نظر آجانے کے بعد نکلے۔ اعتکاف منذور ایک دن سے کم کا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ (وجوبی) اعتکاف ایک دن سے کم کا نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "لا اعتکاف الا بصیام" "اعتکاف

---

۱ [بخاری ۵۹/۳]

روزے کے بغیر (مکمل) نہیں ہے"۔ اور جیسا کہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا میں نے ایک دن کے اعتکاف کی نذر مانی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اعتکف وصم" اعتکاف کرو اور روزہ رکھو۔[۱] اور جیسا کہ حضرت سیدہ عائشہؓ سے اعتکاف والی حدیث مروی ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو شخص اعتکاف کرے وہ روزہ بھی رکھے۔[۲]

جائے اعتکاف

ہر وہ مسجد جس میں باجماعت نماز ہوتی ہو اس میں امام اور مؤذن بھی (مقرر) ہو اس مسجد میں اعتکاف کرنا جائز ہے البتہ جامع مسجد میں اعتکاف افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ" [البقرة] عورت اعتکاف کے لئے اپنے گھر کی مسجد میں بیٹھے گی گھر کی مسجد وہ جگہ ہوتی ہے جسے اس نے نماز کے لئے خاص کیا ہوا ہو۔ عورت کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو آدمی کے حق میں مسجد کے اندر شرائط ہیں۔

متعکف خاتون اپنی اعتکاف والی جگہ سے نہیں نکلے گی۔ مگر کسی حاجت طبعی کی وجہ سے جیسے پیشاب، پاخانہ، ازالہ نجاست یا غسلِ جنابت وغیرہ کے لئے یا حاجتِ ضروریہ کے لئے مثلاً جائے اعتکاف کا منہدم ہو جانا یا اپنی جان و مال کا خوف ہونا، یا ظالم کا جبراً نکال دینا وغیرہ۔ اگر اب ہو سکے تو وہ فوراً متبادل جگہ میں اعتکاف کرے۔ یا پھر حاجت شرعی کی وجہ سے نکلنا۔ مثلاً جہاں آدمی اعتکاف کر رہا ہے وہاں جمعہ نہیں ہوتا اور جس کام کے لئے نکلے وہ کام کر کے فوراً وہاں سے چل پڑے وہاں رکا نہ رہے۔ اس لئے کہ ضرورت بقدر ضرورت ہی ہوتی ہے۔ اگر جائے اعتکاف سے ایک گھڑی کے لئے بھی بغیر ضرورت کے باہر نکلا تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔ حضرات صاحبین رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ جب تک کہ وہ دن کا اکثر حصہ مسجد سے باہر نہ رہے۔ کیونکہ اعتبار اکثر ہی کا ہوتا ہے۔

معتکف کا کھانا پینا، خرید و فروخت اور نکاح ورجوع مسجد میں ہوگا۔ کیونکہ وہ ان کاموں کا محتاج ہے اور ان کو جائے اعتکاف میں پورا کرنا ممکن ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مسجد ہی میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اور وہیں کھانا بھی تناول فرماتے تھے وہیں پانی بھی نوش فرماتے تھے اور وہیں باتیں بھی فرماتے تھے اور خرید و فروخت بھی۔

---

[۱] [دارقطنی ۲/۲۰۰] [۲] [دارقطنی: ۲/۲۰۱]

لیکن مسجد میں سامانِ (تجارت) کا حاضر کرنا مکروہ ہے جیسا کہ غیرِ معتکف کے لئے مطلقاً مکروہ ہے۔ معتکف خیر کی بات کرے گا۔ اگر چہ غیر معتکف کو بھی خیر ہی کی بات کرنی چاہیے۔ مگر معتکف کے لئے یہ بات زیادہ مناسب ہے۔ معتکف کو چاہیے کہ لایعنی باتوں سے زبان (اور کانوں) کی حفاظت کرے۔ لیکن اس کو بالکل خاموش رہنا بھی مکروہ ہے۔ اگر چہ وہ اس خاموشی سے خدا کا قرب ہی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ اور معتکف کے لئے وطی اور دواعی وطی حرام ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ ''وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ'' [البقرة] مباشرت اور دواعی مباشرت ممنوعات اعتکاف میں سے ہیں۔ اس لئے چھونا اور بوسہ لینا بھی حرام ہے۔ بخلاف روزے کے کہ اس کا رکن امساک ہے سو وہ کنارہ کشی نہیں کرے گا (حرام سمجھتے ہوئے)۔

اگر معتکف نے دن میں یا رات میں عمداً یا سہواً جماع کر لیا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا اسی طرح اگر بوسہ لینے یا چھونے سے انزال ہو جائے تو بھی اعتکاف باطل ہو جائے گا اور اگر انزال نہ ہوا تو اعتکاف فاسد نہیں ہوگا۔ اگر چہ وہ بوسہ کسی اجنبیہ (نامحرم) ہی کا ہو۔ حالتِ اعتکاف میں نسیان معتبر نہیں ہے۔ کیونکہ حالتِ اعتکاف حالتِ ذکر ہے پس حج کی طرح اعتکاف میں بھی نسیان معتبر نہیں ہے۔ بخلاف روزہ کے۔

جس شخص نے کئی دنوں کے اعتکاف کی نذر مان لی تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ راتوں سمیت مسلسل اعتکاف کرے، اس لیے کہ یوم کی جمع ذکر کرنے سے راتیں بھی اس میں داخل ہو جاتی ہیں جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ثلثة ایام'' [آل عمران:۴۱] ''تین دن'' اور فرمایا ''ثلث لیالٍ'' ''تین راتیں'' [مریم:۱۰] جبکہ قصہ ایک ہی ہے۔

حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اعتکاف ابتداء کرنے سے لازم ہو جاتا ہے بخلاف صاحبین رحمہما اللہ کے۔ اس لئے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اعتکاف روزے کے بغیر جائز نہیں۔ چنانچہ ایک دن سے کم کا اعتکاف بھی جائز نہیں جبکہ صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک جائز ہے۔

﴿کتاب الحج﴾

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً." [القبرة]

حج زندگی میں ایک ہی بار فرض ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے دوران خطبہ ہمیں ارشاد فرمایا: یاایھاالناس قد فرض اللّٰہ علیکم الحج فحجوا: " اے لوگو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر حج فرض کردیا ہے پس تم حج کیا کرو: ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا یارسول اللہ! ہر سال؟ آپ ﷺ نے سکوت اختیار فرمایا۔ حتی کہ انہوں نے تین بار دریافت کیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا لوقلت نعم لوجبت ولما استطعتم اگر میں ہاں کہہ دیتا تو حج ہر سال فرض ہوجاتا اور تم نہ کرسکتے۔ مسند احمد میں یہ روایت ان الفاظ میں مذکور ہے۔ ولووجبت لم تعملوابھا ولم تستطیعوا ان تعملوا بھا الحج مرة، فمن زاد فھو تطوع.[1] "اگر حج ہر سال فرض ہوجاتا تو تم اس پر عمل نہ کرتے اور نہ کرسکتے۔ حج ایک ہی بار فرض ہے۔ اگر زیادہ مرتبہ کیا جائے تو نفل ہے۔"

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امر تکرار کا مقتضی نہیں ہوتا۔

حج کا سبب چونکہ بیت اللہ ہے اور وہ ایک ہی ہے (لہٰذا حج بھی ایک ہی بار فرض ہے)

حج کا لغوی معنی ہے ارادہ کرنا۔ امام خلیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حج کا معنی ہے کسی معظم جگہ کا بہ کثرت ارادہ کرنا۔ اور حج کی شرعی تعریف ہے کہ طواف بیت اللہ کرنا اور وقوف عرفہ کا زمانہ حالت احرام میں حج کے ارادے سے گزارنا۔ یہ ۹ ہجری میں فرض ہوا پوری زندگی میں ایک ہی بار ہر اس شخص پر فرض ہوتا ہے جو شرائط وجوب اور شرائط اداء پوری کرسکتا ہو۔ اگر زیادہ مرتبہ کرے گا تو نفل ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ۶ ہجری میں فرض ہوا۔ حضرات شوافع رحمہما اللہ کے نزدیک حج نفل نہیں ہوتا۔ بلکہ پہلی مرتبہ فرض عین ہے۔ اور اس کے بعد جب بھی کیا جائے گا فرض کفایہ ہے۔

کیونکہ ہر سال حج کی ادائیگی مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔[2] حج علی الفور ادا کرنا واجب ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: من ارادالحج

---

[1] [مسند احمد] [2] [غنیۃ المناسک]

فلیتعجل فان احدکم لایدری ما یعرض له۔"جو حج کا ارادہ رکھتا ہے اسے جلدی کرنی چاہیے کیونکہ تم میں سے کسی کو خبر نہیں کہ اس کے ساتھ کیا پیش آجائے۔"

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حضرت فضلؓ سے یا حضرت فضلؓ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:من اراد الحج فلیتعجل فانه قد یمرض المریض وتضل الراحلة وتعرض الحاجة[1] جو حج کا ارادہ رکھتا ہے اسے جلدی کرنی چاہیے اس لئے کہ کبھی انسان بیمار پڑ جاتا ہے کبھی سواری معدوم ہو جاتی ہے اور کبھی کوئی اور ضرورت پیش آجاتی ہے۔ یہ حدیث حسن درجہ کی ہے۔ اس لئے کہ اس روایت کے ایک راوی ابو اسرائیلؒ میں اختلاف ہے۔امام احمدؒ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان سے حدیث لے لی جائے۔

امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ وجوب علی الفور کے قائل ہیں جبکہ امام محمد اور امام شافعی رحمہما اللہ وجوب علی التراخی کے قائل ہیں۔اگر بلا عذر حج کو کئی سال تک مؤخر کیا تو فاسق اور مردود الشہادۃ ہوگا۔اس لئے کہ تاخیر گناہ صغیرہ اور مکروہ تحریمی ہے۔اگرچہ انسان ایک بار گناہ صغیرہ کے ارتکاب سے فاسق نہیں ہوتا لیکن بار بار اس کے ارتکاب سے فاسق ہو جاتا ہے۔اور ایسا کیوں نہ ہو؟ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے تو یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو مرض، حاجت یا مشقت ظاہرہ یا ظالم سلطان حج سے نہ روکے اور وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی ہو کر۔

حضرت ابن سابطؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مرسلاً روایت کی ہے ایک اور طریق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ان الفاظ میں مرفوعاً ثابت ہے۔من ملک زادا وراحلته تبلغه الی بیت اللہ ولم یحج فلا علیه ان یموت یهودیا او نصرانیا ."جو شخص بیت اللہ تک زادراہ اور سواری پر قادر ہو اور حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی ہو کر مرے چاہے نصرانی ہو کر"۔حضرت ابن عدیؒ فرماتے ہیں کہ یہ روایت ایک اور طریق سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً ثابت ہے۔ان مختلف طرق کی وجہ سے یہ روایت درجہ حسن لغیرہ تک پہنچ جاتی ہے باقی محدثین رحمہم اللہ نے جو یہ فرمایا ہے کہ اس باب میں کوئی صحیح روایت مذکور نہیں ہے۔اس سے حسن کی نفی نہیں ہوتی رہا یہ کہ حج میں کتنے سال کی تاخیر باعث فسق ہوگی تو پانچ سال کی تاخیر پر یہ حکم لگانا زیادہ بہتر ہے۔اس لئے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں جس شخص کا جسم تندرست ہو اور اس کی معیشت بھی ٹھیک ہو اور وہ پھر پانچ سال تک میرے پاس

---

[1] [مسند احمد]

نہ آئے تو وہ محروم ہے۔

وجوب حج کے لئے حریت وبلوغ کی شرط

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا **ایما صبی حج ثم بلغ الحنت فعلیه ان یحج حجة اخری وایما اعرابی حج ثم هاجرفعلیه ان یحج حجة اخری وایما عبد حج ثم اعتق فعلیه ان یحج حجة اخری**۔[1] جس شخص نے بچپن میں حج کیا پھر جب بالغ ہوگیا تو اس پر ضروری ہے کہ وہ ایک اور حج کرے۔ جس اعرابی نے حج کیا اور پھر ہجرت کی تو اس پر بھی ضروری ہے کہ وہ ایک اور حج کرے۔ جس غلام نے حج کیا اور پھر وہ آزاد ہوگیا تو اس پر بھی ضروری ہے کہ وہ ایک اور حج کرے۔

بلوغ کی شرط تو اس لئے ہے کہ بچے کسی بھی عبادت کے مکلف نہیں ہیں اور حج چونکہ عبادت بدنیہ اور مالیہ سے مرکب ہے لہٰذا یہ غلام پر بھی واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ غلام کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا۔ غلام کی تمام چیزیں حتیٰ کہ غلام بھی اپنے مولیٰ کی ملک ہوتا ہے۔

زادسفر اور سواری کی شرط

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ! حج کس سبب سے فرض ہوتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "**الزاد والراحلة**" (ترمذی) "زادسفر اور سواری سے"۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اہل علم اسی حدیث پر عمل کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص زادسفر اور سواری کا مالک ہو تو اس پر حج فرض ہے۔ اس دور میں سواری سے مراد ہوائی جہاز، بحری جہاز، اور گاڑیاں ہیں۔ جو شخص مذکورہ تین سواریوں میں سے کسی ایک سواری پر بھی قادر ہو اور اس کے ملک کے لوگ اس سواری کے ذریعے سفر کرتے ہوں نیز اس کے پاس مکمل زمانہ حج کا اپنا اور گھر والوں کا خرچ بھی موجود ہو تو اس پر حج فرض ہے۔ اور حاجی پر عائد ٹیکس کے ذریعے حج ساقط ہو جاتا ہے اگرچہ حج نہ کرے۔ تاہم جو شخص حج کرلے اس پر دوبارہ حج فرض نہیں ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے امور حج کی تسہیل کے لئے کوئی رقم ادا کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ ظلم پر دوسروں کی اعانت کرے گا۔

اہل مکہ اور مکہ کے قریب رہنے والوں میں سے جو شخص پیدل چل سکتا ہو اس کے لئے سواری کی شرط نہیں ہے تاہم زادسفر ان کے لئے بھی ضروری ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "وَ

---

[1] [بیہقی]

تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی. [البقرة]

شرائط وجوب مندرجہ ذیل ہیں: اسلام، حج کے فرض ہونے کا علم، بلوغ، عقل، آزادی، قدرت اور وقت حج۔ جب یہ تمام شرائط پائی جائیں گی تو حج واجب ہوگا ورنہ نہیں۔ اور جب تمام شرائط ادا شروط وجوب کے ساتھ پائی جائیں تو خود حج کرنا فرض ہے اور شرائط اداء میں سے اگر ایک بھی شرط نہ پائی گئی اور شروط وجوب پائی جاتی ہوں تو اس صورت میں کسی دوسرے کو اپنی طرف سے حج کرانا یا موت کے وقت وصیت کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔

اور شرائط ادا مندرجہ ذیل ہیں صحت، خوف کا نہ ہونا، ظالم کی قید، وغیرہ میں نہ ہونا۔ راستے کا پر امن ہونا، پس جو شخص اتنا مریض ہو کہ وہ بیت اللہ تک آ جا نہ سکتا ہو یا اتنا بوڑھا ہو کہ خود سواری پر نہ بیٹھا رہ سکتا ہو۔ یا اسے کوئی شدید مجبوری اور سخت ضرورت پیش آ جائے جیسے کہ انسان کا بچہ بہت چھوٹا ہو اور اس کا محتاج ہو یا اسے ڈر ہو کہ وہ کسی ظالم کے ہاتھ لگ جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے تمام اعذار میں مبتلاء شخص کے لئے جائز ہے کہ وہ زوال عذر تک حج کو مؤخر کردے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت فضل رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھے ہوئے تھے کہ خشعم کی ایک عورت آئی۔ حضرت فضل رضی اللہ عنہ اسے دیکھنے لگے اور وہ حضرت فضل رضی اللہ عنہ کو دیکھنے لگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فضل رضی اللہ عنہ کا چہرہ دوسری جانب کردیا۔ وہ عورت کہنے لگی یارسول اللہ! میرے والد بہت بوڑھے ہیں سواری پر نہیں ٹک سکتے۔ ان پر حج فرض ہے، کیا میں ان کی طرف سے حج کرسکتی ہوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں!۔ یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے[1]

عورت پر ادائے حج کے وجوب کیلئے محرم یا خاوند شرط ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا یحل لا مرأة تومن باللّٰہ والیوم الاخر تسافر میسرة ثلاث لیال الا ومعھا ذومحرم.** جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے بغیر محرم کے تین دن اور رات کا سفر جائز نہیں[2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لا تسافر المراہ الامع ذی محرم** "عورت بغیر محرم کے سفر نہ کرے۔ ایک صحابی نے کہا یارسول اللہ! میں فلاں لڑائی میں شریک ہونا چاہتا ہوں اور میری بیوی حج کرنا چاہتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اپنی بیوی کے ساتھ جاؤ: اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں۔ **لا یدخل علیھا رجل الا ومعھا محرم.** "جب تک عورت کے پاس کوئی محرم نہ ہو، اس کے پاس کوئی غیر مرد نہ آئے"۔[3] اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۱۲۳] [2] [مسلم ۹/۱۰۳] [3] [عمدۃ القاری ۱۰/۵۲۵]

فرمایا: لا تسافر المرأة ثلاثا الا ومعها ذو محرم۔[1]

عورت بغیر محرم کے تین دن کا سفر نہ کرے

پس بالغہ عورت کے لئے اگرچہ اس کے ساتھ ثقہ عورتیں یا صالح افراد ہوں اور اگرچہ وہ بوڑھی ہی ہو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بغیر محرم یا خاوند کے مسافت شرعی طے کر کے حج کے لئے جائے۔ تاہم اگر مکہ کا سفر مسافت شرعی سے کم ہو تو اس پر حج فرض ہے۔ بشرطیکہ عدت گذارنے والی نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمہما اللہ کے نزدیک عورت کا بغیر محرم کے ایک دن کی مسافت طے کرنا بھی فساد زمانہ کی وجہ سے مکروہ ہے۔ شیخین رحمہما اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے: **لایحل لامراة تومن باللّٰہ والیوم الاخر تسافر میسرة یوم ولیلة الا مع ذی محرم.** جو عورت اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہے اس کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ بغیر محرم کے ایک دن رات کی مسافت کے بقدر سفر کرے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے منقول ہے کہ کوئی عورت دو دن کا سفر بغیر محرم یا شوہر کی معیت کے نہ کرے۔[2]

اس مذہب کے مطابق کہ عورت تین دن کا سفر نہ کرے خاوند کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی بیوی کو حج کرنے سے منع کر دے اگر پیادہ کے تین دن کی مسافت سے سفر کم ہو۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: حضرت ابن عمرؓ کی روایات میں تین یوم کی مسافت کا ذکر ہے۔ یہی معتمد علیہ ہے۔ اور یہی حکم میں اصل ہے۔ اور جن روایات میں دو دنوں یا ایک دن کا ذکر ہے وہ کسی عارض جیسے فساد زمانہ وغیرہ کی وجہ سے ہے۔ علماء نے فساد زمانہ کی وجہ سے اسی پر فتویٰ دینے کو مستحسن قرار دیا ہے۔ الغرض احناف تمام احادیث پر عمل کرتے ہیں اور اس وقت تک حدیث کو نہیں چھوڑتے جب تک کہ اس کا موضوع یا منسوخ ہونا واضح نہ ہو جائے۔ تو حدیث پر قیاس کو ترجیح دینے کا کیا مطلب؟

محرم وہ شخص ہوتا ہے جس سے نسبی رشتہ داری، رضاعت یا سسرالی رشتہ داری کی وجہ سے کسی بھی طرح نکاح درست نہ ہو۔ فقہاء کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ فساد زمانہ کی وجہ سے اپنی رضاعی بہن کے ساتھ سفر نہ کرے کیونکہ اس سے خلوت مکروہ ہے اور سفر بھی خلوت ہی کی طرح ہوتا ہے امام ابن المنذر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ لوگ محرم کے متعلق مذکوران روایات پر عمل نہیں کرتے اور نہ محرم کے ساتھ جانے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے اقوال نقل کئے ہیں حالانکہ ظاہری روایات پر عمل ہی مناسب ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: عورت عورتوں کی جماعت کے ساتھ

---

[1] [مسلم ۹/۱۰۲]

[2] [مسلم ۹/۱۰۲]

جا سکتی ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مسلمان آزاد ثقہ عورت کے ساتھ جا سکتی ہے۔ امام ابن سیرین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں مسلمان لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے۔

میقات

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مدینہ کیلئے ذوالحلیفہ، اہل شام کے لئے جحفہ، اہل نجد کے لئے قرن منازل اور اہل یمن کے لئے یلملم کو میقات قرار دیا اور فرمایا **فهن لهن ولمن اتى عليهن من غير اهلهن ممن ارادا الحج والعمرة فمن كان دونهن فمن اهله وكذا فكذالك حتى اهل مكة يهلون منها.** "یہ میقات ان کیلئے ہے اور ان کے علاوہ جو لوگ اس جگہ سے حج وعمرہ کی نیت سے آئیں ان کیلئے ہے۔ اور جو میقات کے اندر رہنے والے ہیں وہ اپنے گھر ہی سے احرام باندھیں۔ حتی کہ مکہ والے مکہ ہی سے احرام باندھ لیں۔"[1]

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بھی نقل کی ہے اور فرمایا کہ میرا گمان ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً ذکر فرمایا ہے کہ اہل مدینہ کی میقات ذوالحلیفہ اور دوسرے راستہ سے جحفہ ہے۔ اور اہل عراق کی ذات عراق، اہل نجد کی قرن منازل اور اہل یمن کی یلملم ہے۔[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عراق کے لئے ذات عراق کو میقات قرار دیا۔[3] اس کی سند صحیح اور قابل استدلال ہے اور وہ حدیث اس معارض نہیں ہے جسے امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرما کر حسن قرار دیا ہے جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقیق کو اہل مشرق کی میقات قرار دیا کیونکہ عقیق اور ذات عرق متحد و متحاذی ہیں۔

الغرض میقات سے بغیر احرام نہیں گذرنا چاہیے کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لاتجاوزو االميقات الا باحرام۔** "میقات سے بغیر احرام کے نہ گذرو۔"[4] امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت نقل کی ہے کہ **لا يدخل احد مكة الامحرما** مکہ میں احرام کے بغیر داخل نہ ہو۔ یہ حدیث اس کے معارض نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فتح مکہ کے دن سفید عمامہ باندھ کر بغیر احرام مکہ میں داخل ہوئے، یا سر مبارک پر خود رکھ کر مکہ میں داخل ہوئے کیونکہ مکہ میں لڑائی یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاصہ ہے۔ صحیح میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی پوچھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں کیوں قتال کیا تو تم کہہ دینا: اللہ نے اپنے رسول کو اجازت دی، تمہیں اجازت نہیں دی۔ پس اس حدیث سے ثابت ہوا کہ کسی غیر کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ میں قتال کے جواز سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر احرام میقات سے گذرنے

---

[1] [مسلم ۸۲/۸] [2] [مسلم ۸۹/۹] [3] [الالام ۱۳۷/۲] [4] [طبرانی ۳۰/۵]

کا جواز بھی سمجھ آتا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو شخص مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہوا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مکہ سے نکل کر حج یا عمرہ کا احرام باندھے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب حنین سے احرام باندھا تو فرمایا تھا: هذه العمرة لد خولنامكة بغير احرام. "یہ عمرہ ہے کیونکہ ہم مکہ میں بغیر احرام کے داخل ہوئے تھے۔"

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ موطا میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حجاج بن علاط مکہ میں آئے اور اپنا مال جمع کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں احرام باندھنے کا حکم نہیں فرمایا۔ اس کا جواب تو ظاہر ہے کہ وہ مکہ میں اپنے اسلام کا اظہار کر کے داخل نہیں ہوئے تھے اسی طرح حضرت ابوقتادہؓ کہ انہوں نے شکار کے وقت مکہ یا حج کا ارادہ نہیں کیا تھا انہوں نے تو مکہ کا اس وقت ارادہ کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غسفان میں قیام پذیر ہوئے۔

اگر حج یا عمرہ کرنے والے کو علم ہو کہ وہ گناہ میں مبتلاء نہیں ہوگا تو اسے میقات سے پہلے احرام باندھنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن سلمہ المرادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ. [البقرة] کی تفسیر پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا: اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے گھر سے احرام باندھو۔

امام حاکمؒ مستدرک میں فرماتے ہیں کہ صحابی کی تفسیر جو وحی کے مطابق ہو شیخینؒ کے نزدیک حدیث مسند ہے پس "وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" کی یہ تفسیر حکماً مرفوع ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے گھروں سے احرام نہیں باندھا باوجودیکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں حج وعمرہ کے اتمام کا حکم فرمایا ہے۔ حج وعمرہ کو فرائض کی ادائیگی سے ادا کرنا فرض اور مستحب طریقہ سے ادا کرنا مستحب ہے۔ اپنے گھروں سے احرام باندھ کر حج کرنے کو اتمام حج کہنے کا یہی مطلب ہے کہ ایسا کرنا مستحب ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اس مستحب کو اس لئے ترک فرمایا تا کہ بعد والے لوگ مشکل میں نہ پڑیں۔ بہر حال ان احادیث پر عمل کرنا عمل نہ کرنے سے بہتر ہے۔ اس کی تائید حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا: **من اهل بحجة اوعمرة من المسجد الاقصى الى المسجد الحرام غفرله ماتقدم من ذنبه وماتاخر او وجبت له الجنته** "جس نے مسجد اقصیٰ سے مسجد الحرام تک حج یا عمرہ کا احرام باندھا تو اس کے گذشتہ اور آئندہ کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں" یا فرمایا کہ "اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے"۔ امام مالک رضی اللہ عنہ نے ایک ثقہ روای سے روایت کیا ہے کہ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایلیاء سے احرام باندھا۔

ایک راستے میں دو میقاتوں کا حکم

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ، حضرت اسحاق بن راشد رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: من احب منکم ان یستمتع بثبابه الی الجحفة فلیفعل: جو شخص اپنے کپڑوں سے ''جحفہ'' تک فائدہ اٹھانا چاہے وہ ایسا کرلے''۔ امام محمدؒ نے اسے موطا میں ذکر کیا ہے۔ یہ حدیث مرسل صحیح ہے اس لئے کہ حضرت اسحاق بن راشدؒ کو علامہ ابن حبان نے ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ امام نسائیؒ، امام ابن معینؒ اور امام ابو حاتمؒ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل بھی اسی روایت کے مطابق تھا۔ انہوں نے ایک سال دو عمرے ادا فرمائے ایک بار ذوالحلیفہ سے اور ایک بار جحفہ سے۔ یہ روایت امام شافعیؒ نے کتاب الام میں نقل فرمائی ہے اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اس کی تائید حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غالباً حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت مرفوعاً ذکر فرمائی ہے کہ اہل مدینہ کی میقات ذوالحلیفہ اور دوسرے راستہ سے جحفہ ہے۔[1] یعنی اہل مدینہ کی دو میقاتیں ہیں۔ جس نے دونوں میقاتوں سے گذرنا ہو اس کے لئے ابعد میقات سے احرام باندھنا افضل ہے اور اگر یہ شخص دوسری میقات تک احرام موخر کردے تو ظاہر الروایہ میں اس پر کوئی جنایت لازم نہیں ہوتی۔ البحر الرائق میں مذکور ہے کہ مدنی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ذوالحلیفہ ہی سے احرام باندھے بلکہ وہ جحفہ سے بھی احرام باندھ سکتا ہے۔ شامی میں مذکور ہے کہ ذوالحلیفہ سے احرام افضل ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اس پر ایک دم لازم آئے گا۔ اور مدنی کیلئے پہلی میقات سے بغیر احرام گزرنا بالاتفاق مکروہ تنزیہی ہے تاہم اگر کسی ضرورت کے تحت پہلی میقات سے بغیر احرام گذرنا ہے تو بالاتفاق مکروہ نہیں ہے۔ الغرض ذوالحلیفہ سے احرام باندھنا عزیمت اور جحفہ سے احرام باندھنا رخصت ہے۔

اہل مکہ کی میقات

حضرت ابن عباسؓ سے میقات کی حدیث مروی ہے جس کے آخر میں ہے کہ حتی کہ اہل مکہ مکہ ہی سے احرام باندھیں۔[2] اہل مکہ جب عمرہ کا ارادہ کریں تو حل چلے جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبدالرحمٰنؓ کو تنعیم جانے کا حکم ارشاد فرمایا تھا کیونکہ حل کی قریب ترین جگہ وہی ہے امام بخاریؒ

---

[1] [مسلم ۸/۸۶] [2] [عمدۃ القاری ۹/۱۳۹]

نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے روایت کی ہے کہ ان سے آنحضرت نے فرمایا: عائشہ کو پیچھے بٹھالو، اور انہیں تنعیم سے عمرہ کرادو۔[1] تنعیم یا حل کی دیگر جگہیں تمام برابر ہیں۔ جو شخص بھی عمرہ کر کے حلالی ہوگیا اس کا حکم اہل مکہ کا ہے۔ اس کے حج وعمرہ کی میقات وہی ہوگی جو اہل مکہ کی میقات ہے۔

احرام کے وقت غسل کرے

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت اسماء بنت عمیس کو نفاس کا خون آرہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ انہیں کہہ دو کہ یہ غسل کر کے احرام باندھ لیں۔[2] ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کسی کو بھیجا اور پوچھا کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: نہالو! کپڑے اتار دو اور احرام باندھ لو۔[3]

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ انہوں نے احرام کے لئے کپڑے اتارے اور غسل فرمایا۔[4] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب عمرہ کا ارادہ ہو تو غسل سنت ہے۔ یہ غسل نظافت کیلئے ہے حتی کہ حائضہ کو بھی اس کا حکم دیا جائے گا۔ اگرچہ وضو اس کے قائم مقام ہوسکتا ہے لیکن غسل بہرحال افضل ہے۔

احرام کے وقت خوشبو لگانا مستحب ہے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احرام کا ارادہ فرماتے تو جو اچھی سے اچھی خوشبو ان کے پاس ہوتی لگا لیتے۔ پھر میں خوشبو کا نشان آپ کے سر اور داڑھی میں دیکھتی۔[5]

غسل کے بعد اگر خوشبو میسر ہو تو اس کا بدن پر استعمال مسنون ہے۔ اگر اپنے پاس نہ ہو تو کسی دوسرے سے نہ مانگے۔ اور احرام کے بعد وہ خوشبو بالاتفاق جائز ہے۔ جس کی عین باقی نہ رہتی ہو۔ اور جس کی عین باقی رہتی ہو جیسے کہ مشک وغیرہ، شیخینؒ کے نزدیک وہ بھی جائز ہے امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے اس سے دم لازم ہوجاتا ہے یہی امام مالکؒ کا قول ہے جس خوشبو کی عین باقی نہیں رہتی اسی کا استعمال افضل ہے تاکہ خروج عین الخلاف پایا جائے۔

خوشبوؤں میں مشک کا استعمال مستحب ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تواتراً منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشک کی خوشبو لگایا کرتے تھے۔ البتہ کپڑے کے اوپر وہ خوشبو جس کی عین باقی ہو

---

[1] [عمدۃ القاری ۱۰/۱۱۹] [2] [مسلم ۸/۱۳۳] [3] [مسلم ۲/۸۸۷]

[4] [ترمذی: ۳/۸۳۰] [5] [مسلم ۸/۱۰۱]

استعمال کرنا بالاتفاق جائز نہیں۔

حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خلوق خوشبو لگے ہوئے کپڑے کے متعلق فرمایا کہ خلوق دھودو اور جبہ اتاردو عمرہ میں بھی وہی کرو جو حج میں کرتے ہو۔ آپ ﷺ نے خلوق سے اور جس میں زعفران اور ورس کا اثر ہو اس کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ احرام باندھتے تو میں احرام کے لئے خوشبو لگاتی اور طواف کرنے سے پہلے حل کیلئے۔

احرام سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا

مستحب یہی ہے کہ احرام فرض یا نفل نماز پڑھنے کے بعد باندھا جائے بشرطیکہ کوئی ممنوع وقت نہ ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے نماز کے بعد احرام باندھا حضرت امام مالک ہشام بن عروہؒ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت پڑھتے اور جب سواری آپ ﷺ کو لے چلتی تو آپ احرام کا تلبیہ پڑھتے۔

احرام نیت مع التلبیہ کا نام ہے۔ یہ حج کے فرائض میں سے پہلا فرض ہے۔ اس سے پہلے کی چیزیں چادر وغیرہ باندھنا اور سلے ہوئے کپڑے اتارنا یہ اس کے لئے تمہید ہے۔ اہلال کا مطلب ہے بلند آواز سے تلبیہ پڑھنا۔ حتیٰ کہ حائضہ بھی بلند آواز سے پڑھے۔ حائضہ عورت وہ تمام افعال کرے گی جو حاجی کرتا ہے ہاں طواف نہیں کرے گی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں مکہ آئی تو حیض سے تھی میں نے نہ تو طواف کیا اور نہ سعی بین الصفاء والمروہ کی میں نے اس کی شکایت آنحضرت ﷺ سے کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: **انقضی رأسک وامتشطی واھلی بالحج ودعی العمرة.** "اپنے سر کے بالوں کو کھول دو اور کنگھی کرلو حج کا احرام باندھ لو اور عمرہ چھوڑ دو" [۲]۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ کا تلبیہ یہ تھا "**لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لا شریک لک**" [۳] حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مدینہ منورہ میں ظہر کی چار رکعتیں ادا فرمائیں پھر ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعتیں ادا فرمائیں میں نے سنا پھر ان تمام نے بلند آواز سے تلبیہ پڑھا [۴] تلبیہ بلند آواز سے پڑھنا مستحب ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ، امام سفیان ثوری

[۱] [ترمذی ۲/۱۵۷] [۲] [مسلم ۸/۱۳۸] [۳] [عمدۃ القاری ۹/۱۷۲] [۴] [عمدۃ القاری ۹/۱۷۰]

رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔

عورت اتنی بلند آواز سے تلبیہ کہے کہ خود سن سکے۔ تاہم اگر بلند آواز سے کہہ لے تو حرام نہیں ہے۔ یہ بھی مستحب ہے کہ تلبیہ کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کی رضا و رحمت اور جنت کا سوال کرے اور جہنم سے پناہ مانگے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود بھیجے۔ حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تلبیہ سے فارغ ہوتے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی رضا و جنت کا سوال کرتے اور جہنم سے اللہ کی پناہ مانگتے۔ حضرت قاسم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب انسان تلبیہ سے فارغ ہو تو اس کیلئے مستحب ہے کہ وہ آنحضرت علیہ السلام پر درود بھیجے۔ حدیث اول وثانی میں صالح بن محمدؒ مختلف فیہ ہیں۔ امام احمدؒ نے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ان سے روایت کرنے میں کچھ حرج نہیں ہے۔[1]

تلبیہ پر زیادتی بھی جائز ہے۔ جیسا کہ صاحب تلخیص نے امام رافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت احرام میں اگر کوئی چیز دیکھتے تو پسند فرماتے جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا "لبیک ان العیش عیش الاخرۃ" اے اللہ! میں حاضر ہوں، بے شک حقیقی عیش تو آخرت کی عیش ہے۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تلبیہ میں ان الفاظ کی زیادتی بھی منقول ہے "لبیک حقا حقا تعبدا و رقا"۔ اے اللہ میں حاضر ہوں حالت آزادی میں بھی اور حالت غلامی میں بھی یقیناً میں حاضر ہوں۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلبیہ پر اضافہ سنا اور اس پر سکوت اختیار فرمایا۔

نماز کے بعد تلبیہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے بعد تلبیہ پڑھا۔[2] حضرت مالک ہشام بن عروہؒ سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعات ادا کرتے، اور جب سواری آپ کو لے کر چلتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تلبیہ ادا فرماتے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا: مجھے تعجب ہے کہ اصحابؓ رسول کا اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کب تلبیہ پڑھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مجھے دوسروں سے زیادہ بہ خوبی معلوم ہے۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ہی حج ادا فرمایا اس لئے صحابہؓ میں اختلاف ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے ارادے سے نکلے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذوالحلیفہ میں دو رکعت ادا فرمائیں تو اسی مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلبیہ پڑھا۔ کچھ صحابہ نے یہ

---

۱ [اعلاء السنن ۱۰/۳۴۳] ۲ [ترمذی ۲/۱۵۷] ۳ [موطا ۱/۲۴۳]

تلبیہ سنا اور اسے یاد رکھا۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سواری پر سوار ہوئے اور سواری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر چلی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر تلبیہ پڑھا۔ کچھ صحابہ نے پھر سنا کیونکہ لوگ جماعتوں کی صورت میں آرہے تھے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا سفر جاری رکھا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرف بیداء پر چڑھے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلبیہ پڑھا کچھ صحابہ نے وہاں سنا تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرف بیداء پر چڑھتے ہوئے تلبیہ پڑھا۔ اللہ کی قسم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلبیہ اپنے مصلّٰی پر ہی پڑھ لیا تھا۔ تاہم سواری پر بیٹھ کر بھی تلبیہ پڑھا اور شرف بیداء پر چڑھ کر بھی تلبیہ پڑھا۔ حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں جو حضرت ابن عباسؓ کے قول پر عمل کرتے ہیں وہ اپنی نماز سے فارغ ہوتے ہی اپنے مصلّٰی پر ہی تلبیہ پڑھ لیتے ہیں۔[1]

احرام کے بعد ممنوع چیزیں

(۱) جماع اور اس کا ذکر اور اس کے دواعی جیسے شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا یا بوسہ لینا حرام ہے تاہم حالت احرام میں عقد نکاح حرام نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے حالت احرام میں نکاح فرمایا۔[2] ویسے بھی حالت احرام میں عقد نکاح سے منع کا کوئی سبب نہیں ہے۔ دواعی جماع اللہ تبارک تعالیٰ کے اس ارشاد کے سبب ممنوع ہیں۔ ”فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ وَ لَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ“ [البقرۃ]

(۲) کوئی بھی گناہ کا کام کرنا۔ اگرچہ یہ حالت احرام کے علاوہ بھی ممنوع ہے۔ لیکن حالت احرام میں گناہ نہ کرنے کی مزید تاکید وارد ہے۔ پس اپنے ساتھیوں کے ساتھ لڑنا جھگڑنا جائز نہیں ہے۔ تاہم اپنے حق کے حصول کا مطالبہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح حصول انصاف کے لئے حاکم کے سامنے ظالم کی شکایت بھی کرسکتا ہے۔

(۳) خشکی کا شکار نہیں کرسکتا خواہ وہ شکار مأکول اللحم ہو یا غیر مأکول اللحم۔ تاہم سمندر کا شکار بالاتفاق حلال ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَ طَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّيَّارَةِ وَ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا“ [المائدۃ: ۹۶]

محرم حل میں کئے گئے حلالی کے شکار کو کھا سکتا ہے خواہ اس حلالی نے اپنے لئے شکار کیا ہو یا محرم کیلئے بشرطیکہ محرم نے نہ تو اس شکار کا حکم کیا ہو، نہ اس کی طرف اشارہ کیا ہو نہ اس کی طرف رہنمائی کی ہو اور نہ شکاری کی کسی قسم کی مدد کی ہو۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں نکلے۔ ہم میں کچھ لوگوں نے احرام باندھ رکھا تھا اور کچھ لوگ بغیر احرام کے تھے۔ جب

[1] [مستدرک ۱/۴۵۳] [2] [عمدۃ القاری ۱۰/۹۵]

ہم صحراء میں پہنچے تو میں نے اپنے کچھ ساتھیوں کو دیکھا کہ وہ کسی چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ میں نے بھی دیکھا تو مجھے ایک حمار وحشی نظر آیا۔ میں نے اپنے گھوڑے پر زین رکھی اور اپنا نیزہ لے کر اس پر سوار ہو گیا۔ اسی دوران میرا کوڑا نیچے گر گیا۔ میں نے اپنے محرم ساتھیوں سے کہا کہ مجھے میرا کوڑا اٹھا دیں۔ انہوں نے کہا واللہ ہم تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ میں گھوڑے سے نیچے اترا اور کوڑا اٹھایا اور پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور حمار کو اس کے پیچھے سے جالیا۔ وہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں تھا۔ میں نے اسے نیزہ کھینچ مارا اور اسے ذبح کر دیا اور اسے لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا۔ بعض نے کہا: کھالو اور بعض نے کہا کہ نہ کھاؤ! آپ ﷺ ہمارے آگے تشریف لے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا **هو حلال فكلوه** یہ شکار حلال ہے کھالو۔[1] پس محرم کے لئے وہ شکار جائز ہے جو نہ اس نے خود کیا ہو اور نہ اس کے حکم، اس کے اشارے اور اس کی اعانت وغیرہ سے کیا گیا ہو۔ اس لئے کہ حضرت قتادہؓ نے جب شکار کیا تو ان کا یہ ارادہ بالکل نہیں تھا کہ وہ اکیلے ہی شکار کھائیں بلکہ لامحالہ ان کا ارادہ یہی تھا کہ تمام ساتھی مل کر یہ شکار کھائیں گے۔ اور آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھیوں کو کھلانے کے ارادے کی وجہ سے شکار کو حرام قرار نہیں دیا۔

(۴) محرم کیلئے سلے ہوئے کپڑے پہننا جائز نہیں ہے۔ امام مالکؒ نے حضرت نافعؒ سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہ! محرم کون کونسے کپڑے پہن سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: محرم قمیص، عمامہ شلوار اور موزے نہ پہنے الا یہ کہ اس کے پاس جوتے نہ ہوں تو پھر موزے کو ٹخنوں کے نیچے سے کاٹ کر پہن سکتا ہے اور محرم وہ کپڑا بھی استعمال نہ کرے جس پر زعفران یا ورس لگی ہوئی ہو۔[2] اور ایک روایت میں ہے کہ محرم عورت نہ نقاب ڈالے اور نہ دستانے پہنے[3]

یعنی ہر سلا ہوا کپڑا اور ہر وہ کپڑا جو سر اور پاؤں ڈھانپے ممنوع ہے اور عورت کے لئے نقاب لٹکانا اور دستانے پہننا بھی ممنوع ہے۔ نقاب ممنوع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو کپڑا بھی عورت کے چہرے پر مس کرے وہ ممنوع ہے۔ اور دوسری جانب عورت کے لئے اجنبی مرد سے پردہ بھی ضروری ہے۔ اسی لئے احناف رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ عورت کے لئے سر کی جانب سے کپڑا نیچے لٹکانا ضروری ہے۔ اگر غیر محرم لوگ موجود ہوں تاہم یہ احتیاط ضروری ہے کہ وہ کپڑا چہرے پر نہ لگے۔ اگر عورت اپنا چہرہ نہ ڈھانپے تو اجنبی لوگوں پر ضروری ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لیں احناف کا قول

[1] [مسلم ۸۵۲/۲] [2] [عمدۃ القاری ۱۶۰/۹] [3] [عمدۃ القاری: ۱۹۸/۹]

ہی اس مسئلہ میں راجح ہے کیونکہ اس میں ایک طرف تو حدیث پر عمل ہے اور دوسری جانب فتنہ کا سد باب ہے۔

محرم کیلئے بالا اتفاق اپنا سر ڈھانپنا حرام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی اپنی سواری سے گرے جس سے ان کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ فوت ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اغسلوه بماء سدر و كفنوه في ثوبيه ولا تخمر وارأسه فان الله يبعثه يوم القيامه ملبيا.** اسے بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دو۔ اسے اس کے کپڑوں ہی میں کفن دو اور اس کے سر کو نہ ڈھانپو! کیونکہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ اسے قیامت کے دن مبعوث فرمائیں گے تو یہ تلبیہ پڑھ رہا ہوگا۔ احناف کے نزدیک محرم اپنا چہرہ بھی نہ ڈھانپے۔ اس لئے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا روایت میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں۔ **اغسلوه ولا تقربوه طيبا ولا تغطوا وجهه فانه يبعث يلبی.** "اسے غسل دو! اسے خوشبو نہ لگاؤ اور نہ ہی اس کے چہرے کو ڈھانپو! کیونکہ یہ تلبیہ کہتا ہوا مبعوث ہوگا۔[۱]

اگر انسان اپنے سر یا چہرے کو دانستہ یا بھول کر مکمل دن میں رات تک ڈھانپ کر رکھے تو اس پر دم لازم ہو جاتا ہے اگر کامل دن نہ ڈھانپے تو اس پر صدقہ واجب ہوتا ہے۔

محرم کے لئے حالت احرام میں سر وغیرہ کے بال کاٹنا حرام ہے۔ ہاں اگر کسی عذر سے ایسا کرے تو جائز ہے تاہم اس پر فدیہ لازم ہوگا۔ اور جو شخص بغیر عذر بال کٹوائے گا تو اس پر دم لازم آئے گا۔

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: **لعلک اذاک هوامک** شاید تمہیں تمہارے بال تکلیف دیتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! جی ہاں آپ نے فرمایا: **احلق راسک وصم ثلاثه ايام او اطعم ستة مساكين او انسک بشاة** سر مونڈلو اور تین دن کے روزے رکھ لو یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو یا بکری ذبح کر دو۔[۲] تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرورت کی بنا پر حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کو اجازت مرحمت فرمائی۔ اگر کوئی محرم بغیر کسی ضرورت کے سر مونڈ وادے تو اس پر دم واجب ہے خواہ جان بوجھ کر مونڈے یا بھول کر اور خواہ اسے معلوم ہو یا نہ ہو۔

مسکین کو کھانا کھلانے کا مطلب ہے کہ اسے آدھا صاع آٹے یا جو یا کھجور کا دے دے بہتر یہی ہے کہ آٹے کا نصف صاع دیا جائے۔ محرم روزے جہاں چاہے رکھے اسی طرح صدقہ

---

۱ [مسلم ۱۳۰/۸] ۲ [عمدۃ القاری ۱۵۰/۱۰]

جہاں چاہے ادا کرے لیکن قربانی بہر صورت حرم ہی میں کرنی ہوگی۔

علماء کرام فرماتے ہیں کہ بدن کے تمام بال مونڈنے پر فدیہ لازم ہے کیونکہ ان کا حکم وہی ہے جو سر کے بالوں کا ہے۔ امام داؤدؒ کا مسلک، اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت یہ ہے کہ جسم کے بالوں کے ساتھ فدیہ کا کچھ تعلق نہیں ہے۔ اگر محرم حلالی کے بال کاٹتا ہے تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس پر صدقہ واجب ہے۔ اور جمہور کے نزدیک ان دونوں پر کچھ لازم نہیں ہوتا۔

(۵) احرام کے بعد خوشبو کا استعمال بھی حرام ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ زعفران اور خلوق وغیرہ دھوڈالے جو اس کے بدن پر لگی ہو۔ اور اگر کپڑوں پر لگی ہو تو تین بار دھوڈالے۔ جیسا کہ مروی ہے کہ حضرت ابو یعلیٰؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت دیکھنا چاہتا ہوں جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی اتر رہی ہو ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جعرانہ میں تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ صحابہ کی جماعت تھی کہ ایک آدمی نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آدمی کے بارے میں کیا حکم ہے جس نے عمرہ کا احرام باندھا اور وہ خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ دیر خاموش رہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو یعلیٰؓ کی طرف اشارہ فرمایا حضرت ابو یعلیٰؓ آگے بڑھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کپڑے کے سائے میں آرام فرماتے تھے۔ حضرت ابو یعلی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے ہنڈیا سے جوش کے وقت آواز آتی ہے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ شخص کہاں ہے جس نے عمرہ کے متعلق سوال کیا تھا وہ آدمی حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اغسل **الطیب الذی بک ثلاث مرات وانزع عنک الجبة واصنع فی عمرتک کما تصنع فی حجتک.** "جو خوشبو تمہیں لگی ہوئی ہے اسے تین مرتبہ دھو دو! اپنا جبہ اتار دو! اور اپنے عمرہ میں وہی کرو جو اپنے حج میں کرتے ہو۔"[1]

محرم اگر احرام سے پہلے کوئی خوشبو مشک وغیرہ لگانا چاہے تو اسے اختیار ہے وہ لگا سکتا ہے۔ اور اگر وہ خوشبو بعد میں باقی بھی رہی تو بھی کچھ حرج نہیں ہے۔ محرم کے لئے خوشبو دار تیل استعمال کرنا بھی حرام ہے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اس پر فدیہ واجب ہے۔ اور اگر وہ دوا وغیرہ کے لئے بغیر خوشبو والا تیل استعمال کرتا ہے تو اس پر فدیہ واجب نہیں ہے۔

محرم کے لئے خوشبو دار چیز کا کھانا پینا بھی منع ہے خواہ اس میں خوشبو کی آمیزش کم ہی ہو۔ الا یہ کہ اس خوشبو کا کوئی ذائقہ یا اس کی بو بالکل باقی نہ رہی ہو۔

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۱۴۹]

محرم کے لئے زیتون اور گھی کا استعمال نیز ہاتھوں کو بغیر خوشبو کے صابن سے دھونا جائز ہے ہاں اگر صابن خوشبودار ہو تو جائز نہیں ہے۔

محرم اپنا سر اور بدن پانی سے دھو سکتا ہے بشرطیکہ اس کا کوئی بال نہ گرے۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ محرم دخول مکہ اور وقوف عرفات کے وقت غسل کے دوران اپنے جسم کو نہ ملے اور اپنے سر کو بھی نہ ملے بلکہ صرف اس پر پانی بہائے۔

حضرت نافع ؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں یہ بھی ہے کہ پھر صبح کے وقت حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ غسل کرتے اور فرماتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح کیا کرتے تھے۔[1]

مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت مسور بن مخرمہؓ کا ابواء میں اختلاف ہو گیا۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: محرم اپنا سر دھوئے اور حضرت مسور رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہ دھوئے: پس حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا کہ میں ان سے یہ پوچھوں؟ میں نے دیکھا تو آپ قرنین کے درمیان کپڑا اوڑھ کر غسل فرما رہے تھے۔ میں نے سلام کیا انہوں نے پوچھا کون ہے؟ میں نے کہا عبداللہ بن حنین مجھے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کی طرف بھیجا ہے کہ میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حالت احرام میں کس طرح غسل کیا کرتے تھے؟ حضرت ابوایوبؓ نے اپنے اوپر لیا ہوا کپڑا اٹھانا شروع کیا۔ حتیٰ کہ آپ کا سر نظر آنے لگا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: انسان کو پانی بہا دینا چاہیے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے اپنے سر پر پانی بہایا۔ اور اپنا ہاتھ سر پر پھیرا، آگے کی طرف پھر پیچھے کی طرف۔ پھر فرمایا: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔[2]

محرم کسی درخت، خیمے، گھر، کپڑے یا چھتری وغیرہ کے نیچے سایہ حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ یہ چیزیں اس کے سر یا چہرے کو مس نہ کریں۔ حضرت ام الحصین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمرہ عقبہ پر رمی کی تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سواری پر واپس ہوئے آپؐ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ تھے۔ ایک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کو ہانک رہا تھا اور دوسرے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دھوپ سے بچانے کے لئے ان پر کپڑے سے سایہ کیا ہوا تھا۔[3] حضرت جابرؓ کی طویل حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نمرہ میں ایک خیمہ نصب کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

1 [عمدۃ القاری ۹/۲۰۷] 2 [مسلم ۸/۱۲۵] 3 [مسلم ۹/۴۵]

نے وہاں قیام فرمایا۔[1]

محرم بچھو، چوہے، کوے، چیل، کاٹنے والے کتے، سانپ، بھیڑیئے اور ہر حملہ آور کو قتل کرسکتا ہے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اضافہ بھی فرمایا ہے کہ ہر اس چیز کو قتل کرسکتا ہے جو انسانوں کو کاٹتی ہو اور اس کی دشمن ہو۔ جیسے درندے وغیرہ۔ حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خمس من الدواب لیس علی المحرم فی قتلھن جناح الغراب والحداۃ والعقرب والفارۃ والکلب العقور۔ "محرم اگر پانچ جانوروں کو قتل کردے تو اسے کچھ گناہ نہیں ہوتا کوا، چیل، بچھو، چوہا، اور کاٹنے والا کتا"۔[2]

حالت احرام میں ممنوع چیزوں کا خلاصہ

(۱) محرم بغیر عذر کے اپنے بال نہیں کاٹ سکتا۔

(۲) محرم بغیر عذر کے اپنے ناخن نہیں کاٹ سکتا تاہم اگر اس کا ناخن ٹوٹ جائے تو اسے جدا کرسکتا ہے اگر محرم اپنا ناخن کاٹ لے تو اس پر دم واجب ہوجاتا ہے۔

(۳) محرم اپنا سر اور چہرہ نہیں ڈھانپ سکتا۔ اور نہ شلوار یا سلا ہوا کپڑا پہن سکتا ہے۔ یہ حکم صرف مردوں کے لئے ہے۔

(۴) محرم اپنے اوپر کوئی چادر وغیرہ نہیں باندھ سکتا۔ اور نہ ہی کوئی بٹن یا کنڈے یا کانٹے یا سوئی وغیرہ کے ذریعے لباس سی سکتا ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں کپڑے کو سلے ہوئے کپڑے کے حکم میں کردیتی ہیں۔ ہاں محرم ازار بند باندھ سکتا ہے کیونکہ ستر عورت کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے اور ھمیانی بھی باندھ سکتا ہے اگر اس میں خرچ رکھا ہوا ہو۔ حالت احرام میں جبہ نہ پہنے ہاں اگر اپنے ہاتھ اس کی آستینوں میں نہیں ڈالے گا تو اس پر فدیہ نہیں ہے۔ محرم انگوٹھی اور گھڑی پہن سکتا ہے۔

(۵) محرم خوشبو استعمال نہ کرے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لا تمسوا طیباً خوشبو نہ لگاؤ۔ اور حضرت ابو یعلیٰ رضی اللہ عنہ سے آپؐ نے فرمایا تھا اغسل الطیب الذی بک جو خوشبو تم نے لگائی ہوئی ہے اسے دھودو! محرم جب بھی خوشبو استعمال کرے گا تو اسے فدیہ دینا پڑے گا۔ محرم خوشبودار تیل نہ تو استعمال کرسکتا ہے اور نہ سونگھ سکتا ہے۔ اس کے حرام ہونے میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔ محرم وہ چیز نہیں کھا سکتا جس میں خوشبو ہو۔ محرم کے لئے بالقصد خوشبو سونگھنا ریحان سونگھنا، اور اچھے پھل سونگھنا مکروہ ہے۔ اگر بغیر قصد سونگھ لے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور اس میں فدیہ بھی نہیں ہے۔

---

[1] [مسلم ۹/۱۸۱] [2] [مؤطا ۱۱/۲۵۸]

(۶) خشکی کے شکار کا قتل یا شکار محرم پر حرام ہے۔
(۷) قبل یا فرج میں جماع حرام ہے۔
(۸) شرم گاہ کے علاوہ بھی عورت سے مباشرت حرام ہے۔
(۹) عقد نکاح صحیح ہے ہم بستری صحیح نہیں ہے۔

حج کی اقسام

تمتع، قِران، افراد اور فسخ حج

تمتع: یہ ہے کہ حج کے مہینوں میں عمرہ کا احرام باندھے، پھر اس سے فارغ ہو کر اسی سال حج کا احرام باندھا جائے۔

قِران: ایک ہی احرام کے ساتھ حج اور عمرہ کو جمع کرنا یا عمرہ کا اہلال (احرام باندھنا) کر کے پھر افعال عمرہ ادا کرنے سے قبل اس پر حج کو داخل کرنا۔

افراد: حج کے مہینوں میں صرف حج کا احرام باندھنا یا مجوزین کے نزدیک اشہر حج کے علاوہ دوسرے مہینوں میں حج کا احرام باندھنا، اور افعال حج سے فارغ ہو کر عمرے کی ادائیگی جس کا جی چاہے۔

فسخِ حج: حج کا احرام باندھنا، پھر عمرے، کے ذریعہ اس سے حلال ہو کر متمتع ہو جائے اس میں علماء کا اختلاف ہے حنابلہ اس صورت کو جائز قرار دیتے ہیں۔ البتہ قران اور حج افراد کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ فسخ حج کے جواز میں اختلاف ہے۔ عنقریب ایک حدیث بیان ہوگی کہ عمرے کے ذریعہ فسخ حج کی صورت حجۃ الوداع میں منحصر ہے جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا روئے زمین میں کیے گئے گناہوں میں سے سب سے بڑا گناہ ہے، اور وہ محرم کو صفر بنا دیتے تھے اور کہتے تھے کہ جب اونٹوں کی پیٹھ کا زخم اچھا ہو جائے اور نشان مٹ جائے اور صفر کا مہینہ گذر جائے تو عمرہ کرنے والوں کے لیے عمرہ کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرام رضی اللہ عنہم چوتھی تاریخ کی صبح کو حج کا احرام باندھے ہوئے مکہ مکرمہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ اس کو عمرہ بنا لو، یہ بات ان پر گراں گذری انہوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ کیسا اہلال ہے فرمایا کہ سارا ہی احرام کھول دو، آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس سے مقصد مشرکین کے طریقہ کی تردید اور ابطال تھا۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ خدا کی قسم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اسی لیے عمرہ کرایا تھا تاکہ اس طرح

مشرکین کے عمل کی تردید ہو جائے کیونکہ مشرک لوگ عمرے کی ادائیگی کو حرام سمجھتے تھے تاوقتیکہ ذوالحجہ اور محرم گذر نہ جائیں۔[1]

شافعیہ کے نزدیک حج افراد افضل ہے، مالکیہ بھی یہی کہتے ہیں اور حنابلہ کے نزدیک عمرہ کے ذریعہ حج کو فسخ کر کے متمتع ہونا افضل ہے اور حنفیہ کے نزدیک حج قران افضل ہے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آغاز میں عمرے کا احرام باندھا، پھر متمتع ہو کر اسی کو ادا کرتے رہے پھر طواف سے پہلے حج کا احرام باندھا اور اس کیلئے الگ احرام باندھا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قارن ہو گئے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ ''ہم لوگ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلے، ہم نے عمرہ کا احرام باندھا، پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جس کے ساتھ ہدی ہو اسے چاہیے کہ عمرہ کے ساتھ حج کا احرام باندھ لے، پھر حلال نہ ہو، یہاں تک کہ ان دونوں سے حلال ہو جائے۔

اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جن لوگوں نے عمرے کا احرام باندھا تھا، وہ بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر کے حلال ہو گئے، پھر منیٰ سے واپسی کے بعد انہوں نے ایک ہی طواف کیا اور جن لوگوں نے حج وعمرہ کو جمع کیا تھا، انہوں نے بھی ایک ہی طواف کیا۔[2]

جس نے عمرے کے لیے احرام باندھا ہو وہ اس عمرے سے فارغ ہونے کے بعد حلال ہو جاتا ہے لیکن جب وہ ہدی بھی ساتھ لایا ہو تو پھر ایسا نہیں ہے۔ اور جس نے صرف حج کا احرام باندھا ہو یا حج وعمرہ دونوں کو جمع کیا ہو وہ یوم نحر کو حلال ہونگے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا بات ہے کہ لوگ تو عمرہ سے حلال ہو گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے عمرہ سے حلال نہیں ہوئے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''میں نے تو اپنے سر کے بال چپکا لیے اور ہدی کے جانور کے گلے میں قلادہ (پٹا) ڈالا ہے پس میں احرام اس وقت تک نہیں کھول سکتا جب تک کہ قربانی کا جانور ذبح نہ کر دوں۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حجۃ الوداع کے سال نکلے، بعضوں نے عمرے کا احرام باندھا، بعضوں نے حج اور عمرے دونوں کا احرام باندھا اور بعض نے صرف حج کا احرام باندھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کا احرام باندھا، پھر جنہوں نے

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۱۹۹] [2] [عمدۃ القاری ۹/۱۸۲] [3] [عمدۃ القاری ۹/۲۰۱]

صرف حج کا احرام باندھا تھا یا حج وعمرہ دونوں کو جمع کیا تھا انہوں نے احرام نہیں کھولا، یہاں تک کہ یوم نحر آ گیا۔[۱]

ظاہر یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرے کا احرام باندھا تھا، پھر عمرہ شروع کرنے سے پہلے حج کا احرام باندھ لیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قارن ہوئے پھر جب رمل اور اضطباع کے ساتھ عمرے کا طواف کر لیا تو اس کے بعد سعی کی پھر لوگوں کو عمرے کے ساتھ فسخ حج کا حکم دیا، مگر جو لوگ ہدی کا جانور ساتھ لائے تھے ان کا اس کا حکم نہیں دیا۔ پھر حج کے لئے طواف نہیں کیا، بلکہ ایک ہی طواف پر اکتفا کیا۔ جن اصحاب نے حج کو عمرے کے ساتھ مقترن کیا تھا انہوں نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح کیا کہ عمرہ کا طواف کیا اور سعی کی۔ جیسا کہ ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: کیا تم نے حج کا ارادہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے کس کے ساتھ احرام باندھا؟ میں نے کہا میں نے حضور علیہ السلام کے احرام کے مثل احرام باندھنے کی نیت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اچھا کیا، بیت اللہ کا طواف اور صفا ومروہ کی سعی کر کے حلال ہو جاؤ''۔ پس میں نے بیت اللہ کا طواف کیا، پھر صفا ومروہ کی سعی کی، پھر میں بنو قیس کی ایک عورت کے پاس آیا، اس نے میرے سر کی صفائی کی، پھر میں نے حج کا احرام باندھا[۲] پھر لوگوں نے حج کا احرام باندھا تو طواف نہیں کیا پھر یوم نحر کو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کا طواف کیا، جن لوگوں نے حج اور عمرے کو جمع کیا تھا انہوں نے ایک ہی طواف کیا جب وہ عمرے کے لیے مکہ پہنچے تھے، طوافِ قدوم سنت ہے، لیکن انہوں نے یہ طواف نہیں کیا۔

کیا مُحدِث اور جنبی طواف کر سکتا ہے؟ فقہاء کرام کا اس میں اختلاف ہے: امام احمدؒ سے دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں درست ہے اور دوسری میں نادرست۔

ہمارے اصحابؒ کہتے ہیں کہ طہارت شرط نہیں ہے پس اگر محدث یا جنبی نے طواف کیا یا اس حال میں طواف کیا کہ اس کے جسم پر نجاست تھی تو طواف درست ہوگا۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے، ''وَ لْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ'' [الحج/۲۹] اس آیت میں مطلقاً طواف کا حکم دیا گیا ہے اور اس کو خبر واحد کے ذریعہ طہارت کی قید سے مقید کرنا نص پر زیادتی ہے جو کہ جائز نہیں ہے۔ البتہ محدث نے طواف کیا تو اس کے ذمہ بکری واجب ہوگی اور اگر جنبی نے طواف کیا تو بدنہ لازم ہوگا اور جب تک مکہ معظمہ میں ہے اس طواف کا اعادہ کرنا ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک طہارت شرط ہے، لہٰذا طہارت کے بغیر طواف درست نہ ہوگا، جمہور ائمہ کے نزدیک محدث، جنبی اور حائضہ عورت کا سعی

---

[۱] [عمدة القاری ۹/۱۹۷] [۲] [عمدة القاری ۱۰/۱۲۹]

کرنا درست ہے، یہ حدیث ان علماء کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ قارن کے لئے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے، حضرت عطاء حضرت حسن حضرت طاؤس رحمہم اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور امام مالک، امام شافعی، امام احمد امام، امام اسحاق، امام ابو ثور اور امام داؤد رحمہم اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔

مجاہد، جابر بن زید شریح القاضی شعبی محمد بن علی بن حسین نخعی، اوزاعی، ثوری، حماد ان، حکم بن عینیہ ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ اور امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ اور ان کے اصحاب کہتے ہیں کہ قارن کے لیے دو طواف اور دو سعی ضروری ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بھی یہی منقول ہے اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت یہی ہے۔

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حج اور عمرہ کو جمع کیا اور فرمایا کہ ان دونوں کا راستہ ایک ہے، اور انہوں نے ان دونوں کے لیے دو طواف کیے اور دو سعی کیں اور فرمایا کہ میں نے جس طرح کیا ہے اسی طرح میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سعی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے بھی ان دونوں کو جمع کیا اور اسی طرح کیا، پھر فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسی طرح حضرت علقمہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمرہ اور حج کے لیے دو طواف اور دو سعی فرمائیں، اور حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم نے بھی ایسا ہی کیا اور انہوں نے حدیث عمران بن حصینؓ روایت کی ہے اور اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔[1] لیکن **التعلیق المغنی علی الدار قطنی** کے مصنف نے نقل کیا ہے کہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کو مرفوعاً نقل کیا ہے جس کی اسانید مجموعی لحاظ سے **لاباس به** کے درجہ میں ہیں۔ دار قطنی نے ابو نصرؒ سے روایت کیا ہے کہ میری ملاقات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی میں نے حج کا اور انہوں نے حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا ہوا تھا، میں نے پوچھا کہ کیا میں بھی آپ کی طرح ایسا کرسکتا ہوں؟ فرمایا کہ ہاں جب تم عمرہ سے ابتداء کرو، میں نے پوچھا کہ اس کا ارادہ کرتے وقت میں کیا کروں؟ انہوں نے فرمایا کہ پانی کا برتن لو اور اس کو اپنے بدن پر بہاؤ، پھر دونوں کا احرام باندھ لو، پھر دونوں کے لیے دو طواف اور دو سعی کرو، یوم نحر سے قبل احرام کھولنا حلال نہیں ہے۔

منصورؒ کہتے ہیں کہ میں نے یہ بات مجاہدؒ سے ذکر کی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ایک ہی طواف کا فتویٰ دیتے تھے لیکن اب ایسا نہیں کریں گے۔[2]

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۱۸۴] [2] [سنن الدار قطنی ۲/۲۶۵]

مسجد حرام سے ابتداء اور طواف کے لیے استلام حجر

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب (مکہ معظمہ) آئے تو سب سے پہلے آپؐ نے وضو کیا پھر طواف کیا پھر اس کو فسخ نہ کیا۔ پھر ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے بھی آپ کی طرح حج کیا۔[۱] مسلم شریف نے حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا نقل کی ہے لیکن اس میں یہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ پھر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حج کیا تو انہوں نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کا طواف کیا، پھر اس کو فسخ نہیں کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی طرح کیا، پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حج کیا تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے بھی سب سے پہلے بیت اللہ کا طواف کیا پھر اس کو فسخ نہیں کیا، پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی ایسا ہی کیا، پھر میں نے ابوالزبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا انہوں نے بھی سب سے پہلے بیت اللہ کا طواف کیا، اور اس کو فسخ نہیں کیا پھر میں نے مہاجرین وانصار کو بھی ایسا ہی کرتے دیکھا پھر اس کو فسخ نہیں کیا، پھر آخر میں جس کو میں نے ایسا کرتے دیکھا وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔ انہوں نے عمرے سے اس کو نہیں توڑا اور حضرت ابن عمرؓ کا لوگوں کی نظر میں بڑا مقام تھا۔[۲]

معلوم ہوا کہ مسجد حرام میں داخل ہونے والا سب سے پہلے طواف کرے گا نہ کہ نماز پڑھے گا، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکہ معظمہ پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد سے آغاز کیا تھا اور نماز کی بجائے طواف کیا تھا۔ اگر مسجد میں داخل ہونے والا حلالی (بغیر احرام کے) ہو تو اس کا طواف، طواف تحیہ ہوگا اور اگر محرم بالحج ہو تو اس کا طواف، طوافِ قدوم ہوگا اور اگر محرم بالعمرہ ہو تو عمرے کا طواف ہوگا۔ علماء کہتے ہیں کہ مسجد حرام کا تحیہ طواف ہے اس کے لیے جو اس کا ارادہ رکھتا ہو اور جو اس کا ارادہ نہ رکھے وہ دو رکعت پڑھے بغیر نہ بیٹھے، جبکہ وقت کراہت نہ ہو، جیسا کہ دوسری مساجد کا حکم ہے۔[۳]

طواف کی ابتداء

بیت اللہ کا طواف استلام حجر سے ہی شروع ہوگا اور حجرِ اسود سے پیشانی لگائے دارِ قطنی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجر اسود پر اپنا ماتھا ٹیکا۔[۴] نیز صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حج کے بارے میں ہے، اس میں ہے کہ "یہاں تک کہ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ کے پاس پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکن کا استلام کیا۔"[۵] استلام رکن کا معنی اس کو بوسہ دینا ہے، اگر بوسہ دینا ممکن نہ ہو تو اپنے ہاتھ یا لاٹھی

---

۱ [عمدۃ القاری ۹/۲۵۸] ۲ [صحیح مسلم ۸/۲۲۰] ۳ [ذکرہ صاحب اعلاء السنن/]

۴ [سنن الدار قطنی ۲/۲۸۹] ۵ [صحیح مسلم ۸/۱۷۴]

وغیرہ سے استلام کر کے پھر اس چیز کو بوسہ دے جس کے ساتھ استلام کیا ہے۔ اگر استلام سے عاجز ہو تو ہاتھ سے اشارہ کرلے، منہ کے ساتھ تقبیل کا اشارہ نہ کرے کیونکہ یہ امر منقول نہیں ہے۔ ہر چکر میں اس کی رعایت رکھے اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کے ذمے کچھ نہیں ہے۔ جیسا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کا بوسہ لیا پھر فرمایا میں تیرا بوسہ لیتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ تو ایک پتھر ہے، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ تیرا بوسہ لیتے تھے۔ ایک روایت جو سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، میں ہے کہ انہوں (راوی) نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کا بوسہ لیا اور اس کو چمٹ گئے اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تیرا اہتمام کرتے دیکھا ہے۔[۱]

نیز حضرت نافع روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کو دیکھا کہ آپؓ نے اپنے ہاتھ سے حجر اسود کا استلام کیا، پھر اپنے ہاتھ کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ جب سے میں نے یہ عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے ترک نہیں کیا۔[۲] ابوالطفیل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کا طواف کر رہے ہیں اور اپنی لکڑی کے ساتھ حجر اسود کا استلام کر رہے ہیں اور پھر اس لکڑی کو بوسہ دے رہے ہیں۔[۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اونٹ پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی رکن (حجر اسود) پر آتے تو کسی چیز کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کرتے اور اللہ اکبر کہتے۔[۴] معلوم ہوا کہ اس موقع پر تکبیر مستحب ہے اور تسمیہ بھی مستحب ہے۔ چنانچہ استلام حجر کے وقت یوں کہے۔ بسم اللّٰہ وَاللّٰہ اکبرُ جیسا کہ بیہقی نے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما جب استلام حجر کرتے تھے تو یہ کہتے بسم اللّٰہ وَاللّٰہ اکبر۔[۵] یہ اشارہ استلام حجر کے وقت رفع یدین کے ساتھ ہوگا، جیسا کہ ابراہیم النخعیؒ روایت کرتے ہیں کہ سات جگہ میں ہاتھوں کو اٹھایا جائے، نماز کے آغاز میں، وتر میں دعائے قنوت کی تکبیر کے وقت، عیدین میں، استلام حجر کے وقت، صفا و مروہ پر، مزدلفہ میں، عرفات میں اور دونوں جمروں کے نزدیک دو مقاموں پر۔

صرف رکن یمانی کا استلام کرے

یہ حنفیہ کا مذہب ہے، اس لیے کہ یہ دونوں رکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیادوں کے

---

۱ [صحیح مسلم ۹/۱۷] ۲ [صحیح مسلم ۹/۱۵] ۳ [صحیح مسلم ۹/۲۰]
۴ [عمدۃ القاری ۹/۲۵۷] ۵ [سنن البیہقی ۵/۷۹]

مطابق ہیں۔ نیز امام مسلمؒ، حضرت ابن عمرؓ، سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کے صرف دو یمانی رکنوں کو چھوتے ہوئے دیکھا ہے ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے ارکان میں سے صرف رکن اسود کا استلام کرتے تھے۔ یمانیان (دو یمانی) تغلیباً کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسے ماں باپ کو تغلیباً ابوان اور شمس وقمر کو قمران کہہ دیتے ہیں۔ اس رکن کی تقبیل بھی کریگا؟ دار قطنی میں حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رکن یمانی کی تقبیل کرتے تھے اور اپنا رخسار مبارک اس پر رکھتے تھے۔[1] ابو الزبیرؒ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم طواف کرتے تھے تو شروع میں اور آخر میں رکن کا استلام کرتے تھے اور صبح کے بعد طواف نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جاتا اور نہ عصر کے بعد یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے''[2]

طواف میں رمل اور اضطباع

حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ مکہ معظمہ آتے تو رکن اسود کا استلام کرتے اور طواف کے پہلے تین چکروں میں رمل کرتے تھے۔ نافعؒ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے حج اور عمرے کے طواف میں تین چکر دوڑ کر لگائے اور چار چکر معتدل رفتار سے چل کر لگائے۔[3] حدیث ہذا میں ''خبب'' کا لفظ ہے، جس کا معنی یہ ہے کہ طواف کو ذرا دوڑ کر شروع کرنا اور یہ چیز طوافِ قدوم، طواف افاضہ، اور طواف عمرہ میں متصور ہے، طوافِ وداع میں متصور نہیں ہے، لہٰذا جب طوافِ قدوم کرے اور نیت یہ ہو کہ اس کے بعد سعی کریگا تو اس میں رمل کرنا مستحب ہے اگر اس کی نیت نہ ہو تو رمل نہ کرے اور طوافِ افاضہ میں رمل کریگا۔ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع ۱۰ ہجری کے طواف میں رمل کیا تھا، حجر سے حجر تک۔ لہٰذا آخری عمل واجب ہوگا۔ رمل کہتے ہیں کہ چلنے والا اپنے کندھوں کو ہلاتے ہوئے تیزی سے چلے۔ اور اضطباع کہتے ہیں کہ چادر کو دائیں بغل کے نیچے سے لاکر اس کے کنارے بائیں مونڈھے پر ڈال دینا۔ جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ نے مقام جعرانہ سے عمرے کا احرام باندھا پھر بیت اللہ کا رمل کیا اور اپنی چادروں کو بغلوں کے نیچے سے لاکر ان کو اپنے بائیں کندھوں پر ڈال دیا۔[4]

---

[1] [سنن الدار قطنی ۲/۲۹۰] [2] [عمدۃ القاری ۹/۲۵۰]

[3] [مسند احمد بشرح البناء ۱۲/۱۸۔۱۷] [4] [مسند احمد بشرح البناء ۱۲/۱۹]

معذور کے لئے سواری پر طواف

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں یہ باب باندھا ہے، ''باب المریض یطوف راکبًا۔'' ''مریض کا سوار ہو کر طواف کرنا'' اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث ذکر فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکن تک پہنچے تو اس کی طرف کسی چیز سے اشارہ فرمایا اور تکبیر کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا کسی عذر کے سوار ہو کر طواف فرمایا۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تکلیف کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا طوفی من وراء الناس وانت راکبة'' سوار ہو کر لوگوں سے ہٹ کر طواف کرلو!'' چنانچہ میں نے (ایسے ہی) طواف کیا۔[1]

اس حدیث مبارکہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کے کندھوں پر یا کسی سواری پر سوار ہو کر طواف کرنا مباح ہے۔ لیکن بغیر کسی عذر کے کندھوں پر بیٹھ کر طواف کرنا مکروہ ہے۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت ذکر فرمائی ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت ناساز تھی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اونٹنی پر طواف کیا۔ پھر جب رکن پر پہنچے تو چھڑی سے استلام کیا۔ پھر طواف سے فارغ ہو کر اونٹنی کو بٹھایا، اور دو رکعتیں ادا فرمائیں۔[2]

گویا یہ حدیثِ مبارکہ امامِ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر کردہ باب کی تفسیر ہے۔

اور جب آدمی احرام کی حالت میں کسی مُحرِم بچے یا بڑے کو اٹھا کر طواف کرائے تو وہ یہ نیت کرے کہ میں (اس) بچے یا بڑے کو بھی طواف کرا رہا ہوں اور خود بھی طواف کر رہا ہوں۔ کیونکہ اٹھانے والے کا طواف نہیں ہوتا بلکہ اٹھائے جانے والا کا طواف ہوتا ہے، اور اس اٹھانے والے پر طواف کا اعادہ لازم ہے، کیونکہ یہ ایسا ہی ہے گویا کہ اس نے طواف کیا ہی نہیں غور فرمایئے کیا ہاتھ گاڑی وغیرہ پر طواف کرنے کا یہی حکم نہیں ہوگا؟ بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ حامل ومحمول دونوں کا طواف درست ہے۔

طواف کا طریقہ

طواف کرنے والا اپنی داہنی طرف سے شروع کرے۔ اور حجر اسود سے ابتداء کر کے باب کعبہ کی طرف چلے، پھر حطیم سے باہر سات چکر پورے کرے، حطیم رکن عراقی سے رکن شامی کی درمیانی جگہ کو کہتے ہیں اسے حطیم کہا جاتا ہے کیونکہ یہ بیت اللہ سے کٹ کر الگ ہو گیا ہے اور اس میں

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۲۶۲] [2] [سنن ابی داود ۲/۱۸۸۱]

میزاب رحمت نصب ہے اس کے اور بیت اللہ کے درمیان دونوں جانب سے راستہ ہے۔ پس اگر طواف کرتے ہوئے اس میں داخل ہو جائے تو ناجائز ہے کیونکہ حطیم بیت اللہ کا حصہ ہے۔ چنانچہ وہ دوبارہ حطیم کے اوپر سے طوف کرے گا۔ اور جب سات چکروں سے فارغ ہو جائے تو مقام ابراہیم علیہ السلام پر دو رکعتیں ادا کرے۔ امام مسلمؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکن کا استلام کیا، تین دفعہ رمل فرمایا اور چار مرتبہ درمیانی رفتار سے چلے پھر مقامِ ابراہیمؑ پر پہنچے اور یہ آیت تلاوت فرمائی ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِمَ مُصَلًّی'' [البقرة] پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح کھڑے ہوئے کہ مقام ابراہیم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور بیت اللہ کے درمیان تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دو رکعتوں میں ''قُلْ یٰاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' تلاوت فرمائی۔ پھر رکن کی طرف لوٹے اور استلام فرمایا پھر دروازے سے نکل کر صفا تشریف لے گئے اور جب صفا کے قریب ہوئے تو یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی۔ ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ'' [البقرة] اور فرمایا ''ابداء بما ابدأ اللّٰه به'' میں بھی وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللہ نے ابتداء کی ادا کی''۔ چنانچہ صفا سے ابتداء فرمائی اور اس پر چڑھ گئے۔ یہاں تک کہ بیت اللہ نظر آنے لگا۔ پھر آپ نے اس کی طرف رخ کیا اور اللہ کی توحید بیان کی، تکبیر کہی اور کہا ''لا اِله الا اللّٰه وحده لاشریک لهٗ لهٗ الملک ولهٗ الحمد وهو علی کل شئی قدیر لا الٰه الا اللّٰه وحدهٗ انجز وعده ونصرعبده وهزم الاحزاب وحده.'' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تمام تعریفیں ہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے، اس نے اپنا وعدہ پورا فرمایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اسی اکیلے نے لشکروں کو شکست دی۔'' پھر اسی دوران دعا کی اور اس طرح تین مرتبہ کہا پھر مروہ کی طرف چل دیے اور جب وادی کے درمیان میں پہنچے تو سعی فرمائی۔ پھر جب چڑھائی شروع ہوئی تو آرام سے چلنے لگے۔ حتی کہ مروہ تک پہنچے اور اس پر چڑھ گئے پھر بیت اللہ کو دیکھ کر فرمایا ''لا اله الا اللّٰه وحده لا شریک له له الملک وله الحمد وهو علی کل شیئٍ قدیر'' اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کے لئے بادشاہت ہے اور اسی کے لئے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ تین مرتبہ اس طرح کہا پھر اللہ کا ذکر اور اس کی تسبیح وتحمید بیان کی۔ اور جو اللہ نے چاہا دعا مانگی۔ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طواف سے فارغ ہو گئے۔[1]

---

[1] [نسائی ۵/۲۵۰]

نسائی کی ایک اور روایت کے مطابق......... پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استلام کیا، پھر وہاں سے چل دیے اور یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی۔ ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ.[البقرة] پھر فرمایا''فابدؤ وابما بدأ اللّٰه به'' سوتم بھی وہاں سے آغاز کرو جہاں سے اللہ نے ابتداء فرمائی۔[1] حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نسائی شریف کی اس روایت کی وجہ سے صفا سے ابتداء کرنے کو واجب کہا ہے پس صفا سے سعی کی ابتداء کرنا واجب ہے۔ اگر مروہ سے ابتداء کر کے صفا پر ختم کی تو دوبارہ چکر لگانا پڑے گا۔ اور یہ بھی سعی کے واجبات میں سے ہے کہ سعی طواف کے فوراً بعد ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طواف کے بعد سعی کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کیا۔ اور یہ بات احادیثِ صحیحہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور یہ بھی واجب ہے کہ یہ سعی اس طواف کے بعد ہو جو جنابت اور حیض سے طہارت کے ساتھ ہو۔ تاہم حدث اصغر سے طہارت، کپڑے اور بدن کی طہارت اور جائے طواف کی طہارت واجبات سعی میں سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ سعی کی سنتیں ہیں سو اگر کسی نے بغیر طہارت کے طواف قدوم کیا اور اس کے بعد اگر حالت جنابت میں سعی کی تو اس کے ذمے طوافِ زیارت کے بعد سعی کرنا وجوباً لازم ہے۔ اور اگر اس نے دوبارہ سعی نہ کی تو اس پر دم واجب ہو جائے گا اور اگر بے وضو تھا تو طواف زیارت کے بعد دوبارہ سعی مستحب ہے۔ اگر وہ دوبارہ سعی نہ کرے تو کوئی حرج نہیں نیز سعی میں حیض اور جنابت سے پاک ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ خواہ وہ سعی عمرے کی ہو یا حج کی اس لئے کہ وہ ایسی عبادت ہے جو مسجد حرام میں ادا نہیں کی جاتی۔ جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں اسناد صحیحہ کے ساتھ مذکور ہے۔''اذا طافت ثم حاضت قبل ان تسعیٰ بین الصفاوالمروة فلتسع'' ''اگر عورت نے طواف کیا اور پھر وہ سعی سے پہلے حائضہ ہوگئی تو وہ سعی کرے۔''

لیکن خبردار! آج کل سعی والا مقام مسجد حرام میں ضم ہو چکا ہے۔ لہٰذا بحالتِ حیض مسجد میں دخول ممنوع ہونے کی وجہ سے اس سے احتراز کرے۔

طواف کے بعد دو رکعتوں کا وجوب

حضرت ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف میں حضرت امام حسنؓ سے روایت کیا ہے کہ سنت یہ ہے کہ سات چکروں کے بعد دو رکعتیں ہیں ان کی جگہ کوئی اور نفل اور فرض نماز نہیں لے سکتی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر سات چکروں کے بعد دو رکعتیں ادا فرمائی ہیں۔ امام نافعؒ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ ہر سات چکروں کے بعد دو رکعتیں ادا فرماتے تھے۔ اور امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طواف کے سات چکروں کے بعد کبھی دو رکعتیں نہیں چھوڑیں۔[2]

---

[1] [نسائی ۵/۲۴۳] [2] [عمدة القاری ۹/۹۶۷]

امام ظفرؒ فرماتے ہیں کہ امام جصاص رازیؒ نے علماء احناف سے طواف کی دو رکعتوں کے وجوب کا حکم قرآن سے استدلال کیا ہے اور فرمایا کہ جب نبی کریم ﷺ نے مقام ابراہیمؑ پر دو رکعتیں ادا کرنے کا ارادہ فرمایا تو یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِمَ مُصَلّٰی'' [البقرۃ] یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آیت سے مراد ہے کہ طواف کے بعد دو رکعتیں ادا کی جائیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ یہ امر ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ چنانچہ واضح ہو گیا کہ وہ جگہ مقام ابراہیم علیہ السلام ہے جو آیت سے مراد ہے اور مصلّٰی کا مطلب ہے رکوع و سجود والی نماز نہ کہ مطلقاً دعا، نیز یہ کہ یہ نماز طواف کے بعد ہے اور یہ واجب ہے جیسا کہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ سے مذکور ہے کہ طواف کے بعد جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین نے دو رکعتوں میں رخصت دی ہے۔ چاہے جو وقت بھی ہو اور بعض نے تو مکروہ بھی لکھا ہے اس بنا پر کہ فجر و عصر کی نماز کے بعد مطلقاً نماز کی نہی ہے۔ اور یہ حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت سیدہ عائشہ سے روایت ہے کہ: **اذا اردت ان تطوف بعد الفجر او العصر فطف واخر الصلوۃ حتی تغیب الشمس اوحتی تطلع.** ''جب تم فجر یا عصر کے بعد طواف کا ارادہ کرو تو طواف کر لو! اور نماز کو طلوع شمس یا غروب آفتاب تک مؤخر کر دو۔''

اور نبی کریم ﷺ کے فرمان ''**یبنی عبد مناف من ولی منکم من امر الناس شیئاً فلا یمنعن احداً طاف بھذا البیت وصلیٰ ایۃ ساعۃ شاء من لیل اونھار**'' (اے بنو عبد مناف تم میں سے جو شخص بھی لوگوں کا والی بنے وہ دن رات کے کسی بھی وقت کسی کو بھی اس گھر کے طواف اور یہاں نماز کی ادائیگی سے منع نہ کرے) سے مراد یہ ہے کہ بیت اللہ پر کوئی شخص تسلط قائم کر کے اپنے لئے مختص نہ کر لے کہ دیگر لوگوں کو وہاں عبادت سے منع کرنے لگے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو بیت اللہ تمام لوگوں کے لئے بنایا ہے اور بنی عبد مناف کو خطاب کرنا اس معنی پر قرینہ ہے۔

اور ہمارے نزدیک نبی کریم ﷺ کے فرمان ''**مانھیتکم عنه فاجتنبوہ وما امرتکم به فأتو منه ما استطعتم**'' (جس چیز سے میں تمہیں منع کروں اس سے اجتناب کرو اور جس چیز کا حکم دوں اس کو حسب استطاعت بجالاؤ) کے مطابق قاعدہ یہ ہے کہ نہی امر پر مقدم ہے۔ چنانچہ حدیث مبارکہ پر عمل کرتے ہوئے ہم تمام منہیات کو مامورات پر مقدم رکھتے ہیں۔ اور امر جب نہی کے متعارض ہو تو نہی اس پر مقدم ہوتی ہے۔

طواف کی دو رکعتیں مسجد میں اور غیر مسجد میں دونوں جگہ ادا کرنا جائز ہیں اگر کوئی شخص

طواف کی رکعتیں بھول جائے تو جب اسے یاد آئیں انکی قضاء کرلے، چاہے محرم ہو یا حلالی، جمہور کا یہی قول ہے تمام اہل علم اس پر متفق ہیں کہ طواف کی دو رکعتیں جہاں چاہے پڑھو۔ لیکن انہیں مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر ادا کرنا افضل ہے۔ پھراس کے ارد گرد ادا کرنا، پھراس سے قریب تر ادا کرنا افضل ہے۔ اور انکو طواف کے متصل بعد ادا کرنا سنت ہے جیسا کہ حضرت حسنؓ کا فرمان گذر چکا کہ ''مضت السنته ان مع کل طوافِ رکعتین'' سنت یہی ہے کہ ہر طواف کے بعد دو رکعتیں ہیں۔

اوراس کی دلیل، کہ طواف کی نماز کو طواف سے مؤخر کرنا جائز ہے، یہ ہے جو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے نکلنے کا ارادہ فرمایا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ابھی طواف نہیں کیا تھا۔ سو وہ بھی نکلنے لگیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اذا أقیمت صلوۃ الصبح فطوفی علی بعیرک والناس یصلون'' جب فجر کی نماز کھڑی ہو جائے تو تم اپنے اونٹ پر طواف کرلینا، جبکہ دیگر لوگ نماز میں مشغول ہوں گے۔ سو انہوں نے طواف کرلیا اور طواف کی نماز پڑھے بغیر چلی گئیں۔[1] اگر طواف کی نماز مسجد میں ادا کرنا شرطِ لازم ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہرگز ایسا نہ فرماتے، بخاری شریف میں یہ روایت تعلیقاً مذکور ہے جو کہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فجر کے بعد طواف کیا، پھر سوار ہو کر چلے گئے۔ اور طواف کی نماز ذی طویٰ میں ادا کی۔

طواف کے دوران گفتگو کرنا

ایسا کلام جو قابلِ مواخذہ نہ ہو، دورانِ طواف جائز ہے، جیسا کہ حضرت طاؤسؒ ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''الطواف بالبیت صلوٰۃ فاقلوا من الکلام'' ''بیت اللہ کا طواف کرنا نماز ہے۔ لہٰذا کلام کم کرو''۔ ایک روایت میں امام طاؤسؒ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ''أقلو الکلام فی الطواف فانما انتم فی الصلوۃ'' ''طواف کے دوران کلام کم کرو اس لئے کہ تم نماز کی حالت ہو۔'' [نسائی ۵/۲۲۹] طواف کے دوران بہتر یہی ہے کہ اللہ کا ذکر کیا جائے مباح کلام کو بھی چھوڑ دیا جائے اور ہر اس عمل کو ترک کر دیا جائے جو خشوع وخضوع کے منافی ہو، اور عوام الناس کی طرف غیر ضروری التفات بھی نہ کرے اور جو شریعت میں ناپسند ہو اس عمل کو طواف سے دور رکھے۔ نامحرم کی طرف نہ دیکھے جس آدمی میں کوئی نقص ہو اسکو حقارت سے دیکھنا بھی ممنوع ہے جو آدمی مناسک حج سے

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۲۶۹]

ناواقف ہو اس کو نرمی سے مناسک سکھائے اور بے ادبی کا ارتکاب نہ کرے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ ابن بطالؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ جمہور علماء اس بات کے قائل ہیں کہ اگر دورانِ طواف نماز قائم ہو جائے تو نماز کی ادائیگی کے بعد طواف وہیں سے جاری رکھے۔ یہ قول حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت النخعیؒ، حضرت عطاء ابن المسیبؒ اور حضرت طاؤسؒ سے مروی ہے اس قول کو ائمہ اربعہؒ نے اپنایا ہے۔ اسی طرح حضرت ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جمہور کا مذہب ہے کہ دورانِ طواف اگر کوئی عذر لاحق ہو جائے تو ٹھہر جائے پھر وہیں سے جاری رکھتے ہوئے طواف کو مکمل کرے۔ دوبارہ از سرنو شروع کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

امام بخاریؒ اپنی کتاب میں تعلیقاً ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اگر دورانِ طواف نماز قائم ہو جائے تو نماز کے بعد طواف کو وہیں سے شروع کرے جہاں چھوڑا تھا، دوبارہ از سرنو شروع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔[1]

طواف کیلئے وجوب طہارت اور ستر کا ڈھانپنا

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے وضو فرماتے اس کے بعد طواف کرتے۔ اور امام نسائیؒ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ جب مجھے مقام سرف میں حیض آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''هٰذا شيئ کتبه الله عزوجل علىٰ بنات آدم فاقضي ما يقضي المحرم غير ان لا تطوفي بالبيت'' ''یہ ایسی چیز ہے جو اللہ نے حضرت آدمؑ کی بیٹیوں کی تقدیر میں لکھی ہے لہٰذا تم محرم والے تمام افعال کرو لیکن بیت اللہ کا طواف نہ کرو''۔ امام بخاریؒ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر یوم النحر سے قبل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو لوگوں کی طرف بھیجا کہ جاؤ اعلان کرو۔ کہ خبردار اب کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور کوئی بھی برہنہ بدن طواف نہیں کرے گا۔ یہ خبر نہی کے معنی میں ہے۔

سترِ عورت طواف کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔ ائمہ ثلاثہؒ فرماتے ہیں کہ شرط ہے۔ احنافؒ فرماتے ہیں کہ شرط نہیں ہے بلکہ احادیث کی رو سے واجب ہے احادیث میں بغیر طہارت کے طواف کرنے کی نہی موجود ہے۔ اور طواف کی حقیقت دیکھیں تو یہ حقیقی نماز نہیں ہے۔ لہٰذا طہارت فرض نہیں ہونی چاہیے اور اگر نماز سے مشابہت کا لحاظ رکھیں تو طہارت واجب ہے۔

---

[1] [عمدۃ القاری ۹/۲۶۶]

لہٰذا دونوں دلیلوں پر عمل کرتے ہوئے طہارت واجب ہے اور اگر برہنہ بدن طواف کرے گا تو طواف ٹھیک ہوگا۔ کیونکہ وہ مصلی نہیں ہے بلکہ طائف ہے۔ اس پر ستر عورت کی قید لگانا مطلق کو مقید کرنے کے مترادف ہے اور یہ ہمارے ہاں منسوخ ہے۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ فرضیت طواف کتاب اللہ سے ثابت ہے اور وجوب ستر عورت حدیث سے ثابت ہے۔

حج اور عمرے میں سعی کا وجوب

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک لمبی حدیث نقل کرتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفا، مروہ کے درمیان سعی کو سنت قرار دیا ہے۔ لہٰذا کسی کے نزدیک بھی ترک سعی جائز نہیں۔

احناف اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ صفا مروہ کے درمیان سعی واجب ہے اس لئے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ **وقد سن رسول اللہ الطواف بينهما فليس لاحدٍان يترک الطواف بينهما** وجوب سعی پر دلالت کرتا ہے اور آیت میں رفع حرج اور تخییر فرضیت کی نفی کرتے ہیں اور یہی مذہب حضرت حسن بصری، امام قتادہ اور امام ثوری رحمہم اللہ کا ہے۔ حتی کہ ترک سعی پر دم واجب ہوتا ہے اور حضرت عطاءؒ سے مروی ہے کہ سعی سنت ہے اس میں کوئی چیز نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہؒ فرماتے ہیں کہ سعی فرض ہے اس کے بغیر حج صحیح نہیں ہوتا۔ حتی کہ اگر کسی آدمی کے ذمہ کچھ سعی باقی ہو تو اسے گھر سے بھی آنا پڑے تو لوٹ کر سعی کرے۔ اور اگر واپس آنے سے قبل عورت سے جماع کر لیا تو حج اور عمرے کا پورا کرنا واجب ہے۔ اور لازمی ہے کہ اگلے سال حج کرے۔

ابن قدامہؒ، امام احمدؒ کے قول میں فرماتے ہیں کہ یہ مستحب ہے اور یہی بات اقرب الی الحق ہے۔

تکرار سعی جائز نہیں

حج اور عمرہ میں بار بار سعی کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ایک ہی مرتبہ کی جائے گی۔ تکرار سعی بدعت ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔ جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ نے صرف ایک مرتبہ سعی کی ہے۔ لہٰذا سعی مکرر نہیں کی جائے گی۔ حج اور عمرے میں سعی صرف ایک مرتبہ ہی واجب ہے۔ صاحب غنیۃ المناسک فرماتے ہیں کہ اگر کوئی رمل اور اضطباع کے بغیر طواف کرے تو اس کے بعد سعی نہ کرے اس لئے کہ نفلی طواف کی سعی نہیں ہوتی

اور حج وعمرہ میں دوسری سعی مشروع نہیں۔ جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں منقول ہے۔

حج کے خطبے

حج کے تین خطبے ہوتے ہیں (۱) سات ذوالحجہ (۲) یوم عرفہ (۳) گیارہ ذوالحجہ کا۔

پہلا خطبہ

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ جعرانہ سے واپس آئے اور ہم یوم الترویہ سے پہلے ہی مکہ پہنچ چکے تھے۔ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مناسک حج پر خطبہ دیا۔[1]

دوسرا خطبہ

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حج کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفہ پہنچے تو صحابہؓ نے مقام نمرہ پر خیمہ لگایا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں ٹھہر گئے حتیٰ کہ سورج ڈھلنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوچ کا حکم دیا پھر وادی کے درمیان میں پہنچ کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا: ان دماء کم واموالکم حرام علیکم کحرمة یومکم هذا. "بلاشبہ تمہارا خون اور اموال تمہارے اوپر اس دن کی طرح محترم ہیں۔" اور اس حدیث میں یہ بھی الفاظ ہیں: اللهم اشهد اور یہ الفاظ تین مرتبہ مذکورہ ہیں، پھر موذن نے اذان دی اور اقامت کہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر پڑھائی، پھر اقامت کہی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھائی اور دونوں نمازوں کے درمیان کوئی نماز ادا نہ کی۔[2]

امام نسائیؒ حضرت سلمہ بن نبیطؒ سے روایت کرتے ہیں اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یوم عرفہ میں نماز سے قبل سرخ اونٹ پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا۔[3]

تیسرا خطبہ

امام نسائیؒ، حضرت عبدالرحمٰن بن معاذؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقام منیٰ میں خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ نے ہمارے کانوں کی سماعت کو تیز کر دیا حتیٰ کہ ہم گھروں میں ہوتے ہوئے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سن لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں مناسک حج کی تعلیم دینا شروع کی پھر آپؐ جمرات پہنچے اور کنکریاں اٹھاتے ہوئے مہاجرین کو مسجد کے اگلے حصے میں اور

۱۔ [نسائی ۵/۲۵۳] ۲۔ [مسلم مع نووی ۸/۱۸۴] ۳۔ [نسائی ۵/۲۵۹]

انصار کو پچھلے حصے میں قیام کا حکم دیا۔[1]

امام ابوداؤدؒ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم الرؤس کو خطبہ دیا۔ سوال کیا گیا یہ کون سا دن ہے۔ صحابہ نے عرض کیا **اللہ ورسولہ اعلم** فرمایا: کیا یہ ایام تشریق کا وسط نہیں ہے۔؟!

یوم النحر کا خطبہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم نحر کو بھی خطبہ دیا اور اس خطبے میں یوم نحر کی تعظیم، ذوالحجہ کی عظمت مکہ مکرمہ کی عظمت، خون، مال، عزت کی حرمت اور اسلام پر باقی رہنے کی تعظیم پر متنبہ فرمایا۔ اور یہ امور ایسے ہیں جو کہ خاص حج کے موقع پر نہیں ہیں۔ بلکہ ہر آن ان کا لحاظ مطلوب ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطبہ میں لوگوں کو وعظ ونصیحت فرمائی لیکن مناسک حج کے متعلق کوئی بات بھی نہ ارشاد فرمائی۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایام منیٰ میں سوالات کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوابات ارشاد فرمائے، لیکن مناسک حج کو بیان نہیں کیا۔ چنانچہ اسے حج کا مسنون خطبہ نہیں کہا جا سکتا۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوم النحر کو مقام منی میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لا حرج" پھر ایک آدمی نے سوال کیا کہ میں نے ذبح سے پہلے حلق کروالیا ہے۔ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا اب ذبح کرلو کوئی حرج نہیں پھر سوال کیا کہ شام کے بعد رمی کی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی حرج نہیں۔[2]

لہٰذا جو لوگ اس کو مجلس افتاء کہتے ہیں تو حقیقت میں وہ مجلس افتاء تھی اور جو لوگ اس کو خطبہ کہتے ہیں ان کے نزدیک خطبہ ہے۔ لیکن کیونکہ اس خطبے میں مناسک حج اور شعائر کا تذکرہ نہیں لہٰذا اس کو خطبہ مسنونہ نہیں کہا جا سکتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم النحر کو خطبہ دیا اور فرمایا اے لوگو! یہ کون سا دن ہے؟ لوگوں نے جواب دیا محترم دن ہے! پھر پوچھا یہ کون سا شہر ہے؟ جواب دیا گیا محترم شہر ہے پھر پوچھا یہ کونسا مہینہ ہے؟ جواب دیا محترم مہینہ ہے! پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "**فان دماء کم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمة یومکم ھذا فی بلدکم ھذا فی شھرکم ھذا** بے شک تمہارا خون مال عزت ایسے ہی محترم ہیں جیسا کہ یہ دن شہر اور مہینہ محترم ہے۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ بیان فرمائی پھر سر اٹھا کر فرمایا **اللھم ھل بلغت! اللھم ھل بلغت**؟!

[1] [نسائی ۵/۲۵۵] [2] [عمدۃ القاری ۱۰/۷۲]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم کی امت کے لئے وصیت تھی کہ **فلیبلغ الشاھد الغائب لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض.** حاضر غائب تک دین کا پیغام پہنچائے اور خیال رکھو! میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کو قتل کرنے لگو۔[1]

یوم الترویہ کو طلوع شمس کے بعد منیٰ کو جانا اور قیام کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واقعہ نقل کرتے ہیں اس میں یہ بات ہے کہ یوم الترویہ کو لوگ منی کی طرف گئے اور حج کا احرام باندھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر، عصر مغرب، عشاء اور فجر کی نماز پڑھائی۔[2]

نو ذی الحجہ کو منیٰ سے عرفہ کو روانگی اور تکبیر وتہلیل کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب ان سے اس دن کے تلبیہ کے بارہ میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا: میں اس سفر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کے ساتھ تھا۔ ہم میں سے کوئی تکبیر میں مشغول تھا اور کوئی تہلیل میں اور کوئی بھی ایک دوسرے پر نکیر نہیں کر رہا تھا۔[3]

امام مسلمؒ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے حدیث الحج ذکر کی ہے جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طلوع آفتاب تک رکے رہے اور نمرہ میں خیمہ نصب کرنے کا حکم فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے۔ قریش کا گمان تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشعر حرام کے قریب وقوف فرمائیں گے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں قریش کیا کرتے تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے گذر کر عرفہ پہنچ گئے، وہاں دیکھا کہ خیمہ نصب ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں فروکش ہو گئے۔ حتیٰ کہ جب سورج نے ڈھلنا شروع کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قصوا کی تیاری کا حکم دیا اور اس پر جلوہ فگن ہو کر بطن الوادی پہنچ گئے اور خطبہ ارشاد فرمایا: **ان دماء کم**......... یہاں تک کہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا **اللھم اشھد** (اے اللہ! گواہ رہنا) پھر اذان واقامت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی اور پھر اقامت کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ ان دونوں نمازوں کے درمیان مزید کوئی نماز نہیں پڑھی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوار ہو کر موقف تشریف لائے اور اپنی اونٹنی قصواء کے پیٹ کو چٹانوں کی طرف کر دیا اور حبل مشاۃ کو اپنے سامنے کر لیا اور قبلہ رو ہو گئے اور غروب شمس تک ٹھہرے رہے۔ یہاں تک کہ جب سورج غروب ہو گیا تو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھا لیا۔

وقوف عرفہ حج کا سب سے بڑا رکن ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال سے ثابت

---

[1] [عمدۃ القاری ۱۰/۷۷] [2] [مسلم مع نووی ۸/۱۸۰] [3] [مسلم ۲/۹۳۴]

ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وقوف عرفہ کیا اور فرمایا **هذا عرفة وهو الموقف وعرفة كلها موقف** یہ عرفہ ہے، یہی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ عرفہ سارے کا سارا ہی ٹھہرنے کی جگہ ہے۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **كل عرفات موقف فارفعوا عن عرفة وكل مزدلفة موقف فارفعوا عن محسر وكل ايام منى منحر**۔[۲] سارا عرفات ہی موقف ہے، ہاں! عرنہ نہ ٹھہرو۔ سارا مزدلفہ ہی موقف ہے۔ ہاں! محسر میں نہ ٹھہرو! اور منیٰ کے تمام دن قربانی ہوسکتی ہے۔

ان احادیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عرفہ وقوف کے لئے متعین ہے اور یہ کہ عرفہ ہی میں وقوف کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کا وقوف معتبر نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام ثوری اور امام شافعی رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ یوم عرفہ کے دن وقوف دن میں زوال سے لے کر کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔ ساری رات بھی اسی کے تابع ہے۔ اگر دن یا رات میں ایک گھڑی کے لئے بھی وقوف پایا گیا تو کافی ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر زوال کے بعد دن کے کسی حصہ میں وقوف پایا گیا نہ کہ رات میں تو اس پر دم واجب ہے اور اگر رات کے کسی حصہ میں وقوف پایا گیا نہ کہ دن میں تو اس پر دم واجب نہیں ہے۔ اگر وہ غروب سے پہلے چلا گیا اور دن ہی میں لوٹ آیا تو اس پر کوئی دم نہیں ہے۔ امام نسائی نے حضرت عبدالرحمٰن بن یعمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب تھا۔ لوگ آکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حج کے متعلق دریافت کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **والحج عرفة فمن ادرک ليلة عرفة قبل طلوع الفجر من ليلة جمع فقدتم حجه**۔[۳] حج عرفہ کا نام ہے۔ جو شخص مزدلفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے عرفہ پہنچ جائے تو اس کا حج مکمل ہوجاتا ہے۔

وقوف عرفہ کے لئے طہارت، استقبال قبلہ، اور نیت شرط نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: **افعلي ما يفعله الحاج غير ان لا تطوفي بالبيت**. جو حاجی کرتے ہیں وہ کرتی رہو! ہاں صرف طواف نہ کرنا۔ اسی لئے تمام اہل علم کا اجماع ہے کہ وقوف عرفہ بغیر طہارت کے بھی جائز ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ذیشان انما الاعمال بالنيات (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے) سے مراد آغاز عمل میں نیت کا پایا جانا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گھر سے حج کی نیت کے ساتھ نکلتا ہے اور احرام باندھ لیتا ہے تو اس کی نیت تو موجود ہے۔ ہر رکن میں اس کی تجدید ضروری نہیں ہے۔

---

۱ [ترمذی ۲/۱۸۵] ۲ [ابن حبان ۹/۱۶۶] ۳ [نسائی ۵/۲۶۲]

عرفہ کے دن خوب دعا کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مامن یوم اکثر من ان یعتق اللّٰہ عزوجل فیه عبدا اوامة من النار من یوم عرفة وانه لید نو ثم یباھی بھم الملائکة ویقول ما اراد ھؤلاء.[1] اللہ تبارک تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں کو سب سے زیادہ جہنم سے یوم عرفہ کے دن آزاد کرتے ہیں۔ وہ انہیں اپنا قرب عطا فرماتے ہیں اور فرشتوں کے سامنے ان پر فخر فرماتے ہیں اور استفسار فرماتے ہیں: میرے بندے کیا چاہ رہے ہیں؟

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عرفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا فرما رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی بدک گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے اس کی مہار چھوٹ گئی۔ آپؐ نے ایک ہاتھ سے اس کی مہار کو پکڑ لیا جبکہ دوسرا ہاتھ بدستور دعا کے لئے اٹھائے رکھا۔[2]

حضرت عمرو بن شعیب رضی اللہ عنہ اپنے والد سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: خیر الدعا دعاء یوم عرفة وخیر ماقلت انا والنبیون من قبلی لا الٰه الا اللّٰه وحدهٗ لا شریک له له الملک وله الحمد وھو علی کل شیء قدیر[3] بہترین دعاء عرفہ کی دعاء ہے اور وہی دعا بہترین ہے جو میں نے اور مجھ سے پہلے نبیوں کی تھی۔ لا اله الا اللّٰه وحده لا شریک له له الملک وله الحمد وھو علی کل شیئ قدیر.

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ الاذکار میں فرماتے ہیں کہ اس ذکر اور دعاء کا بہ کثرت ورد کرنا چاہیے اس دن خصوصیت سے دعا کرنی چاہیے کیونکہ یہ دن دعا کے لئے سال بھر میں سب سے افضل ترین ہے۔ یہی دن ایام حج میں اہم ترین اور مقصود ترین ہے لہٰذا انسان کو چاہیے کہ اس دن یکسو ہو کر ذکر خداوندی، دعا اور قرأت قرآن کریم میں مشغول رہے۔ تنہا بھی اللہ کا ذکر کرے اور جماعت کے ساتھ بھی۔ اپنے لئے بھی دعا کرے، والدین کے لئے، عزیز واقارب، مشائخ کرام، شریک دوست احباب اور ہر اس شخص کے لئے دعا کرے جس نے کبھی بھی اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیا ہو۔ اور اس دن دعاء میں کمی کوتاہی سے مکمل پرہیز کرے کیونکہ اس کا تدارک ممکن نہیں ہے۔

ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ لا اله الا اللّٰه وحده لا شریک له توحید وثناء ہے دعا نہیں ہے اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ توحید وثناء دعا کے قائم مقام ہے۔ حدیث ضعیف میں یہ بھی وارد ہے۔ من شغله ذکری عن مسألتی اعطیته افضل ما اعطی السائلین. "جو شخص مجھ سے

---

[1] [نسائی ۵/۲۵۸] [2] [نسائی ۵/۲۶۰] [3] [ترمذی ۵/۳۵۷۹]

مانگنے کی بجائے میرے ذکر ہی میں مشغول رہے تو میں اسے مانگنے والوں سے بہتر عطا کرتا ہوں۔"

عرفات سے واپسی

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفات سے نکلے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اونٹنی قصواء کی مہار کھینچی ہوئی تھی حتی کہ اس کا سر کجاوے میں پاؤں رکھنے کی جگہ تک پہنچ رہا تھا۔ جب بھی اونچائی آتی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مہار ڈھیلی فرما دیتے اور وہ اس بلند جگہ چڑھ جاتی حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزدلفہ تشریف لے آئے۔[1]

بخاری شریف میں مذکور ہے: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذرا تیز چل رہے تھے اور جب کھلا میدان آتا تو مزید تیز ہو جاتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وادی محسر میں تیز ہو گئے تھے۔ نیز یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو حکم فرمایا تھا کہ اطمینان سے چلو اور فرمایا: ایھا الناس علیکم بالسکینة فان البر لیس بالا یضاع[2] "اے لوگو! اطمینان سے چلو! تیز چلنا نیکی نہیں ہے۔"

مزدلفہ میں مغرب اور عشاء اکٹھی ادا کرنا

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرفات سے نکلے اور ایک گھاٹی میں اتر کر پیشاب فرمایا پھر وضو فرمایا لیکن مکمل وضو نہیں کیا، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الصلوۃ امامک نماز آگے چل کر پڑھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزدلفہ تشریف لائے اور مکمل وضو فرمایا۔ پھر اقامت کہی گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز مغرب ادا فرمائی۔ پھر ہر شخص نے اپنی سواری کو اپنے پڑاؤ کے قریب باندھا پھر نماز کی اقامت کہی گئی اور نماز (عشاء) ادا کی گئی۔ ان دونوں نمازوں کے دوران کوئی (نفلی یا سنت) نماز ادا نہیں کی گئی۔[3]

مزدلفہ میں جمع بین المغرب والعشاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ جمع حج کی وجہ سے ہے یا مطلق سفر کی وجہ سے ہے یا سفر طویل کی وجہ سے ہے؟ وہ حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ جمع نسک کی وجہ سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اہل مکہ، اہل منی، اہل مزدلفہ اور اہل عرفات تمام جمع کریں گے اور جو حضرات یہ فرماتے ہیں کہ یہ جمع مطلق سفر کے لئے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اہل مزدلفہ کے سوا تمام لوگ جمع کریں گے اور جو حضرات فرماتے ہیں کہ سفر طویل کے لئے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اہل مکہ، اہل منی، اہل عرفات، اہل مزدلفہ اور تمام وہ لوگ مکمل نماز ادا کریں گے جن

---

[1] [مسلم ۱۸۶/۸] [2] [عمدۃ القاری ۹/۱۰] [3] [عمدۃ القاری ۹/۱۰]

کے اور مزدلفہ کے درمیان مسافت قصر نہ ہو۔ اور لمبے سفر والے قصر کریں گے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اہل علم کے نزدیک اس حدیث پر عمل استحباباً ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ مغرب کو بغیر جمع کے پڑھ ہی نہیں سکتے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر مزدلفہ آنے سے پہلے یہ نمازیں پڑھیں تو اعادہ واجب ہے چاہے غیوب شفق سے پہلے پڑھی ہو یا بعد میں، اس کے ذمے ضروری ہے کہ مزدلفہ آکر طلوع فجر سے پہلے ان کا اعادہ کرے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں بلا عذر مغرب کو نماز عشاء کے وقت سے پہلے بغیر جمع کے ادا نہیں کر سکتا۔ اگر عذر کے ساتھ انہیں ادا کر لیا تو غیوب شفق تک انہیں جمع نہیں کیا جا سکتا۔

جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایسا کرنے کو افضل قرار دیتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو اگر مغرب کے وقت جمع کرنا چاہیں یا عشاء کے وقت ادا کرنا چاہیں عرفات میں ادا کرنا چاہیں یا کسی اور وقت ادا کرنا چاہیں یا دونوں نمازوں کو اپنے وقت پر ادا کرنا چاہیں یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔ یہی امام اوزاعی، امام اسحاق، امام ابو یوسف، حضرت عطاء، حضرت عروہ، حضرت سالم، حضرت القاسم اور حضرت سعید بن جبیر رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔

مزدلفہ میں مغرب اور عشاء ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کی جائے گی۔ یہی علی الاصح امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا مسلک ہے۔ جبکہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک اذان اور ایک اقامت سے ادا کی جائیں گی اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ ہر نماز کے لئے الگ اذان اور الگ اقامت کہی جائے گی۔ اور نمرہ میں نماز ظہر وعصر کو ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ یہی امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک ہے جیسے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث میں ایک اذان اور دو اقامتوں کا ذکر ہے۔ جبکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ ہر نماز کے لئے الگ اذان اور الگ اقامت کہی جائے گی۔

کیا مزدلفہ میں دونوں نمازوں کے درمیان تسبیحات پڑھی جائیں گی؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حجۃ الوداع والی حدیث میں مذکور ہے کہ یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مزدلفہ تشریف لائے اور مغرب وعشاء کی نماز ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا فرمائی اور ان دونوں کے درمیان تسبیحات نہیں پڑھیں۔[1] پھر طلوع فجر تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرما ہوئے۔ حضرت عبدالرحمٰن ابن یزیدؒ فرماتے ہیں: حضرت عبداللہؓ نے حج ادا کیا۔ ہم عشاء کی اذان کے وقت یا اس کے قریب

---

[1] [مسلم ۸/۱۸۷]

قریب مزدلفہ پہنچے۔ آپ ﷺ نے ایک شخص کو حکم دیا۔ جس نے اذان واقامت کہی۔ پھر آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھی اور دو رکعتیں ادا کیں۔ پھر رات کا کھانا تناول فرمایا۔ پھر ایک شخص کو حکم فرمایا جس نے اذان واقامت کہی پھر آپ ﷺ نے عشاء کی دو رکعتیں ادا فرمائیں...... اس حدیث کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ میں نے آپ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔[۲]

بہر حال اس بارے میں اختلاف ہے کہ آپ ﷺ نے مزدلفہ کی دونوں نمازوں کے دوران کوئی نماز ادا فرمائی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جیسے آنحضرت ﷺ نے عرفات میں دونوں نمازوں کے درمیان مزید کوئی نماز ادا نہیں کی اسی طرح اس پر قیاس کرتے ہوئے مزدلفہ میں بھی دونوں کے درمیان مزید نماز نہیں ادا کرنی چاہیے۔ ان دونوں میں جامع یہ ہے کہ یہ دونوں ہی محرم کے حق میں حج کے سبب مکان مخصوص یعنی عرفات ومزدلفہ میں واجب ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ دو دو فرضوں کے درمیان کوئی نفلی نماز نہیں ہونی چاہیے۔ اور ان دو دو نمازوں کو ایک اذان اور ایک ہی اقامت سے ادا کرنا چاہیے۔

کمزوروں کو آگے بھیجنا

ضعیف سے مراد، عورتیں بچے اور بوڑھے ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن حبانؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنی ہاشم کے کمزوروں اور بچوں کو رات ہی کے وقت آگے بھیج دیا تھا۔ اور ان کے ساتھ بیمار لوگ بھی چلے گئے کیونکہ ان کے لئے ہجوم کی صورت میں نقصان کا خطرہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں آپ ﷺ نے مزدلفہ کی رات اپنے گھر کے کمزور لوگوں کے ساتھ آگے بھیج دیا تھا۔ حضرت الفضل سے بھی مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بنی ہاشم کے کمزوروں کو حکم دیا تھا کہ وہ مزدلفہ سے رات ہی کے وقت نکل جائیں[۲] حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا: مجھے آنحضرت ﷺ نے اپنے گھر کے کمزور لوگوں کے ساتھ بھیجا ہم نے صبح کی نماز منیٰ میں ادا کی اور رمی کی۔[۳]

مزدلفہ میں رات ٹھہرنے کا حکم

مزدلفہ میں رات گذارنے میں سلف صالحین کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام احمدؒ کا مسلک اور امام شافعیؒ کا ایک قول یہ ہے کہ مزدلفہ میں رات کا قیام واجب ہے، رکن نہیں ہے۔ لہٰذا جو

---

[۱] [عمدۃ القاری ۱۰/۷۳]   [۲] [نسائی ۵/۲۶۸]   [۳] [نسائی: ۵/۲۷۳]

اسے ترک کرے گا اس پر دم لازم ہو جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: "فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ"۔ [بقرہ ۱۹۸]

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: من صلی صلواۃ الغداۃ ھا ھنا معنا وقداتی عرفۃ قبل ذلک فقد قضی تفثہٗ وتم حجہ جس نے ہمارے ساتھ یہاں فجر کی نماز ادا کی اور اس سے پہلے وہ عرفات بھی پہنچا تھا تو اس نے میل کچیل دور کر لیا اور اس کا حج مکمل ہو گیا۔ ان دلائل سے وجوب ہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی آیت یا حدیث میں اس کے رکن ہونے کی تصریح نہیں ہے ویسے بھی اگر کوئی شخص مزدلفہ میں رات گذارے اور وہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے اور فجر کی نماز میں حاضر ہو تو بھی اس کا حج ادا ہو جائے گا لہٰذا مذکورہ بالا آیت وحدیث سے یا وجوب ثابت ہوتا ہے اور یا صرف فضیلت واستحباب۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول یہ ہے کہ وقوف مزدلفہ سنت ہے ور یہ رات کے دوسرے نصف کے کسی بھی گھڑی میں حاصل ہو سکتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بھی مروی ہے کہ مزدلفہ میں اترنا واجب اور وہاں رات گذارنا سنت ہے۔ احناف کے نزدیک اگر صبح کے بعد بلا عذر وقوف مزدلفہ چھوڑ دا تو دم لازم ہو جائے گا۔ اور اگر بھیڑ کے عذر کے سبب جلدی منیٰ چلا گیا تو کچھ بھی ذمہ میں لازم نہیں ہوگا۔ اور آیت کریمہ میں ذکر کا حکم ہے نہ کہ وقوف کا۔ مزدلفہ میں وقوف کا وقت یوم نحر کی طلوع فجر سے خوب روشنی پھیلنے تک ہے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت عمرو بن میمونؓ سے مروی ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مزدلفہ میں فجر کی نماز پڑھی پھر کھڑے ہو کر فرمایا: مشرکین طلوع فجر سے پہلے نہیں جاتے تھے وہ کہتے تھے اشرق ثبیر۔ جبکہ آپ ﷺ نے ان کی مخالفت فرمائی۔

تلبیہ کب بند کیا جائے

رمی جمرۃ العقبہ کے بعد تلبیہ کہنا بند کیا جاتا ہے۔ البتہ دسویں ذی الحجہ کی شب تک برابر تلبیہ جاری رہے گا۔ دلیل اس کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: وہ فرماتے ہیں کہ عرفہ سے مزدلفہ تک حضور ﷺ کے ردیف میں اسامہ بن زیدؓ ہوتے، اور مزدلفہ سے منیٰ تک فضل بن عباسؓ ہوتے، یہ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ حضور ﷺ جمرۃ عقبہ کی رمی تک برابر تلبیہ پڑھتے رہے۔[1]

---

[1] [عمدۃ القاری ۱۰/۲۴]

ھدی کے جانور پر سواری کا حکم

ضرورت کے موقع پر ہدی کے جانور پر سواری کرنا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا قول بھی یہی ہے البتہ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ایک قول میں عدم جواز اور دوسرے قول میں جواز ہے۔ احناف اور شوافع کہتے ہیں کہ سواری کی وجہ سے اگر اس میں نقص پیدا ہوا تو اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہے۔ جواز کی دلیل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو قربانی کے لئے مکہ مکرمہ کی طرف اونٹ لے جاتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بدنہ (قربانی کا اونٹ) ہے آپؐ نے فرمایا اس پر سوار ہو جاؤ۔ اس نے کہا: یہ بدنہ ہے آپ نے فرمایا تیرا ناس ہو سوار ہو جا۔[1]

حج تمتع

ارشاد خداوندی ہے۔ "فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ أَهْلُهُ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" [البقرہ:۱۹۶]

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسجد حرام میں حاضرین سے مراد اہل مکہ اور وہ لوگ ہیں جو میقات کے اندر رہتے ہیں چنانچہ امام صاحبؒ کے نزدیک ان کے لئے حج تمتع اور قران مکروہ ہے اگر یہ لوگ تمتع یا قران کریں گے تو ان پر اس کی تلافی کیلئے دم واجب ہو جائے گا۔ اور میقات سے باہر سے آنے والے کے لئے تمتع وقران مستحب ہے۔ یہ بھی قربانی کریں گے مگر یہ دم دم جبر نہیں بلکہ دم شکر ہوگا۔ تمتع کرنے والے دو طرح کے ہوتے ہیں ایک یہ کہ قربانی کا جانور اپنے ساتھ مکہ مکرمہ لے جائے تو یہ جانور کو قربان گاہ میں قربان کرنے سے پہلے حلال نہیں ہوگا دوسرا وہ ہے جو جانور ساتھ لیکر نہ جائے تو وہ عمرے سے فارغ ہو کر حلال ہو جائے گا۔ پھر حج کے لئے دوبارہ احرام باندھے گا۔

حج تمتع: یہ ہے کہ اشہر حج میں عمرہ اور حج کو جمع کرے، یعنی عمرہ بھی کرے اور حج بھی اگر مکہ کا رہنے والا نہ ہو۔ متمتع اگر قربانی کے لئے جانور نہ پائے تو روزے رکھے، تین ایام حج میں اور سات اپنے وطن لوٹنے کے بعد، امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ساتویں، اٹھویں اور نویں ذی الحجہ کو یہ روزے رکھنا افضل ہے۔ اگر دس ذی الحجہ سے پہلے روزہ نہیں رکھ سکا تو اب روزہ نہیں رکھے گا بلکہ اس پر دم واجب ہو جائے گا امام صاحبؒ کے نزدیک۔

---

[1] [عمدۃ القاری ۱۰/۲۴]

حضرت سالمؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حجۃ الوداع میں تمتع کیا، اور قربانی کا جانور ساتھ لے گئے۔ مقام ذوالحلیفہ سے سوق ہدی فرمایا۔ پہلے آپؐ نے عمرہ کا احرام باندھا، پھر حج کا احرام باندھا تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیروی میں تمتع کیا۔ بعض حضرات اپنے ساتھ ہدی کے جانور لے گئے تھے بعض نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب مکہ پہنچے تو فرمایا۔ لوگو! جو لوگ قربانی کے جانور اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں وہ حج مکمل ہونے تک حالت احرام میں رہیں گے اور جو لوگوں ہدی لے کر نہیں آئے ہیں ان کو چاہئے کہ طواف وسعی کرنے کے بعد سر مونڈوا کر حلال ہو جائیں، پھر حج کیلئے دوبارہ احرام باندھیں اور جن کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش نہیں ہے وہ تین روزے ایام حج میں اور سات روزے اپنے گھر لوٹنے کے بعد رکھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مکہ پہنچ کر پہلے بیت اللہ کا طواف فرمایا: سب سے پہلے حجر اسود کا استلام کیا: پھر طواف شروع فرمایا۔ شروع کے تین چکروں میں تیز تیز کندھے ہلا کر چلے۔ اور باقی چار چکروں میں عام چال چلے۔ طواف کے اختتام پر مقام ابراہیمؑ پر آ کر دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ پھر صفا کی طرف تشریف لائے۔ صفا مروہ کے درمیان سات چکر لگائے۔[1] اس کے بعد حج کے تمام ہونے تک حالت احرام میں رہے اور دسویں ذی الحجہ کو اونٹ کی قربانی کی، پھر مسجد حرام آ کر بیت اللہ کا طواف کیا۔ پھر حلال ہو گئے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی آپ کی پیروی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرح حج کے ارکان ادا کئے۔

ھدی

ھدی اس جانور کو کہا جاتا ہے جو قربانی کیلئے حرم لے جایا جائے اور وہاں ذبح کیا جائے۔ اونٹ، گائے، بکری وغیرہ جو ایک دو سال یا اس سے زیادہ عمر کا ہو۔ ارشاد نبوی ہے۔ **"لاتذبحوا الامسنة الا ان یعسر علیکم فتذبحوا جذعة من الضان[2]**

اکثر علماء کے نزدیک بھیڑ کا چھ مہینے کا بچہ قربانی میں ذبح کرنا جائز ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے، بھیڑ کے چھ مہینے کا بچہ اچھا اضحیہ (قربانی) ہے۔[3]

نفلی قربانی، حج تمتع اور حج قران پر واجب شدہ قربانی دسویں ذی الحجہ کو ذبح کیے جائیں گے۔ اور اس کے گوشت سے کھانا جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **"فکلوا امنھا"** [الحج:۲۸] حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سو اونٹ اپنے ساتھ مکہ مکرمہ ذبح کرنے کے لیے لے گئے تھے، جن میں سے تریسٹھ اونٹ خود اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے اور باقی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

۱ [عمدۃ القاری: ۱۰/۳]　۲ [مسند احمد ۱۳/۷۲]　۳ [مسند احمد ۱۳/۷۲]

نے ذبح کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج قران کیا تھا اور اس کے گوشت میں سے تناول فرمایا اور شوربے کو نوش فرمایا۔ باقی ہدایا جس وقت چاہے ذبح کرے مگر ذبح حدود حرم میں ہونا چاہیے۔ احرام کی حالت میں شکار کرنے کے دم کے متعلق ارشاد خداوندی ہے۔ "هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ" [المائدہ:۹۵] اور دم احصار کے متعلق ارشاد ہے۔ "حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ" [مَحِلَّهٗ:۱۹۶] اور ہدی کہتے ہی اس کو ہیں جو حرم میں ذبح ہو۔ منیٰ میں کسی بھی جگہ کریں جائز ہے۔ اس لیے کہ وہ منحر ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا افضل ہے۔ اگر خود ذبح نہ کرسکتا ہو تو کسی کو اس کے لیے مقرر کرے۔ کانا جانور یا لنگڑا جانور جو قربان گاہ تک چل کر نہ آسکتا ہو اس کی قربانی کرنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح انتہائی کمزور اور بیمار کو بھی ذبح کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ "اربع لاتجزی العوراء البین عورها والمريضة البين مرضها، والعرجاء البين طلعها، والكسير التي لاتنقى"[1]

کان کٹا اور نابینا بھی جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں بطور خاص کان اور ناک کو بغور دیکھنے کا حکم فرماتے۔[2] اور ایسا جانور بھی قربانی میں ذبح نہیں کیا جائے گا جو پیدائشی طور پر بے کان ہو۔

ہدی کو علامت زدہ کرنے کا حکم

اس بات کو ظاہر کرنے کیلئے کہ یہ قربانی کا جانور ہے۔ اس میں علامت لگانا درست ہے۔ چنانچہ اہل حجاز اونٹ کے کوہان کے دائیں طرف زخم کرکے خون آلود کرتے ہیں اور اہل عراق اس کے گلے میں قلادہ وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔

اشعار افضل ہے یا قلادہ ڈالنا؟

حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اشعار سے گلے میں قلادہ باندھنا افضل ہے۔ مگر صاحب ہدایہ نے فرمایا۔ "لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ" [المائدہ:۲] اور آیت "جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ" [المائدہ:۹۷] ان آیات میں قلادہ ذکر ہے۔ اس لیے اشعار کو قلادہ سے افضل کہنا اچھا نہیں ہے اور اشعار کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہوا ہے اور حدیث میں بھی صیغہ امر کے ساتھ اشعار کا حکم نہیں ہے۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشعار کرنے کا تعلق ہے اس کی کئی

[1] [مسند احمد:۱۲/۸۰] [2] [مسند احمد:۱۴/۷۷]

وجہیں ہوسکتیں ہیں۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے کہا ہے۔ حضور ﷺ کے اشعار کرنے کی وجہ ہدی کے جانور کو مشرکین کی ایذا رسانی سے بچانے کیلئے تھا۔ کیونکہ وہ صرف اشعار کی صورت میں تعرض نہیں کرتے تھے۔ کفار، یہود و نصاریٰ اور مشرکین ہر وقت تاک میں رہتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قلادہ ڈالنا اشعار سے بہر حال افضل ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اشعار کو قلادے پر ترجیح دینے کو مکروہ کہتے ہیں۔ مگر نفس اشعار کو مکروہ نہیں کہتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ میں نے ہدیٰ کے جانور کے گلے میں ڈالنے کیلئے روئی سے قلادہ بنایا تھا۔ اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: حضور ﷺ نے ایک شخص کو قربانی کے اونٹ ہانک کر حرم کی طرف لے جاتے دیکھ کر فرمایا۔ اس پر سوار ہو جاؤ، اس نے کہا یہ بدنہ (قربانی کی گائے یا اونٹ جو حرم میں ذبح کیا جائے) ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ اس پر سوار ہو جاؤ۔ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ اس جانور کے گلے میں قلاوہ ہے اور وہ اس پر سوار ہو کر رسول اللہ ﷺ کیساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

نحر افضل ہے یا ذبح

علماء نے گائے کو نحر کرنے کو جائز کہا ہے البتہ افضل ذبح ہے۔ کیوں کہ ارشاد خداوندی ہے۔ "اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً" [البقرہ:٦٧]

اونٹ میں مستحب نحر ہے۔ مگر ذبح کرنا بھی جائز ہے۔ اونٹ کو اپنے ہاتھ سے نحر کرنا افضل ہے اگر نحر کا طریقہ آتا ہو۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں! جانور کو لیٹے یا کھڑے، باندھے یا بغیر باندھے ہر حالت میں نحر کرنا درست ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ "فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ" [الحج:٣٦]

اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے سات اونٹ کھڑے کر کے نحر فرمایا۔[1]

قربانی کرنے کیلئے اور گوشت تقسیم کرنے کے لیے کسی کو مقرر کرنا بھی جائز ہے۔ دلیل اس کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قربانی کے جانوروں کے ذبح کرنے اور گوشت پر مجھے مقرر فرمایا: اور یہ فرمایا کہ میں قصاب کی اجرت گوشت سے نہ دوں۔

لہٰذا قربانی کے گوشت سے ذبح کرنے والے کو اجرت دینا درست نہیں ہے۔ بلکہ قربانی کرنے والا اپنے جیب سے اس کی اجرت ادا کرے۔ ہاں ذبح کرنے والے کو، گوشت بطور صدقہ یا ہدیہ کے دینا قیاس کے موافق ہے۔

---

[1] [عمدۃ القاری:۱۰/۵۱]

رمی جمار

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دسویں ذی الحجہ کو چاشت کے وقت رمی کی، دوسرے دنوں میں زوال کے بعد کی۔ رمی (شیطان کو کنکری مارنا) کرنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد اور آپ کے عمل کی وجہ سے واجب ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد گرامی ہے۔ ''ارم ولا حرج'' شیطان کو کنکری مارو۔ کوئی حرج نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بڑے جمرے کے پاس تشریف لائے اور اس طرح کھڑے ہوگئے کہ بیت اللہ آپؐ کے بائیں طرف اور منیٰ دائیں طرف ہوگیا۔ اور سات کنکریاں ماریں۔ ہر کنکر مارتے وقت اللہ اکبر کہا۔ رمی جمار مناسک حج میں سے ہے۔ سات کنکریاں مارنا ضروری ہیں۔ اگر نصف سے زیادہ کنکریاں مارنا چھوڑ دیا تو اس پر دم واجب ہوجائیگا۔ اگر نصف سے کم رہ گئیں تو ہر کنکری کے بدلے نصف صاع واجب ہوگا۔ سات کنکریوں کو اس مقام پر رکھنا کافی نہیں ہوگا بلکہ مارنا ضروری ہے اسی طرح اکٹھے ایک دفعہ مارنا جائز نہیں ہوگا۔ چھ اور مارنا واجب ہوگا۔ اور اس چیز سے مارنا جائز ہے جو زمین کی جنس میں سے ہو جیسے پتھر اور ڈھیلا وغیرہ۔ کنکری مارتے وقت اللہ اکبر کہنا مستحب ہے، اگر تکبیر چھوڑ دی تب بھی جائز ہے۔ تکبیر یوں ہے۔ ''بسم اللہ واللہ اکبر'' اس سے شیطان کی ذلت ہوتی ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ رمی کرتے وقت فرمایا کرتے۔ **اللھم اھدنی بالھدی، وقنی بالتقوی واجعل الآخرۃ خیرالی من الاولی**[1] '' اے اللہ ھدی کے ذریعے مجھے ہدایت عطا فرما۔ اور تقویٰ کے ذریعے سے مجھے گناہوں سے بچا، اور میری آخرت کو میری دنیا سے بہتر فرما۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم یہ الفاظ فرمایا کرتے تھے۔ **اللھم اجعلہ حجاً مبروراً، وذنبا مغفوراً، وسعیاً مشکوراً** ابن قاسمؒ کہتے ہیں اگر اللہ اکبر کے بجائے سبحان اللہ کہدے تو کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔

جمرہ عقبہ کے پاس نہیں کھڑے ہونا چاہیے۔ اور باقی دو کے پاس کھڑے ہوکر دعا کرنا چاہیے۔ حضرت سالم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما چھوٹے شیطان کو سات کنکریاں مارتے اور ہر کنکر کے ساتھ اللہ اکبر کہتے۔ اس سے فارغ ہوکر تھوڑا ہٹ کر قبلے کی طرف رخ کرکے دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا فرماتے۔ پھر درمیانے شیطان کو مارنے کے بعد اس کے بائیں طرف کھڑے ہوکر قبلے کی طرف منہ کرکے یہاں بھی طویل دعا کرنے میں مشغول ہوجاتے۔ اس کے بعد جمرہ عقبہ کو مارنے کے لئے تشریف لاتے، اس کے پاس نہ کھڑے ہوتے، اور لوٹ جاتے،

اور فرماتے حضور ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے میں نے دیکھا ہے۔[۱] جمرات کو سواری پر سوار ہو، یا پیادہ دونوں حالتوں میں مارنا جائز ہے۔ یہی امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے۔ آپ ﷺ نے دسویں ذی الحجہ کو جمرۂ عقبہ کی سواری کی حالت میں اور باقیوں کی پیدل حالت میں رمی کی، جمرۂ عقبہ کو سوار ہو کر اس لئے مارا کے تا کہ لوگوں کو مناسک سمجھا دیں۔

پہلے رمی، پھر ذبح پھر حلق

ان تینوں سے فارغ ہونے کے بعد بیوی کے علاوہ سب اس کے لئے حلال ہے۔ کیوں کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔ **اذا رمیتم الجمرۃ فقد حل لکم کل شیئی اِلاّ النساء**[۲] جب جمرات کی رمی کر لی تو عورتوں کے علاوہ سب کچھ تمہارے لئے حلال ہے۔ حضور ﷺ کا دوسرا ارشاد ہے۔

اور جب تم نے رمی کرالی اور حلق کرلیا اور قربانی کر لی تو عورتوں کے علاوہ باقی افعال تمہارے لیے حلال ہیں۔[۳] آپ ﷺ سے اسی طرح ترتیب سے کرنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا کہ حضور ﷺ رمی کرنے کے بعد قربان گاہ کی طرف تشرف لے گئے اور اپنے دست مبارک سے تریسٹھ اونٹ ذبح فرمائے، پھر باقیوں کو ذبح کرنے کا حکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا، انہوں نے باقیوں کو ذبح کیا، اس کے بعد آنحضرت ﷺ طواف کے لئے بیت اللہ کی طرف چل پڑے۔[۴]

ذبح حلق سے مقدم ہے۔ حضور ﷺ سے کسی نے دریافت کیا اگر کسی نے ذبح کرنے سے پہلے حلق کیا تو کیا ہوگا؟ فرمایا ''لاحرج لاحرج''[۵]

جمرۂ عقبہ کی رمی کا وقت

رمی کا پہلا وقت دسویں ذی الحجہ کے طلوع فجر کے بعد ہے۔ کیوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے حکم فرمایا کہ میں آپ ﷺ کے گھر والوں کو جو کمزور تھے لے کر چلوں، چنانچہ فجر کی نماز ہم نے منی میں پڑھ کر جمرۃ کی رمی کی۔[۶] البتہ رمی کا مستحب وقت طلوع آفتاب کے بعد ہے۔ چنانچہ حضرت ابن عبداللہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ اپنے بعض گھر والوں کو لے کر تشریف لائے اور طلوع آفتاب سے پہلے رمی کرنے کا حکم دیا۔[۷]

---

۱ [عمدۃ القاری ۱۰/۹۱] ۲ [مسند احمد ۱/۲۳۴] ۳ [دار قطنی ۲/۲۸۲]
۴ [صحیح مسلم/۱۹۸] ۵ [عمدۃ القاری ۱۰/۵۸] ۶ [نسائی ۵/۲۷۳] ۷ [نسائی ۵/۲۷۹]

جمرۃ عقبہ کو مارنے کے تین اوقات ہیں۔ مسنون وقت طلوع آفتاب کے بعد ہے۔ مباح وقت بعد از زوال ہے۔ مکروہ وقت دسویں ذی الحجہ کی طلوع فجر کے بعد ہے۔ بلا عذر رات کے وقت رمی کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ گیارھویں ذی الحجہ کی صبح تک جمرۃ عقبہ کی رمی نہ کی تو اس پر ایک دم واجب ہوگا۔ پہلے دن میں رمی کا وقت صبح صادق کے طلوع کے بعد شروع ہوتا ہے، اور افضل وقت طلوع آفتاب کے بعد ہے۔ اور آخری وقت دوسرے دن یعنی گیارہویں ذی الحجہ کی صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے تک ہے۔

دسویں ذوالحجہ کی فجر سے پہلے رمی کرنا حضرات حنفیہ، امام احمد اور امام اسحاق اور جمہور علماء رحمہم اللہ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اور اس کا اعادہ واجب ہے۔ کیوں کہ اس کے متعلق آپ ﷺ سے روایات تواتر کے ساتھ ثابت ہیں کہ آپ ﷺ نے فجر کی نماز مزدلفہ میں ادا کی۔ پھر روشنی خوب پھیلنے کے بعد منی کی طرف روانہ ہوئے۔ اور چاشت کے وقت جمرہ عقبہ کی رمی کی، البتہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مزدلفہ کی رات اپنے چند گھر والوں کے ساتھ مجھے بھی پہلے بھیج دیا۔ چنانچہ میں نے منی آکر رات رمی کی اور مکہ کو روانہ ہوئی اور فجر کی نماز مکہ میں ادا کی پھر منی کی طرف لوٹی۔ اس روایت کی سند میں ایک روای سلیمان ابن داؤدؒ ہیں۔ اگر سلیمان بن داؤد الدمشقی الخولانیؒ ہیں تو وہ قابل اعتماد ہیں۔ اور اگر سلیمان بن داود دیمانی ہے تو وہ قابل اعتماد راوی نہیں ہے۔ لہٰذا اگر سلیمان بن داؤد الدمشقیؒ ہیں تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات میں سے خصوصیت کے ساتھ صرف حضرت ام سلمہؓ کو اجازت دی اور صرف ان کے لئے رخصت ہو دوسروں کے لئے نہ ہو اور وجہ اختصاص یہ ہوسکتی ہے کہ دسویں ذی الحجہ کا دن ان کے ساتھ گذارنے کی نوبت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے لئے جب چاہے تخصیص فرما سکتے ہیں اور اگر راوی سلیمان بن داوود دیمانی ہو تو یہ روایت ہی معتبر نہ ہوگی۔ البتہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ رات طلوع فجر سے پہلے رمی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مگر افضل ان کے نزدیک بھی طلوع فجر کے بعد رمی ہے۔[1] حضرات شوافع کے نزدیک نصف رات کے بعد رمی کرنا جائز ہوتا ہے۔

رمی، ذبح اور حلق میں تقدیم وتاخیر کرنے کا حکم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ جو شخص حج کے امور میں تقدیم وتاخیر کرلے، اس پر دم واجب ہوگا حضرت ابراہیمؒ، حسن بصریؒ اور قتادہؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ البتہ امام عطاء بن ابی رباح، طاؤسؒ اور مجاہدؒ کہتے ہیں مناسک حج میں تقدیم وتاخیر کرنے میں

---

[1] [اعلاء السنن]

کوئی حرج نہیں ہے چنانچہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول کو اختیار فرمایا، حضرت امام ابوحنیفہؒ، حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص اپنے حج میں سے کسی حکم کو مقدم کرے تو اس کو چاہیے کہ جانور قربان کرے۔ اسی طرح سعید بن جبیرؓ، ابراہیم نخعیؒ اور جابر بن زیدؒ سے بھی اس طرح کی روایات مروی ہیں۔ امام صاحبؒ اس روایت کے متعلق فرماتے ہیں جس سے امام شافعی واحمد رحمہما اللہ استدلال کرتے ہیں، کہ ایک شخص نے خدمت نبوی میں آکر عرض کیا، میں نے رمی جمرۃ سے پہلے طواف زیارت کرلیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "لا حرج" کوئی بات نہیں ہے۔

اس نے کہا: ذبح سے پہلے حلق کرلیا، تو آپ نے فرمایا: "لا حرج" کوئی حرج نہیں۔
پھر اس نے کہا: رمی سے قبل ذبح کرلیا تو فرمایا کوئی حرج نہیں۔[1]

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں یہاں "لا حرج" سے مراد کوئی گناہ نہیں ہے، گناہ کی نفی سے قربانی کی نفی نہیں ہوتی۔

ذبح سے پہلے حلق کرنے میں حضرات فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، چنانچہ امام مالک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ اور حضرات صاحبینؒ کے نزدیک ذبح سے پہلے حلق کرنے پر کوئی فدیہ واجب نہیں ہے کیوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "لا حرج" جبکہ امام ابوحنیفہؒ اور حضرت ابراہیم النخعیؒ کے نزدیک اس پر دم واجب ہو جائے گا۔ اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی فرماتے ہیں اگر وہ حج قران میں ہو تو اس پر دو دم واجب ہوں گے۔ رمی، کے بعد ذبح اور پھر حلق ہے۔

کیوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منیٰ آکر پہلے جمرہ کی رمی کی۔ اس کے بعد قربانی کی پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سر کے دائیں جانب اشارہ کرکے فرمایا۔ "خذ" پھر بائیں جانب بالوں کی طرف اشارہ کرکے کاٹنے کا حکم دیا۔

پھر بالوں کو لوگوں میں تقسیم فرمایا۔[2] بال منڈوانے کی مقدار میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ چنانچہ امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک سر کے سارے بالوں کو حلق کرنا واجب ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمیع سر کا حلق فرمایا تھا۔ اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "خذوا عنی مناسککم" اپنے حج کے احکام مجھ سے حاصل کرو، امام مالکؒ اور امام احمدؒ ایک قول میں اکثر حصے کا حلق کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک چوتھائی سر کے حلق کرنے کو واجب قرار دیتے ہیں اور امام ابو یوسفؒ آدھے سر کے حلق کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تین بال کاٹنا بھی کافی

---

[1] [عمدۃ القاری ۱/۵۹] [2] [مسلم ۹/۵۲]

ہے۔حنفیہ کے نزدیک سارے سر کا حلق افضل ہے۔کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔"اللھم ارحم المحلقین" اے اللہ! حلق کرنے والوں پر رحم کیجئے، حضرات صحابہ نے عرض کیا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قصر کرنے والوں پر بھی تو آپ نے فرمایا۔"اللھم ارحم المحلقین" پھر کہا قصر کرنے والوں پر بھی تو آپ نے فرمایا۔والمقصرین[1] حلق کی افضلیت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں بالوں کو ختم کر کے زینت کو اللہ کی رضا کے لئے ختم کرنا ہے جبکہ قصر میں تھوڑے بال کاٹ کر زینت کو برقرار رکھا گیا ہے جبکہ حج میں زینت سے دور رہنے کا حکم ہے۔البتہ حلق کرنا مردوں کے لئے افضل ہے عورتوں کے لئے نہیں۔

حلق کرتے وقت پہلے دائیں طرف پھر بائیں طرف کاٹنا مستحب ہے، اس طرح قبلہ رو ہونا مستحب ہے اور فارغ ہونے کے بعد اللہ اکبر کہنا اچھا ہے۔اور بالوں کو زیر زمین دبا دینا بہتر ہے۔ایام نحر کے ختم ہونے تک حلق نہ کرنے کی صورت میں دم واجب ہے۔حلال ہونے تک حلق نہ کرنے والے پر دم واجب ہے کیوں کہ یہ امور حج میں سے ہے اور اگر حلق کیا ہی نہیں حتی کہ اپنے گھر واپس لوٹ آیا تو گھر آکر حلق کرے اور قربانی کے لئے جانور حرم بھیج دے۔اسی طرح حلق سے پہلے بیوی کے ساتھ جماع کیا تو پھر اس پر دم واجب ہوگا۔دسویں ذی الحجہ کے دن حلق کرنا افضل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلق کس نے کیا

حضرت معمر العدویؓ کہتے ہیں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالوں کو کنگا کیا کرتا تھا جب آپؐ حج سے فارغ ہوئے اور یوم النحر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلق کرانے کے لئے تشریف فرما ہوئے تو میری طرف نظر فرمائی اور ارشاد فرمایا: معمر! آپ کے ہاتھ میں استرا ہے اور آپ کے نبی آپ کے حوالے۔ میں نے عرض کیا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی مجھ پر بہت بڑی مہربانی اور بہت بڑا فضل وکرم ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہاں: چنانچہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر مبارک کا حلق کیا۔اور حدیبیہ کے سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر کو حلق کرنے کا شرف خراش بن امیہ کو حاصل ہوا۔[2]

باقی جمرات کی رمی کا وقت

حضرت وبرۃ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ میں کس وقت رمی جمار کروں؟ تو فرمایا: اگر تمہارا امیر رمی کرے تو تم بھی رمی کرو، میں نے پھر اپنے سوال کو دہرایا تو فرمانے لگے: ہم ایک طرف ہو کر انتظار کرتے۔جب سورج ڈھل جاتا تو رمی کرتے۔(رمی جمار کے بارے

---

1 [عمدۃ القاری ۱/۶۴] 2 [عمدۃ القاری ۱۰/۸۶]

میں یہ سوال یوم نحر کے بعد کے ایام کے متعلق ہے) جمہور علماء کے نزدیک ایام تشریق میں رمی جمار زوال سے پہلے جائز نہیں ہے اور زوال کے بعد جائز ہے اور ایام تشریق کے آخری دن غروب آفتاب کے بعد رمی کا وقت ختم ہوتا ہے۔

رمی کے بعد دم کے ذریعے سے ہی تلافی ہوسکتی ہے۔ اگر دو تین کنکریاں مارنے سے رہ گئیں تو دوسرے دن مارے اور اس پر ہر کنکری کے بدلے نصف صاع واجب ہوگا۔ اور تین سے زیادہ رہ گئی ہوں تو دم واجب ہوگا۔ ایام تشریق کے پہلے دونوں دنوں میں رمی کا مسنون وقت زوال شمس سے غروب آفتاب تک ہے۔ اور غروب آفتاب کے بعد طلوع فجر تک مکروہ وقت ہے جب طلوع فجر ہو جائے تو ادا کا وقت ہوگیا کیوں کہ ہر دن کی رمی اسی دن کرنا واجب ہے۔ یہ قول امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جبکہ حضرات صاحبین رحمہما اللہ کہتے ہیں: رمی کا وقت ایام تشریق کے آخر تک رہتا ہے۔ اور قضاء کا وقت پورے ایام تشریق میں لہٰذا اگر پہلے دن اور آنے والی رات میں رمی نہ کرسکا تو یہ وقت گذرنے کی وجہ سے قضا ہوگیا۔ تو اس کو قضاء ایام تشریق کے اندر اندر کرسکتا ہے۔ چوتھے دن کے غروب آفتاب کے بعد قضاء کا وقت ختم ہوجائے گا۔ چوتھے دن طلوع فجر سے غروب آفتاب کے درمیان رمی کرنا جائز ہے۔ البتہ زوال سے پہلے مکروہ ہے جبکہ بعد زوال رمی مسنون ہے۔ چوتھے دن کے سورج غروب ہونے کے بعد رمی کا وقت ختم ہوتا ہے۔ کسی کا اختلاف نہیں ہے اگر چوتھے دن کے غروب آفتاب تک رمی نہ کرسکا تو بعد میں نہیں کرسکتا۔ صرف دم سے ہی اس کی تلافی ہوگی۔

رمی کے ایام میں منیٰ میں رات گذارنے کا حکم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حاجیوں کو پانی پلانے کی غرض سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایام منیٰ کی راتوں کو مکہ میں گذارنے کی اجازت طلب فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت دی۔[1] حضرت ابن المنذرؒ نے کہا: ایام تشریق میں رات منیٰ میں گذارنا سنت ہے البتہ ان لوگوں کے لئے رخصت ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اجازت دی ہے چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو مکہ میں رات بسر کرنے کی اجازت حاجیوں کو پانی فراہم کرنے کی غرض سے دی تھی۔ اور اونٹ چرانے والوں کو اجازت دی تھی۔ ان کے علاوہ جو لوگ ایام منیٰ کی راتیں مکہ میں گذاریں تو حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان پر دم واجب ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مسکین کو کھانا کھلانا ضروری ہے اور اگر ساری راتیں منیٰ میں گذار دیں تو جانور قربان کرنا ان کے نزدیک مستحب ہے۔ اور حضرات حنفیہ کے نزدیک کچھ بھی واجب نہیں اگر رمی جمار کے لئے دن کے وقت منیٰ آتے

---

[1] [المبسوط ۴/۶۸]

رہے اور رمی جمار کر کے چلے گئے۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے۔ منیٰ میں رات گذارنا سنن حج میں سے نہیں ہے البتہ یہ کہ اس سے رمی جمار میں اس کے لئے آسانی ہے۔ لہٰذا منی میں رات نہ گذارنے کی وجہ سے کچھ واجب تو نہیں ہوگا۔ البتہ اس کو ترک کرنے کی وجہ سے مکروہ ہوگا۔

منی میں رات گذارنا حاجیوں پر واجب نہیں ہے کیونکہ حضرت عباسؓ کو ایام منی کی راتیں مکہ میں گذارنے کی اجازت ملنا اس کے عدم وجوب کی دلیل ہے۔ اگر واجب ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عباسؓ کو پانی پلانے کی وجہ سے اجازت نہ دیتے، جیسا کہ ترک وقوف عرفہ، ترک وقوف مزدلفہ ترک رمی جمار کی اجازت نہ دی۔

خوشبو لگانے کا حکم

حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک خوشبو کا حکم لباس کے حکم کی طرح ہے۔ لہٰذا لباس حلال ہو جائے تو خوشبو بھی حلال ہوگی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے ہاتھ پھیلا کر فرمایا کہ میں نے اپنے ان ہاتھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوشبو لگائی ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حلال ہو گئے، طواف سے پہلے۔[1] اور امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ نے کہا: خوشبو کا حکم جماع کے حکم کی طرح ہے۔ لہٰذا جب تک جماع حلال نہ ہو خوشبو لگانا حلال نہیں ہوگا۔ استدلال کرتے ہیں حضرت ام قیس بنت محصنؓ کی روایت ہے کہ دسویں ذی الحجہ کی شام کے وقت میں عکاشہ ابن محصن کے پاس گئی انہوں نے احرام کے کپڑے اتار دیے مگر خوشبو نہیں لگائی۔ میں نے کہا: خوشبو کیوں نہیں لگاتے؟ کہنے لگے! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمایا جو شخص اس شام کو بیت اللہ نہ جا سکے تو اس کو چاہئے وہ کپڑے اور خوشبو کو چھوڑ دے۔ لیکن امام اعظم اور امام شافعی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ جمرۂ عقبہ کی رمی اور حلق کے بعد عورتوں کے علاوہ تمام چیزیں اس کے لئے حلال ہیں۔

طواف وداع

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگ حج کے بعد جلد منیٰ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لاینفر احدکم حتی یکون آخر عهده بالبیت**[2] آخر میں بیت اللہ کا طواف کئے بغیر ہرگز نہ لوٹیں۔ البتہ حائضہ عورتوں کیلئے اس میں تخفیف ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ صفیہ بنت حیی طواف زیارت کے بعد حائضہ ہو گئیں۔ تو میں نے اس کا تذکرہ رسول

---

[1] [عمدۃ القاری ۱۰/۹۴] [2] [مسلم ۹/۷۸]

کریم ﷺ کے سامنے کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''أحابستنا هي؟'' کیا وہ ہمیں روکے رکھے گی؟ تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ وہ طواف زیارت کرنے کے بعد حائضہ ہوگئیں ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا ''فلتنفر'' تب تو اس کو لوٹنا چاہیے۔[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کو آخر میں گھر لوٹنے سے قبل طواف وداع کا حکم دیا گیا ہے ہاں البتہ حائضہ عورتوں کیلئے تخفیف ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں طواف وداع واجب ہے اس کو ترک کرنے سے دم واجب ہوگا۔ یہی حضرات شوافع کا قول ہے۔ امام مالکؒ اور داؤد ظاہری نے کہا ہے کہ طواف وداع سنت ہے۔ اس کے چھوٹنے سے کوئی شے بھی واجب نہیں۔ حج کے آخری عمل کے طور پر طواف کا حکم دینا اس آیت کی وجہ سے ہے۔ ''ذٰلِکَ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْب '' [الحج:۳۲]

حضرات حنفیہ کے نزدیک غیر مکی پر طواف وداع واجب ہے، مکہ یا داخل میقات کے اندر رہنے والوں پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ البتہ حنفیہ میں سے امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مکی کے لئے بھی طواف وداع کرنا مستحب ہے کیوں کہ یہ مناسک میں سے آخری عمل ہے۔ جو شخص طواف وداع کئے بغیر چل پڑا۔ تو اگر وہ قریب ہے تو واپس لوٹ کر طواف کر کے چلے، اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو، تو دم ادا کرے، یہ قول امام ابو حنیفہ، امام شافعی رحمہما اللہ اور ایک قول امام احمدؒ کا بھی یہی ہے۔

کسی شخص کو طواف وداع کے بعد اپنے کسی کام کی غرض سے مزید مکہ میں ٹھہرنا پڑا تو امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں اگر یہ ایک مہینہ مزید رہے تو اس پر دوبارہ طواف وداع کرنا واجب نہیں ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اعادہ واجب ہے۔ کیونکہ مکہ میں اس کا آخری عمل طواف ہونا چاہیے اگرچہ ایک دن زائد ٹھہرے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں طواف وداع کے بعد اگر اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خریدے تو اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے۔ ہاں البتہ ایک دن ٹھہرے تو اعادۂ طواف کرے حائضہ اور نفاس والی عورتوں پر طواف وداع واجب نہیں ہے۔ نہ عمرہ کرنے والے پر واجب ہے۔ اس لئے کہ اس کا وجوب صرف حج میں منصوص ہے۔ لہٰذا اسی میں منحصر رہے گا۔

وادی محصب میں ٹھہرنا

محصب، ابطح، بطحا، خیف بن کنانہ، یہ چاروں نام ایک ہی مقام کے ہیں یہ وہ مقام ہے۔ جو معلّٰی کے قبرستان اور منی کے درمیان کشادہ جگہ ہے۔ حضور ﷺ منی سے چلنے کے بعد وہاں

---

[1] [مسلم ۹/۸۰]

ٹھہرے تھے۔ظہر،عصر مغرب اور عشاء کی نمازیں یہی پڑھی تھیں تھوڑی دیر لیٹنے کے بعد سوار ہو کر بیت اللہ تشریف لا کر طواف وداع فرمایا تھا۔اس میں ٹھہرنا مستحب ہے۔ابن عباسؓ نے کہا: محصب میں ٹھہرنا کوئی چیز نہیں ہے بس فقط ایک پڑاؤ تھا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر کے لئے ٹھہرے تھے۔[1]

---

[1] [عمدۃ القاری ۱۰۱/۹]

﴿باب العمرة﴾

عمرے کی فضیلت

حضور ﷺ کا ارشاد گرامی ہے ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ کرنا دونوں کے درمیان گناہوں کے لئے کفارہ ہے۔اور حج مبرور (مقبول) کا بدلہ صرف جنت ہے۔[1]

عمرے کا وقت

عمرے کیلئے کوئی وقت متعین نہیں چنانچہ حج سے پہلے حج کے بعد اور سال کے سارے مہینوں میں عمرہ ہوسکتا ہے۔البتہ، یوم نحر اور یوم عرفہ میں مکروہ ہے۔چنانچہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے قبل الحج عمرہ کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا ''لا باس'' اور فرمایا حضور ﷺ نے حج سے قبل عمرہ ادا فرمایا ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے عبدالرحمن بن ابی بکرؓ کے ساتھ تنعیم کی طرف بھیجا۔میں نے ان کے ساتھ جا کر تنعیم سے عمرے کا احرام باندھا۔[2]

حضرت عائشہؓ کا یہ عمرہ حج کے بعد تھا۔ایک ہی سال میں ایک سے زائد عمرے کرنے کے متعلق حضرات فقہاء کرام کے درمیان اختلاف رہا ہے چنانچہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک مکروہ ہے اور جمہور کے نزدیک مکروہ نہیں ہے مکہ میں مقیم شخص اگر عمرہ کرنا چاہے تو اس کی میقات تنعیم ہے۔اور یہ افضل ہے۔کیونکہ آپ ﷺ نے اس کا امر فرمایا ہے۔عمرہ احرام، طواف، سعی بین الصفا والمروۃ، حلق اور قصر وغیرہ کے اعتبار سے بالکل حج کی طرح ہے۔حضرت یعلی بن امیہؓ کے والد امیہؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ مقام جعرانہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا اور جبہ پہنے ہوئے تھا اور جبہ پر خلوق (ایک قسم کی خوشبو) کا اثر تھا یہ پہلے رنگ لگا ہوا تھا۔اس نے عرض کیا: میرے عمرے کے متعلق آپ کیا حکم فرماتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا، جبہ اتار دو، اور خلوق کا اثر اپنے بدن سے دور کرو، اور رنگ کو مٹا دو، اور پھر جس طرح حج کرتے ہو عمرہ بھی اسی طرح کرو۔[3]

عمرے کے افعال یہ ہیں: عمرے کی نیت سے احرام باندھنا، بیت اللہ کا طواف سات چکروں کے ساتھ، طواف کے بعد مقام ابراہیمؑ کے پاس دو رکعت نماز، صفاء مروہ کی سعی، حلق یا قصر۔

ا [صحیح بخاری:۳۵۱] ۲ [صحیح بخاری/۳۵۳] ۳ [بخاری/۳۵۴]

جو اعمال حج میں واجب ہیں وہ عمرے میں بھی واجب، اور جو حج میں سنت ہیں اس میں بھی سنت عمرہ احرام، فرائض و واجبات سنن و مستحبات، حرام و مکروہات اور مفسدات کے اعتبار سے بالکل حج کی طرح ہے۔ البتہ چند امور میں حج سے مختلف ہے۔ مثلاً عمرے کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں جس میں نہ کرنے کی وجہ سے فوت ہو جائے گا۔ البتہ یوم نحر، ایام تشریق، میں عمرہ مکروہ ہے۔ اس میں وقوف عرفہ نہیں ہے نہ ہی مزدلفہ میں ٹھہرنا ہے۔ اور رمی جمار بھی نہیں ہے نہ اس میں جمع بین الصلواتین ہے خطبہ ہے، نہ طواف قدوم، تمام لوگوں کے لئے اس کا میقات حل ہے۔ بخلاف حج کے۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں: حضور ﷺ تشریف لائے، بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا، طواف کے بعد مقام ابراہیمؑ کے پیچھے دو رکعت پڑھ لی۔ اور صفاء و مروۃ کے درمیان سات چکر لگائے۔

عمرہ کرنے والا کس وقت تلبیہ کہنا بند کردے

آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ عمرہ کرنے والا حجر اسود کے استلام تک تلبیہ کہتا رہے گا۔ چنانچہ عمرہ کرنے والا استلام حجر اسود کے وقت تلبیہ کہنا بند کریگا۔

عمرہ کا حکم

عمرہ سنت ہے واجب نہیں۔ کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اقرع بن حابسؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ کیا حج ہر سال واجب ہے؟ فرمایا: نہیں بلکہ ایک ہی حج واجب ہے۔ ایک حج کرنے کے بعد دوبارہ حج نفل ہوگا۔ اگر میں ہاں کہتا تو ہر سال حج کرنا تم پر فرض ہو جاتا اور تم اس کو سنتے نہ ہی اطاعت کرتے[1] اس حدیث شریف میں واجب نہ ہونے کی صراحت ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی عدم وجوب مصرح ہے۔ اگر اس حدیث کو حجاج بن ارطاۃ کی وجہ سے معطل قرار دیا جائے تو عمرہ کے وجوب کی حدیث بھی ابن لہیعۃ کی وجہ سے معطل ہے جبکہ ابن ارطاۃ علماء کے نزدیک ابن لھیعہ سے مقدم ہیں جب دونوں میں تعارض ہوا تو دونوں قابل استدلال نہ رہے، تو مستدل کے طور پر یہ آیت باقی رہی۔ "وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ [البقرہ:۱۹۶] اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حج و عمرہ مکمل کرو۔ اس میں فرضیت عمرہ ثابت نہیں ہے اگرچہ عمرہ کو واجب کرنے والے حضرات اس آیت سے استدلال کرتے ہیں اس آیت سے وجوب

[1] [مسند احمد ۸۵/۱۱]

عمرہ کا ثبوت اس لئے نہیں ہے کہ یہاں حج کے ساتھ عمرہ کو مکمل کرنے کا جو حکم دیا گیا وہ شروع کرنے کے بعد مکمل کرنے کے لئے ہے نہ کہ ابتداءً وجوب عمرہ کے لئے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ آیت کریمہ "وَ اَقِیْمُو الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُو الزَّکٰوۃَ. [بقرہ:۴۳]

تو آیت سے صرف مکمل کرنے کا حکم ثابت ہوتا ہے چنانچہ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں! آیت کا یہ مقصد ہے کہ جو شخص حج کا یا عمرے کا احرام باندھے تو ان کو مکمل کرنے کے بغیر حلال نہ ہو۔ اور حج مکمل ہوتا ہے دسویں ذی الحجہ کے دن جمرہ عقبہ کی رمی کے بعد طواف زیارت کرنے سے۔ اس کے بعد حلال ہے۔ اور عمرہ مکمل ہوتا ہے طواف کعبہ اور سعی بین الصفاء والمروہ کے بعد۔

صاحب البناء نے الفتح الربانی میں علامہ شوکانیؒ کے حوالہ سے لکھا ہے حق یہ ہے کہ عمرہ واجب نہیں ہے۔ کیونکہ وجوب کے ثبوت کے لئے قطعی الثبوت وقطعی الدلالت دلیل چاہئے جو یہاں نہیں ہے بلکہ عدم وجوب کی دلیل موجود ہے۔ چنانچہ بنی الاسلام علی خمس والی حدیث میں صرف حج ہے عمرہ کا ذکر نہیں ہے اس طرح آیت کریمہ وَ لِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلاً [آل عمران:۹۷] اس طرح "اَتِمُّو الْحَجَّ وَالْعُمْرَۃَ" میں بھی شروع کے بعد تمام کرنے کا حکم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنے عمرے کئے؟

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کتنے عمرے کئے؟ فرمایا: چار (۱) صلح حدیبیہ کے سال ذی القعدہ کے مہینے میں عمرہ ادا فرمایا (۲) مقام جعرانہ میں جس سال مال غنیمت کی تقسیم فرمائی۔ (۳) غزوہ حنین کے موقع پر اس وقت عمرہ ادا کیا میں نے عرض کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کتنے کئے؟ فرمایا: صرف ایک، ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمرے کے متعلق فرمایا: ایک عمرہ اس وقت ادا کیا جس وقت مشرکین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو روکا ایک عمرہ اس کے اگلے سال ایک عمرہ ذی العقدہ ایک حج کے ساتھ۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام عمرے ذی العقدہ میں ہیں سواء اس عمرے کے جو حج کے ساتھ ادا فرمایا تھا۔

---

[1] [بخاری:۳۵۲]

رمضان میں عمرے کی فضیلت

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ایک انصاری صحابیہؓ سے فرمایا: ہمارے ساتھ حج کرنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ کہنے لگی: ہمارا ایک اونٹ تھا جس کے ذریعے فصلوں کے لئے پانی نکالتی تھی اس پر میرے میاں اور میرا بیٹا سوار ہو کر چلے گئے۔ ایک اونٹ ہے اس کے ذریعے میں فصلوں کے لئے پانی نکالتی ہوں۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا رمضان میں عمرہ کرنا، رمضان میں عمرہ کرنا حج کے برابر ہے۔[۱] مسلم شریف کی روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا "**فعمرة فی رمضان تقضی حجة معی**" رمضان المبارک میں عمرہ کرنا میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔"[۲]

طواف کے شروع کے تین چکروں میں تیز تیز چلنا مستحب ہے

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں حضور ﷺ نے شروع کے تین چکروں میں رمل (تیز تیز چلنا) کیا، باقی چار میں عام چال چلے۔[۳] اور دوسری جگہ روایت ہے کہ حضور ﷺ جب عمرہ یا حج کے لئے تشریف لاتے تو پہلے طواف کے شروع میں تین چکروں میں رمل کرتے، پھر باقیوں میں عام چال چلتے، طواف کے بعد دو رکعت ادا فرماتے، اس کے بعد صفا مروہ کے درمیان سعی کرتے۔[۴] رمل کی اصل وجہ بیان کرتے ہوئے ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے مشرکین کے سامنے اپنی قوت کو ظاہر کرنے کے لئے رمل فرمایا۔[۵]

عمرہ کی نیت کے بعد حلال ہونے تک بیوی کے قریب نہ جانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی کرنے سے پہلے اپنی بیوی سے ہمبستری کر سکتا ہے؟

تو فرمایا: رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور صفا مروہ کی سعی کی، آپ ﷺ تمہارے کے لئے بہترین نمونہ ہیں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو فرمایا: صفا مروہ کی سعی سے پہلے ہرگز بیوی کے قریب نہ جائے۔

حضرت سعید بن جبیرؒ فرماتے ہیں ایک مرتبہ ایک شخص اور اس کی بیوی نے عمرے کا احرام

---

۱ [مسلم ۲/۹۱۸] ۲ [مسلم ۲/۹۲۱] ۳ [مسلم ۲/۹۲۱]
۴ [مسلم ۲/۹۲۱] ۵ [مسلم ۲/۹۲۳]

باندھ کر مناسک عمرہ ادا کیئے صرف بال کٹوانا باقی رہ گیا تھا کہ اس نے بیوی کے ساتھ جماع کیا۔ اس کے متعلق حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا، تو فرمایا وہ عورت بڑی شہوت والی ہے۔ آپؓ کو بتایا گیا عورت سن رہی ہے تو ابن عمر رضی اللہ عنہما کو شرم آ گئی اور عورت سے کہا، اھریقی دمًا خون بہا، عورت نے کہا، کس کا؟ فرمایا: اونٹ یا گائے یا بکری ذبح کرو۔[۱]

حج بدل کا حکم

مردے یا مستقل معذور شخص جو حج کرنے پر قادر نہ ہو کے بدلے حج کرنا جائز ہے۔
حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس میں بیٹھا ہوا تھا، ایک عورت آ کر کہنے لگی، میں نے ایک باندی اپنی والدہ کو صدقہ کر دی تھی۔ والدہ کا انتقال ہوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آپ کو مکمل ثواب مل گیا، اللہ تعالیٰ اس کو بطور میراث کے آپ کو واپس عطا کر دیا۔ کہنے لگی: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نے کبھی حج نہیں کیا تھا کیا میں اس کے لئے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا: حجی عنھا"[۲] اس کے لئے حج کرو۔

یہ حدیث مرنے کے بعد اس کے لئے حج بدل کے جواز پر دلالت کر رہی ہے۔
ایک روایت میں ہے قبیلہ بنو خشعم کی ایک عورت نے خدمت نبویؐ میں آ کر عرض کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر حج فرض فرمایا: یارسول اللہ میرے والد انتہائی بوڑھے ہیں سواری پر بیٹھنے کے قابل نہیں ہیں۔ کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟
فرمایا: کر سکتی ہو! یہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا۔[۳] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج کرنے پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں دوسرا اس کے لئے حج بدل کر سکتا ہے۔ البتہ حج کرنے پر قدرت رکھنے والے کی طرف سے حج بدل نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ حج عبادت بدنیہ ہے انسان کے امتحان کے لئے، واجب ہوا ہے اور یہ امتحان وابتلاء بدن کو مشقت میں ڈالنے اور تکلیف اٹھانے سے ہوتا ہے۔ یہ افعال حج کرنے والے کی طرف سے ادا ہوتے ہیں لہٰذا حج کرنے پر قادر شخص کی طرف سے کوئی دوسرا حج کر لے تو ادا نہیں ہوگا۔ البتہ عذر کی حالت جدا ہے اور عذر بھی ایسا ہو کہ وہ مرتے دم تک حج کرنے کی گنجائش نہ رکھتا ہو۔
جس شخص کے لئے حج کر رہا ہے اس شخص کی طرف سے حج کرنے کی نیت کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے۔ امتثال امر کے لئے نیت کا پایا جانا ضروری ہے دوسری بات یہ ہے کہ یہ عبادت ہے اس میں نیابت جاری ہو سکتی ہے۔

---

۱ [بیہقی: ۵/۱۷۲] ۲ [مسلم ۲/۸۰۵] ۳ [مسلم ۲/۹۷۳]

تو حکم دینے والے کی طرف سے حج کرنے کی نیت کرے تا کہ حج اس کی طرف سے ادا ہو جائے اور احرام باندھتے وقت کہہ دے۔ لبیک بحجة عن فلان اگر زبان سے نہ بھی کہے صرف دل سے نیت کرے تب بھی درست ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے دل کے بھید خوب جاننے والا ہے۔

جو شخص کسی میت یا معذور کے لئے حج کرنے کا ارادہ کرے، تو اس کو چاہیے کہ ایسے آدمی کو منتخب کرے جو خود حج کر چکا ہو اور امور حج سے خوب واقف ہو تا کہ اس کا حج کامل طریقہ سے ادا ہو جائے۔ حضرات حنفیہؒ کے ہاں حج بدل کرنے والے کے لئے پہلے حج کرنا ضروری نہیں ہے۔ استدلال کرتے ہیں خثعمیہ کی روایت سے کہ حضور ﷺ نے اس سے نہیں پوچھا کہ تم خود پہلے حج کر چکی ہو یا نہیں بلکہ اس سے فرمایا: اپنے باپ کے لئے حج کرسکتی ہو اگر حج بدل کرنے والے کے لئے پہلے حاجی ہونا تو ضروری ہوتا تو آپ ﷺ اس سے ضرور پوچھتے۔ دیگر ائمہ کے نزدیک حج بدل کرنے والے کے لئے پہلے خود حج کیا ہوا ہونا ضروری ہے۔ ان کا استدلال حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ''لبیک عن شبرمة'' کہتے ہوئے سن کر فرمایا: ''من شبرمة'' شبرمہ کون ہے؟ اس نے کہا میرا بھائی ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: حججت عن نفسک'' تم خود حج کر چکے ہوں؟ کہنے لگا: نہیں کیا۔ تو فرمایا پہلے اپنے لئے حج کرو، پھر شبرمہ کیلئے[1]۔

حج تمتع یا قران وغیرہ میں کوئی جنایت کرنے کی وجہ سے دم واجب ہو جائے تو وہ مامور پر واجب ہوگا۔ اس پر نہیں ہوگا۔ دم تمتع اور دم قران حج وعمرہ دو عبادتوں کی ادائیگی کے شکرانے کے طور پر واجب ہے۔ دم کا وجوب خود اس کی وجہ سے واجب ہو گیا ہے لہٰذا اس کی ادائیگی بھی اسی پر واجب ہوگی۔

غیر کی طرف سے حج کرنے والا اگر وقوف عرفہ سے پہلے اپنی بیوی کے ساتھ جماع کر لے تو نفقہ کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اس لئے کہ وہ تو حج صحیح پر مامور تھا دم بھی خود ادا کرے گا کیونکہ جماع اسی کا فعل ہے۔ لیکن بیماری کی وجہ سے حج نہ کرسکا۔ اور لوگوں کے ساتھ واپس آ گیا، تو یہ ضامن نہیں ہوگا۔ اگر وہ میت کی طرف سے حج کرنے کا دعویٰ کرے اور میت کے ورثاء اس کو جھٹلا دیں تو اس کا قول مانا جائے گا۔ جو رقم بچ جائے۔ اس کو واپس کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ وہ اس کا مالک نہیں ہے جو کچھ رقم اس کو دی گئی تھی وہ حج کیلئے تھی۔ جو بچ جائے اس کو اس کے مالک کی طرف لوٹا دے

---

[1] [سنن ابوداؤد: ۱۶۲/۲]

مالک نے اس کو اس کام کے لئے اجیر مقرر نہیں کیا تھا کہ وہ بطو اجرت اس پر قبضہ کرے۔ کیونکہ اس کی اجرت دینا جائز نہیں ہے جو شخص وصیت کرے کہ اس کے مال سے اس لئے حج کیا جائے تو درمیانہ خرچہ حج مراد ہوگا۔ ایسے شخص کا انتقال ہوا کہ جس پر حج فرض ہو چکا تھا اور اس نے حج نہیں کیا اور نہ ہی حج کی وصیت کی۔ تو اس کے وارثوں پر اس کیلئے حج کرنا واجب نہیں ہے۔ لیکن اگر وارث اس کی طرف سے خود حج کرے گا یا کسی اور سے کرائے تو ادا ہو جائے گا۔

احرام کے منافی امور انجام دینا

حالت احرام میں خوشبو استعمال کرنا منع ہے اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے ہاں البتہ احرام سے پہلے خوشبو بدن پر لگی ہو تو یہ جائز ہے کپڑے پر نہیں۔ کیونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے زعفران یا ورس کے رنگ میں رنگے ہوئے کپڑا محرم کے لئے منع فرمایا ہے۔[1] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: "**لاتطیبی وانت محرم ولا تمسی الحناء فانه طیب**" [2] حالت احرام میں خوشبو مت لگاؤ، اور مہندی بھی استعمال نہ کرو، کیونکہ یہ بھی خوشبو ہے۔"

كفاية الاخيار میں لکھا ہے کہ محرم پر جملہ ممنوعات میں سے خوشبو لگانا بھی ہے بدن میں یا کپڑوں میں ممنوع ہے کیوں کہ یہ خوش عیشی ہے جبکہ حاجی پراگندہ بال اور غبار آلود ہوتا ہے احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہننا بھی ممنوع ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اسی طرح سر کو ڈھانپنا بھی جنایت (خلاف احرام کام) ہے اس لئے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ محرم کس طرح کا لباس پہن لے؟ فرمایا: محرم قمیص، شلوار اور عمامہ وغیرہ نہیں پہن سکتا اور اس شخص کے متعلق فرمایا جس کو اس کے اونٹ نے زخمی کر کے مار دیا تھا۔ "اس کے سر کو مت ڈھانپو" چنانچہ احرام میں سر ڈھانپنا منع ہے۔

اسی طرح سر کے ایک چوتھائی کا بال کٹوانا بھی ممنوع ہے اس لئے کہ ایک چوتھائی کل کا قائم مقام ہے اسی طرح ایک یا دونوں بغلوں کے بال صاف کرنا بھی حالت احرام میں جنایت میں شمار ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ پراگندگی دور کرنا ہے اور جبکہ حج پراگندگی کا نام ہے۔

ناخن کاٹنا بھی جنایت ہے یہ بھی پراگندگی کو دور کرنا ہے۔ البتہ اگر ایک ہی مجلس میں کاٹے تو تمام ناخن ایک عضو شمار ہوں گے۔ اور اگر جدا جدا مجالس میں کاٹے تو ہر عضو کے ناخن مستقل جنایت شمار ہوگی۔

---

[1] [سنن النسائی ۵/۱۴۹] [2] [طبرانی ۲۳/۴۱۸]

لہٰذا ایک مکمل عضو مثلاً سر، یا پنڈلی یا اور کسی عضو پر خوشبو لگائے یا سر کے ایک چوتھائی یا اس سے زائد بال کٹوائے یا پورا دن سر ڈھانپے رکھے، یا پورا دن سلے ہوئے کپڑے پہن لے تو دم کے طور پر ایک بکری ذبح کرنا حضرات حنفیہ کے نزدیک واجب ہوگا۔ اور حضرات شوافع کہتے ہیں واجب نہیں ہے اسے اختیار ہے اور اگر ایک عضو سے کم حصے میں خوشبو لگائی، یا چوتھائی سر سے کم بال کٹوائے یا ایک دن سے کم سلا ہوا کپڑا پہنے رکھا تو معاملہ دم سے صدقہ کی طرف آئے گا۔ اور وہ ہے نصف صاع گندم، کیونکہ یہ مقدار صدقہ کی اقل مقدار ہے جو شریعت نے مقرر فرمائی ہے۔ جیسا کہ فدیہ، کفارہ اور صدقہ فطر وغیرہ میں واجب ہے۔

اگر طواف قدوم یا طواف وداع جنبی حالت میں کیا یا طواف زیارت بے وضو ہو کر کیا تو اس پر ایک بکری ذبح کرنا واجب ہے حائضہ کا حکم جنبی کی طرح ہے اور اگر ان طوافوں کا بحالت پاکی دوبارہ اعادہ کیا تو دم ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ اس نے مناسک کو مشروع طریقے سے ادا کیا اس لئے دم ساقط ہو جائے گا۔ اگر عرفہ سے امام کے چل پڑنے سے قبل غروب سے پہلے مزدلفہ کی طرف چلا تو اس پر بھی دم واجب ہوگا۔ ایک بکری ذبح کرنا پڑے گی۔ لیکن غروب آفتاب سے قبل دوبارہ عرفہ کی طرف لوٹے تو دم ساقط ہو جائے گا۔ اگر امام کے روانہ ہونے کے بعد یا مغرب کے بعد عرفہ کی طرف جائے گا تو دم ساقط نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے فوت شدہ امر کی تلافی نہیں ہوئی۔ اگر طواف زیارت کے تین یا اس سے کم چکر رہ جائیں یا طواف وداع کو چھوڑ دے یا صفا مروہ کے درمیان سعی کو چھوڑ دے یا مزدلفہ کے وقوف کو ترک کر دے تو بھی ایک بکری ذبح کرنا واجب ہو جائے گا۔ وجوب دم کی دلیل حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے ''جو شخص حج کے امور میں سے کسی امر کو بھول جائے یا چھوڑ دے تو اس کو چاہیے کہ جانور قربان کر دے۔[1] اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوب دم میں چھوڑنے والا اور بھولنے والا برابر ہیں دونوں پر دم واجب ہے البتہ فرق یہ ہوگا کہ بھولنے والا گناہ گار نہیں ہوگا اور عمداً ترک کرنے والا گناہ گار ہوگا۔

اگر طواف زیارت اس حالت میں کیا کہ اس کا ستر کھلا تھا۔ تو اس کا اعادہ کرے اگر اعادہ نہیں کر سکا تو اس پر بھی ایک بکری ذبح کرنا واجب ہو جائیگا۔

اگر تمام جمار کی رمی مکمل چھوڑ دے، یا ایک دن کی رمی چھوڑ دے یا دسویں ذی الحج کو جمرۂ عقبہ کی رمی ترک کر دے تو اس سے بھی دم واجب ہوگا۔ اگر پوری نہیں تھوڑی رمی ترک کر دے تو صدقہ دینا واجب ہو جائے گا۔ اسی طرح اپنے بدن کے سات بال بدن کے مختلف حصوں سے کاٹ

---

[1] [دار قطنی ۲/۲۴۴]

دے تو اس پر بھی دم واجب ہو جائیگا۔ اگر طواف وداع کے تین چکر چھوڑ دے تو ہر چکر کے بدلے نصف صاع گندم صدقہ کرنا واجب ہے اگر طواف زیارت جنبی حالت میں کیا تو اس پر ایک بدنہ (اونٹ) واجب ہوگا۔ حائضہ کا بھی یہی حکم ہے۔

بہتر یہ ہے کہ بحالت پاکی اس کا اعادہ کیا جائے تا کہ کامل طور پر یہ ادا ہو جائے۔ اب اگر اعادہ کر لیا تو کوئی دم واجب نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے بوجہ عذر خوشبو لگائی یا سلا ہوا کپڑا پہن لیا یا سر کے بال کٹوا دیئے تو اسے اختیار ہے۔ چاہے ایک بکری ذبح کر دے۔ یا تین صاع گندم چھ مسکینوں میں تقسیم کر دے یا تین دن روزہ رکھے۔ کیونکہ فرمان الٰہی ہے "فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْبِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ" [البقرہ:۱۹۶]

اسی طرح حضرت کعب بن عجرہؓ فرماتے ہیں کہ حدیبیہ میں رسول اللہ ﷺ نے میرے پاس کھڑے ہو کر دیکھ لیا کہ میرے سر سے جوئیں گر رہی ہیں فرمایا: ان سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے؟ میں نے عرض کیا ہوتی ہے فرمایا: بال کٹوا دو (حضرت کعبؓ فرماتے تھے یہ آیت "فمن کان منکم مریضا" میرے متعلق نازل ہوئی) اور تین دن روزے رکھو، یا ایک فرق (تین صاع) چھ مسکینوں میں تقسیم کرو، یا قربانی کرو اگر میسر ہو۔[۱] ایک روایت میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس بکری ہے؟ میں نے عرض کیا نہیں: فرمایا تین دن روزے رکھو، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو فی مسکین نصف صاع گندم کے حساب سے۔[۲]

پھر صدقہ اور روزہ کسی بھی جگہ میں ادا کر سکتا ہے، جبکہ ذبح جانور فقط حرم میں ہی جائز ہے۔ دوسری جگہ جائز نہیں ہے۔ اسی طرح حج میں واجب ہونے والے ہر دم جنایت کو حدود حرم میں ذبح کرنا ضروری ہے اس لئے کہ اس کا ثواب ہونا مخصوص وقت یا مخصوص جگہ کے ساتھ متعلق ہے۔

جو شخص وقوف عرفہ سے پہلے احد السبیلین میں جماع کرے تو اس کا حج فاسد ہوگا اور ایک بکری ذبح کرنا اس پر واجب ہوگا اور باقی ارکان حج کو بھی حسب معمول کرتا رہے گا۔ یہی طرح حکم عورت کیلئے ہے کیونکہ ارشاد خداوندی ہے۔ "فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ" [البقرہ/۱۹۷]

ایک شخص کو حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جس نے حالت احرام میں اپنی بیوی کے ساتھ جماع کیا تھا کہ حج کے باقی امور بھی سرانجام دو اور اپنے وطن لوٹ جاؤ، اگلے سال دوبارہ حج کو آؤ، البتہ یہ اہتمام کرو، کہ جب تم احرام باندھو، تو تم (میاں بیوی) اکٹھے نہ رہو۔ حتی کہ حج کے ارکان مکمل کر لو، اور قربانی کرو۔[۳] اگر وقوف عرفہ کے بعد جماع کر لیا تو حج فاسد نہیں ہوگا۔ کیونکہ حضور ﷺ کا

---

۱ [بخاری/۳۵۹] ۲ [بخاری/۳۵۹] ۳ [بیہقی ۵/۱۶۷]

ارشاد ہے۔ الحج عرفة، الحج عرفة، من أدرک عرفة قبل أن يطلع الفجر فقد أدرک الحج أو تم حجه ا؎ حج عرفہ ہے حج عرفہ ہے جو شخص طلوع فجر سے پہلے پہلے عرفہ کا وقوف کر سکا تو اس نے حج کو پایا۔ یا فرمایا اس کا حج مکمل ہو گیا۔ البتہ وقوف عرفہ کے بعد جماع کرنے پر ایک بدنہ (اونٹ یا گائے) واجب ہوگا کیونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کے متعلق فرمایا تھا جس نے طواف کے علاوہ حج کے تمام ارکان سرانجام دینے کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ جماع کا ارتکاب کیا تھا، کہ حج اس کا مکمل ہے البتہ ایک بدنہ اس پر واجب ہو گیا۔ ۲؎

سر کے بال کٹوانے کے بعد جماع کیا، یا بوسہ لیا، یا شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا یا عضو مخصوص کے علاوہ کسی اور جگہ انزال کیا تو اس پر ایک بکری ذبح کرنا واجب ہے۔ عمرے میں بیت اللہ کے چار چکر لگانے سے پہلے جماع کیا تو اس کا عمرہ فاسدہ ہو گیا۔ باقی امور بھی انجام دے گا۔ پھر اس کی قضاء کرے گا اس پر ایک بکری ذبح کرنا واجب ہے۔ چار چکر کے بعد جماع کا فعل صادر ہوا تو عمرہ فاسد نہیں ہوگا۔ مگر بکری ذبح کرنا پھر بھی ضروری ہے۔

اگر حج قران کرنے والا عمرے کا طواف کرنے سے پہلے جماع کر لے تو اس کا عمرہ اور حج دونوں فاسد ہو گئے۔ اب دو احراموں کی وجہ سے دو بکریاں واجب ہوں گی۔ اور اگر عمرہ کرنے کے بعد وقوف عرفہ سے پہلے جماع کر لیا تو عمرہ اس کا صحیح ہوگا مگر حج فاسد۔ اسی طرح حج قران کرنے والے نے وقوف عرفہ کے بعد حلق سے پہلے جماع کر لیا تو حج کے لئے بدنہ اور عمرہ کے لئے بکری ذبح کرنا اس پر واجب ہو جائے گا۔ اس معاملے میں بھول کر کرنے والا اور عمداً کرنے والا دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ احرام کی حالت یاددہانی کی حالت ہے بھول کا عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔ اسی طرح کسی عورت کے ساتھ نیند کی حالت میں یا بیداری میں زبردستی جماع کیا گیا اس کا حکم بھی یہی ہے۔

شکار کرنے پر جزاء

محرم اگر خود شکار کرے، یا شکار کی طرف نشاندھی کرے، جس کی نشاندھی کی وجہ سے شکاری اس کو قتل کر دے۔ تو دونوں صورتوں میں جزاء واجب ہوگی۔ حالت احرام میں شکار کے حرام ہونے کی دلیل یہ فرمان الٰہی ہے۔ "يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ" [المائدہ:۹۵] اور دوسری دلیل: "وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَادُمْتُمْ حُرُماً" [المائدہ:۹۶]

البتہ سانپ، بچھو، کاٹنے والا کتا، چوہا، کوا اور چیل وغیرہ شکار کے حکم سے مستثنیٰ ہیں

ا؎ [بیہقی ۱۷۳/۵] ۲؎ [بیہقی ۱۷۱/۵]

اور قاتل پر جزا واجب ہونے کی دلیل یہ ہے: ''فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَاقَتَلَ مِنَ النَّعَمِ'' [المائدہ:۹۵]

اللہ تعالیٰ نے مارنے والے پر جزا کو واجب فرمایا: اور نشاندہی کرنے والے پر جزاء واجب ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس نے شکار کے جانور کے امن کو خطرے میں ڈال دیا کیونکہ اس کی زندگی کا بقاء امن میں ہے۔ اس نے شکار کرنے والے کو اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے اس کے امن کو محل خطر میں ڈال دیا۔ گویا یہ بھی قاتل کی طرح ہو گیا۔ دوسری وجہ حضرت ابو قتادہؓ کی روایت ہے وہ ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ شکار کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم میں سے کسی نے شکار کرنے والے کو حکم دیا تھا یا اس کی طرف نشاندھی کی تھی؟ صحابہ نے عرض کیا: نہیں فرمایا: ''فکلوا مابقی من لحمہ'' جو کچھ تمہارے پاس موجود ہے اسکو کھاؤ [مسلم:۲/۵۵۶] نشاندھی کرنے والے پر جزا واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ مدلول (جس کو بتایا جارہا ہے) کو اس کا علم نہ ہو۔ یا اس کی نشاندھی کرنے کی تصدیق کر کے شکار کرلے۔ اگر پہلے سے اس نے خود شکار دیکھا ہے یا نشاندھی کرنے والے کو جھٹلایا۔ اور تیسرے شخص نے اس کی طرف نشاندھی کی جس پر اس کو قتل کر دیا تو پہلے نشاندھی کرنے والے پر جزاء واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح شکاری کے پاس چھری موجود ہو اور شکاری شکار کرنے کے بعد ذبح کرنے کے لئے چھری مستعار لے تو بھی چھری والے پر جزا واجب نہیں ہوگی۔ اور اگر شکاری کے پاس چھری موجود نہ ہو اور محرم اپنی چھری ذبح کرنے کے لئے اس کو دے دے تو اس صورت میں اس پر جزا واجب ہو جائے گی۔

جزاء یہ ہے کہ دو عادل اور ثقہ شخص شکار کی قیمت لگائیں گے۔ قیمت لگانے کے بعد اب اس کو اختیار ہے چاہے اس قیمت کے بدلے جانور خرید کر ذبح کرے یا مسکینوں کو فی مسکین نصف صاع گندم کے حساب سے کھانا کھلائے۔ یا فی صاع کے بدلے روزے رکھے۔ دلیل اس میں اللہ تعالیٰ فرمان ہے۔ ''فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَاقَتَلَ مِنَ النَّعَمِ سے لے کر اَوْعَدْلُ ذٰلِکَ صِیَاماً'' (المائدۃ) تک ہے۔

حضرت قبیصہ بن جابر الاسدیؒ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم احرام باندھ کر حج کے لئے روانہ ہوئے راستے میں ہمارے سامنے ایک ہرن آگیا ہم میں سے ایک صاحب نے پتھر اٹھا کر اس کی طرف پھینکا، اور سیدھا جا کر اس کی کنپٹی پر جالگا، اور وہیں ہمارے سامنے گر کر مر گیا، ہم مکہ آگئے۔ اور سارا قصہ ان کو بتایا، تو انہوں نے اس شخص سے کہا: ایک بکری خرید کر ذبح کرو، اور اس کا گوشت دوسروں کو کھلا دو، یا فرمایا اس کا گوشت صدقہ کر دو اور کھال کو مشکیزہ بنالو۔ ان کے پاس سے باہر آکر میں نے اپنے ساتھی سے کہا: ابن خطاب کا فتوی تم کو اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ اے ابن

خطاب سے پوچھنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خود پتہ نہیں چلا حتیٰ کہ انہوں نے اپنے پاس والے سے پوچھا لہذا تم اپنی اونٹنی کو ذبح کرلو اور اب اس کے گوشت کو صدقہ کرو اور شعائر اللہ کی تعظیم کرو۔

اس نے یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتا دیا، مجھے اس سے اندیشہ ہوا کہ کہیں مجھے کوڑے نہ ماردیں۔ انہوں نے فرمایا، اللہ تعالیٰ تجھے ماردے تم فتویٰ کو نہیں مانتے اور حالت احرام میں قتل کے مرتکب ہو رہے ہو۔ اور یہ بھی کہتے ہو۔ اللہ کی قسم: عمر نے نہیں سمجھا حتیٰ کہ انہوں نے اپنے پاس والے سے پوچھا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ ''یحکم به ذوا عدل منکم'' دو عادل آدمی ان کے متعلق فیصلہ دیں اور فرمایا گیا ہے۔

پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا! میں تمہیں فصیح اللسان اور کشادہ سینہ والا پاتا ہوں بعض دفعہ ایک انسان میں دس خصلتیں ہوتی ہیں جن میں سے اچھے اخلاق اور ایک بری صفت ہوتی ہے۔ مگر یہ بری صفت ان تمام اچھی صفات کو فاسد کر دیتی ہے۔ تم اپنے آپ کو جوانی کی آفتوں سے بچا کر رکھو، ایک روایت کے مطابق فرمایا جوانی کی لغزشات سے بچتے رہو۔[1]

جزاء میں مثل صوری اور مثل معنوی واجب ہے۔ فرمان تعالیٰ ہے۔ ''فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَاقَتَلَ مِنَ النَّعَمِ'' [المائدہ:۹۵] چنانچہ ہرن کے قتل کے بدلے، گوہ اور لومڑی کے بدلے ایک بکری واجب ہے خرگوش کے بدلے بکری کا ایک سال سے کم عمر والا بچہ واجب ہے۔ چوہے کے بدلے چار مہینے والا بکری کا بچہ واجب ہے۔ شتر مرغ کا شکار کرنے پر بدنہ (اونٹ یا گائے) واجب ہے اور جنگلی حمار کے بدلے گائے، یہ ساری چیزیں حدیث سے ثابت ہیں۔

اور ایسی چیز شکار کرے جس کی کوئی نذر وغیرہ نہیں دی جاسکتی جیسے کبوتر، چڑیا، وغیرہ تو ان میں قیمت لگائی جائے گی اور قیمت واجب ہوگی۔ یہ حضرات صاحبین کا قول ہے جو شخص کسی شکار کے جانور کو زخمی کردے یا اسکے بال اکھاڑ دے یا اس کا کوئی عضو کاٹ دے تو اس نقص کا وہ ضامن ہوگا۔ کسی پرندے کے پر اکھاڑے دے یا کسی شکار کے جانور کی ٹانگیں کاٹ ڈالے تو پورے پرندے اور جانور کی قیمت ادا کرنا ضروری ہے انڈے توڑ دینے میں اس کی قیمت واجب ہوگی۔

اور اگر ٹنڈی مار ڈالے، تو اپنے اختیار سے جو بھی صدقہ دیدے دے سکتا ہے۔ شکار کا ہر وہ جانور جو حج افراد کرنے والے پر اس کی جزا میں دینا واجب ہے قارن اور متمتع پر بھی وہی واجب ہے۔

---

[1] [سنن بیہقی ۱۸۱/۵]

احصار

احصار کا معنی ہے روکنا، منع کرنا، امام فراءؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص خوف یا بیماری یا کسی قید میں محبوس ہونے کے سبب سے تمام عمر حج وعمرہ سے قاصر ہو جائے اہل عرب اس کو محصر (روکا ہوا) کہتے ہیں محرم دشمن یا بیماری، یا زادراہ کے ختم یا چوری یا تلف ہونے کی وجہ سے حرم نہیں پہنچ سکا، تو وہ ایک بکری حرم بھیج دے کہ وہ حرم میں ذبح ہو یا بکری کی قیمت بھیج دے اس کے ذریعے وہی جانور خرید کر ذبح کیا جائے اور جانور ذبح ہونے کے بعد حلال (احرام سے نکلنا) ہو جائے گا دلیل اس کی یہ آیت ہے۔ ''فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ'' [البقرہ:۱۹۶] چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ ۶ ہجری کو عمرہ کے لئے احرام باندھ کر چلے تو حدیبیہ کے مقام میں مشرکین نے ان کو حرم پاک جانے سے روک دیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے ساتھ صلح کی اور جانور حرم میں ذبح کرا کر حلال ہوئے اور آئندہ سال اس کی قضاء کے لئے آئے اور عمرہ کیا۔ چنانچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت ان کے حق میں نازل ہوئی ہے۔

لہٰذا ہر وہ شخص جو حج یا عمرہ کے لئے احرام باندھے اور کسی وجہ سے بیت اللہ پہنچنے سے قاصر رہے وہ محصر ہے چاہے کسی بھی سبب سے ہو باقی جو لوگ احصار کو دشمن کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں ان کا قول قرآن کریم کے مخالف ہونے کی وجہ سے نا قابل قبول ہے۔ البتہ امام الکسائیؒ اور ابو عبیدہؒ نے لفظی فرق بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں جو محرم خرچہ ختم ہونے یا بیماری کی وجہ سے بیت اللہ تک پہنچنے سے قاصر رہے اس کو محصر اور جو دشمن کے نرغے میں آنے کی وجہ سے بیت اللہ تک نہ پہنچ سکے اس کو محصور کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے تو اس قول پر تمام اہل لغت کے متفق ہونے کا قول کیا ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار نے حدیبیہ میں بیت اللہ جانے سے جب روک دیا تو حدیبیہ میں آپؐ جانور ذبح کر کے حلال ہو گئے۔ حدیبیہ کا کچھ حصہ حرم میں داخل ہے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہاں ذبح کرنا درست ہے۔ دم احصار کے وجوب پر قرآن کریم کی یہ آیت دلیل ہے۔ ''فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ [البقرہ:۱۹۷]''

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک محصر پر ہدی واجب نہیں ہے وہ استدلال کرتے ہیں! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول سے جس کو دشمن محصور کرے کہ اس پر ہدی واجب نہیں ہے۔ حج اور عمرے کی قضا بھی واجب نہیں ہے اگر وہ ہدی لے کر جا رہا تھا تو اس کے ذبح کے بعد حلال ہو جائے گا۔ اور آیت کریمہ ''فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ'' کو اپنے ساتھ

ہدی کے جانور لے جانے والے محصور پر محمول کرتے ہیں حضرت امام عطاء نے ابن عباسؓ سے عدم وجوب ہدی وحج وعمرہ کا انکار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خود حضرت ابن عباسؓ سے صحیح روایت سے علی بن ابی طلحہؒ سے وجوب قضاء کا قول مروی ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیرؒ نے ابن عباسؓ سے وجوب ھدی اور وجوب قضاء دونوں کی روایت نقل کی ہے اگر ایک مجتہد سے دو متضاد قول مروی ہوں تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو کتاب وسنت کے موافق اور اجماع کے مطابق ہو۔

محصر پر وجوب ہدی کا قول جمہور کا ہے البتہ دسویں ذی الحجہ سے پہلے اسکا ذبح کرنا جائز ہے۔ حج قران کرنے والا دو بکریاں بھیج دے گا۔ جب محصر حلال ہو جائیگا تو اگلے سال اس پر حج وعمرہ ادا کرنا ضروری ہوگا اس کی دلیل یہ آیت ہے۔ ''وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ'' [البقرہ:۱۹۶]

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حج شروع کرنے کے بعد پورا کرنا ضروری ہے پورا کئے بغیر لوٹنے سے قضاء ضروری ہوگی۔ چاہے مکمل نہ کر سکنے میں وہ معذور ہو یا نہ ہو اس لئے کہ جو کچھ واجب ہو چکا وہ عذر کی وجہ سے ساقط نہیں ہوگا۔

تمام علماء کے نزدیک حج کو فاسد کرنے کی وجہ سے جب قضاء واجب ہے تو احصار کی وجہ سے ترک کرنے پر بھی قضا واجب ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے تکلیف کی وجہ سے بال کٹوانے والوں کو معذور تو قرار دیا مگر فدیہ کو معاف نہیں فرمایا۔

تمام علماء کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر مرض کی وجہ سے حج کے ارکان ادا نہ ہوں تو ان کی قضا واجب ہے۔ خلاصہ یہ کہ حج میں داخل ہونے کے بعد اس کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے قضاء کا وجوب معذور اور غیر معذور دونوں میں یکساں ہے، تو یہ صورت محصر میں بھی موجود ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ محصر سے قضاء ساقط نہیں ہوگی۔

عمرہ سے روکے ہوئے کا حکم

معتمر محصر جب حلال ہوگا تو اس کے بدلے ایک عمرہ کرنا اس پر واجب ہوگا۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔ ''وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ فَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ [البقرہ:۱۹۶] کی تفسیر میں حضرت علقمہؒ فرماتے ہیں کہ انسان جب محصور ہو جائے تو ہدی حرم بھیجے وہ وہاں ذبح ہوگی تو یہ حلال ہو جائے گا۔

اگر جلد بازی کر کے ہدی حرم پہنچنے سے پہلے بال کٹوائے گا تو اس پر فدیہ (تین دن کا روزہ

یا صدقہ یا قربانی) واجب ہو جائے گی۔ روزہ تین دن، اگر صدقہ دیا تو چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے، فی مسکین نصف صاع گندم کے حساب سے۔ اور قربانی بکری ذبح کرنا ہے۔

ہدی بھیجنے کے بعد اگر احصار ختم ہو تو کیا کیا جائے؟

محصر کے ذبح کرنے کے لئے ہدی حرم کی طرف بھیجنے کے بعد اگر اسکا احصار ختم ہو جائے تو اگر بھیجی ہوئی ہدی کو پانے کی گنجائش اور حج کرنے پر قدرت ہو تو اس کو چاہیے کہ حلال نہ ہو، اور حج کے لئے جائے کیوں کہ نائب پر عمل کرنے سے پہلے اصل پر عمل کرنا ممکن ہو گیا ہاں البتہ ہدی تک پہنچ سکتا ہو مگر حج نکل جاتا ہو تو جانے میں کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر حج کو پا سکتا ہو اور ہدی کو پانے کی صورت نہ ہو۔ تو حج کو پہنچ جائے۔ کیونکہ اصل پر عمل کرنے پر قادر ہے۔

جو شخص مکہ پہنچنے کے بعد وقوف عرفہ اور طواف زیارت سے محصر ہو گیا۔ وقوف وطواف سے قاصر رہا۔ تو وہ محصر ہے۔ اگر وقوف اور طواف زیارت میں سے کسی ایک کو کرنے پر قادر ہو گیا تو محصر کے حکم میں نہیں ہو گا۔ کیونکہ اگر وہ وقوف عرفہ پر قادر ہو گیا تو حج کے فوت سے محفوظ ہو گیا۔ کیونکہ طواف زیارت وقوف کے بعد ہوتا ہے اگر طواف زیارت سے قاصر رہا تو ٹھہرے اور صبر کرے پھر عمرے کے افعال سے حلال ہو جائے اس پر کوئی دم واجب نہیں ہو گا۔

محصر حلال ہونے کے لئے حلق کرے یا قصر؟

امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک محصر پر حلق واجب نہیں ہے کیونکہ حلق مناسک کی ادائیگی کے ساتھ منسلک ہے ادائے ارکان حج کے علاوہ حلق ثابت نہیں ہے۔

حتیٰ کہ اگر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نفلی حج یا عمرے کے لئے احرام باندھے تو شوہر کے لئے جائز ہے کہ بغیر حلق کے اس کو حلال کر دے شوہر کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے یہ عورت محصر ہے۔ اب اگر شوہر بیوی کے بال کٹوائے بغیر کسی دوسرے طریقے مثلاً اس کو خوشبو لگا کر یا سلے ہوئے کپڑے پہنا کر حلال کر دے تو سب کے نزدیک جائز ہے۔ اگر حلق (تمام بال کٹوانا) واجب ہوتا تو حلق کرائے بغیر وہ حلال نہ ہوتی اور قصر کے واجب نہ ہونے کی دلیل حضورؐ کا حدیبیہ کے سال کا عمل ہے راوی کہتا ہے "نحر هديه و دعا" آپ ﷺ نے جانور ذبح فرمایا اور بال کاٹنے والے کو بلایا۔[1]

آپ ﷺ نے ذبح پہلے اور بال بعد میں کٹوائے، اسی طرح حضرت ابن کی روایت بھی

---

[1] [مسند احمد ۲۱/۱۰۰]

اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ ہم عمرہ کے لئے روانہ ہوئے راستے میں کفار نے بیت اللہ شریف جانے نہ دیا۔ حضور ﷺ نے جانور ذبح کیا پھر سر مبارک منڈایا اسی طرح حضرت عائشہ نے حیض اور نفاس والی عورت کے متعلق آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا تو فرمایا ''انقضی رأسک وامتشطی وأھلی بالحج ودعی العمرة''

اپنے سر کے بال کھول کر کنگھی کرو اور حج کا احرام باندھ لو اور عمرہ چھوڑ دو، حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں ایسا ہی کرتی تھی۔

حضرات طرفینؒ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہ کو عمرے کے افعال مکمل ہونے سے پہلے عمرہ ترک کرنے کا حکم دیا مگر قصر (تھوڑے بال کٹوانے) کا حکم نہیں دیا اس سے ثابت ہوا کہ جس شخص کے لئے مناسک کی ادائیگی سے پہلے حلال ہونا جائز ہے اس پر تحلیق یا تقصیر واجب نہیں ہے۔

اور حضرت امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ محصر پر حلال ہونے کے لئے حلق یا قصر کرنا واجب ہے۔ یعنی ذبح جانور کے بعد حلق یا قصر کر کے ہی حلال ہو جائے گا۔ وہ حضور ﷺ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں۔ جس کو انہوں نے حدیبیہ میں صلح نامہ لکھنے کا فرمایا تھا۔ ''قوموا فانحروا ثم احلقوا'' اٹھو قربانی کرلو، اور سر منڈالو۔[1] یہاں آپ ﷺ نے امر کا صیغہ فرمایا ہے جو وجوب کے لئے آتا ہے۔

ہدی کا محل حرم ہے

ھدی حرم ہی میں ذبح کرنا ضروری ہے حل میں ذبح کرنا صحیح نہیں ہے۔ چاہے وہ دم احصار ہو یا دم جنایت یعنی احرام کے منافی کام کرنے کی وجہ سے ہو یا حج قران یا حج تمتع کرنے والے اپنے ساتھ جانور لے گئے ہوں۔ حج کرنے والا ہو یا عمرہ کرنے والے کے شکار کا بدل ہو۔

تمام کو حرم میں ذبح کرنا واجب ہے۔ اس پر قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات دلالت کر رہی ہیں۔ هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ [المائدہ:۹۵] حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ [البقرہ:۱۹۶] ''ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ'' [الحج:۳۳]

اگر حضور ﷺ کا یہ فرمان ''کل فجاج مکة طریق ومنحر'' مکہ کی ہر گلی راستہ اور قربان گاہ ہے۔'' نہ ہوتا تو ہم ضرور کہتے مذکورہ قربانیاں منی کے علاوہ کسی اور جگہ جائز نہیں ہیں۔''

---

[1] [فتح الباری ۴/۸]

دم احصار کے علاوہ باقی تمام دموں کو حرم میں ذبح کرنے کے وجوب پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔ البتہ دم احصار کے بارے میں اختلاف ہے۔ چنانچہ حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ محصر کے لئے جہاں وہ محبوس ہے وہیں ذبح کرنا جائز ہے چاہے وہ حل ہو یا حرم۔ ان کا استدلال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حدیبیہ کے عمل سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں ذبح فرمایا جہاں آپؐ محصر تھے۔

حنفیہ کے دلائل وہ تمام آیات ہیں جن میں حرم میں ذبح کرنے کا حکم ہے۔ اور ھدی اور بدنہ کے جانوروں کو حرم کے اندر ذبح پر نصوص وارد ہیں۔ مثلاً یہ آیت "ذٰلِکَ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ ○ لَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّھَآ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ" [الحج:۳۳/۳۲]

دوسری آیت "وَ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْھَدْیَ مَعْکُوْفًا اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّہٗ" [البقرہ:۲۵]

یہاں اکثریت کے اعتبار سے فرمایا ورنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ جانے طواف وسعی کرنے کی اجازت دی تھی مگر انہوں نے خود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر طواف نہیں کیا اسی طرح ھدی بھی بعض حرم میں ذبح ہوئیں اور بعض حل میں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ھدی حرم میں ذبح ہوئی جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ ناجیہ بن جندب الاسلمیؓ کہتے ہیں کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا! یارسول اللہ! آپ اپنی ھدی میرے ساتھ بھیج دیں تا کہ میں اس کو حرم لے جا کر ذبح کر دوں چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ہدی میرے ساتھ بھیج دی۔ ایک روایت میں اس طرح ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا تم کس طرح لے جاؤ گے۔ میں نے کہا وادیوں سے گذار کر لے جاؤں گا وہ مجھے نہیں پکڑ سکیں گے۔ چنانچہ میں اس کو اپنے ساتھ لے گیا اور حرم میں لے جا کر ذبح کر دیا اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ہدی حرم میں ذبح کروائی۔ باقی رہے صحابہؓ جنہوں نے حدیبیہ میں ذبح کیا وہ مجبور تھے۔ ان کی ہدایا کو کوئی حرم لے جا کر ذبح کرنے والا نہیں تھا وہیں ذبح کر دیں۔ حضرات حنفیہ ابو حاضر الحمیدیؒ کی روایت سے بھی استدلال کرتے ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ میں اس سال عمرے کے لئے چلا جس سال اہل شام نے حضرت ابن زبیرؓ کا مکہ میں محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اور میری قوم کے کچھ لوگوں نے بھی اپنی ہدایا میرے ہاتھ حرم بھیجی تھیں کہ حرم میں ان کو ذبح کر لوں۔ جب ہم اہل شام جو محاصرہ کرنے والے تھے کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہمیں مکہ جانے نہ دیا تو ہم نے اسی جگہ پر اپنی ہدایا کی قربانی کی اور حلال ہو گئے، میں اگلے سال عمرہ کی قضاء کے لئے مکہ

مکرمہ پہنچا، اور حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر پچھلے سال کے معاملے کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے فرمایا پچھلے سال کے ذبح کردہ ھدی کے بدلے اس سال دوبارہ ھدی ذبح کرو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابہ کو فرمایا تھا جنہوں نے حدیبیہ (حل) میں اپنے جانور ذبح کئے تھے کہ وہ لوگ جنہوں نے حدیبیہ میں ذبح کئے۔ اس سال ان کے بدلے دوبارہ ذبح کریں۔[۱] ابو حاضر یمنیؒ بزرگ ہیں عادل اور ثقہ ہیں۔ اس روایت میں واضح دلیل ہے کہ محصر کے لئے ہدی حرم ہی میں ذبح کرنا واجب ہے اور اگر اس نے حل میں ذبح کیا تو اگلے سال حرم میں ذبح کر کے اس کی قضاء کرے۔

حج اور عمرے میں شرط لگانا

طبریؒ نے حضرت سالمؒ کا قول نقل کیا ہے کہ ابن عمرؓ اشتراط فی الحج کا انکار کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت تمہارے لئے کافی نہیں ہے؟ اگر تم میں سے کوئی محبوس ہونے کی وجہ سے حج کی تکمیل سے قاصر رہے تو اس کو چاہیے کہ (آزادی کے بعد) بیت اللہ کا طواف اور صفا و مروہ کی سعی کر کے حلال ہو جائے پھر اگلے سال حج کرے اور ہدی کا جانور ذبح کرے اگر میسر ہو سکے۔ ورنہ روزہ رکھے۔[۲] امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حدیث حسن صحیح فرمایا ہے۔

ایک شخص نے حضرت ابراہیم نخعیؒ سے حج میں شرط لگانے سے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: ''لیس شرطه بشیئ'' اس کی شرط کی کوئی حیثیت نہیں' امام محمدؒ اس قول کو کتاب الآثار میں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: 'وبه ناخذ'' ہم بھی اسی کو اختیار کرتے ہیں حالانکہ حضرت عمر، عثمان، علی، عمار، ابن مسعود، عائشہ اور ام سلمہ رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے علاوہ دوسرے صحابہؓ نے اشتراط کا قول کیا ہے، ابن عمرؓ کے علاوہ کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا البتہ حضرت ابن عمرؓ کے قول کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حج میں کوئی شرط نہیں لگائی نہ ہی عمرے میں اور صحابہ کو اس کا حکم دیا۔ حالانکہ ضرورت اس کی تھی۔ کیونکہ کوئی انسان عوارض سے خالی نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی عارض لاحق ہونے کے امکانات ہوتے ہیں۔ آپؐ نے صرف حضرت ضباعة بنت الزبیر رضی اللہ عنہا کو حج کی نیت سے شرط لگانے کا حکم دیا۔ چنانچہ امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ کی روایت اپنی صحیح میں ذکر فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضباعة بنت زبیر کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا: لگتا ہے تم نے حج کا ارادہ کر لیا ہے کہنے لگی، اللہ کی قسم! سوائے ایک درد کے اور کوئی مانع نہیں ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا حج کرو اور شرط لگا کر یہ کہہ دو! ''اللهم محلي حيث حبستني'' اے اللہ! جہاں تو مجھے روکے وہی

---

۱ [سنن ابی داؤد: ۱۷۲/۲] ۲ [تفسیر طبری ۱۳۱/۲]

میرے حلال ہونے کی جگہ ہے۔[1]

ہم اشتراط کا بالکلیہ انکار نہیں کرتے البتہ یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں ذبح ھدی کے بغیر حلال ہونا ثابت نہیں لہٰذا شرط لگانا محض اپنے دل کو تسلی دینے کے سوا کچھ نہیں۔

کسی کا حج فوت ہو جائے تو کیا کرے؟

عروہ بن مضرس الطائیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے عرفہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: کیا میرا حج ہو گیا؟ تو فرمایا: جو اس نماز کو ہمارے ساتھ پڑھ لے اور یہاں وقوف کرے، رات یا دن کے وقت عرفہ سے گذر جائے تو اس کا حج مکمل ہے۔[2] امام شعبیؒ نے فرمایا کہ جو شخص عرفہ کا وقوف نہ کر سکا اس کا حج تو نہیں ہے اس کو عمرہ بنا دے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جس شخص نے (نو ذی الحجہ) کو عرفہ کا وقوف کیا اور مزدلفہ میں قیام کیا تو اس کا حج مکمل ہوا جو عرفات کا وقوف نہ کر سکا تو اس کا حج فوت ہو گیا۔ وہ عمرہ سے حلال ہو جائے اور آئندہ سال اس حج کی قضا کرے۔[3]

ہدایہ میں لکھا ہے کہ جو شخص حج کا احرام باندھے اور دسویں ذی الحجہ کے طلوع فجر تک وقوف نہ کر سکے تو اس کا حج چھوٹ گیا البتہ طواف اور سعی کرے اور اگلے سال آ کر قضاء کرے اس پر کوئی دم واجب نہیں ہے۔

یوم عرفہ یوم نحر اور ایام تشریق کے علاوہ تمام سال عمرے کا وقت ہے

سعید بن المسیبؒ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ذی الحجہ کے آخر میں جحفہ سے عمرہ کی نیت کرتیں اور رجب کے مہینے میں مدینہ منورہ سے اور ذوالحلیفہ سے احرام باندھتیں۔ حضرت قاسمؒ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سال میں تین مرتبہ عمرہ ادا کرتیں۔ حضرت مجاہدؒ کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا: ہر مہینے میں عمرہ ہے حضرت نافعؒ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سال میں دو مرتبہ عمرہ ادا کرتے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی اولاد میں سے کسی نے کہا کہ ایک مرتبہ حضرت انسؓ کے ساتھ مکہ مکرمہ میں تھے۔ جب سر میں بال اُگتے تو عمرہ کرتے۔[4]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے تین عمرے ادا فرمائے۔ ایک عمرہ ماہ

۱۔ [صحیح بخاری: ۱۱۵] ۲۔ [النسائی: ۲۶۴/۵]

۳۔ [دار قطنی ۲۴۱/۲] ۴۔ [بیہقی ۳۴۴/۴]

شوال میں، اور دو عمرے ماہ ذیقعدہ میں، حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس سے پوچھا کہ آپ ﷺ نے کتنے عمرہ ادا فرمائے؟ فرمایا: چار: ایک عمرہ ذی القعدہ میں جب مشرکین نے حدیبیہ کے مقام پر آپ ﷺ کو روکا۔ ایک عمرہ اگلے سال ان سے صلح کے بعد، یہ بھی ذی القعدہ میں ہوا۔ ایک عمرہ جعرانہ ہے جو تقسیم غنیمت کے بعد کیا، اور چوتھا عمرہ حج کے ساتھ ادا فرمایا![1]

زیارت نبوی ﷺ کے آداب

زیارت نبوی ﷺ کے دلائل

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے حج کیا، پھر میری وفات کے بعد میری قبر (مبارک) کی زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی۔‘‘[2]

اس کی سند میں حفص بن سلیمانؒ راوی ہیں جو کہ صاحب قرات ہیں ان کے متعلق امام ذھبی رحمۃ اللہ علیہ ’’المیزان‘‘ میں فرماتے ہیں کہ ان کو حدیث میں اتقان اور رسوخ حاصل نہیں ہے لیکن قرآن مجید میں رسوخ حاصل ہے اور اس کو تجوید کے ساتھ پڑھتے ہیں ورنہ وہ فی نفسہ صادق ہیں‘‘

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ’’مابہ بأس، صالح‘‘ یعنی ان میں کوئی حرج نہیں، نیک ہیں‘‘۔ ابن معینؒ کہتے ہیں کہ لیس بثقة، لیس بشیئ ’’یعنی وہ کوئی چیز نہیں (کمزور ہیں) امام وکیع رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ثقہ راوی ہیں امام بخاریؒ نے ان کی تعلیقاً روایت کی ہے اور ان کے شیخ لیث بن ابی سلیمؒ علماء میں سے ایک ہیں۔ امام احمد رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں، مضطرب الحدیث ولکن حدث الناس عنه. ’’یعنی مضطرب الحدیث ہیں البتہ لوگوں نے ان سے حدیث بیان کی ہے۔‘‘

صاحب دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ وہ صاحب سنت ہیں۔ عبدالوارثؒ کہتے ہیں ’’کان من اوعیته العلم یعنی وہ علم کے ظروف میں سے ہیں۔‘‘

حاطب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے میرے انتقال کے بعد میری زیارت کی تو گویا اس نے میری زندگی میں میری زیارت کی، اور جس کا حرمین میں سے کسی ایک میں انتقال ہوا وہ قیامت کے روز آمنین (بے خوف لوگوں) میں سے اٹھایا جائے گا۔[3] امام

---

[1] [صحیح بخاری/۳۵۲] [2] [سنن الدار قطنی ۲/۲۷۸] [3] (ایضا)

ذھبی ''المیزان'' میں لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے فرمایا: **لا یتابع علیہ**

شعبہؒ، سوادؒ سے وہ ہارونؒ سے بایں الفاظ اس کو روایت کرتے ہیں کہ جس نے قصداً میری زیارت کی وہ قیامت کے دن میرے پڑوس میں ہوگا، اور جو حرمین میں سے کسی ایک میں فوت ہوا وہ قیامت کے روز آمنین میں سے اٹھایا جائے گا۔[1]

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے میری قبر (مبارک) کی زیارت کی میری شفاعت اس کے لیے واجب ہوگئی۔ اس کی سند میں موسی بن ہلال العبدیؒ (راوی) ہیں امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ نے تینوں احادیث کے متعلق سکوت اختیار کیا ہے، ان کو ضعیف قرار نہیں دیا۔ ابن عدیؒ کہتے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ اس راوی میں کوئی حرج نہیں ہے ''امام ذھبیؒ'' ''المیزان'' میں رقم طراز ہیں **ھو صالح الحدیث** یعنی وہ صالح الحدیث ہیں امام احمدؒ، فضل بن سہل الاعرجؒ، ابوامیر الطرسوسیؒ اور دیگر حضرات نے ان سے روایت کی ہے۔

ابو حاتمؒ کہتے ہیں کہ یہ مجہول راوی ہیں عقیلیؒ کہتے ہیں کہ ''**لا یتابع علی حدیثہ**'' یعنی ان کی حدیث کا کوئی متابع نہیں ہے۔

زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم

زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مندوب و مستحب ہے جمہور اہل علم کا یہی قول ہے۔ انکی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ ''**وَ لَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَآءُوْکَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰہَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰہَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا**'' [النساء:۶۴]

''اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگیں اور پیغمبر ان کے لئے بخشش مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائیں گے۔''

اس آیت سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور وصال کے بعد بھی نبی اور رسول ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ''**وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ**'' [آل عمران:۱۶۹] جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے ہیں ان کو مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں۔'' انبیاء علیہم السلام تو اس کے زیادہ

---

[1] [میزان الاعتدال ۴/۲۸۵]

حق دار ہیں، کیونکہ شہادت کا مرتبہ نبوت کے مرتبہ سے کم ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔"فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ" [النساء:۶۹] "پس ایسے لوگ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام کیا یعنی نبیوں، صدقین اور شہداء کے ساتھ ہوں گے۔" اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کا مرتبہ نبوت کے بعد تیسرے نمبر پر ہے۔ نیز احادیث صحیحہ بھی وارد ہوئی ہیں جو اس مضمون پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ قشیریؒ، صغانیؒ سے وہ سفیان الثوریؒ سے وہ عبداللہ بن السائبؒ سے وہ زاذانؒ سے وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا "بے شک اللہ عزوجل کے مقرر کردہ فرشتے ہیں جو زمین میں گھومتے پھرتے ہیں میری امت کی طرف سے مجھے سلام پہنچاتے ہیں۔" اب سلام اسی کو پہنچایا جاسکتا ہے جو زندہ ہو۔ حدیث ہذا کے راوی صغانیؒ بھی ثقہ ہیں اور ابن مقسم صدوق ہیں اور ابن السائبؒ اور زاذان بھی ثقہ ہیں اسی طرح امام قشیری سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے میں اس کو سنتا ہوں اور جو مجھ پر دور سے درود پڑھتا ہے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ (اس حدیث کے راوی بھی قابل اعتماد ہیں) حسن بن قتیبہ المدائنی سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز پڑھتے ہیں۔[1] امام مسلمؒ سلیمان التیمی سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذرا تو وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے تھے۔"[2]

امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو مسلمان بھی مجھ پر سلام پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ میری روح کو مجھ پر لوٹاتے ہیں یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔[3] اس حدیث کے راوی بھی ثقہ ہیں)

روح کے لوٹانے کا مطلب یہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ سلام کو سنتے ہیں تو بیدار ہو کر اس کا جواب دیتے ہیں، یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضور ﷺ کی روح مبارک قبض ہو جاتی ہے، پھر ان میں پھونک دی جاتی ہے اور دوبارہ لوٹائی جاتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی وفات حالتِ شہادت میں ہوئی، جیسا کہ امام بخاری اللہ تعالیٰ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ "نبی کریم ﷺ اپنے مرضِ وفات میں فرماتے تھے کہ

---

[1] [میزان الاعتدال ۱/۵۱۸] [2] [صحیح مسلم ۴/۱۸۴۵] [3] [سنن ابی داود ۲/۲۱۸]

''اے عائشہ! جو کھانا (لقمہ) میں نے خیبر میں کھالیا تھا اس کے درد کا اثر میں ہمیشہ سے محسوس کرتا رہا ہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زہر کے اثر سے میری شہ رگ کٹ رہی ہو۔'' [1]

امام احمد اور حاکم رحمہما اللہ نے بھی ابن مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ مجھے نو مرتبہ اس بات پر قسم کا کھانا کہ آنحضور ﷺ شہید ہوئے تھے، اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں اس پر ایک مرتبہ قسم کھاؤں کہ وہ شہید نہیں ہوئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی اور شہید بنایا۔'' [2]

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے ام بشر رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے (حاکمؒ نے اس کی تصحیح کی ہے اور امام ذھبیؒ نے اس کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے) میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آپ ﷺ کی مرضِ وفات کے دن حاضر ہوئی، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے باپ آپ پر فدا ہوں! آپ کس کو موردالزام ٹھہراتے ہیں؟ میں اپنے بیٹے کو متہم نہیں کرتی مگر وہ لقمہ جو اس نے آپ کے ساتھ خیبر میں کھالیا تھا۔ (ام بشر کے صاحبزادے بشر بن براء بن معرورؓ کا آپ ﷺ سے پہلے انتقال ہو گیا تھا) آپ ﷺ نے فرمایا ''میں اس عورت کے علاوہ کسی کو موردالزام نہیں ٹھہراتا اب ایسا محسوس ہوتا کہ میری شہ رگ کٹ گئی ہو۔'' [3]

امام حاکمؒ نے شعبیؒ سے روایت کیا اور حاکمؒ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے اور امام ذھبیؒ نے سکوت اختیار کیا ہے کہ ''خدا کی قسم! رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا: حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو زہر دیا گیا اور حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کو شہید اب ہم ان کے بعد کیا امید رکھیں۔'' [4]

میں (مؤلف) کہتا ہوں کہ شہداء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں، اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں اور وہاں رزق سے بہرہ یاب ہوتے ہیں: جیسا کہ اس آیت قرآنی سے ثابت ہوتا ہے۔ ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ'' [آل عمران:۱۶۹] اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کیے گئے ہیں ان کو مردہ خیال نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس رزق پاتے ہیں۔''

---

1. [صحیح البخاری/۹۱۴] 2. [مستدرک ۳/۵۹]
3. [مستدرک ۳/۲۱۹] 4. [الترغیب والترتیب ۲/۵۰۲]

ایک شاعر کہتا ہے:

تواترت الدلائل والنقول فما یحصی المصنف مایقول
بان المصطفی حی طری هلال لیس یطرقه افول
وأن الجسم منه بقاع لحد کورد لا یدنسه الذبول
وأن الهاشمی بکل وصف جمیل لا یغیره الحلول
وأن الدود لا یأتی الیه کذا الآفات لیس لها وصول

اس بات پر دلائل ونقول اتنے کثیر ہیں کہ مصنف اپنے قول میں انکو شمار نہیں کر سکتا کہ مصطفیٰ ﷺ زندہ تروتازہ ہیں، ایسے چاند ہیں کہ جو غروب نہیں ہوتا، آپ کا جسدِ اطہر لحد مبارک میں اس طرح شگفتہ ہے جس طرح گلاب کا پھول کہ اس کو پژمردگی عیب دار نہیں کرتی، آپ ﷺ ایسے رسول ہاشمی ہیں کہ ہر وصف جمیل سے موصوف ہیں کوئی بات اس کو متغیر نہیں کرتی اور آپ ﷺ تمام آفات وحوادث سے محفوظ ہیں۔''

امام احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، ابن حبان اور حاکم رحمہم اللہ نے اوس بن ابی اوسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے دنوں میں افضل دن جمعہ کا دن ہے اس میں آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور اسی دن ان کی روح قبض ہوئی اسی دن صور پھونکا جائے گا اور اسی دن سب بے ہوش ہوں گے، پس اس دن تم مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ آپ پر ہمارا درود کیسے پیش ہوتا ہے حالانکہ آپ تو آسودہ خاک ہو چکے ہوں گے؟ آپ نے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو کھائے''[1]

امام بن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسناد جید کے ساتھ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر جمعہ کے روز مجھ پر کثرت سے درود پڑھو! کیونکہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور جب کوئی شخص مجھ پر درود پڑھتا ہے تو اس کا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس سے فارغ ہوتا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ وفات کے بعد کیسے پیش کیا جاتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کو کھائے۔''[2]

ان دو حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی قبر مبارک میں اس طرح زندہ ہیں جس طرح شہداء زندہ ہوتے ہیں بلکہ آپ ﷺ کی حیات زیادہ تام اور مکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ

---

[1] [مسند احمد بشرح البناء ۶/۹] [2] [الترغیب والترہیب ۲/۵۰۲]

فرماتے ہیں: ''وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ'' ''جولوگ اللہ کے راستے میں قتل ہو گئے ان کو مردہ خیال ہرگز نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں۔'' [آل عمران:۱۶۹] مصنف ''الفتح الربانی'' امام شوکانیؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ''محققین کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی وفات کے بعد زندہ ہیں اور آپ ﷺ اپنی امت کی طاعات سے خوش ہوتے ہیں اور یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام بوسیدہ نہیں ہوتے جب کہ مطلق ادراک، جیسے علم اور سماع، تمام مردوں کے لیے ثابت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب کوئی شخص اپنے مومن بھائی کی قبر کے پاس سے گذرتا ہے اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کسی آدمی کی قبر کے پاس سے گذرتا ہے جس کو وہ دنیا میں جانتا تھا اور اس کو سلام کرتا ہے تو وہ اس کو پہچانتا ہے اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔ جب شہداء کے حق میں کتاب اللہ کی یہ نص وارد ہوئی ہے کہ وہ زندہ ہیں اور انکی حیات ان کے جسم سے متعلق ہے تو انبیاء ومرسلین کا کیا حال ہوگا؟!

زیارتِ نبوی ﷺ کے آداب

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ ''المجموع'' میں لکھتے ہیں جاننا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک کی زیارت کرنا اہم ترین قربت اور بامراد عمل ہے پس جب حاجی اور عمرہ کرنے والے مکہ معظمہ سے واپس آئیں تو ان کے لیے تاکید کے ساتھ مستحب ہے کہ زیارت روضہ اقدس کے لیے مدینہ منورہ جائیں اور زائر اپنی اس زیارت میں تقرب کی اور مسجد نبوی کے سفر اور اس میں درود شریف پڑھنے کی نیت کرے، روضہء اقدس پر حاضر ہو کر قبر مبارک کی دیوار کی طرف رخ کرے اور قبلہ کی طرف پشت کرے، قبر مبارک کے سر سے تقریباً چار ذراع دور کھڑا ہو اور اس مقام ہیبت وجلال میں اپنی نگاہیں نیچی رکھے، دل دنیا کے علائق سے فارغ ہو اپنے دل میں اس مقام اور صاحب مقام کی عظمت وجلالت کا استحضار رکھے، پھر سلام کہے آواز کو بلند نہ کرے بلکہ میانہ روی اختیار کرے، پھر یہ کہے ''السلام علیک یا سید المرسلین، وخاتم النبین، السلام علیک یا خیر الخلائق اجمعین، السلام علیک وعلی آلک واھل بیتک وازواجک واصحابک اجمعین، السلام علیک وعلی سائر النبیین، وجمیع عباداللہ الصالحین: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ آپ کو ہماری طرف سے بہترین جزا اور بدلہ عطا فرمائے جو ہر نبی اور رسول کو اس کی امت کی طرف سے عطا فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی کامل ترین

۱؎ [مسند احمد بشرح البناء ۶/۱۲۰]

رحمت نازل فرمائے جب تک کہ ذکر کرنے والے آپ کا ذکر کریں اور غافل آپ کے ذکر سے غافل رہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی مکمل ترین رحمت نازل فرمائے جو کہ اس نے تمام مخلوق میں سے کسی پر نازل فرمائی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی مخلوق میں سے بہترین مخلوق ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے پیغام الٰہی (لوگوں تک) پہنچادیا اور امانت کو ادا کیا اور امت کی خیر خواہی فرمائی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا جیسے جہاد کرنے کا حق تھا، اے اللہ! ان کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرمائیں اور اس مقامِ محمود تک پہنچا جس کا تو نے ان سے وعدہ فرمایا ہے اور ان کو اس چیز کی انتہاء عطا فرما جو سوال کرنے والوں کے سوال کے مناسب ہے۔"

اگر کسی نے سلام علی النبی ﷺ کی تاکید کی ہو تو یوں کہے: **السلام علیک یا رسول اللّٰہ من فلان بن فلان، وفلان بن فلان یسلم علیک یا رسول اللّٰہ،** یا اس جیسے الفاظ کہے پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حضور سلام عرض کرنے کے لئے اپنی دائیں جانب ایک ذراع کے بقدر پیچھے کو ہٹے، کیونکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا سر مبارک آنحضور ﷺ کے کندھے مبارک کے پاس ہے، پھر یہ الفاظ کہے، "**السلام علیک یا ابا بکر! صفی رسول اللّٰہ ﷺ وثانیہ فی الغار، جزاک اللّٰہ عن أمة رسول اللّٰہ ﷺ خیراً.** پھر دائیں طرف ایک ذراع کی مقدار پیچھے کو ہٹے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حضور سلام عرض کرنے کے لیے یوں کہے: **السلام علیک یا عمر الذی اعز اللّٰہ بہ الاسلام، جزاک اللّٰہ عن امة نبیہ ﷺ خیراً.**

پھر مواجہہ شریف کی طرف آئے اور اپنے حق میں آپ ﷺ کا توسل اختیار کرے اور اللہ تعالیٰ سے آپ ﷺ کی شفاعت کی درخواست کرے۔

اس سلسلہ میں بہترین الفاظ وہ ہیں جو امام ماوردیؒ، قاضی ابوالطیبؒ اور ہمارے تمام اصحاب نے امام عتبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیے ہیں اور ان کو بنظرِ استحسان دیکھا ہے امام عتبی فرماتے ہیں کہ میں روضہ اطہر پر موجود تھا کہ ایک دیہاتی آدمی آیا اور اس نے یوں کہا: **السلام علیک یا رسول اللّٰہ:** میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک سنا ہے۔"وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْآ اَنْفُسَهُمْ جَآؤُكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا" [النساء:۶۴] "اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے کے بعد آپ کے پاس حاضر ہو کر اللہ سے معافی مانگیں اور پیغمبر (بھی) ان کے لئے بخشش مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا پائیں گے"۔ یارسول اللہ

صلی اللہ علیک وسلم میں بھی اپنے گناہوں کی معافی کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، میں آپ کو اپنے رب کے سامنے شفیع بناتا ہوں، پھر اس نے یہ اشعار کہے:

یا خیر من دفنت بالقاع اعظمه فطاب من طیبهن القاع ولأ کم
نفسی الفداء لقبرانت ساکنه فیه العفاف وفیه الجود والکرم

''اے وہ بہترین انسان جو سب سے عظیم مقام پر مدفون ہے، ان کی وجہ سے تمام مقامات بھی خوشگوار ہو گئے میں اس قبر مبارک پر قربان! جس میں آپ کی ذات سکونت پذیر ہے اور اس میں عفت اور جود وکرم موجود ہیں۔'' امام عتبی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ پھر مجھے اونگھ آ گئی، میں نے خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا اے عتبی! اس دیہاتی سے ملو اور اس کو خوشخبری سنا دو کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی ہے۔''

بہر حال! مذکورہ آیت مبارک پڑھنے کے بعد کہو: میں اپنے گناہوں کی بخشش کروانے کے لئے آپ کے حضور حاضر ہوا ہوں، اپنے رب کی بارگاہ میں آپ کو اپنا شفیع بناتا ہوں، اے رب! میں آپ سے عرض گذار ہوں کہ آپ میری مغفرت فرما دیں جس طرح آپ نے ان کی مغفرت فرمائی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں حاضر ہوتا، اے اللہ! آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو **اول الشافعین، انجح السائلین** اور **اکرم الاولین والآخرین** بنا دیں۔ **برحمتک یا ارحم الرحمین** پھر اپنے والدین، بھائی بہنوں اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا کریں [1]

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''روضہ اطہر کی زیارت مسلمانوں کے درمیان ایسی سنت ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اور ایسی فضیلت والا عمل ہے جس کی ترغیب دی گئی ہے علماء نے مردوں کے لیے زیارت قبور کے استحباب پر اجماع کیا ہے۔[2] امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بریدہؓ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا پس اب قبروں کی زیارت کیا کرو۔[3]

عورتوں کے بارے میں اختلاف ہے البتہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس کی یہ خصوصیت ہے کہ مرد اور عورت دونوں صلوٰۃ وسلام کے لیے حاضر ہو سکتے ہیں، عورتوں کو چاہیے کہ باوقار اور باحیاء طریقہ سے حاضر ہوں اور مردوں کے ساتھ اختلاط سے۔ (حتی الامکان) احتراز کریں۔ اس خصوصیت کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبر مبارک میں حیات ہوتا ہے۔

۱۔ [المغنی ۳/۵۵۸] ۲۔ [کما حکاہ النووی] ۳۔ [صحیح مسلم ۲/۶۷۲]

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو نفع پہنچائیں گے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت کے روز دوسروں کے لیے باعث نفع ہوں گے جب کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت رکھتے ہوں، حتیٰ کہ کافر کو بھی ایک حد تک نفع ہوگا لیکن اس کو جہنم سے نکال کر جنت میں نہیں لے جائیں گے کیونکہ اس سے یہ آیت متعارض ہوتی ہے۔ ”اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ“ [النساء:۴۸] یعنی اللہ تعالیٰ مشرک کو معاف نہیں فرمائیں گے۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابو طالب کا تذکرہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ”شاید کہ قیامت کے روز میری شفاعت انکو نفع دے اور وہ ہلکی آگ میں رکھے جائیں جو ان کے ٹخنوں تک ہو لیکن دماغ ابلتا رہے۔“[۱]

وصلی اللہ علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم

والحمد اللہ رب العالمین

ازقلم ارکان لجنۃ المصنفین لاہور پاکستان

بتاریخ ۲۰ اگست ۲۰۰۶ء بروز اتوار پایہ تکمیل کو پہنچا

---

۱ [صحیح مسلم ۱/۱۹۵]

﴿تأثرات﴾

حضرت مولانا مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم
مہتمم جامعہ حقانیہ ساہیوال ضلع سرگودھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین والصلوة والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وعلی اله وصحبه اجمعین وعلی کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین، امابعد:

یہ ایک واضح حقیقت اور روشن صداقت ہے کہ دین اسلام حق تعالیٰ کا پسندیدہ اور آخری دین ہے اور اس کی تعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہیں، دین اسلام کی بنیاد بلاشبہ حق تعالیٰ کے فرمان اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر ہے، قرآن کریم جو کتاب ہدایت اور حق تعالیٰ کے مقدس ارشادات پر مشتمل نور مبین اور نسخہ شفاء ہے اس کی توضیح وتشریح اور تفسیر کیلئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی اور پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، آپ ﷺ نے اس فریضہ کو باحسن وجوہ سرانجام دیا اور کتاب اللہ کی تلاوت کے ساتھ کتاب وحکمت کی تعلیم بھی امت کو عطا فرمائی۔

اس طرح دین اسلام کا بنیادی ماخذ قرآن وسنت قرار پائے، لیکن بہت سے مسائل ایسے تھے جن کا واضح حکم قرآن وسنت میں موجود نہ تھا۔ لہٰذا امت مسلمہ کی رہنمائی کیلئے ان مسائل کا شرعی حل اجتہاد کے ذریعے پیش کیا گیا، جبکہ بعض احکام حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین اور امت کے اتفاق واجماع سے طے ہوئے لیکن یاد رہے کہ اجماع امت اور قیاس کا ماخذ بھی قرآن کریم اور سنت ہی ہے، کوئی ایسا قیاس یا اجماع جو قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ سے متصادم ہو اس کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

قرآن وسنت کے ساتھ اجماع اور قیاس بھی شریعت کے اصول قرار پانے کی وجہ سے شریعت کے ماخذ چار قرار پائے: قرآن، سنت، اجماع، قیاس۔

قرآن وسنت سے احکام کے استنباط کیلئے چونکہ بہت سے قواعد اور شرائط ہیں اس لئے اجتہاد کا حق بھی صرف انہی حضرات کو دیا گیا جو پورے طور پر اس کے اہل تھے، ائمہ اربعہ حضرت امام اعظم، ابوحنیفہ، حضرت امام شافعی، حضرت امام مالک، حضرت امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ کو حق تعالیٰ نے ایسا عظیم وبلند مقام عطا فرمایا کہ یہ سب حضرات مجتہد مطلق کہلائے اور قرآن کریم، سنت،

اجماع اور قیاس کی روشنی میں قرآن وسنت سے انہوں نے جو احکام مستنبط فرمائے وہ فقہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کے عنوان سے امت کی رہنمائی کر رہے ہیں اور قیامت تک ان حضرات کی کاوشوں سے امت مستفید ہو کر قرآن وسنت پر عمل پیرا ہوتی رہے گی۔

ائمہ اربعہ میں سراج الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمہ اللہ تعالیٰ کو یہ عظیم شرف عطا ہوا کہ فقہ حنفی کو اپنی وسعت اور گہرائی کی بنیاد پر بہ نسبت دیگر مسالک کے زیادہ قبولیت عامہ حاصل ہوئی اور اس وقت ائمہ اربعہ کی تقلید کرنے والوں میں سب سے زیادہ تعداد حضرت امام اعظم کے مقلدین کی ہے۔

فقہ حنفی بھی فقہ مالکی وشافعی وغیرہ کی طرح قرآن وسنت، اجماع وقیاس دلائل شرع سے ماخوذ ومستنبط ہونے کی وجہ سے یقیناً حق اور لائق اتباع واقتداء ہے اور اس وقت کروڑوں مسلمان اس کے ماننے والے ہیں، لیکن افسوس کہ بڑھتی ہوئی مقبولیت اور پذیرائی کو دیکھ کر مخالفین نے بربناء حسد ہمیشہ یہ پروپیگنڈا کیا کہ فقہ حنفی قرآن وسنت کے مطابق نہیں، یا یہ کہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے بیان کردہ مسائل قرآن اور حدیث کے خلاف ہیں، اناللہ۔

اہل حق وانصاف پر یہ حقیقت مخفی نہیں کہ یہ دروغ بے فروغ اور کذب صریح ہے، اس کو سنتے ہی زبان پر یہ جملہ جاری ہوجاتا ہے: فواللہ انها لفرية بلا مرية۔ ولقد صدق القائل:

كضرائر الحسناء قلن لوجهها	حسدا وبغضا انها لدميم
وكم من عائب قولا صحيحا	وآفته من الفهم السقيم

اس دروغ بے فروغ کا ہر دور میں جواب دیا جاتا رہا، حضرات علماء کرام اور فقہاء عظام نے دلائل شرعیہ کی روشنی میں ثابت کیا کہ فقہ حنفی کے مسائل قرآن وسنت کے عین مطابق ہیں۔ ماضی قریب میں اس موضوع پر سب سے جامع کتاب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کی زیر نگرانی ''اعلاء السنن'' کے نام سے بیس جلدوں میں محدث کبیر، فقیہ خبیر حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی تھانوی نور اللہ مرقدہ نے تحریر فرمائی، جس میں کتاب الطہارۃ سے کتاب الفرائض تک تمام مسائلِ احناف کو حدیث سے ثابت فرما کر امت پر عظیم احسان فرمایا۔ حضرت علامہ نے چونکہ احادیث پر تفصیلی کلام فرمایا ہے اور فریق مخالف کے دلائل کا جواب شافی بھی تحریر فرمایا ہے اس لئے یہ کتاب ایک عظیم وطویل شرح کا درجہ رکھتی ہے، اس کی بے نظیر افادیت کے باوجود دور حاضر کے تقاضا کے مطابق ضرورت تھی کہ فقہ حنفی اور اس کے ادلہ پر مختصر اور جامع انداز میں ایک کتاب تحریر کی جائے جس میں مختصر وقت میں استفادہ ممکن ہو، چنانچہ حال ہی میں علامہ صاغرجی حفظہ اللہ تعالیٰ نے تین جلدوں

میں "الفقہ الحنفی وادلتہ" لکھ کر اس ضرورت کو باحسن وجوہ پورا کر دیا ہے، جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

انتہائی ضرورت تھی کہ اس مبارک کتاب کا اردو ترجمہ کر کے عوام کو اس سے استفادہ کا موقع دیا جائے تا کہ ان کے ذہن میں یہ حقیقت قائم رہے کہ فقہ حنفی کے تمام مسائل پر قرآن وسنت سے دلائل موجود ہیں۔ حق تعالیٰ ادارہ اسلامیات لاہور کے ذمہ دار حضرات کو بہت بہت جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس ناگزیر ضرورت کا احساس کیا اور لجنۃ المصنفین کے اراکین کو یہ ذمہ داری سپرد فرمائی، خوشی کا مقام ہے کہ انہوں نے نہایت محنت سے اس کتاب کا سلیس اردو ترجمہ مکمل کر کے اس کو مفید عوام وخواص بنا دیا ہے۔ برادر عزیز مولانا سید عبدالعظیم ترمذی سلمہ اللہ تعالیٰ جو باقاعدہ لجنۃ المصنفین کے سرگرم رکن، خاصے تجربہ کار اور کامیاب مترجم ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر اس کتاب کے ترجمہ کی خدمت مندرجہ ذیل حضرات نے سرانجام دی ہے، مولانا محمد انس چترالی، مدرس دارالعلوم الاسلامیہ لاہور مولانا خالد محمود صاحب مدرس جامعہ اشرفیہ لاہور اور عزیزم مولانا سید عبدالعظیم ترمذی دارالافتاء جامعہ اشرفیہ لاہور سلمہم اللہ تعالیٰ۔ برادر عزیز سلمہ کے ترجمہ کا کچھ حصہ احقر کے ملاحظہ سے بھی گزرا ہے جسے دیکھ کر معلوم ہوا کہ ترجمہ انتہائی سلیس بامحاورہ اور عام فہم ہے، امید ہے کہ سب حضرات نے اسی طرح محنت فرمائی ہوگی، حق تعالیٰ تمام حضرات کی کاوش اور جدوجہد کو قبول فرمائیں اور اصل کتاب کی طرح اس کے ترجمہ کو بھی نافع ومفید بنائیں اور تمام معاونین اور کارکنان ادارہ کو فلاح دارین اور جزائے خیر سے نوازیں، آمین۔

آخر میں قارئین وناظرین کتاب سے گزارش ہے کہ وہ اس ترجمہ سے استفادہ تو ضرور فرمائیں تا کہ انہیں کسی قدر اندازہ ہو سکے کہ فقہ حنفی کے مسائل اور ان کے دلائل کیا ہیں، لیکن کسی بھی مسئلہ پر عمل یا دوسروں کو بتانے سے قبل کسی معتمد ومستند عالم اور مفتی سے دریافت فرمالیں، کیونکہ جب تک ماہرین فقہ سے اس کتاب کے تمام مسائل کا مفتی بہ ہونا معلوم نہ ہو اس وقت تک اس کے تمام مسائل پر بغیر تحقیق کے عمل کا مشورہ نہیں دیا جاسکتا، هذا ماعندی والله اعلم وعلمه اتم واحکم۔

فقط

احقر سید عبدالقدوس ترمذی غفرلہ

جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

۱۴۲۹/۳/۲۶ھ

عرض مترجم

سید عبدالعظیم ترمذی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمده ونصلي على رسوله الكريم ۔ امابعد:

اسلام دین فطرت ہے جوانسانی رہنمائی کے لیے زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے زریں اصول پیش کرتا ہے، جنکی روشنی میں قیامت تک آنے والی نسلوں اور نت نئے ابھرنے والے مسائل کا حل موجود ہے۔

قرآن حکیم اور سنت رسول اکرم ﷺ میں اصول تو موجود ہیں لیکن مسائل کی جزئیات اور ہر دور کے جدید تقاضوں کے سبب پیش آمدہ نت نئے مسائل کی تفصیلات موجود نہیں۔

والو قائع المتجددة لاتتوفى بها النصوص (مقدمہ ابن خلدون ص ۴۴۵)

چنانچہ امت مسلمہ کے اکابر علماء اور فقہاء نے اس سلسلہ میں ادلۂ شرعیہ میں غور وفکر کے ذریعے استنباط احکام اور استخراج مسائل کر کے آنے والے مسلمانوں کیلئے بیش بہا اور گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ انہیں احکام مستنبطہ اور مسائل مستخرجہ کو آجکل فقہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ الاشباہ والنظائر میں مذکور ہے الفقه معقول عن منقول ۔ یعنی فقہ ایک عقلی علم ہے جسے قرآن وسنت سے حاصل کیا گیا ہے (ص ۵)۔

فقہ کے مناقب وفضائل قرآن وحدیث میں جابجا مذکور اور علماء وعوام میں شائع ذائع ہیں۔ قرآن کریم کی نصوص صریحہ اور احادیث صحیحہ میں جابجا نہ صرف یہ کہ ضروریات زمانہ کے سبب استخراج مسائل واحکام کی حوصلہ افزائی اور تعریف وتوصیف کی گئی ہے، بلکہ تشویق وتحریض کے لیے فضائل ذکر کر کے اس کے حصول کی ترغیب دی گئی ہے۔ لیکن بعض ناقص الفہم اور کوتاہ بین ان مسائل مستخرجہ کو محض ائمہ مجتہدین کی ذاتی رائے قرار دیتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو ائمہ محدثین تفقہ فی الدین کی حفظ احادیث اور جمع روایات پر ترجیح نہ دیتے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: مجھے حدیث کی معرفت اور اس میں تفقہ پیدا کرنا محض الفاظ حدیث یاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے (منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۱۵) بلکہ امام ترمذیؒ نے تو فیصلہ ہی فرما دیا: فرماتے ہیں فقہاء ہی حدیث کے معانی کو بہتر سمجھتے ہیں (ترمذی ج ۱ ص ۱۱۸) جسے محدث کبیر حضرت سلیمان بن الاعمشؒ نے کس خوبصورت انداز سے بیان فرمایا ہے: اے فقہاء: طبیب تو تم ہو، ہم تو صرف پنساری ہیں (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۳۱)۔ یعنی انسان کو جتنی بھی احادیث یاد ہو جائیں جب تک اسمیں تفقہ کی شان نہ ہو وہ ان احادیث کے محمل اور مراد کو متعین نہیں کر سکتا۔

الغرض حدیث کے حقیقی معنی اور مفہوم کو واضح کرنے کے لیے فقہاء سے رابطہ کیا جائیگا، وہ بتائیں گے کہ یہ حدیث ناسخ ہے؟ منسوخ ہے؟ معلول بالعلۃ ہے؟ اس کا حکم عام ہے؟ یا کسی خاص

وقت کے ساتھ مقید ہے؟ وغیرہ وغیرہ..... بلکہ سچ پوچھیں تو جمع احادیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ ہرکس وناکس عالم وجاہل بلکہ لفظ حدیث کے معنی تک سے ناواقف شخص کیلئے ذخیرہ احادیث کو بازیچہ اطفال بنا دیا جائے کہ وہ ان میں رائے زنی کر کے اپنے مطلب کے معانی حاصل کرے اور دینی روح کو مسخ کر کے دیدہ دانستہ یا کم فہمی کی وجہ سے اپنی سہولت وخواہش پر ہی حدیث کا ٹائٹل لگا کر ساری زندگی اپنی خواہشات کا پجاری بنا رہے، بلکہ حفظ احادیث کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ حدیث کے اس ذخیرہ کو ان لوگوں تک پہنچا دیا جائے جو اس سے مسائل مستنبط کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''اللہ تبارک وتعالیٰ اس شخص کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی، یاد کی اور ان تک پہنچادی جنہوں نے مجھ سے براہ راست نہ سنی تھی۔ کیونکہ بعض اوقات ایک شخص حامل فقہ تو ہوتا ہے مگر فقیہ نہیں ہوتا یا فقیہ بھی ہوتا ہے مگر اعلیٰ درجہ کا نہیں ہوتا۔ اس ذریعہ سے بات اس تک پہنچ جائیگی جو اس فن میں اس سے ارفع واعلیٰ ہوگا'' (مسند دارمی ج ۱ ص ۷۵)۔

آپ خود انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجئے کہ کہاں حدیث کا وہ مطلب جو پندرہویں صدی کا غیر متقی، عامی اور دینی ابجد سے ناواقف شخص سمجھے اور کہاں وہ مطلب جو پہلی صدی کا دینی علوم کا ماہر، صحابہ کا شاگرد، خشیت وخوف خدا کا پیکر اور تقویٰ وپاکیزگی کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز امام سمجھے؟ ایک حدیث کا وہ مطلب جو صرف ایک حدیث کے ظاہر کو دیکھ کر سمجھا جائے اور ایک حدیث کا وہ مطلب جو لاکھوں احادیث فن اسماء الرجال اور جرح وتعدیل کو سامنے رکھ کر کتاب اللہ، اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم اور اجماع امت کی تائید کے ساتھ ساتھ روایت ودرایت کی کسوٹی پر پرکھ کر سمجھا جائے۔

"بہ بیں تفاوتِ راہ از کجا است تابہ کجا"

ایک طرف حدیث کا مطلب بیان کرنے والا پندرھویں صدی کی گوناں گوں دنیاوی مصروفیات میں گھیرا شخص جو علم حدیث سے متعلق علوم کے نام تک سے لاعلم ہو اور ایک طرف استاذ المحدثین امام ابو حنیفہؒ جس کی روایت فی الحدیث اور تفقہ فی الدین کے تمام ائمہ محدثین معترف بلکہ اکثر اسی کے خوان کرم کے خوشہ چین ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ (حدیث کی پہلی کتاب لکھنے والے) فرماتے ہیں: اگر اللہ تبارک وتعالیٰ امام ابو حنیفہ کے ذریعے میری مدد نہ فرماتے تو میں بھی ایک عام آدمی ہوتا۔ جب مجھے آثار واحادیث کی تلاش ہو تو سفیان ثوری کا قول دیکھتا ہوں اور جب ان سے مسائل کی تحقیق مقصود ہو تو ابو حنیفہ کا قول دیکھتا ہوں (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۴۳ و ۳۳۷)۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں: وہ ایسے شخص تھے اگر تم ان سے پیالہ کے بارے میں کلام کرو کہ

یہ سونے کا ہے تو وہ اس کو دلائل سے سونے کا ثابت کردیں گے۔ حضرت یحیی بن سعید قطانؒ فرماتے ہیں: اسمیں کوئی جھوٹ نہیں کہ امام ابوحنیفہ سے بہتر ہم نے کسی کا قول نہیں سنا۔ ہم اکثر انہیں کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے خوشہ چین ہیں۔ جو شخص فقہ میں تبحر حاصل کرنا چاہے، وہ ابوحنیفہ کا محتاج ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کو جب محمد بن بشیر کوئی مسئلہ بتاتے کہ امام ابوحنیفہ نے ارشاد فرمایا ہے تو حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے: تم نے روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ سے یہ بات حاصل کی ہے۔ (ایضا)

امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں: دو شخص ہی امام ابو حنیفہ کے بارے میں زبان کھول سکتے ہیں۔ (۱) انکے علم سے حسد کرنے والا (۲) جاہل۔ انکے علم کی قدر نہ کرنے والا۔ امام اوزاعیؒ اور امام عمریؒ دونوں حضرات فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ مشکل مسائل کو سب سے زیادہ جانتے تھے۔ (مناقب ابی حنیفہ)

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہ سابقہ علماء کا نمونہ تھے۔ لیکن خدا کی قسم روئے زمین پر ان کے جانے کے بعد کوئی ان جیسا نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: وہ علم وتقوی، زہد اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے ایسے مرتبے پر فائز تھے جسے کوئی نہیں پا سکتا۔ (تذکرۃ الحفاظ ص ۱۶۰)۔

حضرت یحیی بن معین جو جرح وتعدیل کے امام ہیں، جن کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جس حدیث کو ابن معین نہ جانتے ہوں وہ حدیث نہیں۔ اور جنکے بارے میں علامہ عجلیؒ فرماتے ہیں کہ یحیی بن معین سے زیادہ احادیث کو پہنچاننے والا اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا ہی نہیں کیا، اور علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ انہوں نے دس لاکھ احادیث اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ یہ حضرت یحیی بن معین پکے حنفی ہیں۔ اگر امام ابوحنیفہؒ کے متخرج مسائل حدیث کے خلاف ہوتے تو یہ حنفی کیوں ہوتے؟ حتیٰ کہ خود صحاح ستہ کے مؤلفین امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ رحہم اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ کے شاگردوں کے شاگرد یا بالواسطہ شاگرد ہیں۔ حتیٰ کہ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں جو بائیس ثلاثیات ذکر کی ہیں ان میں سے بیس امام ابوحنیفہ کے تلامذہ اور شاگردوں سے منقول ہیں: (مقدمہ لامع الدراری)

قارئین کرام۔ یقیناً سراج الائمہ فیقہ الملہ امام اعظم ابوحنیفہ یا دیگر ائمہ مجتہدین کے مستنبطہ ومستخرجہ مسائل ان کی ذاتی رائے اور قرآن وحدیث سے متصادم نہیں ہیں بلکہ ان کے ہر ہر مسئلہ کا مستدل اور ماخذ بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن وحدیث ہی ہے۔ اسی لیے علماء متقدمین ومتاخرین نے جہاں مسائل حنیفہ کے قرآن کریم سے اثبات اور انہیں قرآنی دلائل سے مزین ومبرھن کرنے کیلئے احکام القرآن للجصاص اور احکام القرآن للتھانوی جیسی کتابیں تحریر کیں، وہیں بار بار اس

موضوع پر قلم اٹھا کر ذخیرۂ احادیث میں مذکور مستدلات الفقہ الحنفی کو بھی اپنے اپنے انداز میں جمع کر کے کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔ جس کے سبب مسند الامام الاعظم، کتاب الاثار، طحاوی شریف اور اعلاء السنن جیسے علمی شہ پارے ارباب علم وفکر سے داد تحسین وصول کر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلۃ الذھب کی ایک کڑی ہے جس میں شیخ اسعد محمد سعید الصاغرجی حفظہ اللہ نے فقہ حنفی کی روشنی میں کتاب الطہارۃ سے لے کر کتاب الفرائض تک تقریباً تمام اہم مسائل اور قرآن و حدیث سے ان کے مستدلات جمع کئے ہیں۔ نیز ہر حدیث مکمل تخریج کے ساتھ نقل کی ہے۔ انشاء اللہ یہ کتاب بھی فقہ حنفی کے بڑے ماخذ میں ایک بہترین اضافے کے طور سے یادگار رہے گی۔ اصل کتاب عربی زبان میں ہے۔ مخدوم ومکرم جناب حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب عثمانی دامت برکاتہم العالیہ کے حکم سے لجنۃ المصنفین نے اسے اردو قالب میں ڈھالا ہے کتاب کے آغاز میں مصنف کتاب علامہ صاغرجی کے قلم سے امام اعظم ابوحنیفہ کے مختصر حالات زندگی بھی موجود ہیں۔ نیز برادر مکرم جناب مولانا مفتی سید عبدالقدوس ترمذی دامت برکاتہم کی تقریظ بھی شامل ہے۔ احقر ان کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے احقر کی درخواست کو شرف قبول بخشا اور کتاب ھذا کیلئے تقریظ تحریر فرمائی۔ "فجزاھم اللہ خیرا"۔ ہم اراکین لجنۃ المصنفین برادر محترم جناب سعود عثمانی صاحب کے بھی ممنون ہیں جنہوں نے اس عظیم سعادت کیلئے لجنۃ المصنفین کا انتخاب کیا اور جنکی کاوشوں سے یہ کتاب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں اس کتاب کی نشر واشاعت پر اجر جزیل عطاء فرمائیں۔

آخر میں قارئین کرام سے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ کسی بھی فقہی کتاب کو از خود دیکھ کر اس پر عمل کرنے کی بجائے احتیاط اسی میں ہے کہ کسی بھی مسئلہ سے متعلق مفتی بہ قول جاننے کیلئے دارالافتاء سے رجوع کر کے اس پر عمل کیا جائے۔

احقر دعاء گو ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اصل کتاب کی طرح اس کے ترجمہ کو بھی قبولیت عامہ نصیب فرمائے اور اسکے مصنف۔ مترجمین، ناشرین اور اس سلسلہ میں کوشش کرنے والے تمام احباب کیلئے دنیا و آخرت دونوں میں باعث خیر اور اپنی رضا کا ذریعہ بنائیں اور اپنی بارگاہ میں اس کاوش کو قبول فرمائیں۔

"وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین برحمتك یا ارحم الراحمین"۔

احقر العباد سید عبدالعظیم ترمذی کان اللہ لہ

لجنتہ المصنفین ۱۵ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ/۲۲ اپریل ۲۰۰۸ء

معھد الترمذی۔ اچھرہ۔ لاہور